مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

خدمات و آثار

مرتبہ

مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی

مولانا عبدالماجد دریابادی
خدمات و آثار

مرتبہ:

مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

بسلسلۂ مطبوعات شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ

۷

نام کتاب : مولانا عبدالماجد دریابادی — خدمات و آثار

مرتبہ : مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

قیمت : 200/-

سن اشاعت : ۱۵/جون ۲۰۰۶ء

آئی ایس بی این : ۸۱_۹۰۱۸۴۸_۳_۰

تعداد : 1100

مطبع : کلاسیکل آرٹ، دلی۔

کمپوزنگ : تبریز عالم اقراء کمپیوٹر سینٹر N-80/C ابوالفضل انکلیو، اوکھلا، نئی دہلی۔۲۵

ناشر : شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، مسجد کاکانگر، نزد (این، ڈی، ایم، سی پرائمری اسکول) کاکانگر نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۳

Title : Maulana Abdul Majid, Darya Badi Khidmat wa Aasar
Editing : Maulana Mufti Ataur Rahman Qasmi
First Edition: 15-06-2006
Price : 200/-
ISBN : 81-901848-3-0
Composing : Tabrez Alam N-80/C, Abul Fazal Enclave, New Delhi-25

Published by

Shah Waliullah Institute

Masjid Kaka Nagar, Near (N. D. M. C.
Primary School) Kaka Nagar, New Delhi-110 003
Ph. : 2632 3430 / 32 Mob.98117 40661
website : www.shahwaliullah.com
Email : qasmi@shahwaliullah.com

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی ☆

اردو زبان وادب کے فروغ وارتقاء میں جہاں خاندان ولی اللّٰہی کا زبردست حصہ رہا ہے وہاں دینی مدارس، اسلامی مراکز، روحانی خانقاہوں اور ان سے وابستہ علماء وفضلاء اور صوفیاء ومشائخ کا بھی اہم رول رہا ہے اور انہوں نے اردو زبان کو پروان چڑھانے میں تاریخ ساز کردار نبھایا ہے۔

حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے دور میں سرکاری زبان فارسی تھی، خود شاہ صاحب کی مادری زبان فارسی تھی۔ اگر چہ ان کا تمام تر علمی کام عربی اور فارسی زبان میں ہوا ہے اس کے باوجود حضرت شاہ صاحب اردو زبان (جو اس وقت نوخیز ونوزائیدہ تھی) سیکھنے کی تاکید کرتے تھے۔ حضرت خواجہ میر درد دہلویؒ اردو زبان کے قادر الکلام شاعر اور مشہور صوفی تھے۔ ان کی ادبی مجلسوں میں شرکت کرنے پر زور ڈالتے تھے۔ مشہور روایت ہے کہ حضرت شاہ صاحب اپنے صاحبزادوں سے کہا کرتے تھے کہ جس طرح اصول حدیث اور اصول فقہ فن ہے۔ اسی طرح زبان بھی ایک فن ہے۔ اردو زبان کے موجد ومجتہد خواجہ میر درد ہیں، ان کی صحبت اس فن کے لئے غنیمت خیال کرو۔ کیونکہ خواجہ صاحب کے پان ہیں۔ چنانچہ شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ آپ کی ادبی مجلس میں جایا کرتے تھے اور اردو زبان کے محاورے اور اسلوب بیان سیکھتے تھے۔ آپ کے دوسرے صاحبزادگان اردو زبان وادب کے تعلق سے خواجہ صاحب سے استفادہ کرتے تھے، یا نہیں اس کی روایت نہیں ملتی ہے، لیکن حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے عوامی درس قرآن

☆ چیئرمین شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

اور مواعظ میں دہلی اسکول کے بڑے بڑے شعراء اور ادباء اردو زبان اور محاورے سیکھنے جاتے تھے، مشہور واقعہ ہے، کہ استاذ شاعر شاہ نصیر دہلوی جو سلطنت مغلیہ کے آخری چشم و چراغ بہادر شاہ ظفر اور مشہور شاعر شیخ ابراہیم ذوق دہلوی کے استاذ تھے جب شاہ نصیر صاحب ذوق دہلوی سے کسی بات پر خفا ہو گئے اور اصلاح موقوف کر دی تو ذوق ہر جمعہ کو حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے وعظ میں جانے لگے۔ اور وعظ بہت غور سے سننے لگے۔ کسی دوست نے اس کا سبب پوچھا تو ذوق نے کہا کہ استاذ مجھ گناہگار سے خفا ہیں۔ شعر و سخن میں اصلاح ملتی نہیں اس کا بدل میں نے یہ نکالا ہے کہ شاہ صاحب کا وعظ سنا کروں کیونکہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب اردو زبان دانی میں شاہ نصیر صاحب سے کسی طرح کم نہیں، ان کے بیان و گفتگو کو سنتا ہوں اور اردو زبان کے محاورے یاد کرتا ہوں۔

حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ باوجود اس کے وہ عربی و فارسی زبان کے آدمی تھے، لیکن ان کی دوررس نگاہ زمانہ و حالات پر بھی تھی۔ وہ مستقبل میں پیش آنے والے حالات ولسانی تغیرات سے باخبر تھے۔ وہ بخوبی دیکھ رہے تھے کہ اب فارسی زبان کا چلن دن بدن کم ہوتا جارہا ہے۔ اس کی جگہ اردو زبان لیتی جارہی ہے۔ آئندہ اردو زبان ہی یہاں کی علمی وادبی زبان ہوگی۔ اور سارے اسلامی علوم وفنون اسی زبان میں منتقل ہوں گے۔

چنانچہ آپ کے دوراندیش صاحبزادوں نے بھی آپ کے اشاروں کو بھانپ لیا تھا اور مروج فارسی زبان کے بجائے نومولود اردو زبان میں علمی کاموں کا آغاز کر دیا تھا۔ بلاشبہ یہ اس وقت ایک انقلابی واجتہادی قدم تھا۔ اور زمانہ کی عمومی روش سے ایک حد تک انحراف بھی تھا۔

حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ نے قرآن کریم کا بامحاورہ اور حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی نے تحت اللفظ ترجمے کئے، حضرت عبدالقادر صاحب کا ترجمہ الہامی ترجمہ بھی کہلاتا ہے۔ یہ دونوں فاضل صاحبزادے اردو زبان ومحاورے کے موزوں استعمال کے تعلق سے "سند" تسلیم کئے جاتے ہیں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے اپنے بعض مکتوبات میں حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی کی زبان کو سند قرار دیا ہے۔

اردو زبان وادب کے ساتھ یہ لگاؤ اور تعلق خاندان ولی اللہی کے ساتھ مختص نہیں ہے۔ بلکہ ہر عہد کے علماء زبان وادب کے تعلق سے فراخ دل وکشادہ چشم رہے ہیں۔ اگر تعصب وتنگ نظری کی عینک ہٹا کر علماء وصوفیاء کی زندگیوں اور ان کے رویوں کا معروضی مطالعہ کیا جائے تو علماء اور

صوفیوں کا مرتبہ بلند سے بلند تر نظر آئے گا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ آزاد ہندوستان میں اردو زبان کا وجود ہی علماء اور مدارس کی رہین منت ہے۔ چونکہ علماء ومشائخ کی زبان اور ان کے درس و تدریس کی زبان بھی اردو ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برصغیر کے مشہور عالم دین اور مولانا دریابادیؒ کے پیرومرشد حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اردو زبان سیکھنے کو واجب قرار دیا ہے اس سے نہ صرف اردو زبان کی عظمت واہمیت کا اظہار ہوتا ہے۔ بلکہ علماء کی بلند فکری وفراخ دلی کا پہلو بھی سامنے آتا ہے۔

اردو زبان وادب کے فروغ وارتقاء میں جن علماء ومشائخ کا اہم حصہ رہا ہے ان میں مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا شبلی نعمانی، الطاف حسین حالی، مولوی محمد حسین آزاد، خواجہ حسن نظامی، مولانا عبیداللہ سندھیؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا حامد الانصاری غازی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، مولانا منت اللہ رحمانی، قاری محمد طیب صاحب، مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مولانا عبدالماجد دریابادی۔ کا نام سرفہرست ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی، جامع الحیثیات بزرگ تھے۔ وہ مشہور عالم دین، مفسر قرآن، فلسفہ شناس، نفسیات داں، مترجم، نقاد، انشاء پرداز، سوانح نگار، خودنوشت، شخصیہ نگار، سفرنامہ نگار، شاعر، ڈرامہ نگار، مکتوب نگار، اور محقق ومرتب بھی تھے۔ آپ کی تحریروں میں اثر آفرینی، سحرانگیزی اور معنی آفرینی ونکتہ سنجی کے عناصر بدرجہ اتم موجود تھے۔ آپ اپنے اسلوب وطرز نگارش کے موجد بھی تھے اور خاتم بھی تھے۔ آپ کے علمی، ادبی، تنقیدی، تفسیری، کلامی اور حدیثی کاموں کا دائرہ بڑا وسیع ہے۔ اور نصف صدی سے زائد عرصہ پر محیط ہے۔ اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہے کہ آپ نے تن تنہا اتنے علمی وتحقیقی کام کئے ہیں، جو ہندو پاک ہی نہیں عالم عرب اور یوروپین ممالک کی بعض بڑی بڑی سرکاری وغیر سرکاری اکیڈمیاں نہیں کر پائی ہیں۔ رحمہم اللہ رحمۃً واسعۃ۔

اتفاق سے ایک تقریب میں برادر محترم پروفیسر ڈاکٹر محمد سلیم قدوائی صاحب استاذ شعبۂ امریکن اسٹڈیز جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے ملاقات ہوئی۔ ڈاکٹر محمد سلیم قدوائی صاحب مفسر قرآن مولانا عبدالماجد دریابادی کے نواسے اور مشہور مصنف ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی صاحب سابق استاذ شعبۂ سیاسیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، وسابق ممبر پارلیمنٹ کے فرزند ارجمند ہیں۔ خود بھی صاحب علم وصاحب ذوق اور طبعاً شریف النفس انسان ہیں، انگریزی اور اردو زبان پر یکساں عبور رکھتے ہیں۔ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ آپ کی کتاب ''اسلام، امریکہ اور ساؤتھ ایشیا''

بہت ہی مشہور ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی گود میں پلے بڑھے ہیں۔ موصوف بھی مولانا دریابادیؒ کی طرح مشرقیت واسلامیت کے دلدادہ ہیں۔ حالانکہ جواہر لال نہرو جیسی یونیورسٹی میں امریکی تہذیب وثقافت کا درس دیتے ہیں۔

موصوف واپسی کے موقع پر مجھے اپنے ہمراہ لائے، دوران سفر مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کا ذکر آیا تو بڑے دکھ وکرب کے ساتھ کہنے لگے کہ مولانا مرحوم کو نہ جانے کیوں ان کی زندگی میں بھی نظر انداز کیا گیا اور وفات کے بعد بھی ان کی خدمات کا صحیح اعتراف نہیں کیا جارہا ہے۔ جو ایک افسوسناک ادبی حادثہ ہے۔

میں نے عرض کیا کہ ''شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ'' ایک علمی وتحقیقی ادارہ ہے، اس کے قیام کے مقاصد واہداف میں ولی اللہی فکر علماء اور دانشوروں کے علمی وتحقیقی کاموں کا تعارف وتذکرہ بھی رہا ہے۔

مفسر قرآن مولانا عبدالماجد دریابادیؒ ایک ولی اللہی فکر عالم دین اور مفسر قرآن کریم تھے، ان کی شخصیت اور ان کے علمی وادبی کارناموں پر سیمینار کرنا ہم سب کے لئے باعث سعادت وافتخار ہے۔

یہ سیمینار شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام ہوگا اور مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے شایان شان ہوگا۔ میں نے سیمینار کرنے کا وعدہ ضرور کرلیا لیکن اس سیمینار کا فیصلہ بڑی بے سروسامانی کی حالت میں کیا گیا تھا۔ بعد میں میں اور ڈاکٹر محمد سلیم قدوائی صاحب بڑی تشویش میں مبتلا ہوگئے۔ کہ یہ ملک گیر سطح کا سیمینار کیسے ہو پائے گا۔ ہم لوگوں نے فیصلہ کیا کہ محترمہ محسنہ قدوائی صاحبہ ایم پی، وسابق مرکزی وزیر حکومت ہند، اور ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی گورنر ہریانہ سے ملنا چاہئے۔ اور ان سے مشورہ کرنا چاہئے۔ جن سے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے خاندانی تعلقات بھی ہیں۔ چنانچہ ہم دونوں ایک دن محترمہ محسنہ آپا کے گھر گئے۔ ان سے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نیشنل سیمینار کے تعلق سے گفتگو کی، محسنہ آپا نے کافی دیر تک مرحوم مولانا عبدالماجد دریابادیؒ (جنھیں وہ ماجد دادا کہتی ہیں) سے خاندانی تعلقات اور ذاتی روابط پر گفتگو کرتی رہیں۔ اور کہنے لگیں کہ ان سے میرے والد قطب الدین ملا صاحب مرحوم کے بڑے دیرینہ وعقیدت مندانہ تعلقات تھے۔ والد مرحوم کوئی بھی کام ان کی مرضی کے خلاف نہیں کرتے تھے۔ اور ہر کام میں ان سے مشورہ کرتے تھے۔ مکتوبات ماجدی میں والد صاحب کے نام متعدد خطوط بھی ہیں۔

میری شادی کے موقع پر بھی مبارکبادی کا خط تحریر تھا، جو مکتوبات ماجدی میں موجود ہے۔ان کے پاکستان جانے کے بعد بھی ان کے تعلقات بدستور قائم تھے، محسنہ آپا نے کہا کہ آپ لوگ بہت اچھا کام کر رہے ہیں کہ ماجد دادا پر سیمینار کر رہے ہیں، آپ بتائیں کہ میں کیا مدد کرسکتی ہوں، مجھے سیمیناروں کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ہم نے کہا کہ محسنہ آپا آپ کی حوصلہ افزائی سے ہم لوگوں کا حوصلہ بلند ہو گیا ہے، لگتا ہے کہ یہ سیمینار ہو جائے گا۔پھر ہم دونوں ایک دن ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی گورنر ہریانہ سے ملنے ہریانہ بھون نئی دہلی گئے، اتفاق سے وہ چندی گڑھ سے دہلی آئے ہوئے تھے۔ڈاکٹر صاحب سے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ سیمینار کا ذکر کیا گیا تو بہت خوش ہوئے۔مبارکبادی اور کہا کہ آپ لوگ سیمینار کریں میں ضرور شریک ہوں گا۔اور کسی طرح کی کوئی ضرورت ہو تو مجھے ضرور خبر کریں۔میں نے کہا کہ اس سیمینار کے لئے ایک مجلس استقبالیہ تشکیل دی گئی ہے۔اس میں محسنہ آپا اور آپ کا نام بھی رکھنا چاہتے ہیں۔کہنے لگے کہ ضرور رکھ لیں۔اس کے علاوہ کوئی اور ضرورت ہو تو بلاتکلف بتائیں ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی صاحب سے تفصیلی گفتگو کے بعد سیمینار کی بنیادی کارروائی شروع کر دی گئی۔چنانچہ مدارس، جامعات، (یونیورسٹیز) کے ذمہ داروں اور اہم شخصیات سے رابطہ قائم کرنا شروع کر دیا گیا۔اور شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نیشنل سیمینار کے مقالات کے حصول کے لئے باضابطہ دعوت نامے جاری کر دیئے گئے۔چونکہ سیمینار کے تعلق سے سب سے اہم مسئلہ مقالات کے حصول کا ہوتا ہے۔مجھے مختلف شخصیات اور اہل علم کی جانب سے بڑے حوصلہ افزاء خطوط موصول ہوئے، ان خطوط سے مولانا عبدالماجد دریابادی کی شخصیت کی مقبولیت ومحبوبیت اور ان کے علم وفن کی معنویت کا احساس ہوا، بڑے بڑے علماء ومشائخ اور دانشوروں نے اس سیمینار کے انعقاد پر خوشی ومسرت کا اظہار کیا اور شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کے اس اقدام کو سراہا۔اور شرکت کرنے اور مقالے لکھنے کی یقین دہانی کرائی، مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند، مولانا محمد سالم قاسمی صاحب مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند اور مولانا سید انظر شاہ کشمیری شیخ الحدیث دارالعلوم وقف دیوبند نے سیمینار کی کامیابی کے لئے دعائیں دیں۔اور مقالات و پیغامات بھیجنے کا وعدہ فرمایا۔

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے لکھا کہ:

آپ کا خط ملا، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی شخصیت اور خدمات پر سیمینار کرنا بہت اچھا اقدام ہے، ایسی قد آور اور علمی وادبی، دینی شخصیت پوری طرح اس بات کی مستحق ہے کہ اس پر قومی سطح کا سیمینار کیا جائے۔

اس میں شرکت کے لئے آپ کے دعوت نامہ پر میں اپنی قدر کا اظہار کرتا ہوں انشاء اللہ شرکت کی پوری کوشش کروں گا۔

پھر مولانا سید محمد رابع صاحب ندوی نے ایک دوسرے خط میں لکھا کہ:

آپ کا خط ملا، برائے شرکت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ سیمینار موصول ہوگیا تھا اور فون پر بھی بات ہوئی، میں نے وعدہ کیا ہے۔ انشاء اللہ حاضر ہو جاؤں گا مولاناؒ سے ہم اہل ندوہ کا جو تعلق ہے، اس کا بھی تقاضہ ہے کہ میں سیمینار پر اپنی قدر دانی کا اظہار کروں، اللہ تعالیٰ اسے مفید طریقے سے کروائے۔

مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن الاعظمی ایڈیٹر البعث الاسلامی ومہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے بھی اس سیمینار میں مقالہ پیش کرنے اور شرکت کی یقین دہانی کرائی۔ انہوں نے مولانا دریابادیؒ سے عقیدت مندی کا اظہار کیا۔ اور مقالہ بھی تحریر فرمایا اور سیمینار میں شریک بھی ہوئے۔ میں ان کا خاص طور پر ممنون ومشکور ہوں۔

اسی طرح مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب ناظم دار المصنفین اعظم گڑھ نے لکھا تھا کہ:

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا، آپ کا مراسلہ دو ہفتہ پہلے ملا تھا مگر بڑی مصروفیت میں تھا اس لئے پہلے تو جواب امروز وفردا پر ٹلتا رہا۔ پھر مراسلہ کاغذات میں دب گیا، بعض چیزوں کی تلاش میں وہ مل گیا تو فوراً جواب لکھنے بیٹھ گیا۔

مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم سے اس ناچیز کو جو عقیدت ہے اس کی بنا پر ان پر منعقد ہونے والے سیمینار میں شریک ہونا میرے لئے باعث فخر اور اس سے استفادہ باعث سعادت ہے۔

پروفیسر عبدالقوی دسنوی صاحب (بھوپال) نے بڑا حوصلہ مند خط لکھا اور شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کے اس اقدام کو سراہا، اور مولانا عبدالماجد دریابادیؒ سے اپنے ربط وتعلق کا اظہار کیا۔

پروفیسر انیس چشتی صاحب رکن مسلم پرسنل لا بورڈ نے بھی مولانا عبدالماجد دریابادیؒ سیمینار کے انعقاد پر خوشی ومسرت کا اظہار کیا ہے۔

بالآخر ۱۵رجنوری ۲۰۰۵ء راجندر بھون راوز ایونیو، دین دیال اوپادھیائے مارگ، نئی دہلی میں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نیشنل سیمینار ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی گورنر ہریانہ کے زیر صدارت منعقد ہوا۔ میں نے بحیثیت کنوینر مولانا عبدالماجد دریابادی نیشنل سیمینار افتتاحی اجلاس میں شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کی علمی و تحقیقی خدمات کا مختصر تعارف کراتے ہوئے کہا کہ شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کے قیام کے مقاصد میں ایک مقصد عربی، فارسی اور اردو مخطوطات کی اشاعت کے ساتھ خاندان ولی اللٰہی اور ولی اللٰہی فکر علماء کی خدمات کا تعارف و تذکرہ بھی رہا ہے۔ جس کی بنا پر مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نیشنل سیمینار منعقد کیا جا رہا ہے۔

اس کے بعد مجلس استقبالیہ کے صدر ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی صاحب سابق استاد شعبۂ سیاسیات مسلم یونیورسٹی و سابق ممبر پارلیمنٹ نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں سیمینار کی غرض و غایت کو بیان کرتے ہوئے مہمانان خصوصی، مقالہ نگاروں اور سامعین کا پر جوش استقبال کیا۔ اور سیمینار کے منعقد کرنے میں پیش آمدہ دشواریوں اور پریشانیوں کا ذکر کیا۔ اس کے بعد میں نے بڑے ادب و احترام کے ساتھ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ و صدر آل انڈیا مسلم پرسنل بورڈ سے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نیشنل سیمینار کے افتتاح کرنے کی درخواست کی۔ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب نے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نیشنل سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ سے اپنے اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے تعلق کا ذکر کیا، سیمینار کے انعقاد پر خوشی کا اظہار کیا اور شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کی ستائش کی۔ اسی موقع پر شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام شائع شدہ کتاب ''امام شاہ ولی اللہ اور ان کے افکار و نظریات'' کی رونمائی کرتے ہوئے کتاب کے مرتب خاکسار عطاء الرحمٰن قاسمی کو مبارکباد دی۔ اور شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کے علمی و تحقیقی کاموں کو بے حد سراہا۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ صاحب نے بھی شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کے اس باوقار سیمینار پر خوشی کا اظہار کیا، اور شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کے علمی کاموں کو بنظر تحسین دیکھتے ہوئے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کے درمیان اشتراک عمل پر زور دیا اور شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کے علمی پروجیکٹوں میں تعاون کرنے کی یقین دہانی کرائی۔

محترمہ محسنہ قدوائی صاحبہ ایم پی و سابق مرکزی وزیر حکومت ہند نے افتتاحی اجلاس میں

تقریر کرتے ہوئے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ سے خصوصی تعلق وعقیدت کا ذکر کیا اور اپنے ماجد دادا کی سوچ اور طریقۂ تربیت پر بھرپور روشنی ڈالی۔ محسنہ آپا کی تقریر کو سامعین نے بے حد پسند کیا۔

ڈاکٹر سید محمد فاروق صاحب چیئرمین تسمیہ ٹرسٹ نے اپنے افتتاحی اجلاس میں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی علمی خدمات کا تعارف کراتے ہوئے شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کی مطبوعات کی ستائش کی، اور ہر طرح کے تعاون کرنے کا یقین دلایا۔ محترمہ حامدہ حبیب اللہ صاحبہ سابق ایم پی وسابق چیئرمین اردو اکادمی اتر پردیش نے بڑے جذباتی انداز میں مولانا دریابادی مرحوم کی صاحبزادی محترمہ زہیرا قدوائی صاحبہ کا ذکر کیا، جن کا انتقال سیمینار سے چند روز قبل ہوا تھا بیگم صاحبہ نے بے ساختہ روتے ہوئے کہا کہ آج اس باوقار سیمینار کے موقع پر میری چھوٹی بہن یاد آتی ہے، جو مجھے داغ فراق دے گئی ہے۔ بیگم صاحبہ نے اشکبار آنکھوں کے ساتھ سیمینار میں اپنا مقالہ پیش کیا۔

محترمہ بیگم حامدہ حبیب اللہ صاحبہ کے متعلق یہ وضاحت ضروری ہے کہ یہ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی بھانجی ہیں۔ اور ممبر پارلیمنٹ بھی رہی ہیں۔ آپ کے صاحبزادے جناب وجاہت حبیب اللہ صاحب سینئر آئی اے ایس آفیسر ہیں جو حال میں کمشنر آف انفارمیشن حکومت ہند بنائے گئے ہیں۔ جو ایک اہم عہدہ ہے۔ ان کا شمار ملک کے ممتاز دانشوروں میں ہوتا ہے۔

اس افتتاحی اجلاس میں مولانا سید انظر شاہ کشمیری صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم وقف دیوبند نے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی صحافتی خدمات اور طرز تحریر پر فاضلانہ گفتگو کی۔ مولانا انظر شاہ کشمیری کی تقریر کو سامعین نے بے حد پسند کیا۔ اور ان سے مزید تفصیلی روشنی ڈالنے کی درخواست کی گئی۔ مولانا سید انظر شاہ کشمیری کے بعد خانقاہ رحمانی مونگیر کے سجادہ نشین مولانا محمد ولی رحمانی صاحب نے افتتاحی اجلاس میں تقریر کرنے کے بجائے اپنا مقالہ پیش کیا۔ آپ کا مقالہ بھی پسند کیا گیا۔

درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء کے سجادہ نشین اور دلی کے بزرگ خواجہ حسن ثانی نظامی صاحب نے اپنے افتتاحی بیان میں کہا کہ شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ نے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی شخصیت اور ان کی علمی خدمات پر یہ باوقار سیمینار منعقد کر کے بڑا مستحسن اقدام کیا۔ لیکن مولانا عبدالماجد دریابادیؒ جیسی عظیم شخصیت پر ایک روزہ سیمینار کے بجائے دو روزہ، سہ روزہ سیمینار ہونا چاہئے، اور ان کے تمام علمی پہلوؤں پر سیر حاصل بحث ہونی چاہئے اس میں دلی کے مختلف

سرکاری اور غیر سرکاری ادارے بھی بھرپور تعاون کریں گے۔

آخر میں ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی گورنر ہریانہ نے اپنے صدارتی خطبہ میں جہاں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی شخصیت اور ان کے علمی کارناموں کو بیان کیا وہاں شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کی علمی سرگرمیوں کا بھی خصوصی طور پر ذکر کیا۔ گورنر صاحب نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان حکومت ہند کو شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کے علمی منصوبوں میں تعاون کرنے کی طرف توجہ دلائی۔

ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی صاحب نے کہا کہ شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے تعلق سے کوئی بھی منصوبہ بنائے، اس میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور دوسرے سرکاری اداروں کو بھرپور تعاون کرنا چاہئے چونکہ شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کی مطبوعات وتحقیقات سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک مستند ومعتبر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ہے۔

میں شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ اور مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی صاحب کے تحقیقی کاموں سے خوب واقف ہوں، اور ان کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔

اس خطبۂ صدارت کے بعد پروفیسر ڈاکٹر محمد سلیم قدوائی صاحب خازن مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نیشنل سیمینار نے تمام مہمانان خصوصی، اور سامعین کا شکریہ ادا کیا، اور افتتاحی اجلاس کے اختتام کا اعلان کیا اس کے بعد چائے وغیرہ کا اہتمام کیا گیا۔ وقفۂ چائے کے بعد دوسری نشست کا آغاز ہوتا تھا۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نیشنل سیمینار کی دوسری نشست کی صدارت پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شیروانی صاحب سابق صدر شعبۂ عربی کشمیر یونیورسٹی نے کی۔ اس نشست میں حافظ عمیر الصدیق دریابادی صاحب دارالمصنفین اعظم گڑھ، پروفیسر محمد شافع قدوائی صاحب شعبۂ صحافت مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ڈاکٹر ضیاء الحق چودھری صاحب کرسچن کالج لکھنؤ، مولانا سعید الرحمٰن اعظمی صاحب ایڈیٹر البعث الاسلامی ومہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، اور یعقوب الرحمٰن صاحب مہاراشٹر کے مقالات پڑھے گئے۔ جس کی نظامت جناب منصور آغا صاحب نے کی۔ اس نشست کے اختتام کے بعد نماز اور کھانے کا اہتمام کیا گیا، نماز اور کھانے سے فراغت کے بعد تیسری نشست زیر صدارت مولانا عمید الزماں کیرانوی جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت ہوئی۔

جس میں پروفیسر بدرالدین الحافظ صاحب سابق صدر شعبۂ عربی ہندو یونیورسٹی بنارس،

ڈاکٹر علیم اشرف خاں صاحب اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی، ڈاکٹر ریاض الرحمٰن خاں شروانی صاحب سابق صدر شعبۂ عربی کشمیر یونیورسٹی، پروفیسر منشاء الرحمٰن خاں منشاء (ناگپور) مولانا جنید احمد بنارسی ممبئی، ڈاکٹر ریاض احمد جامعہ ملیہ اسلامیہ، مولانا مزمل حسین قاسمی ٹریننگ کالج جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، مولانا عقیدت اللہ قاسمی سہ روزہ دعوت، محمد شیث ادریس تیمی چیئر مین الثقافہ فاؤنڈیشن نئی دہلی، اس تیسری نشست کی نظامت پروفیسر ظہیر احمد جعفری نے کی ان کے علاوہ مولانا سعید الرحمٰن الاعظمی ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ، پروفیسر طاہر محمود سابق صدر شعبۂ قانون دہلی یونیورسٹی، مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی مفتی پنجاب مالیر کوٹلہ، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی سابق صدر شعبۂ اردو جواہر لال نہرو یونیورسٹی، وسکریٹری غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ڈاکٹر خلیل الرحمٰن راز (دوحہ قطر)، مولانا سید عزیز الحسن صدیقی مہتمم مدرسہ دینیہ غازی پور، ڈاکٹر شمس بدایونی بریلی، پروفیسر سلیمان اشرف جاوید صاحب حیدرآباد، محترمہ زہیر اقدوائی صاحبہ دہلی، پروفیسر شفیق احمد ندوی صدر شعبہ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، مولانا عبداللہ عباس ندوی سابق استاد جامعہ ام القریٰ مکہ مکرمہ، ڈاکٹر سید عبدالباری۔ کے اہم مقالات موصول ہوئے۔

مجھے خوشی ہے کہ ''عہد وسطیٰ کے آثار''، ''قرآنی محاضرات''، اور امام شاہ ولی اللہ نیشنل سیمینار جیسے اہم سیمیناروں کے بعد شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام یہ چوتھا مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نیشنل سیمینار بھی اپنی کمیت وکیفیت کے اعتبار سے راجدھانی دہلی میں ہونے والی سرکاری وغیر سرکاری سیمیناروں میں منفرد نوعیت کا تھا۔ سیمینار کے موقع پر راجندر بھون نئی دہلی کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ہال میں تل رکھنے کی جگہ نہیں تھی۔ بڑے بڑے علماء، فضلا، وسیاسی زعماء اور سابق وزراء اور آئی اے ایس، آئی پی ایس حضرات سامعین کی صفوں میں بیٹھے ہوئے نظر آرہے تھے جو اپنی اپنی جگہوں میں دینی ودنیوی حیثیت سے بلند مقام رکھتے ہیں۔ یہ حضرات بجا طور پر اس کے مستحق تھے کہ ان کو اسٹیج پر بٹھایا جائے لیکن مہمانان خصوصی کی کثرت کی وجہ سے تمام تر خواہشوں کے باوجود یہ ممکن نہ تھا۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نیشنل سیمینار کے تعلق سے ایک ملی حادثہ کا ذکر ضروری ہے کہ میں اور برادر محترم ڈاکٹر محمد سلیم قدوائی صاحب سیمینار کی تیاریوں میں مصروف تھے اور مقررہ وقت کے مطابق ۱۵ر جنوری ۲۰۰۵ء کو مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نیشنل سیمینار ہونے والا تھا کہ ڈاکٹر محمد سلیم قدوائی صاحب کی والدہ ماجدہ محترمہ زہیر اقدوائی صاحبہ جو ایک عرصہ سے کینسر کے موذی

مرض کے سبب حیات وموت کی کشمکش میں مبتلا تھیں اچانک ۱۲رجنوری ۲۰۰۵ء کو ڈیڑھ بجے شب میں انتقال ہوگیا۔ نماز فجر سے قبل ٹیلی فون کی گھنٹی بجی، میں نے ٹیلی فون اٹھایا تو محترم ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی صاحب (جن سے میرے بہت پرانے تعلقات ہیں وہ میرے بڑے بھائی ریاض احمد صاحب ایم اے کے مشفق استاذ ہیں اسی نسبت سے وہ مجھے بھی عزیز رکھتے ہیں،) نے بھرائی ہوئی آواز میں اس تکلیف دہ خبر کی اطلاع دی کہ رات جو نہ ہونا تھا وہ ہوگیا اور تدفین علیگڑھ میں ہوگی۔ میں علی الصباح جناب سید فخر عالم صاحب ندوی (جو مرحومہ کے منجھلے داماد ہیں) کے مکان پریت وہار میں حاضر ہوا۔ میری آمد کی اطلاع ملتے ہی برادر محترم ڈاکٹر محمد سلیم قدوائی صاحب باہر آئے اور دیکھتے ہی مجھ سے لپٹ کر زار وقطار رونے لگے۔ بڑی مشکل سے انہیں سنبھالا، اور بٹھایا، پھر تھوڑی دیر بعد محترم ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی صاحب بھی تشریف لائے، مجھے دیکھتے ہی مجھ سے بغلگیر ہو کر کہنے لگے کہ اب میں کیا کروں گا۔ کہاں جاؤں گا۔ کہاں رہوں گا۔ یہ عجیب اندوہ ناک ماحول تھا۔ میں خود اس اندوہ ناک حادثہ سے غمگین تھا۔ اور سخت کرب واضطراب میں مبتلا تھا اتفاق سے اسی دوران مشہور صحافی جناب محمود سعید بلالی صاحب بھی آگئے جو مجلس استقبالیہ کے رکن بھی تھے۔ مولانا دریابادی مرحوم سے خصوصی عقیدت رکھتے ہیں، ان کی حیات میں ان سے ملنے کے لئے دریاباد بھی گئے تھے۔ مرحومہ کی لاش علی گڑھ جانے والی تھی۔ اور امبولنس کا انتظار تھا اسی مختصر وقت میں فیصلہ کرنا تھا کہ یہ سیمینار ملتوی کردیا جائے یا اسی تاریخ میں کیا جائے۔ میں محترم ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی صاحب اور ڈاکٹر محمد سلیم قدوائی صاحب کے صبر وضبط اور قوت فیصلہ سے حیران رہ گیا کہ دونوں حضرات نے یہ فیصلہ کیا کہ سیمینار کو ملتوی نہ کیا جائے، اور اسی تاریخ میں کیا جائے۔ ہم لوگ علی گڑھ سے کل آجائیں گے۔ جناب محمود سعید بلالی صاحب نے کہا کہ مرحومہ کی خواہش تھی کہ یہ سیمینار ہو۔ یہ سیمینار ان کی روح کے لئے باعث سکون ہوگا۔

مرحومہ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی چہیتی اور مزاج شناس بھی تھیں۔ مولانا دریابادیؒ انہیں اپنے ہمراہ مولانا اشرف علی تھانویؒ کی خدمت میں تھانہ بھون بھی لے جاتے تھے، مولانا تھانوی ہی نے ان کا نام زہیرا خاتون رکھا تھا۔ مرحومہ مولانا دریابادیؒ کے شکستہ خطوط کو پڑھنے میں بڑی مہارت رکھتی تھیں اور مضمون نگاری بھی کرتی تھیں ان کا مضمون بھی اس مجموعۂ مقالات میں شامل ہے۔ جو بہت ہی درد انگیز ہے، مرحومہ کو اس سیمینار سے بڑی دلچسپی تھی۔ برابر پوچھتی رہتی تھیں کہ سیمینار میں کون کون حضرات آرہے ہیں، کتنے مقالات موصول ہوگئے! اللہ کی ذات بے نیاز ہے

کہ مرحومہ اس سیمینار کی کامیابی اور مقالات کی اشاعت دیکھ نہ سکیں۔ مرحومہ باحیات ہوتیں تو مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نیشنل سیمینار کے مقالات کی اشاعت سے بے حد خوش ہوتیں۔ چونکہ انہیں شدید احساس تھا کہ لوگ آئے دن مولانا دریابادیؒ کو بھولتے جارہے ہیں۔ حتیٰ کہ دریاباد والے بھی زیادہ مولانا دریابادیؒ کے نام و کام کو بھول چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جنت الفردوس میں داخل فرمائے۔ آمین یا الله العالمین۔

آخر میں محترم ڈاکٹر سید محمد فاروق صاحب اور جناب عبدالوہاب سلیم صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان حضرات نے سیمینار کو کامیاب بنانے میں بھرپور تعاون کیا۔ اسی طرح پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شیروانی صاحب، مولانا سعید الرحمٰن الاعظمی صاحب، ڈاکٹر ضیاء الحق چودھری صاحب اور پروفیسر شافع قدوائی کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ انہوں نے اچھے مقالات پیش کئے اور انسٹی ٹیوٹ کو زیر بار ہونے سے بچالیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اجر عظیم عطاء فرمائے۔ آمین۔

میں اس سیمینار کے تمام مہمانانِ خصوصی، مقالہ نگاروں اور شرکاء کی صحت وعافیت اور جناب فرید احمد صاحب کی مغفرت کے لئے دعاء گو ہوں، مرحوم فرید احمد صاحب ڈاکٹر سید محمد فاروق صاحب کے برادر اکبر اور بڑے خوش طبع اور نیک وسعید انسان تھے، حال ہی میں ایک کار حادثہ میں شہید ہوگئے۔ جس میں خود ڈاکٹر سید محمد فاروق صاحب بھی زخمی ہوئے تھے۔ مرحوم فرید احمد صاحب اس سیمینار میں بڑے ذوق وشوق سے شریک ہوئے تھے۔ آخیر تک موجود رہے، اللہ تعالیٰ انہیں علی علیین میں بلند مقام عطاء فرمائے۔ اور ڈاکٹر سید محمد فاروق صاحب کو صبر جمیل عطاء فرمائے۔ آمین

بڑی ناسپاسی ہوگی اگر پروفیسر طاہر محمود صاحب کا شکریہ ادا نہ کیا جائے، جنہوں نے میری ادنی درخواست پر سیمینار میں شرکت کی اور ایک ایسا شاندار مقالہ تحریر فرمایا جسے بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔

عطاء الرحمٰن قاسمی

چیئرمین

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

خطبۂ افتتاحیہ

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب☆

الحمد لله، و الصلاة و السلام على خاتم رسله محمد بن عبد الله، وعلى آله وصحبه، و على من والاه۔

حضرات! حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ ہندوستان کی ان عظیم شخصیتوں میں سے ایک تھے جنہوں نے ہندوستان کی آزادی سے پہلے مسلمانوں کی ذہنی تشکیل میں نمایاں حصہ لیا، اس کام میں ان کے علم ومطالعہ کا خصوصی دخل رہا، جوانہوں نے اپنی طالب علمی کے زمانہ میں اوراس کے بعد خصوصی توجہ ومحنت سے کیا۔ یہ ہندوستان کی غلامی کا وہ دور تھا جس میں سامراج سے گلوخلاصی کی توقعات کا محسوس کیا جانا شروع ہوگیا تھا، اور ہندوستانی اہل فکر کی کوششیں اثر انداز ہونا شروع ہوگئی تھیں۔

مولاناؒ کی شخصیت ان شخصیتوں میں تھی، جنہوں نے اولاً صرف علمی اور ادبی دائرۂ کار میں خدمت انجام دینے کو اپنایا تھا، مولانا کا یہ شروع کا دور، ان کی اسلامیت کا دور نہیں تھا لیکن ان کو جو علمی امتیاز حاصل تھا اور جو ادبی خصوصیات ان کو حاصل تھیں ان کا رخ کچھ ہی مدت میں اسلامی ذہن کی نصرت کی طرف مائل ہوگیا، اور انہوں نے اپنی ادبی وعلمی صلاحیتوں سے ذہنوں کی درستگی کا بڑا کام لیا۔

یہ وہ دور تھا جب سامراج کی بالادستی صرف سیاسی اور حکومتی میدان ہی میں نہیں تھی، بلکہ فکری اور ذہنی طور پر بھی جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو متاثر کررہی تھی، اور ذہنوں کا مزاج انگریزوں کے لئے غلامی کا بنارہی تھی، اس وقت کے اہل علم وادب جن میں مولانا ابوالکلام آزاد اور ان سے قبل علامہ شبلی نعمانی، خواجہ الطاف حسین حالی اور اکبرؔ الٰہ آبادی جیسے فکر مند واہل علم وادب حضرات

☆ ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء وصدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ۔

نمایاں مقام رکھتے تھے اپنے زبان وقلم سے بڑی خدمت انجام دے رہے تھے، اور مسلمانوں کو احساس کمتری اور ذہنی غلامی سے بچانے کے لئے اپنے زبان وقلم سے کوشش کررہے تھے۔ ان میں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اپنی ممتاز خصوصیات کے ساتھ نمایاں تھے۔

ان میں سے مولانا دریابادیؒ کو ہندوستان کی آزادی کے بعد کا دور بھی خاصا ملا، اور انہوں نے ایک طرف تو صحافت وادب کی راہ سے صحیح اسلامی فکر کی بڑی خدمت کی۔ دوسری طرف تفسیر قرآن کا بیش بہا کام انجام دیا، خاص طور پر ان کی انگریزی تفسیر قرآن خاصی امتیازی خصوصیات کی حامل ہے، ان کی اردو تفسیر قرآن بھی اپنی جدید تحقیقات اور معلومات کی روشنی میں تشریح و وضاحت کے لحاظ سے ممتاز حیثیت کی مالک ہے۔ مولاناؒ نے ان کے علاوہ بھی متعدد اہم موضوعات پر قیمتی علمی سرمایہ فراہم کیا، اور قارئین کو بہت فائدہ پہونچایا۔ ان کا ایک اہم کام یہ بھی قابل ذکر ہے کہ انہوں نے اکبرالہٰ آبادی اور مولانا محمد علی جوہر کے تعارف میں مفید اور قیمتی کام کیا۔

مولاناؒ کی خصوصیت یہ تھی کہ جو خیالات غلط یا بہکے ہوئے ان کے علم میں آتے تھے، وہ اپنے مؤثر قلم سے ان کا تعاقب کرتے، ان کو نظر انداز نہ کرتے۔ ایک طرف تو قیمتی علمی مواد پیش کرتے اور دوسری طرف صحافتی اور ادبی ذریعہ سے وہ صحیح رجحان کی طرف رہنمائی کرتے۔ ان کا ہفتہ وار ''سچ'' اور پھر ''صدق'' اس سلسلہ میں اپنا اچھوتا اور مؤثر انداز رکھتا تھا، جس کو بڑی دلچسپی سے اور استفادہ کے مقصد سے پڑھا جاتا تھا۔

مولاناؒ اردو کے صاحب طرز ادیب تھے، اور بہکے ہوئے اور غلط رجحانات وخیالات پر اردو کی تنقید بھرپور ہوتی تھی، اسی کے ساتھ ساتھ مولانا نے علمی مشغولیت کے معاملہ میں بھی ایک نمونہ قائم کردیا تھا، اور اس طرح کا طرز اختیار کیا تھا جس میں گویا ان کا ایک منٹ بھی ضائع نہیں ہوتا تھا، اس طریقہ سے مولانا عالم بھی تھے، ادیب بھی تھے، ناقد بھی تھے، مصلح بھی تھے اور ممتاز اہل قلم بھی تھے۔

مولاناؒ نے اپنی زندگی کو صرف علم وادب ہی سے وابستہ نہیں رکھا، بلکہ انہوں نے صلاح ورشد کی معروف شخصیتوں سے بھی گہرا ربط قائم کیا، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے اصلاحی تعلق قائم کیا، اور ان کی حیات اور خصوصیات پر ''حکیم الامت، نقوش وتأثرات'' جیسی اہم کتاب تصنیف فرمائی۔ ان کا اسلامیت کا جذبہ بڑا محکم تھا، انہوں نے اس کے دفاع میں کوئی کمی

بھی نہیں کی، اس سلسلہ میں ان کا قلم مؤثر انداز اختیار کرتا تھا جس سے ان کے معاصر خوب واقف ہو گئے تھے۔

مولاناؒ ایک عظیم شخصیت تھے، اور انہوں نے بھرپور طریقہ سے علم وادب اور اصلاح فکر کے سلسلہ میں خدمت انجام دی، ان جیسی شخصیت بالکل اس بات کا حق رکھتی ہے کہ اس کو نئی نسلوں کے سامنے بطور نمونہ پیش کیا جائے تاکہ نئی نسلوں کو اپنے اسلاف کے مقام بلند سے واقفیت ہو اور وہ ان کے نمونہ سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اس لئے میں اس سیمینار کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں اور چونکہ مولاناؒ سے میری صرف واقفیت ہی نہیں بلکہ نیازمندی بھی رہی ہے اس لئے میرے لئے یہ بڑی مسرت اور سعادت کی بات ہے کہ میں اس بزم میں شریک ہو رہا ہوں، اور اپنے مخلصانہ الفاظ سے ان کو خراج تحسین پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ اور میں اسی کے ساتھ ہی اس سیمینار میں اپنے کو شریک کئے جانے پر داعیوں اور منتظمین کا شکر گذار ہوں۔ اور شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کے استحکام وترقی کے لئے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ انسٹی ٹیوٹ کی علمی خدمات کو قبول فرمائے۔ آمین

سید محمد رابع حسنی ندوی
دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

خطبۂ صدارت

ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی ☆

مجھے خوشی ہے کہ شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ نے مولانا عبدالماجد دریابادی کی حیات وخدمات پر اس سیمینار کو منعقد کیا اور مجھے اس مؤقر اجلاس کی صدارت کا موقع فراہم کیا۔

مولانا دریابادی صاحب سے میرا خاندانی تعلق ہے اور میرے سامنے ان کے بہت سے ایسے پہلو بھی ہیں جو عوام سے پوشیدہ رہے ہیں۔ مولانا کی شخصیت کو وہ لوگ زیادہ بہتر جانتے ہیں جو ہفت روزہ "صدق" کا مطالعہ کرتے رہے ہیں۔ "صدق" مولانا کے لئے اولاد سے زیادہ عزیز تھا اور اس کی منفرد تحریریں لوگوں کے دلوں میں اتر جاتی تھیں۔

آپ جانتے ہیں کہ مولانا عبدالماجد دریابادی مشہور مصنف، صاحب طرز ادیب، بلند پایہ نقاد اور ماہر فلسفہ ونفسیات تھے۔

وہ نہ صرف اسلامیات کا ماہر تھے، بلکہ مختلف مذاہب وادیان کا رمز شناس بھی تھے، تورات اور انجیل پر خصوصی نظر تھی، آپ کی انگریزی تفسیر میں جگہ جگہ ان کے حوالے جات ملتے ہیں۔ یہ گرانقدر تصنیف دراصل قرآن کریم کا تورات اور انجیل کی روشنی میں تقابلی مطالعہ ہے۔ اور آسمانی کتب کی اسلام سے متعلق بیش بہا حوالہ جات کا ذخیرہ ہے۔

مولانا مرحوم کی اردو تفسیر ماجدی اس دور کی تحریر ہے۔ جب وہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے وابستہ ہو چکے تھے۔ ظاہر ہے کہ زندگی میں اس قدر تبدیلی کے بعد اسلوب اور طرز بیان کا مختلف ہونا لازمی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود آسمانی کتب کے حوالوں کے اس اردو تفسیر میں اپنے مرشد کا رنگ نمایاں ہے چونکہ ان کے پیر ومرشد تصوف وسلوک کے آدمی تھے، اس وجہ سے ہر آیت سے عموماً تصوف کے کسی نہ کسی مسئلہ کا استخراج واستنباط کیا ہے۔ اور یہ تفسیر ماجدی کا خصوصی رنگ ہے۔ اور مولانا دریابادی کے صوفیانہ ذوق کی عمومی روش!

☆ گورنر ہریانہ وسابق گورنر بہار وبنگال۔

اس اعتبار سے یہ تفسیر قرآنی تصوف کے لئے مواخذ ومصادر کی حیثیت اور تصوف سے ذوق رکھنے والوں کے لئے" آب حیات" کا درجہ رکھتی ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کی علمی خدمات سے قطع نظر کرتے ہوئے ان کی قومی خدمات خاصی اہمیت کے حامل ہیں! وہ تحریک آزادی وطن کے مایہ ناز سپوت بھی تھے۔انہوں نے تحریک خلافت میں سرگرم حصہ لیا تھا۔تحریک آزادی کے قومی لیڈروں سے خصوصی تعلق رکھتے تھے۔مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا حسرت موہانی اور مہاتما گاندھی سے ذہنی وفکری اعتبار سے بہت ہی قریب تھے اور ان سے راہ ورسم رکھتے تھے۔

مجھے خوشی ہے کہ ابھی ملت میں ایسے حضرات موجود ہیں جو" گاہے گاہے باز خواں این قصہ پارینہ را" کے اصول پر عمل پیرا ہیں۔ جو ملت اپنے ماضی کے محسنوں کو فراموش کردیتی ہے وہ قعر مذلت میں گرجاتی ہے۔آج ملت کی بربادی کے اسباب اس کے سوا کچھ بھی نہیں ہیں کہ اس نے اپنے پیغمبر علیہ السلام کے کردار کو فراموش کردیا ہے۔ اور اپنے اسلاف کے روشن وتابناک کارناموں سے سبق لینا بند کردیا ہے۔

آج مجھے انتہائی مسرت محسوس ہورہی ہے جب میں دیکھ رہا ہوں کہ مولانا عبدالماجد دریابادی کی نسبت سے اس منعقد سیمینار میں ملک کے ممتاز علماء اور دانشوروں اور عام شرکاء کی تعداد خاصی ہے، دراصل اس میں جہاں مولانا دریابادی کی شخصیت کی مقناطیسیت اور ان کے علوم ومعارف کی عصری معنویت ہے وہاں شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کے ٹھوس علمی وتحقیقی کاموں کا بڑا دخل ہے۔

میں آخر میں شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کے چیئر مین مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی کو اس سیمینار کے انعقاد پر مبارکباد دیتا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ انسٹی ٹیوٹ آئندہ بھی اس قسم کا خالص علمی وثقافتی کام کرتا رہے گا۔ جو نئی نسل کی ذہنی وفکری تعمیر میں مفید ثابت ہوگا۔

ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی

گورنر ہریانہ

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ —— حیات وخدمات

مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی ☆

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ —— قدوائی خاندان اور علمی دنیا کے آفتاب و ماہتاب تھے۔ آپ کے خاندان کے مورث اعلیٰ قاضی القضاۃ شیخ معزالدین ملقب بہ قدوۃ العلم والدین یا عرف عام کے مطابق قاضی قدوہ تھے، جو نسلاً اسرائیلی تھے، سلطان محمود غزنوی کے عہد میں ہندوستان آئے اور اجودھیا میں مقیم ہو گئے اغلب یہ ہے کہ منصب قضاو افتاء سے وابستگی رہی ہوگی۔ چونکہ ''قاضی'' اور'' قاضی القضاۃ'' (چیف جسٹس) آپ کے نام کا جزء لاینفک ہے۔ قاضی قدوہ کا انتقال اجودھیا میں ہوا، آپ کا مزار اجودھیا ہی میں بابری مسجد سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر مشرق میں واقع ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اپنی'' آپ بیتی'' میں لکھتے ہیں:

> ''خاندان کے مورث اعلیٰ کا نام قاضی معزالدین عرف قدوۃ الدین تھا، ان کا زمانہ کہا جاتا ہے کہ دسویں صدی عیسوی کا تھا، اور وہ محمود غزنوی کے ہم عصر تھے، بعد کو ان کا نام زبانوں پر محض قاضی قدوہ رہ گیا، مشہور ہے کہ سلطان محمود ہی کے زمانے میں کسی لشکر کے ساتھ ہندوستان آئے اور قصبۂ اجودھیا (ضلع فیض آباد) میں مقیم ہو گئے، وہیں ایک مزار بھی ان کی جانب منسوب ہے، نسلاً اسرائیلی تھے، خاندانی نسب ناموں میں ان کا سلسلہ حضرت ہارونؑ سے ہوتا ہوا لاوی بن حضرت یعقوبؑ سے ملتا ہے۔ اس لئے قدوائی خاندان بھی اسرائیلیوں کی ایک شاخ ٹھہرتا ہے۔'' (ص: ۲۴ آپ بیتی)

قاضی قدوہ کی نسل میں دس پشتوں کے بعد ایک بزرگ مخدوم شیخ محمد آبکش (متوفی ۸۸۰ھ مطابق ۱۴۷۲ء) گزرے ہیں، شیخ محمد آبکش مشہور صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے، لوگوں کو کنوئیں سے پانی بھر بھر کر پلانا اور نمازیوں کو وضو کرانا، آپ کا مجاہدۂ خاص تھا اسی جذبہ خدمت خلق کی بنا پر آپ کا لقب حضرت مخدوم آبکشؒ ہو گیا تھا۔

☆ چیئرمین شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی۔

خزینۃ الاصفیاء میں آپ کا ذکر ان لفظوں میں ملتا ہے:

''شیخ فخر الدین بجنوری، وشیخ محمد آبکشؒ دریابادی از کاملین شیخ ابوالفتح است۔

(خزینۃ الاصفیاء، جلد اول ص:۳۹۶)

شیخ محمد آبکشؒ کی گیارہویں پشت میں مفتی مظہر کریمؒ تھے، جو مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے حقیقی دادا تھے، وہ زمانہ شاہی میں مفتی رہے، اور متعدد کتابوں کے مصنف بھی تھے، فتاویٰ مظہریہ آپ کی یادگار ہے، جو مخطوطہ غیر مطبوعہ ہے آپ پر علمائے فرنگی محلی کا رنگ غالب تھا اور انہیں سے شرف تلمذ حاصل تھا، ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد آپ پر انگریزوں کے خلاف فتویٰ جہاد پر دستخط کرنے اور شاہجہانپور میں اپنے مکان پر باغیوں کی خفیہ میٹنگ کرانے کا الزام عائد کیا گیا۔ جس کے نتیجہ میں مقدمہ چلا اور عبور دریائے شور کی سزا ہوئی۔ انڈمان میں اسیری کے دوران انہوں نے کسی انگریز افسر کی فرمائش پر مشہور عربی لغتِ جغرافیہ مراصد الاطلاع علی اسماء الامکنۃ والبقاع (از صفی الدین عبدالمومن، کا ترجمہ اردو میں کیا جس کے صلہ میں ۹ سال کی سزا کی مدت میں تخفیف ہوئی اور ۷ سال کی سزا پانے کے بعد ۱۸۶۵ء میں وطن دریاباد واپس آئے اور بقیہ زندگی عبادت وریاضت اور فتویٰ نویسی میں بسر کی اور یہیں ۱۰ر شعبان ۱۲۸۹ھ مطابق ۱۴را کتوبر ۱۸۷۳ء کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

ولادت باسعادت:

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی ولادت باسعادت ۱۶ر شعبان ۱۳۰۹ھ مطابق ۱۶ر مارچ ۱۸۹۲ء میں دریاباد ضلع بارہ بنکی میں ہوئی، آپ کے والد ماجد کا اسم گرامی عبدالقادر تھا، دینی تعلیم مشہور عالم دین مولانا محمد نعیم فرنگی محلی سے حاصل کی تھی اور ان ہی سے سلسلۂ قادریہ میں بیعت بھی تھے بڑے عابد وزاہد تھے۔ اور ضلع لکھیم پور کھیری میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ جون ۱۹۰۱ء میں ملازمت سے ریٹائر ہوئے اور پنشن پائی اور ۱۹۱۲ء میں مع اہل وعیال حج بیت اللہ کے لئے روانہ ہوئے اور ۱۴ر نومبر ۱۹۱۲ء کی شب میں منیٰ میں ہیضہ میں مبتلا ہوئے اونٹ پر ڈال کر منیٰ سے مکہ مکرمہ لائے گئے، جہاں آپ کا انتقال ہوا۔ اور مولد رسول میں مدفون ہونے کا شرف واعزاز حاصل ہوا۔

حضرت اکبر الہ آبادی نے یہ قطعۂ تاریخ رقم فرمایا ہے:

پیشوائے قوم والا مرتبت
شیخ عبدالقادر والا صفات

آخرت ہی پر نظر رکھتے تھے وہ
سمجھتے تھے دنیائے دوں کو بے ثبات
جاہ ومنصب میں وہ گو ممتاز تھے
کرتے تھے یادِ خدا دن ہو کہ رات
ان کے ذکر وشغل کا تھا یہ اثر
"شغل" ہی میں نکلی تاریخ وفات
۱۳۲۰ھ

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی والدہ ماجدہ کا نام بی بی نصیر النساء تھا، جوایک پردہ نشیں خاتون تھیں، پردے کا بے حد اہتمام تھا، مردوں ہی سے نہیں اجنبی عورتوں سے بھی ملنا پسند نہیں کرتی تھیں۔حتیٰ کہ سرسید احمد خاں کی ایک عزیزہ سے بھی ملنا پسند نہ کرتی تھیں۔

عبادات کی بے حد پابند تھیں، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے خصوصی عقیدت رکھتی تھیں ۱۳راپریل ۱۹۴۱ء میں فیض آباد میں رحلت فرماگئیں، جہاں آپ کے صاحبزادے عبدالمجید صاحب ڈپٹی کلکٹر تھے، فیض آباد سے آپ کی لاش لائی گئی اور دریاباد میں آسودۂ راحت ہوئیں۔

ابتدائی تعلیم:

رسم زمانہ کے مطابق ۱۸۹۵ء میں بسم اللہ کی رسم گھر پر ادا ہوئی، اس کے بعد ناظرہ قرآن مجید اور اردو فارسی کی متداول کتابیں پڑھیں، جن میں مولوی اسماعیل میرٹھی کی ریڈرین، گلستان، بوستاں، اور سکندر نامہ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں، کیمیائے سعادت بھی پڑھی، ملا جامی کی کتاب یوسف زلیخا کا بھی مطالعہ کیا، اس ابتدائی خانگی تعلیم میں ابتدائی عربی زبان بھی سیکھ لی تھی، اس کے بعد اسکول میں داخل ہوئے، پرائمری اسکول سے دسویں کلاس تک تعلیم سیتاپور ہائی اسکول میں حاصل کی، آپ کی ابتدائی عربی کے استادوں میں حکیم محمد ذکی مرحوم کا نام سرفہرست ہے۔مولوی عظمت اللہ فرنگی محلی سے بھی عربی زبان سیکھی، مولانا دریابادیؒ لکھتے ہیں کہ:

"عربی ٹوٹی پھوٹی جو کچھ بھی آئی ان (مولوی عظمت اللہ) کی بدولت آئی۔ بڑے شفیق بھی تھے اور قابل وفاضل بھی۔ (فروغ اردو عبدالماجد دریابادی نمبر ص:۱۲)

اعلیٰ تعلیم:

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ جولائی ۱۹۰۸ء میں کیننگ کالج لکھنؤ میں داخل ہوئے، جو آگے چل کر یہی کالج لکھنؤ یونیورسٹی میں تبدیل ہوا۔ اختیاری مضامین میں منطق، تاریخ اور عربی تھے، انگریزی لازمی مضمون تھا، انٹرمیڈیٹ کا امتحان درجہ دوم میں پاس کیا۔

پھر مولانا دریابادیؒ نے جولائی ۱۹۱۰ء میں اسی کیننگ کالج میں بی اے کے سال اول میں داخلہ لیا مضامین انگلش ٹیکسٹ، جنرل انگلش، فلسفہ، اور عربی تھے، پہلے دو مضامین لازمی تھے فلسفہ سے آپ کا قلبی تعلق تھا، جس کی تین شاخیں نصاب میں شامل تھیں، الٰہیات، اخلاقیات اور نفسیات اور ان تینوں میں نفسیات سے آپ کو خصوصی تعلق تھا، اس زمانے کے نصاب عربی زبان وادب کے نصاب میں انتخابات ابن خلدون، مقامات حریری، مقامات بدیع اور حصۂ نظم میں متنبی اور ابوتمام کا کلام شامل تھا۔

کیننگ کالج کے زمانہ طالب علمی میں جن رفیقوں سے ان کے خصوصی تعلقات ومراسم رہے، ان میں محمد حفیظ سید اور مولانا عبدالباری ندوی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ اس زمانہ میں کیننگ کالج لکھنؤ میں ایم اے فلسفہ کا انتظام نہ تھا، بی اے کے بعد آپ نے علی گڑھ کا سفر کیا۔ اور والد صاحب کے انتقال کی وجہ سے ایم اے مکمل نہ کر سکے۔ ایم اے، او کالج میں داخل لیا، پہلے سال کا امتحان الہ آباد یونیورسٹی سے دیا، کیونکہ علی گڑھ کالج نے اس وقت تک یونیورسٹی کا درجہ حاصل نہیں کیا تھا، بدقسمتی سے مولانا دریابادیؒ امتحان میں کامیاب نہ ہو سکے، اس کے بعد دلی کے سینٹ اسٹیفن کالج میں داخلہ لیا، عین اسی زمانہ میں نومبر ۱۹۱۲ء میں مکہ مکرمہ میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ جس کی وجہ سے مولانا کی تعلیم موقوف ہوگئی۔ چنانچہ مالک رام صاحب لکھتے ہیں:

> ''تھوڑا بہت جو پس انداز ہوا تھا، وہ پیپلز بنک (لاہور) میں جمع تھا، بدقسمتی سے یہ بنک ٹوٹ گیا، اور یوں ان کی ساری پونجی اس میں ڈوب گئی ظاہر ہے اس کے بعد تعلیم کے جاری رکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، یوں بھی انہیں دلی کی آب وہوا راس نہ آئی، لکھنؤ کی صحبتیں اور یادیں نیند حرام کئے ہوئے تھیں، بنک کا ٹوٹنا گویا اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ ہو گیا، یہ تعلیم کو خیرباد کہہ کر وطن آگئے، اس کے بعد تعلیم کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے منقطع ہو گیا'' (تذکرہ معاصرین جلد چہارم ص: ۱۸۶)

تشکیک والحاد:

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ ایک مذہبی خاندان کے ساختہ پرداختہ تھے، ابتدائی تعلیم بھی مذہبی رنگ میں ہوئی تھی، والدین بھی سخت مذہبی تھے لیکن کالج کی ابتدائی زندگی ہی میں ان کے فکر و ذہن میں تشکیک والحاد کے اثرات نمایاں ہونے لگے تھے، کالج کی طالب علمی کے زمانے میں اکثرو بیشتر ملحدین و مستشرقین کی کتابیں زیر مطالعہ رہتی تھیں، جس کے نتیجہ میں مذہبی واخلاقی اقدار اور اسلامی عقائد پر ان کے اعتقاد وایقان کی جڑیں متزلزل ہوگئیں، مولانا دریابادیؒ ایک مذہب بیزار اور ملحد کی حیثیت سے مسلمانوں کے سامنے آگئے۔

آپ پر ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۸ء تک مذہب بیزاری اور الحاد کا غلبہ رہا۔ جس میں نہ صرف خارجی کتابوں کے مطالعے اور غور وفکر کا اثر تھا بلکہ مروج فرنگی نصاب تعلیم اور طریقۂ تعلیم کا بھی خاصا دخل تھا، اسی وجہ سے حضرت اکبر مرحوم کو یہ کہنا پڑا:

شیخ مرحوم کا قول اب مجھے یاد آتا ہے۔
دل بدل جائیں گے، تعلیم بدل جانے سے

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کو تشکیک والحاد کی پراگندہ فضا سے اسلام کے صاف ستھرے ماحول میں لانے میں حضرت اکبرالہ آبادی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا عبدالباری ندوی، علامہ سید سلیمان ندوی اور ڈاکٹر بھگوان داس نے اہم رول ادا کیا۔

حضرت اکبرالہ آبادی کو مولانا عبدالماجد دریابادیؒ سے جو تعلق خاطر تھا، اس کا اندازہ ان کے خطوط سے بحسن وخوبی لگایا جاسکتا ہے، جو انہوں نے وقتاً فوقتاً مولانا دریابادیؒ کو لکھے، اور بڑے لطیف پیرایہ بیان میں پند ونصائح کے کلمات ارشاد فرمائے تھے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ ''آپ بیتی'' میں حضرت اکبرالہ آبادی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> ''ایک روز بولے کہ کیوں صاحب آپ نے کالج میں عربی لی تھی، پھر اب بھی اس سے کچھ مناسبت قائم ہے؟ علم وزبان کوئی بھی ہو بہر حال اس کی قدر تو کرنی ہی چاہئے'' میں نے کہا ''اب اس کے لکھنے پڑھنے کا وقت کہاں ملتا ہے۔'' بولے کہ ''نہیں کچھ ایسا مشکل تو نہیں، قرآن کی بے مثل ادبیت کے تو اہل یوروپ بھی قائل ہیں، اور سنا ہے کہ جرمن یونیورسٹیوں میں قرآن کے آخری پندرہ پارے عربی ادب

کے کورس میں داخل ہیں جتنے حصے آپ کی سمجھ میں نہ آئیں، انہیں چھوڑتے جائیے اور یہ سمجھ لیجئے کہ وہ آپ کے لئے نہیں لیکن آخر کہیں تو کچھ فقرے آپ کو پسند آ ہی جائیں گے۔بس انہی فقروں کو دو چار بار پڑھ لیا کیجئے اور آپ کے لئے کوئی قید باوضو ہونے کی نہیں، یہ ایک نمونہ تھا، ان کی تبلیغ کا''۔ (آپ بیتی ص:۲۵۰)

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ مستشرقین یوروپ اور الحاد پسند مصنفین بالخصوص مشہور ماہر نفسیات ولیم جیمز اور فلسفی مِل کے بہت ہی مداح وگرویدہ تھے ایک دن حضرت اکبر کی صحبت میں مِل کا ذکر کرتے ہوئے کہنے لگے:

''وہ تو اپنے وقت کا نہیں، ساری دنیا کا اور کل زبانوں کا سب سے بڑا شخص تھا'' اس پر اکبرالہ آبادی خوب ہنسے اور بولے'' اچھا اپنا فقرہ آپ کاغذ پر مِل کے متعلق لکھ کر آج کی تاریخ ڈال دیجئے، میں دس سال بعد آپ کو دکھلا کر پوچھوں گا کہ کہئے اب وہ جوش عقیدت کہاں گیا؟ دس سال تو کیا اس واقعہ کے تین چار سال بعد ہی مولانا عبدالماجد دریابادیؒ ذہنی وفکری مرعوبیت کی اس فضا سے آزاد ہو چکے تھے۔''

(مولانا عبدالماجد دریابادیؒ احوال وآثار ص:۵۶)

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ ''معاصرین'' میں لکھتے ہیں کہ:

''ایک بار جب میں ازسرِنو مسلمان ہو چکا تھا اور اکبر صاحب کا مہمان بن کر انہیں کے دولت خانے میں ان کے ساتھ نماز ظہر میں پہلی بار شریک ہوا تو بہت خوش ہوئے، دعائیں دیں اور بولے کہ آپ کے والد مرحوم کو فرشتوں سے آپ کی نماز کی خبر سن کر کس درجہ مسرت ہوئی ہوگی۔'' (معاصرین: ص:۳۰)

حضرت اکبرالہ آبادی کے بعد دوسری شخصیت جو مولانا دریابادیؒ کی شخصیت کی تعمیر وتخمیر میں سب سے زیادہ اثر انداز ہوئی ہے وہ مولانا محمد علی جوہر کی آفاقی شخصیت تھی، مولانا محمد علی جوہر سے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کو بے پناہ عقیدت تھی، مولانا بھی ان کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے، اور گاہے بگاہے اپنے مخصوص رنگ وآہنگ اور جوش وجلال میں ناصحانہ کلمات کہا کرتے تھے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ رقم طراز ہیں کہ:

''میرے تو گویا محبوب ہی تھے، کبھی خط میں اور کبھی زبانی جہاں ذرا بھی موقع پاتے

ابل پڑتے اور جوش وخروش کے ساتھ، کبھی ہنستے ہوئے، کبھی گرجتے ہوئے اور کبھی
آنسو بہاتے ہوئے تبلیغ کرڈالتے۔''
(آپ بیتی ص: ۲۵۰)

تیسرے بزرگ اور ناصح مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم تھے۔ سید صاحب بھی کبھی حکیمانہ وہمدردانہ لب ولہجہ کے ساتھ کبھی طنز ومزاح کی زبان میں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے فکری ارتداد اور غیر اسلامی سوچ پہ کچھ کہہ جایا کرتے تھے، اور ان کو دعوت فکر دے جاتے تھے۔ سید صاحب ایک خط میں اپنے ایک عزیز بھتیجے کی الم ناک موت کی اطلاع دیتے ہوئے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کونہایت ہی موثر اور حکمت آمیز طنز کے ساتھ مخاطب کرتے ہیں کہ:

''تین برس میں میرا آغوش محبت تین عزیزوں کا بستر مرگ بنا، اپنے ''خدا'' کو تو نہیں، آپ کے ''نیچر'' کو کہتا ہوں کہ وہ کس درجہ بے رحم ہے۔''

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے ان قد آور شخصیتوں سے تاثر پذیری کا اعتراف واقرار کرنے کے ساتھ اپنے رفیق درس مولانا عبدالباری ندوی مرحوم خلیفۂ مولانا تھانوی کے فیضان واکتساب کا بھی کھلے لفظوں میں اعتراف کیا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ ''معاصرین'' میں لکھتے ہیں کہ:

''جولائی ۱۹۲۸ء میں جب ہم تلاش مرشد میں نکلے ہیں اور سہارنپور گئے ہیں، تو یہ میرے رفیق طریق تھے، ضابطے سے جو تعلق مولانا حسین احمد مدنی سے ہوا اور عملاً جو تعلق اصلاح مولانا تھانوی سے رہا۔ اس میں یہ میرے ساتھی اور ساجھی رہے۔''

(معاصرین: ص: ۱۶۴)

افراد وشخصیات کے علاوہ جن کتابوں سے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے خاطر خواہ اثر قبول کیا ان میں انگریزی تفسیر قرآن مؤلفہ محمد علی لاہوری، سیرۃ النبی مؤلفہ مولانا شبلی، تفسیر بیضاوی، مثنوی مولانا روم، منطق الطیر، نفحات الانس، تفسیر کشاف اور بھگوت گیتا جیسی کتابیں رجوع الی الاسلام کی باعث بنیں، اور بالآخر بڑی قوت ومضبوطی کے ساتھ حلقہ بگوش اسلام ہو گئے اور اسلام کی تبلیغ ودفاع میں پوری قوت وتوانائی صرف کی۔

ملازمت اور معیشت:

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے ۱۹۱۳ء میں رسمی تعلیم کی تکمیل کی، تعلیمی فراغت کے بعد معاشی مسائل کے حل کے لئے ملازمت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ والد ماجد کا سایۂ عاطفت سر

سے اٹھ چکا تھا۔ اتفاق سے کیننگ کالج لکھنؤ میں اسسٹنٹ پروفیسر کی جگہ نکلی، اس وقت مولانا دریابادیؒ کی علمی شہرت دور دور تک پھیل چکی تھی۔ فلسفہ میں درجۂ اختصاص و امتیاز تھا ہی کالج کے پرنسپل ڈاکٹر کیمرن بھی آپ کی صلاحیت و قابلیت کے قائل تھے۔ موقع اچھا تھا۔

مولانا شبلی مرحوم نے مولانا دریابادیؒ کے بارے میں ایک زبردست سفارشی خط بھی پرنسپل کے نام تحریر فرمایا، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا شبلی مولانا دریابادیؒ کی صلاحیت و علمی بصیرت سے کس قدر متاثر تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

> ''مولوی عبدالماجد صاحب بی اے کو ایک مدت سے جانتا ہوں، ان کے علمی اور خصوصاً فلسفیانہ مضامین میں نے کثرت سے پڑھے ہیں، مجھ کو یہاں تک معلوم ہے کہ ہندوستان میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے، جو نہایت دقیق فلسفیانہ مسائل کو اس خوبی سے ادا کر سکتا ہو، جس طرح عموماً مولوی عبدالماجد صاحب کے مضامین میں پائے جاتے ہیں۔
>
> میں انگریزی نہیں جانتا لیکن مصر و شام میں یورپ کا فلسفہ جس قدر عربی میں منتقل ہوا ہے، سب میرے پیش نظر ہے، میں بلا تکلف کہہ سکتا ہوں کہ کسی عربی ترجمہ یا مستقل تصنیف میں بھی فلسفیانہ مسائل اس خوبی سے ادا نہیں کیے گئے ہیں۔
>
> مولوی صاحب موصوف بالطبع فلاسفر ہیں، ان کا ذوق خالص علمی ذوق ہے وہ ہر وقت فلسفہ اور متعلقات فلسفہ کے مطالعے میں مشغول رہتے ہیں، اور یہ بالکل قطعی ہے کہ گو وہ فلسفہ میں ایم اے نہیں ہیں، لیکن کثیر التعداد ایم اے سے بہتر ہیں، اگر وہ فلسفہ کے پروفیسر مقرر ہوں تو میں کالج کی خوش قسمتی سمجھوں گا۔
>
> ان اوصاف کے علاوہ ان کے ذاتی اخلاق و عادات اور متانت و سنجیدگی اور شرافت نسب کی بہتر سے بہتر شہادت دے سکتا ہوں۔''
>
> شبلی نعمانی
>
> ۵/اپریل ۱۹۱۴ء
>
> بحوالہ خطوط مشاہیر ص: ۲۶،۲۵

مگر عجیب اتفاق ہوا کہ مولانا دریابادیؒ کی فلسفیانہ صلاحیت، مولانا شبلی کی سفارشی تحریر اور مسٹر کیمرن سے ذاتی مراسم کے باوجود کیننگ کالج میں تقرر نہ ہو سکا۔ جو ایک زبردست علمی حادثہ ہے۔

اور ناقدری کی بدترین مثال۔ آج بھی ہمارے دینی وغیر دینی اداروں میں یہ روش موجود ہے۔

عقد:

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کا عقد مسنون ۲؍ رجون ۱۹۱۶ء کو عفت النساء سے ہوا، جو شیخ یوسف الزماں مرحوم سابق مجسٹریٹ کی صاحبزادی تھیں، اس تقریب عقد میں ملک کے نامور شعراء، ادباء، رؤساء اور اصحاب علم وفضل بالخصوص راجہ صاحب محمود آباد، جسٹس کرامت حسین، مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی، عبدالحلیم شرر، سید سجاد حیدر یلدرم اور مولانا سید سلیمان ندوی شریک ہوئے۔

مولانا دریابادیؒ نے آپ بیتی میں بڑے دلچسپ انداز میں تقریب شادی کی منظر کشی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

حضرت مولانا سید سلیمان ندوی۔ نے پہلے جب مجھے دیکھا کہ سر پر ریشمی زرق وبرق صافہ کے ساتھ فاتحانہ انداز میں محفل کی طرف جارہا ہوں تو کہا کہ غازی محمود سومنات فتح کرنے چلا ہے۔ اور پھر رباعیاں ارشاد فرمائیں، جو مندرجہ ذیل ہیں۔

لایا ہے پیام یہ خوشی کا قاصد	نوشاہ بنے ہیں آج عبدالماجد
وہ روز سعید بھی خدا لائے جلد	بن جائیں وہ جب کسی کے والد ماجد
گر وحدت حق کا کلمہ گو ہونا ہے	معلوم ہو ہر بشر کو جو ہونا ہے
بندہ ہو خدا کے مثل ناممکن ہے	وہ ایک ہے، جب تو ہم کو دو ہونا ہے
منکر ہو نہ کوئی اپنی ہمتائی کا	یہ کام کبھی نہیں ہے دانائی کا
اللہ نے اب غرور ان کا توڑا	دعویٰ تھا میرے دوست کو یکتائی کا

اولادیں:

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی کوئی نرینہ اولاد نہ تھی، صرف چار صاحبزادیاں تھیں، یہ چاروں صاحبزادیاں ان کے چاروں بھتیجوں سے منسوب ہوئی تھیں۔ پہلی صاحبزادی رافت النساء قدوائی صاحبہ حکیم عبدالقوی دریابادی سے، دوسری صاحبزادی حمیرا قدوائی صاحبہ حبیب احمد قدوائی صاحب سے تیسری صاحبزادی زہیرا خاتون قدوائی ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی صاحب سے اور زاہدہ خاتون قدوائی صاحبہ عبدالعلیم قدوائی مرحوم سے منسوب تھیں۔ یہ چاروں بڑے بھائی

مرحوم عبدالمجید صاحب کے صاحبزادے ہیں۔

دارالترجمہ عثمانیہ حیدرآباد سے وابستگی:

دارالترجمہ عثمانیہ حیدرآباد ایک مشہور و معروف علمی و تحقیقی ادارہ ہے، جس سے بڑے بڑے علماء اور اصحاب قلم وابستہ رہے ہیں۔ دارالترجمہ عثمانیہ سے منسلک مصنفین و مترجمین میں بابائے اردو مولوی عبدالحق، ہاشمی فرید آبادی، عبدالحلیم شرر، ظفر علی خاں، عبداللہ العمادی، اور مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے نام سرفہرست ہیں، جس کے ڈائریکٹر سر راس مسعود صاحب مرحوم تھے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ یکم ستمبر ۱۹۱۷ء کو دارالترجمہ سے بحیثیت مترجم فلسفہ و منطق وابستہ ہوئے تھے ان کا تقرر بابائے اردو مولوی عبدالحق کی تحریک پر ہوا تھا جو اس وقت عثمانیہ دارالترجمہ کے ناظم تھے۔ ان کی تنخواہ تین سو روپے ماہوار طے ہوئی تھی، اس وقت یہ تنخواہ اچھی خاصی تھی، اور رہائشی مکان کا بھی نظم منجانب دارالترجمہ کیا گیا تھا۔ اور اس کے لئے ۱۵۰ روپے ماہانہ کرایہ کی منظوری ہوئی تھی۔ مولانا عبدالماجد صاحب یکم ستمبر ۱۹۱۷ء سے آغاز جولائی ۱۹۱۸ء تک حیدرآباد میں رہے اور خوش و خرم رہے، اہلیہ محترمہ بھی ہمراہ تھیں۔ احباب و رفقا کا مجمع بھی اچھا خاصا تھا اس کے باوجود دارالترجمہ حیدرآباد سے من اچاٹ ہوگیا، چنانچہ ''آپ بیتی'' میں لکھتے ہیں:

> ''ملازمت بہرحال ملازمت تھی، جی نہ لگا، پہلی اگست ۱۹۱۸ء کو واپس آگیا، اور لکھنؤ سے استعفیٰ لکھ کر بھیج دیا۔'' (آپ بیتی ص: ۳۱۳)

مولانا دریابادیؒ نے حیدرآباد میں قیام کے دوران کیا تصنیفی یا ترجمہ کا کام کیا۔ اس کی تفصیل نہیں ملتی، اس پہلو پر بھی گفتگو ہونی چاہئے۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے اگرچہ حیدرآباد کو خیرباد کہا تھا، دارالترجمہ سے ملازمتی تعلق منقطع کرلیا تھا، مگر حضرت نظام کی علم و ادب نوازی کی بنا پر سوا سو روپے ماہوار پنشن مقرر ہوگئی، جو تاحیات بیٹھے ملا کرے گی۔ ۱۹۴۶ء میں اس پنشن میں اضافہ ہوا اور دو سو روپے پنشن ہوگئی، لیکن سقوط حیدرآباد کی وجہ سے یہ پنشن موقوف ہوگئی۔ مگر جب کچھ حالات معمول پر آئے تو سابقہ پنشن ہی دوبارہ جاری ہوئی، یعنی سوا سو روپے ماہوار، بس۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اس علمی پنشن کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ:

> ''۱۲۵ روپے ماہوار کی پنشن تاحیات منظور ہوئی اور کام صرف یہ کہ مولانا شبلی کی طرح کتابوں کو سلسلہ آصفیہ سے منسوب کردینا، ظاہر ہے اس سے آسان تر صورت اور کیا

ہوسکتی تھی قیام کی کوئی قید نہیں، جہاں چاہوں، رہوں۔''

(فروغ اردو مولانا عبدالماجد دریابادی نمبر ص:۱۴)

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں سینئر پروفیسر کا عہدہ:

دنیا جانتی ہے کہ مولانا محمد علی جوہر کے از بانیان جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تھے، سب سے پہلا شیخ الجامعہ بھی تھے، شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اسیر مالٹا نے اس کا سنگ بنیاد رکھا تھا، اور بڑے نیک ہاتھوں سے اس کی تاسیس ہوئی تھی، اس کے قیام میں خلوص وللّٰہیت اور اسلام اور اسلامی ثقافت وتہذیب کے فروغ کا جذبہ کارفرما تھا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں مولانا محمد علی جوہر اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندیؒ کو ایک عرصہ تک نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ لائق مبارکباد ہیں موجودہ وائس چانسلر پروفیسر مشیر الحسن صاحب، جنہوں نے جامعہ ایک میں عظیم الشان ''باب مولانا محمود حسن'' تعمیر کرا کے ان کی خدمات کا بھرپور اعتراف کیا ہے۔ لیکن مولانا محمود حسن صاحب اپنے نام کے بجائے اپنے لقب شیخ الہند سے زیادہ مشہور تھے تو ''باب شیخ الہند'' ہونا ہی موزوں ہوتا۔

بہرحال جامعہ میں فلسفہ کے ایک پروفیسر کی جگہ خالی تھی۔ مولانا محمد علی جوہر اس پر مولانا عبدالماجد دریابادی کا تقرر کرنا چاہتے تھے۔ ظاہر بات ہے کہ اس جگہ کے لئے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ سے زیادہ موزوں کون ہوسکتا تھا جنہیں فلسفہ ونفسیات میں درجۂ اختصاص حاصل تھا۔ لیکن مولانا محمد علی جوہر کو ان کے تقرر کرنے میں قدرے تامل تھا۔ چونکہ وہ مولانا دریابادیؒ کے ذہن وفکر سے واقف تھے۔ حالانکہ یہ اس وقت کی بات تھی کہ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے فکر ونظر میں انقلاب آچکا تھا وہ الحاد وتشکیک کے دائرہ سے نکل چکے تھے اور دوبارہ دین کی حقانیت کے قائل اور مومن صادق ہوچکے تھے۔

مولانا محمد علی جوہر نے تقرری کے تعلق سے ایک خط مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے نام تحریر فرمایا، جس کے لفظ لفظ سے دینی غیرت اور اسلامی حمیت ظاہر ہوتی ہے چنانچہ مولانا محمد علی جوہر لکھتے ہیں کہ:

> ''جی چاہتا تھا کہ آپ کو یہاں دیکھوں مگر علم سے زیادہ مذہب عزیز ہے۔ اور ایک مسلمان کے مذہب کے متعلق اگر قومی مسلم یونیورسٹی میں بھی شک وشبہ کیا جائے گا۔ تو ہم یہ کہہ کر پیچھا نہیں چھڑا سکتے کہ ہر شخص کا مذہب اس کا ذاتی معاملہ ہے، جس سے

اس دارالعلوم کو کوئی تعلق نہیں۔
اب تک عمدا میں نے فلسفے کے سینئر پروفیسر کی جگہ کے متعلق کوئی سفارش نہیں کی ہے۔
چونکہ اردو میں تعلیم دلانا منظور ہے اس لئے اور بھی آپ کی ضرورت ہے۔ اگر تکلیف نہ ہو تو ایک دو دن کے لئے مہمان بن کر یہاں کی دال روٹی کھائیے اور تمام معاملات کا تصفیہ کیجئے۔" (خطوط مشاہیر ص:۲۳۴)

مولانا محمد علی جوہر سے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی جس قسم کے تعلقات و مراسم تھے، مولانا دریابادیؒ اگر چاہتے تو بڑی آسانی سے مولانا محمد علی جوہر کی غلط فہمی دور کر سکتے تھے اور شعبۂ فلسفہ کے سینئر پروفیسر کے عہدہ کو حاصل کر سکتے تھے۔ لیکن ان کی طبیعت ملازمت کے لئے زیادہ موزوں نہ تھی، وہ آزادانہ کام کرنے کے عادی تھے۔ اور یکسوئی پسند تھے۔ چنانچہ مولانا محمد علی جوہر کی پیشکش کے باوجود شعبۂ فلسفہ کا پروفیسر ہونا پسند نہیں کیا۔ خدانخواستہ اگر جامعہ میں پروفیسر ہو گئے ہوتے تو ان کے علمی کاموں میں اتنا تنوع نہ ہوتا اور اتنے بڑے علمی سرمایے امت کے سامنے نہ آتے۔

بیعت و ارادت:

جیسا کہ علم میں ہے کہ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کا خاندان ــــــ ایک علمی و روحانی خانوادہ تھا۔ جس میں علم و فضل کے ساتھ تصوف و سلوک کا چرچا رہا ہے۔ بقول مولانا دریابادیؒ رواجی تصوف ہی سہی، مگر اس خاندان کے اکابر مشرب چشت کے پیروکار تھے پھر ان پر رفتہ رفتہ قادریت غالب آ گئی تھی۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے جب دوبارہ اسلام اور اسلامی تعلیمات کی طرف مراجعت کی تو رواجی تصوف کی طرف میلان ہوا۔ جس کے نتیجہ میں مختلف مزارات و خانقاہوں میں حاضری دی اور چلہ کشی شروع کر دی۔ مگر انہیں ایک مرشد معنوی کی ضرورت کا احساس تھا۔ اخلاص وللّٰہیت، غیرت دینی، حمیت اسلامی اور حب رسول کے اعتبار سے مولانا محمد علی جوہر فقید المثال تھے۔ مولانا دریابادیؒ نے بارہا ان سے بیعت ہونے کا قصد کیا۔ مگر یہ ارادہ فسخ ہوتا رہا۔ تلاش مرشد کے تعلق سے عزیز اللہ صفی پوری، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا انور شاہ کشمیری، شاہ سلیمان پھلواری، مولوی شاہ محمد حسین اور کمال احمد شاہ کی طرف توجہ بھی گئی۔ مگر ان میں سے کسی سے بھی اتنی عقیدت پیدا نہ ہو سکی کہ ان سے بیعت اختیار کر لی جاتی اور تصوف و سلوک کے مراحل طے کرنا شروع کر دیا جاتا۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ لکھتے ہیں کہ:

''مرشد کی تلاش ایک عرصہ سے جاری تھی، تصوف اور سلوک کا ذخیرہ جتنا کچھ بھی فارسی اور اردو، ایک حد تک عربی میں ہاتھ لگ سکا پڑھ لیا گیا تھا۔ اتنی کتابیں پڑھ ڈالنے اور اتنے ملفوظات چاٹ جانے کے بعد اب آرزو اگر تھی تو ایک زندہ بزرگ کی۔ حیدرآباد، دہلی اور لکھنؤ جیسے مرکزی شہر اور اجمیر، کلیر، دیوہ اور بانسہ اور ردولی اور صفی پور چھوڑ بڑے آستانے، خدا معلوم کتنے دیکھ ڈالے اور سن گن جہاں کہیں بھی کسی بزرگ کی پائی حاضری میں دیر نہ لگائی۔ حال والے بھی دیکھنے میں آگئے اور قال والے بھی، اچھے اچھے عابد، زاہد مرتاض بھی۔ اور بعض بڑے دکان دار قسم کے گیسودراز بھی، آخر فیصلہ یہ کیا کہ حق حلقہ دیو بند میں محصور ہے۔

انتخاب کے دائرہ کو محدود کر کے اب تفصیلی جائزہ اسی حلقے کا لیجئے اور جس نے بہترین متن سلوک (مثنوی معنوی) کی بہترین شرح لکھ ڈالی (مراد حاجی امداداللہ مہاجر مکی ہیں) اور اپنے چھوٹے چھوٹے سہل فقروں میں حقائق ومعارف کی روح بھر دی ہے۔ دامن اسی کے کسی تربیت یافتہ کا تھامیئے۔'' (حکیم الامت، نقوش وتاثرات ص:۱۳)

اسی دوران حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مرید اور مشہور ادیب وشاعر حضرت وصل بلگرامی مرحوم نے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی خدمت میں حضرت تھانویؒ کے مواعظ وخطبات کے کچھ حصے پیش کیے۔ حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے ان مواعظ حسنہ کا مطالعہ شروع کیا، جوں جوں ان کو پڑھتے گئے۔ ان کے سامنے حقائق ومعارف اور تصوف کے نکات ورموز منکشف ہوتے گئے اور حضرت مولانا تھانوی سے ذہنی وفکری قربت ہوتی گئی۔ حالانکہ ہنوز ان سے بے اعتنائی وبے توجہی اس وجہ سے برتی جارہی تھی کہ ان کی شہرت ایک فقیہ کی حیثیت سے تھی دوسرے یہ کہ وہ خلافت کمیٹی کے بھی مخالف تھے۔ اور مولانا عبدالماجد دریابادیؒ خلافت کمیٹی کے پرجوش حمایتی اور اودھ خلافت کمیٹی کے صدر تھے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم ان مواعظ وخطبات سے اس قدر متاثر ہو گئے کہ مولانا تھانویؒ سے مراسلت شروع کر دی اور مرشد کی نشاندہی کی درخواست بھی کر ڈالی۔ اور ۳۰ رجون ۱۹۲۸ء کو ایک چھوٹے قافلہ کے ساتھ خانقاہ تھانہ بھون بھی پہونچ گئے۔ آپ کے روحانی قافلہ میں مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا عبدالباری ندوی بھی تھے حضرت تھانوی سے بیعت وارادت کے بارے میں تفصیلی گفتگو ہوئی۔

حضرت تھانویؒ نے مولانا مدنی کو مشورہ دیا کہ ان حضرات کو بیعت کر لیں۔ چنانچہ یہ دونوں حضرات مولانا مدنی سے بیعت ہو گئے اور روحانی تربیت حضرت تھانویؒ سے حاصل کی۔ حضرت تھانویؒ کی روحانی تربیت کا یہ اثر ہوا کہ ان دونوں شخصیتوں پر حضرت تھانویؒ ہی کا رنگ چڑھ گیا اور یہ دونوں حضرات حضرت تھانویؒ کے رنگ میں رنگ گئے۔

پھر تو مولانا دریابادیؒ مولانا تھانویؒ کو

''اے تو افلاطون و جالینوس ما'' سے مخاطب کرنے لگے اور ''حکیم الامت: نقوش و تاثرات'' جیسی کتاب وجود میں آ گئی۔ جو پیر و مرشد کے مابین والہانہ تعلق کی زندہ و جاوید یادگار ہے۔

خلافت کمیٹی:

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اگر چہ موجودہ اصطلاحی معنوں میں کوئی سیاست دان، قومی رہنما نہیں تھے، البتہ عصری نظریۂ سیاست اور اس کے تقاضوں سے خوب باخبر تھے، انہوں نے تحریک آزادی کے دور میں تحریک خلافت کے مختلف ادوار کے نشیب و فراز، مد و جزر اور عروج و زوال کا ذاتی مشاہدہ اور صحافتی تجزیہ بھی کیا تھا۔ مولانا محمد علی جوہر (جو دراصل خلافت کمیٹی کے روح رواں اور قائد تھے) کی وجہ سے خلافت کمیٹی سے قریب تھے، چنانچہ فروری ۱۹۲۷ء میں لکھنؤ میں خلافت کمیٹی کے لئے نئے انتخاب میں وہ اودھ خلافت کمیٹی کے صدر بنائے گئے۔ پھر مرکزی خلافت کمیٹی کے ممبر چنے گئے۔ فروری ۱۹۲۷ء میں خلافت کانفرنس کے اجلاس کی صدارت کی، اور ایک شاندار خطبہ دیا، جو ان کے تصور سیاست کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے اور ادبی حیثیت سے بھی اپنا مقام رکھتا ہے۔ مولانا دریابادیؒ نے ترک موالات کی تحریک میں بھی حصہ لیا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ سیاسی لیڈروں میں مولانا محمد علی جوہر کے علاوہ مہاتما گاندھی اور مسز اینی بیسنٹ کی ذات سے محبت و عقیدت رکھتے تھے۔ ان ہی کی وجہ سے کانگریس کو بھی پسند کرتے تھے۔ ورنہ مرحوم ایک خالص علمی آدمی تھے۔

مولانا عبدالماجد مرحوم لکھتے ہیں کہ:

> ''پر جب ۱۹۱۷ء میں مسز اینی بیسنٹ بیک نظر بند ہوئیں تو ان کی ذات سے عقیدت کی بنا پر دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ ہوم رول اور کانگریس کو اچھا سمجھنے لگا۔''
>
> (فروغ اردو عبدالماجد دریابادی نمبر ص: ۲۲،۲۱)

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ، مولانا محمد علی جوہرؔ کو ایک مثالی لیڈر خیال کرتے تھے ان کی وفات کے بعد کوئی قومی لیڈر ان کی نگاہ میں نہ جچا، چنانچہ آپ بیتی میں رقمطراز ہیں کہ:

''مولانا محمد علی جوہرؔ کو زندگی بھر اپنا سیاسی پیشوا سمجھتا رہا۔ ان کے فہم و اخلاص دونوں پر سو فیصدی اعتماد تھا۔ ان کے بعد کوئی لیڈر اس پایہ کا نہ ملا! اس لئے بعد کی کسی تحریک، مسلم لیگ وغیرہ میں عملاً نہ شریک ہوا گو اعتماد بہادر یار جنگ (متوفی ۱۹۴۴ء) اور چودھری خلیق الزماں (متوفی ۱۹۵۴ء) پر بعد کو برابر رہا کیا۔'' (آپ بیتی ص: ۲۶۳)

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ مولانا محمد علی جوہر کے انتقال کے بعد عملی سیاست سے بالکل کنارہ کش ہو گئے تھے جس کی وجہ سے ان کے بڑے بھائی مولانا شوکت علی کو سخت شکایت تھی، چنانچہ مولانا شوکت علی صاحب ۱۷/ دسمبر ۱۹۳۳ء کو بمبئی سے مولانا دریابادیؒ کے ایک خط کے جواب میں لکھتے ہیں:

''آپ کا خط سہارنپور سے ملا۔ شاید میں یہ سمجھوں کہ محمد علی کے مرنے کے بعد سے اسلام بھی مر گیا اور اس کے ساتھ ساتھ ماجد میاں بھی۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ اسلام زندہ ہے اور آپ بھی۔ آپ یہ بتائیے کہ آپ کی حیات و زیست سے مجھے کیا فائدہ؟ ہم سب اس وقت جس دور سے گزر رہے ہیں اسے آپ خود کماحقہٗ جانتے ہیں۔ چاروں طرف ہجوم ابتلا و آلام ہے۔ مجھ ضعیف و ناتواں سے جو کچھ ہو سکتا ہے اس میں دریغ نہیں کرتا۔ تنہا ہوں اور خدا پر بھروسا ہے۔ آپ کا ہونا میرے کس کام کا جب آپ میرا ہاتھ نہ بٹا سکتے ہوں۔ پیری و مریدی کرتا نہیں اور نہ میں تھانہ بھون جانا چاہتا ہوں۔ پھر آپ بتائیے میں کیا کروں؟ آپ سنٹرل خلافت کمیٹی کے ممبر ہیں لیکن اس کے اجلاسوں میں شرکت نہیں کرتے، نہ ہمیں مشورہ دیتے ہیں نہ ہمارے ساتھ کام ہی کرتے ہیں۔ محمد علی مر گیا اور جس کام کی داغ بیل پڑ چکی ہے اس کا کام ماجد ہی کو کرنا ہے اور تا حرکتِ یک تارِ نفس اسے کرنا ہوگا۔ از برائے خدا اٹھئے اور ہمارے کام میں شریک ہو کر اپنے مشوروں اور قابلیت سے ہماری مدد کیجئے۔ میں زبانی آپ سے ذرا تختی سے گفتگو کروں گا۔ آپ اسلام کے لئے جہاد کے میدان سے گریز کرتے ہیں۔ آج الحاد اور بے دینی کا دور ہے اور ہر مسلمان کو اپنے اپنے دائرے میں رہ کر

اس کے لئے حق الوسع خدمت کرنا ہے۔ میں اور کیا لکھوں آپ سب سمجھتے ہیں۔"

آپ کا پریشان بھائی

شوکت علی خادمِ کعبہ ص: ۲۲۳

وفات:

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ ایک عرصہ سے لکھنؤ میں علیل تھے۔ خاتون منزل میں قیام تھا، وہاں حضرت مولانا دریابادیؒ کی عیادت کرنے والوں کا بڑا ہجوم رہتا تھا۔ اس میں ہر طبقہ اور ہر مکتبۂ فکر کے لوگ ہوتے تھے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اساتذہ، بخصوص حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مرحوم بھی برابر آتے رہتے تھے۔ آخری وقت میں دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حکیم الاسلام قاری محمد طیب نوراللہ مرقدہ بھی تشریف لائے اور ان کی عیادت کی۔ حضرت قاری صاحب کی عیادت کے ایک روز بعد ۶ رجنوری ۱۹۷۷ء کو ساڑھے ۴ بجے صبح حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا دریابادی مرحوم کی وصیت کے مطابق ان کی نماز جنازہ حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ نے پڑھائی اس کے بعد ان کا جنازہ دارالعلوم ندوۃ العلماء سے دریاباد لایا گیا۔ اور وہاں حافظ غلام نبی صاحب نے دوبارہ نماز پڑھائی۔ اس کے بعد ان کے آبائی مکان کے ملحق حضرت مخدوم آبکش رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کے متصل تدفین ہوئی۔ رحمھم اللہ رحمۃ واسعۃ

تاریخ رحلت بے ہنگام

۱۹۷۷ء

محبِ اسلام حضرت عبدالماجد دریابادیؒ

عالمِ دیں مفسرِ قرآن — مردِ حق محرمِ رموزِ حیات

اپنے خالق سے جاملا آخر — چھوڑ کر یہ جہانِ مکروہات

بے کم وبیش ہے یہی تاریخ — پاک دل، پاک ذات، پاک صفات

۳۷۸ — ۱۹۷۷۔۳۷۸۔۱۳۹۷ھ۔ص: ۳۰۵

ہر مکتبۂ فکر کو تافہم وقیاس — کی جس نے عطا دولتِ حسنِ احساس

افسوس تہہ خاک ہے آرام پذیر — وہ محرمِ لیلائے سخن نکتہ شناس

۱۹۷۷ء

جناب رہبر تابانی دریابادی نے تاریخ کہی ہے:

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اور مولانا ابوالکلام آزادؒ:

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اور مولانا ابوالکلام آزاد کے درمیان بڑے مخلصانہ وہمدردانہ تعلقات ومراسم تھے۔ مولانا دریابادیؒ کے مضامین الہلال میں شائع ہوتے رہتے تھے، مولانا آزاد بھی مولانا دریابادیؒ کے علم وفضل کے قائل تھے۔ لیکن ان دونوں کے درمیان جون ۱۹۱۳ء میں ایک ادبی معرکہ کی ابتداء اس وقت ہوئی، جب مولانا دریابادیؒ کا ایک مضمون ''حظ وکرب''، ''الہلال'' کے دوشماروں میں شائع ہوا۔ مولانا آزاد نے ''حظ وکرب'' کی جگہ ''لذت والم'' کو موزوں قرار دیا تھا۔ جسے مولانا دریابادیؒ نے تسلیم نہیں کیا، پھر تو الہلال میں ایک ادبی بحث چھڑ گئی۔ اور جوں جوں یہ بحث آگے بڑھتی گئی دونوں کے مابین تلخی بھی بڑھتی گئی، جواب، جواب الجواب ایک عرصہ کے بعد ختم ضرور ہوگیا۔ لیکن ان کے آپسی تعلقات پر اس کا برا اثر پڑا۔ تقریباً ۴ سال تک ان کے تعلقات کشیدہ اور خط وکتابت موقوف رہے، پھر دونوں کے درمیان اس وقت خط وکتابت کا سلسلہ شروع ہوا جب مولانا آزاد رانچی میں نظر بند تھے۔ پھر تو دونوں کے تعلقات نہ صرف بحال ہوگئے۔ بلکہ خط وکتابت بھی شروع ہوگئی۔

ترجمہ نگاری:

ترجمہ نگاری ایک مستقل فن ہے، جس کے کچھ تقاضے وضابطے ہوتے ہیں، ان تقاضوں وضابطوں سے وہی شخص بحسن وخوبی عہدہ برا ہوسکتا ہے، جو دونوں زبانوں میں مہارت وحذاقت کے ساتھ عام فہم سلیس وشگفتہ ترجمہ کرنے کا سلیقہ بھی رکھتا ہو، اور اس کے ترجمہ میں ایسی روانی، شگفتگی، برجستگی ہو کہ کتاب کی روح ترجمہ وشرح میں منتقل ہوجائے، جس کے اصل وترجمہ کے مابین کوئی فرق محسوس نہ ہو، ترجمہ پر اصل اور اصل پر ترجمہ کا شبہ ہونے لگے، یہ اسی وقت ممکن ہو پائے گا کہ جب مترجم کو زبان وبیان پر کمال درک حاصل ہو، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی شخصیت میں ترجمہ نگاری کی جملہ شرطیں پائی جاتی تھیں، وہ متعدد زبانوں بالخصوص اردو وانگریزی زبانوں کے رمز شناس تھے۔ اور ان دونوں میں غیر معمولی کمال وعبور رکھتے تھے۔ ان میں ترجمہ وترجمانی کرنے کی خداداد صلاحیت تھی۔ آپ نے مختلف موضوعات کی کتابوں کے ترجمے کئے ہیں، فلسفہ، سائنس، تہذیب وتمدن، عمرانیات وقرآنیات کے موضوعات پر آپ کے اہم ترجمے ہیں، آپ کے ترجموں میں بڑا تنوع ہے۔ آپ نے کہیں اصل متن کا بامحاورہ ترجمہ کیا، کہیں تحت

اللفظ کیا ہے، اور کہیں محض ترجمہ کیا ہے۔ کہیں ترجمہ کے ساتھ مختصر تشریح وتفسیر سے بھی کام لیا ہے۔ غرضیکہ آپ کے اندر ترجمہ کرنے کا خداداد ملکہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال جیسا ماہر لسانیات نے بھی آپ کے ترجموں پر اعتماد و بھروسہ کرتے ہوئے بعض اہم کتابوں کے ترجمے کرانے کا مشورہ دیا تھا۔

قرآن کریم کے اردو انگریزی ترجموں کے علاوہ ''مکالمات برکلے'' پیام امن، ناموران سائنس، تاریخ یورپ، تاریخ اخلاق یورپ، تاریخ تمدن، منطق استخراجی واستقرائی، مناجات مقبول اور چہل حدیث ولی اللہی وغیرہ آپ کے اہم ترجمے ہیں۔

ان میں زیادہ تر انگریزی اور کچھ عربی کتابوں کے ترجمے ہیں۔ انگریزی ہوں یا عربی اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ یہ شاہکار ترجمے ہیں۔ اور طرز اسلوب کے اعتبار سے فقید المثال ہیں۔ ان ترجموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کو فن ترجمہ نگاری سے طبعی مناسبت تھی۔ انہوں نے اپنی ترجمہ نگاری سے زبان وادب کے ادبی ذخیروں میں معتد بہ اضافہ کیا ہے۔

مولانا دریابادیؒ اور سوانح نگاری:

تاریخ اسلام میں سوانح نگاری کا آغاز سیرت نگاری سے ہوا ہے۔ منظوم ومنثور سیرت نگاری کے فروغ کے بعد سوانح نگاری کی داغ بیل پڑی۔ جس کے تحت عربی، فارسی اور اردو میں بزرگان دین اور صلحائے امت کی سوانح عمریاں وجود میں آئیں، جن سے مذہبی ادبیات کے سرمایوں میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ سیرت نگار بھی تھے اور سوانح نگار بھی تھے۔ سیرت نبوی میں آپ کی پہلی تصنیف ''مردوں کی مسیحائی'' ہے۔ جس میں مولانا مرحوم کے قلم گوہر بار اور اسلوب سحر انگیز کا اعجاز نمایاں ہے۔ یہ عشق نبوی میں ڈوبی ہوئی ایک زندۂ جاوید کتاب ہے۔

مذکورہ بالا کتاب ''سلطانِ مامحمدؐ'' کے نام سے بھی شائع ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی دوسری تصنیف ''سیرت نبوی قرآنی'' ہے۔ جو ان کے محاضرات کا نادر مجموعہ ہے۔ جو جنوری ۱۹۵۷ء کی آخری تاریخوں میں نیو کالج مدراس میں دیئے گئے تھے۔ یہ خطبات بھی بڑے ہی پر مغز ومعلوماتی ہیں۔ اور جوش بیان وشدت جذبات کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے مقالات سیرت کے ایک اہم ترین باب ''سیرت نبویؐ اور

علمائے فرنگ'' ہے۔اس باب میں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے یورپ کے بعض مشہور سیرت نگاروں مثلاً جارج فنلے ،ولیم میور اور گارلائل کی تحقیقات بلکہ تلبیسات وتحریفات کا معروضی جائزہ لیا ہے اور ان کی الزام تراشیوں ،فتنہ پردازیوں اورلن ترانیوں کا پردہ فاش کیا ہے۔اور ثابت کیا ہے کہ مستشرقین یورپ سیرت نگاری کی صلاحیت سے عاری ہیں۔ان کی تعلیم وتربیت خالص مادی ماحول میں ہوتی ہے۔زمہری عقل پرستی ایک خاص سطح ،اور خاص مقام سے آگے نہیں دیکھ سکتی۔مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی تحقیق کے مطابق مستشرقین بظاہر حضورؐ کے برپا کئے ہوئے انقلاب کے معترف نظر آتے ہیں۔لیکن وہ انہیں صرف اور صرف ایک غیر معمولی انسان اور ایک عظیم مصلح ومقنن کے روپ میں دیکھتے ہیں اور انہیں مامور من اللہ اور وحی الٰہی کے فیض یافتہ کے طور پر ماننے کے لئے آمادہ نظر نہیں آتے ہیں۔حضور کو عظیم مصلح اور عظیم سیاسی لیڈر کے طور پر پیش کرنا حضور کے لئے کوئی باعث افتخار واعزاز نہیں ہے۔ان کے لئے مبعوث من اللہ اور مامور من اللہ ہونے پر یقین وایقان کرنا ،ایمان کا حصہ ہے۔اور نبی کا پوراز ور اسی پر صرف ہوتا ہے کہ میں اللہ کا رسول اور اس کا پیغمبر ہوں۔اور یہی لقب اس کے لئے باعث فخر واعزاز ہوتا ہے۔

سیرت کے دو معرکۃ الآراء کتابوں کے علاوہ سوانح نگاری کے باب میں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی دو کتابیں ''حکیم الامت: نقوش وتاثرات'' اور ''محمد علی ذاتی ڈائری کے چند اوراق'' بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔اول الذکر حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی سیرت وسوانح ہے۔ آخر الذکر کتاب مولانا محمد علی جوہر کی حیات وخدمات پر مشتمل ہے،جس میں تحریک آزادی وطن اور تحریک خلافت کی سرگرمیوں کی تفصیلات کے ساتھ مولانا محمد علی جوہر صاحب کی ذات کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں اور دشنام طرازیوں کا بھی عبرت ناک ذکر ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کو مولانا تھانویؒ سے بے پناہ عقیدت تھی مولانا دریابادیؒ اگر چہ کسی اور بزرگ کے مرید تھے۔لیکن روحانی تربیت مولانا تھانویؒ سے حاصل کی تھی اور ۱۶/۱۵ سال تک ان کی تربیت میں رہے۔اور علمی ،فقہی ،کلامی ،تفسیری ،عرفانی ،احسانی ،سیاسی ، ادبی اور صحافتی مسائل کی گتھیوں کو سلجھاتے رہے۔

مولانا تھانویؒ سے مرحوم کو کس قدر گہری عقیدت تھی ،اس کا اندازہ حکیم الامت: نقوش وتاثرات سے بحسن وخوبی ہوسکتا ہے۔کہ اس کی سطر سطر سے عقیدت ومحبت کی خوشبو پھوٹتی ہوئی نظر آتی ہے۔

مولانا تھانویؒ کے وصال کے بعد مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی عجیب کیفیت ہوگئی تھی۔ جب کبھی مولانا تھانویؒ یاد آتے تھے۔ مولانا دریابادیؒ ان کی سحر انگیز شخصیت کے کسی نہ کسی پہلو پر ایک تاثراتی مضمون سپرد قرطاس وقلم کردیا کرتے تھے۔ اور صدق وسچ اور صدق جدید میں شائع کرادیتے تھے۔ اس طرح حکیم الامت: نقوش وتاثرات جیسی تاثراتی کتاب منظرعام پر آئی ہے۔

مولانا محمد علی جوہر سے بھی مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کو والہانہ تعلق تھا۔ ایک زمانہ میں مولانا دریابادیؒ ان سے مرید بھی ہونا چاہتے تھے، کیونکہ اوائل جوانی ہی میں ان سے شدید فکری وجذباتی تعلق قائم ہو چکا تھا۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے اپنی زندگی میں متعدد شخصیتوں سے اثرات قبول کیے، جن کا دائرہ مولانا شبلی واکبرالہ آبادی سے لے کر شیخ سنوسی اور حضرت تھانویؒ تک پھیلا ہوا ملتا ہے۔ لیکن انہوں نے سب سے زیادہ پائیدار اثرات محمد علی جوہر کی شخصیت سے قبول کیے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ حکیم الامت: نقوش وتاثرات میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

> ''عقیدت دینی، مذہبی، روحانی رنگ کی جس زور وقوت، جوش وولولے سے حضرت حکیم الامت کے ساتھ ہوئی، کسی دوسری زندہ ہستی کے ساتھ نہ تھی لیکن عقیدت سے ذرا ہٹ کر ایک شئی محبت بھی ہے، یہ محبت اس جوش وقوت کے ساتھ محمد علی سے تھی گویا ایک مقتدا تھے تو دوسرے محبوب'' (حکیم الامت: نقوش وتاثرات ص: ۱۵)

الحاصل یہ کتاب مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی شاہکار تصنیف ہے۔ جس کے اوراق پر مولانا محمد علی جوہر اپنے رنگ وآہنگ کروفر اور جاہ وجلال کے ساتھ جلوہ فگن ہیں۔ اور کبھی اپنوں پر پھولوں کے ڈونگرے نچھاور کرتے ہوئے نظر آتے ہیں تو کبھی اپنے سیاسی دشمنوں کو دندان شکن جواب اور جواب الجواب دیتے ہوئے میدان کارزار میں کھڑے ہوتے دکھائے گئے ہیں۔ غرضیکہ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے نہ صرف مولانا محمد علی جوہر کی افتاد طبع کی پوری منظر کشی کی ہے بلکہ ان کے عہد کے سیاسی لیڈروں کی سوچ کی بھی پوری ترجمانی کی ہے۔ مولانا محمد علی جوہر کیا تھے، اور ان کا مقام کیا تھا، اس کا بھی تعین کیا ہے۔

مولانا دریابادیؒ اور خاکہ نگاری:

اردو میں خاکہ نگاری اور شخصیت نگاری کی روایت کوئی خاص پرانی نہیں ہے، البتہ عربی میں اس کی روایت خاصی پرانی ہے، عربوں میں شخصیت نگاری کا چلن عام رہا ہے۔

اردو زبان وادب میں خاکہ نگاری کی ابتداء ''آب حیات'' سے ہوتی ہے۔ آب حیات کی

بعض روایت سے قطع نظر اس کے بعض خاکے وشخصیے بڑے دلچسپ بصیرت افروز ہیں، اردو خاکہ نگاری وشخصیہ نگاری کے معماروں میں مولوی عبدالحق، پروفیسر رشید احمد صدیقی، سعادت حسن منٹو، شاہد احمد دہلوی، چراغ حسن حسرت، عبدالمجید سالک، اشرف صبوحی، محمد طفیل، شورش کاشمیری، شوکت تھانوی، خواجہ حسن نظامی، ضمیر جعفری، صالحہ عابد حسین صاحبہ اور مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کا نام خصوصیت کے ساتھ شامل ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی دو کتابیں معاصرین اور وفیات ماجدی خاکہ نگاری اور شخصیہ نگاری کے زمرہ میں آتی ہیں۔

''معاصرین'' میں ۸۰ علمی وادبی، سیاسی اور روحانی شخصیتوں کے قلمی خاکے اور شخصیے ہیں۔ ان خاکوں میں مولانا محمد علی جوہر کا خاکہ بڑا دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ مولانا محمد علی جوہر کا مزاج وانداز سمجھنے میں بڑا مددگار ثابت ہوگا۔ ایک زمانہ میں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ گاندھی جی کے بڑے معتقد تھے۔ مولانا محمد علی جوہر خود گاندھی جی سے بہت قریب تھے۔ ان کے پیر ومرشد مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے ہی انہیں مہاتما کا خطاب دے دیا۔ اور اپنے جیب خاص سے ہندوستان کا دورہ کرایا تھا۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے لکھا ہے کہ ایک روز میں مولانا محمد علی جوہر سے ملنے فرنگی محل لکھنؤ گیا۔ رات زیادہ ہو چکی تھی، مولانا محمد علی لیٹ چکے تھے۔ لیٹے لیٹے مجھ سے فرمایا کہ:

> ''تمہیں مہاتما گاندھی کی عقیدت میں بڑا غلو ہو گیا ہے۔ تم ان کی دینی عظمت وروحانی کرامت کے بھی قائل ہو گئے ہو، مجھے دیکھو، مجھ میں یہ کچھ بھی نہیں، ہاں انہیں اپنا سیاسی لیڈر مانتا ہوں، اور ان کی پیروی میں آخری حد تک جانے کو تیار ہوں، ملک کی آزادی کے لئے انہوں نے وہ کام کئے جو آج تک کوئی نہیں کر سکا تھا۔''
>
> (معاصرین: ص: ۳۸)

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ آگے لکھتے ہیں کہ:

> ''۱۹۲۶ء میں موتمر اسلامی (مکہ مکرمہ) میں جب سلطان عبدالعزیز بن سعود کے خلاف تقریر کرنے انہیں کے سامنے کھڑے ہوئے تو کہا:
>
> ''لوگ مجھے ڈرا رہے ہیں کہ سلطان کی مخالفت شاہی آداب کے منافی ہے۔ اور انتہائی خطرناک ہے، میں ایسوں سے جواب میں کہتا ہوں کہ جب یہ زبان وزیر اعظم برطانیہ لائڈ جارج کے سامنے کلمۂ حق سے نہ رکی، جو والی نجد وحجاز سے کہیں زیادہ طاقت رکھتا تھا، تو پھر یہاں تو ایک مسلمان کے سامنے حرم میں کھڑا ہوا ہوں، جہاں

جانوروں کا بھی شکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔''

جیسا کہ آپ کے علم میں ہے کہ مولانا محمد علی جوہر، مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے مرید تھے، لیکن مولانا محمد علی جوہر کو اپنے پیر و مرشد سے بھی بعض مسائل میں اختلاف تھا مولانا محمد علی جوہر سلطان ابن سعود کی حمایت کرتے تھے اور آپ کے پیر و مرشد مولانا عبدالباری فرنگی محلی مخالفت کرتے تھے۔ کسی نے دوران تقریر کہہ دیا کہ ''مسئلہ حجاز'' میں آپ اپنے مرشد کے خلاف کیسے جارہے ہیں: مولانا نے برجستہ فرمایا کہ:

''میں نے مرشد کا دامن فنا فی الشیخ ہونے کے لئے نہیں، فنا فی اللہ کی خاطر پکڑا تھا۔ جس معاملے میں میں گمراہی پر ہوں، صحیح راستہ بتانا ان کا حق ہے۔ اور میرا فرض ان کو قبول کرنا، لیکن جس معاملے میں میں بصیرت کے ساتھ دیکھ رہا ہوں کہ وہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں، وہاں اس طرح میرا فرض ہو جاتا ہے کہ میں انہیں سیدھی راہ دکھاؤں'' (معاصرین: ص: ۴۱)

بڑوں میں مولانا محمد علی جوہر کے علاوہ مولانا اشرف علی تھانویؒ، افضل العلماء، ڈاکٹر عبدالحق اکبر الہ آبادی، چودھری خلیق الزماں، مظہر الحق صاحب اور برابر والوں میں مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا آزاد، مولانا سید سلیمان ندوی صاحب، مودودی صاحب، اور چھوٹوں میں مولانا محمد اویس نگرامی، شوکت تھانوی اور رئیس احمد جعفری کے قلمی خاکے بڑے مؤثر اور دلچسپ ہیں۔

وفیات ماجدی میں ''بوڑھی محبوبہ'' ماں کے قدموں پر اور ''ایک خدمت گار کی خدمت میں'' بڑے جذباتی اور ادبی نوعیت کے ہیں اسی بنا پر مشہور ادیب ڈاکٹر سعد سندیلوی نے وفیات ماجدی کو ''نثری مرثیے'' کہا تھا۔

مولانا دریابادیؒ اور خودنوشت سوانح نگاری:

خودنوشت سوانح نگاری ایک مشکل ترین فن ہے۔ چونکہ خودنوشت سوانح نگاری میں صدق گفتاری، راست گوئی، صداقت نگاری اور واقعہ نگاری ہونی چاہئے۔ اگر اس میں یہ اوصاف نہیں ہیں تو یہ آپ بیتی پایۂ ثقاہت سے گر جاتی ہے۔ اور دروغ گوئی، کذب بیانی، سخن طرازی، اور خود ستائی کے زمرہ میں آجاتی ہے۔ اس وقت یہ آپ بیتی صحیح معلومات کا وسیلہ نہیں بلکہ غلط معلومات کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

چونکہ خودنوشت سوانح نگاری ایک مشکل کام ہے، یہی وجہ ہے کہ اصناف نثر میں براہ راست ''آپ بیتی'' نسبتاً کم لکھی گئی ہے۔ البتہ خطوط، روزنامچوں یا ناولوں اور افسانوں کے ذریعہ بعض

اوقات اپنی سرگزشت بیان کرلی جاتی ہے۔

اردو زبان میں لکھی گئی آپ بیتیوں وسرگزشتوں میں پروفیسر رشید احمد صدیقی کی آشفتہ بیانی میری، مزدور شاعر احسان دانش کی جہان دانش، قدرت اللہ شہاب کی ''شہاب نامہ'' دیوان سنگھ مفتون کی ''ناقابل فراموش'' عبدالمجید سالک کی ''سرگزشت'' جوش ملیح آبادی کی ''یادوں کی برات'' سرسید رضا علی کی ''اعمال نامہ'' مولانا حسین احمد مدنیؒ کی ''نقش حیات'' مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی ''کاروان زندگی'' اور مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی ''آپ بیتی'' خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی آپ بیتی، ایک سچی آپ بیتی ہے۔مولانا دریابادیؒ، صدق گفتاری، صداقت نگاری اور واقعہ نگاری میں اپنے معاصرین میں ممتاز ونمایاں نظر آتے ہیں۔ آپ کے اندر سچ کو سچ اور غلط کو غلط کہنے کی بے پناہ صلاحیت تھی۔اس سلسلہ میں وہ کسی مصلحت پسندی کے قائل نہیں تھے۔

یہ آپ بیتی ۴۵؍ابواب پر مشتمل ہے۔جس میں ماحول واجداد، والد ماجد، والدہ ماجدہ، بھائی بہنیں، دوسرے اعزا واقربا، پیدائش، بسم اللہ، خانگی تعلیم وتربیت، اسکولی زندگی میں داخلہ، اسکولی زندگی، کالجی زندگی، ازدواجی زندگی، مضمون نگاری وصحافت، انگریزی مضمون نگاری، آغاز الحاد، الحاد وارتداد، مد کے بعد جزر، اسلام کی طرف بازگشت، سیاسی زندگی بیعت وارادت، تصنیف وتالیف، معاشی ومالی زندگی، شاعری یا تک بندی، سفر صحت جسمانی، عام معیشت، چند مخصوص عادات ومعمولات موثر، عزیز، محسن شخصیتیں، چند مظلوم مرحوم شخصیتیں، اولاد، مخالفین ومعاندین، عام نتائج وتجربات زندگی کا نچوڑ، اور زندگی کا زبردست حادثہ جیسے اہم موضوعات پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

مولانا دریابادیؒ اور سفر نگاری:

ہندوستان میں دو قسم کے سفرنامے وجود میں آئے ہیں، ایک وہ سفرنامہ جس میں دوسرے ممالک کے سیاحوں اور مؤرخوں نے ہندوستان کے متعلق اپنے تاثرات ومشاہدات کا ذکر کیا ہے۔مثلاً چینی ھانگ سانگ اور فاھیان۔عرب سیاح ومؤرخ علامہ ابن بطوطہ اور یوروپین سیاح ودانشور برنیر وغیرہ۔دوسرا سفرنامہ وہ ہے جس میں خود ہندوستان کے علماء ومشائخ اور سیاحوں نے دوسرے ممالک وامصار کے عجائبات ومشاہدات قلمبند کئے ہیں۔مثلاً شیخ عبدالحق

محدث دہلوی، امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی اور مولانا مناظر احسن گیلانی وغیرہ۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کا شماران گنے چنے علماء وادیبوں میں ہوتا ہے جن کے سفرنامے مذکورہ بالا دونوں زمروں میں آتے ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے ملی وقومی ضرورت کے تحت ممبئی، بہار، بھوپال، حیدرآباد، کلکتہ اور مدراس کی سیاحت کی اور وہاں کے پیش آمدہ حالات وکوائف قلمبند کئے۔

مولانا دریابادیؒ گوشہ نشین اور تخلیہ پسند انسان تھے۔ سیر وسیاحت سے مجتنب رہتے تھے، مگر کبھی کبھی ملی ضرورتوں کے تحت سفر کی مجبوری پیش آجاتی تو خود ان کو بھی حیرت ہوتی تھی۔ ''چار دن بمبئی میں'' کے عنوان سے لکھا ہے:

> ''سفر اور پھر لمبے سفر کی عادت اب ایسی چھوٹ سی گئی ہے کہ جب کبھی ایسا اتفاق پیش آہی جاتا ہے۔ تو سب سے بڑی حیرت تو اپنے ہی کو ہوتی ہے۔ ؎
> غیر کیا خود مجھے حیرت میرے اسفار پہ ہے۔'' (گیارہ سفرص:۸)

بمبئی میں صدق اور سچ کے قارئین اور مولانا مرحوم کے معتقدین بھاری تعداد میں موجود تھے۔ ان کے ممبئی قیام کے دوران مختلف حضرات سے ملاقات رہی۔

مولانا دریابادیؒ لکھتے ہیں:

> ''ایک اور صاحب صوفی عبدالرحمٰن سے ملاقات ہوئی، معلوم ہوا کہ سیٹھ عمر بھائی چاند بھائی کے صاحبزادے ہیں۔ اور سیٹھ صاحب کی وفات ابھی چند ہی ہفتے قبل ہوئی ہے۔ سیٹھ صاحب خلافت کمیٹی کے پرانے خزانچی تھے۔ ان کا نام آتے ہی کتنی خوشگوار یادیں، مارچ ۱۹۲۹ء کے حج بیت اللہ کی، حجاز کی، خلافت ہاؤس کی، سب نظر کے سامنے پھر گئیں، رہے نام اللہ کا۔
>
> ایک صاحب محمد حسین توفیق نامے کا ذکر تو رہا ہی جاتا ہے، خوب یاد پڑ گئے، مسافر خانہ حاجی صابوصدیق سیٹھ اور انجمن خدام النبی کے خاص کارکن، ''مسافر خانہ'' میرے لئے مقامات مقدسہ سے کم محترم نہیں، دیکھ کر دل پوری طرح بھر آیا، جس جس حصہ سے میرے والدین گزرے تھے، جی میں آتا رہا کہ ان کو آنکھوں سے لگائیے اور ہو سکے تو پلکوں سے جھاڑو دے دے کر خوب دل کھول کر رو دیجئے، اس ناشدنی اس وقت نہ ان کی کوئی خدمت کی نہ قدر! اب کفارہ وتلافی کی صورت ہی کیا

ہے۔'' (ص:۱۸)

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ خلافت کمیٹی کے پرجوش قائد اور مولانا محمد علی جوہر کے رفیق خاص رہے ہیں، خلافت ہاؤس سے ان کا قدیمی تعلق تھا، لیکن کبھی کو خلافت ختم ہوگئی۔ لیکن آج بھی خلافت ہاؤس ممبئی میں موجود ہے۔ مولانا دریابادیؒ لکھتے ہیں کہ:

''خلافت ہاؤس کے بڑے پرانے کارکن، مرزا عبدالستار بیگ ملے، جو اب خود قابل زیارت ہیں، انہیں کے مخلصانہ اصرار پر سہ پہر کے وقت خلافت ہاؤس جانا ہوا۔ وہاں اب کیا ہے، سوا بیگم محمد علی کی قبر کے۔'' (ص:۲۰)

مولانا حامد الانصاری غازی مشہور ادیب و ممتاز صحافی اور دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن تھے، بڑے مرنجاں مرنج اور باغ و بہار قسم کے بزرگ تھے۔ میری کتاب ''نقوش خاطر'' میں ان کا تفصیلی خاکہ موجود ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ ان کے متعلق بڑے دلچسپ انداز میں لکھتے ہیں کہ:

''ایک میرے دشمن بہ صورت دوست غازی حامد الانصاری ملے، خلافت ہاؤس اور دوسری جگہوں میں بھی اپنے سے خدمت ہی کون سی بن پڑتی ہے۔ لیکن خیر تھوڑی بہت جو کچھ بھی اتفاق سے ملتی بھی ہے تو اجر کے سب سے بڑے لٹیرے یہی حضرت نکلتے ہیں، وہ داد، وہ مداحی، وہ قصیدہ گوئی، قصیدہ خوانی کہ گویا میں کوئی امیر یا تو قیر ہوں، یا کوئی درباری شاعر تو جو کچھ اجر ملا بھی وہ سب یہی حضرت چھین چھان کے لے گئے اور مجھے سربزم ٹھکھ اور شرمندہ چھوڑ گئے! ایسے کورہزن اور ''بٹ مار'' اگر نہ کہئے تو اور کیا کہئے۔'' (ص:۲۳)

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے بہار کا بھی سفر کیا ہے — ''بہار کی بہار'' — کے نام سے اپنا سفرنامہ مرتب کیا ہے اس سفر میں ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی صاحب سابق ممبر پارلیمنٹ بھی رفیق سفر تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا مناظر احسن گیلانی کے وطن دسنہ اور گیلان بھی گئے، دسنہ کے مشہور کتب خانہ الاصلاح (جس میں بھاری تعداد میں عربی، فارسی اور اردو مخطوطات ونوادرات تھے) کی عمارت کی خستہ حالی، اسٹاف کی کمی، جس کے نتیجہ میں ان مطبوعات ومخطوطات کے اتلاف وضیاع کے قوی اندیشے کے پیش نظر لکھتے ہیں کہ:

''کاش کوئی صورت اب کتب خانہ (الاصلاح) اور اس کے متعلقات کے لئے نکل آتی،

اور اگر ڈاکٹر ذاکر حسین خان کی گورنری اور شاہ محمد عزیز منعمی کی وزارت کے زمانہ میں بھی نہ نکلی تو پھر کب نکلے گی؟

کتب خانہ کے کتاب معائنہ بجائے خود عجائب و نوادر کے حکم میں ہے، بڑے بڑے مشاہیر وقت مولانا شوکت علی اور صدر یار جنگ، حبیب الرحمٰن خان شیروانی وغیرہ کے معائنے اس میں درج ملے، اور سب سے بڑا انکشاف یہ ہوا کہ آج جو جمہور یہ ہند کے صدر محترم ہیں! ڈاکٹر راجندر پرشاد بالقابہ خود ان کا معائنہ اور وہ بھی شستہ عبارت اور اردو کے خاصے نستعلیق و روشن خط میں درج ملا۔

کتب خانہ کو اچھا خاصا سراہا ہے اور لکھا ہے کہ کسی امیر کی نظر توجہ اس پر پڑ جائے تو کام پورا ہو جائے۔ کاش کتب خانہ والے اس نادر تحریر سے فائدہ اٹھائیں اور عرضداشت بھیجیں یا خود وفد لے کر بارگاہ صدارت پناہ پہنچیں۔ اور عرض کریں کہ عالی جاہ اب تو آپ خود امیر، بلکہ امیر الامراء کے مرتبہ پر ہیں، ہمارا کام بننے میں پھر کیا دیر ہے۔"

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے بڑے درد وخلوص سے اس کتب خانہ الاصلاح کی حفاظت ونگہداشت کی طرف توجہ دلائی تھی۔ مگر آہ! مولانا مرحوم کو کیا خبر تھی کہ ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب کی گورنری شاہ محمد عزیز منعمی صاحب کی وزارت اور ڈاکٹر راجندر پرشاد کی صدارت بھی ختم ہو جائے گی۔ اور کتب خانہ الاصلاح کی اصلاح وتزئین نہ ہو سکے گی اور عدم حفاظت کی بنا پر اس کتب خانہ کے مخطوطات ونوادرات خدابخش اورینٹل لائبریری پٹنہ میں پہونچ جائیں گے۔ اور دسنہ کلکشن کے نام سے ایک گوشہ وجود میں آجائے گا۔

مولانا دریابادیؒ نے اپنے سفرنامہ میں مشہور عالم دین اور عظیم مصنف مولانا مناظر احسن گیلانی کے وطن گیلان اور آخری آرام گاہ قبرستان کے متعلق بڑے دلچسپ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

> "قبرستان" جی ہاں! نہ کوئی گنبد! نہ کوئی مقبرہ نہ کوئی حجرہ نہ کوئی چبوترہ نہ اونچی پکی قبروں کی قطار نہ کوئی در ودیوار ایک بڑے طویل وعریض باغ میں خاندان والوں کی دو ایک کچی تربتیں بس یہ کل کائنات اس گورستان کی ...... کھلے ہوئے آسمان کے نیچے مولانا (مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم) کا مزار پرانوار یعنی مٹی کا ایک ڈھیر، جس کے نیچے جسد خاکی، اس مرد مومن کا دائمی آرام میں ہے جو وقت کا

زبردست فاضل، معقول ومنقول کا جامع، شریعت وطریقت دونوں کا راز داں، ایک بہترین خطیب، ایک بہترین اہل قلم، بیدار دل روشن دماغ مؤرخ محقق، شاعر، عارف، سب کچھ تھا۔ اور ابھی کل تک جیتا جاگتا، اور دوسروں کے دلوں کو زندہ رکھے ہوئے تھا!''

مولانا دریابادیؒ نے حیدرآباد کا بھی سفر کیا تھا، وہاں کے مختلف اداروں اور اہم شخصیات سے ملاقاتیں کی تھیں، وہاں کے اداروں میں دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدرآباد ایک مشہور دینی وعلمی ادارہ ہے۔ جس کا کام مسلمانوں کے قدیم ذخیروں سے نادر ونایاب کتابوں کو تعلیق وتحشیہ کے ساتھ شائع کرنا ہے۔

مولانا دریابادیؒ بھی ایک زمانہ میں اس ادارہ سے وابستہ رہے تھے، اس دائرۃ المعارف عثمانیہ کو بھی بند کرانے کی سازش رچی گئی تھی، یہ وہ زمانہ تھا کہ مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیم تھے، مولانا آزاد نے بڑی جدوجہد کر کے دائرۃ المعارف عثمانیہ کو بند ہونے سے بچایا، یہ آپ کا زبردست کارنامہ ہے۔

مولانا دریابادیؒ دائرۃ المعارف عثمانیہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

''یاروں نے کیا کوئی کسر ادارہ کے بند کرا دینے کی اٹھا رکھی تھی ادارہ مسلمانوں کا مخصوص کام کر رہا ہے، فرقہ وارانہ ہے، سیکولر حکومت میں اس کا کیا کام؟ اسے فوراً بند ہونا چاہئے۔

قریب تھا کہ فرمان قضا اس مضمون کا شائع ہو جائے اور حکومت آندھرا پردیش کے حکم سے ادارہ کے درواززوں میں قفل پڑ جائیں، لیکن حافظ حقیقی کو کچھ اور ہی منظور تھا وزیر تعلیم سرکار ہند مولانا ابوالکلام آزاد (اللہ انہیں غریق رحمت فرمائے) نے اپنے منصب عالی کی کرسی سے زبردست احتجاج نامہ بھیجا کہ ''بند ہونا کیا معنی ایسے ادارہ کو قائم ہی نہیں اور ترقی دینا چاہئے بیرون ہند کی پڑھی لکھی دنیا میں سرکار ہند کی سیکولرزم کا بھرم ہی اس سے قائم ہے۔ اپنے سرکاری دورہ میں۔ کیا جرمنی اور کیا فرانس، کیا برطانیہ اور کیا اٹلی سب کہیں کے اہل علم کو اس کی خیریت دریافت کرتے اور اس کے کارناموں کے راگ گاتے ہوئے پایا جب کہیں جا کر ادارہ کی جان بخشی ہوئی۔'' (ص:۱۰۸)

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ دو دفعہ پاکستان گئے تھے۔ پہلی مرتبہ ۱۹۵۵ء میں گورنر جنرل

غلام محمد کی دعوت پر لاہور اور کراچی گئے۔ اس سفر کی مفصل روئیداد "ڈھائی ہفتے پاکستان میں یا مبارک سفر" کے نام سے ۱۹۵۵ء ہی میں شائع ہوئی تھی مولانا مرحوم سفرنامہ میں لکھتے ہیں:

"زیارتِ پاکستان کی تمنا کس مسلمان کے دل میں نہیں ہے سرگیسوئے تو در ہیچ سرے نیست کہ نیست، ایک تو مسلم ملک پھر پڑوسی اور پڑوسی بھی کیسا اپنے ہی گوشت پوست کا پتلا، اپنے ہی دل وجگر کا ٹکڑا، اپنے کتنے بھائی بند، عزیز دوست، مخلصین اس سرزمین پر آباد اور پھر قائم اسلامیت کے کن کن دعووں کے ساتھ ہوا تھا۔ یہ سب چیزیں مل ملا کر اشتیاق دید کو حد کمال تک پہنچائے ہوئے۔

ازغم عشق تو پرخوں جگرے نیست کہ نیست"

لاہور اور کراچی میں قیام کے دوران وہاں کے علماء، مشائخ اور صحافیوں وادیبوں سے ملاقاتیں کیں اوران سے تبادلہ خیال کیا خاص طور پر وہاں کے علمی کاموں کا بھرپور مطالعہ کیا۔ اور مسلم معاشرہ میں ہونے والی تبدیلیوں کا جائزہ لیا مولانا دریابادیؒ وہاں کی سیکولر فضا، مذہبی رواداری اور آپسی میل جول کے ماحول سے متاثر ہوئے۔ وہاں انہوں نے دیکھا کہ ۴۷ سے قبل سڑکوں، پارکوں اور اداروں کا جو نام تھا اس کو آج بھی برقرار رکھا گیا ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی ہے۔ یہ کسی بھی جمہوری ملک کے لئے ایک اچھی علامت ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے دوسری مرتبہ ۱۹۵۸ء میں پنجاب یونیورسٹی کی دعوت پر مذاکرۂ عالم اسلامی میں ہندوستان کے مندوب ہونے کی حیثیت سے شرکت کی، جس میں مولانا کے سکریٹری کی حیثیت سے مشہور مصنف اور سابق ممبر پارلیمنٹ ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی صاحب بھی شریک ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ ہندوستان سے مولانا سعید احمد اکبرآبادی اور مولانا ابوالحسن علی ندویؒ بھی آنے والے تھے لیکن کسی مجبوری کی وجہ سے شریک نہ ہوسکے تھے۔ اس مذاکرۂ عالم اسلامی میں مصر کے شیخ ابوزہرہ، شیخ مصطفےٰ زرقا، شام کے شیخ الحدیث بہجت البیطار، پاکستان کے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا امین احسن اصلاحی، اور مولانا مفتی محمد شفیع صاحب وغیرہ شریک ہوئے تھے۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے پاکستان سے واپسی کے بعد وہاں کا سفرنامہ ہفت روزہ صدق میں شائع کرنا شروع کیا، یہ سفرنامہ بڑا ہی دلچسپ تھا۔ لکھتے ہیں کہ:

"اپریل ۱۹۵۵ء کے سفر لاہور و کراچی میں قافلہ چار آدمیوں کا تھا اس وقت جانا ملک غلام محمد دریا دل گورنر جنرل پاکستان کی دعوت پر ہوا تھا، اور مصارف کی طرف سے

اطمینان تھا۔اس کی دعوت گورنر جنرل یا گورنر کی طرف سے نہیں محض پنجاب یونیورسٹی کی جانب سے تھی،اور صرف ڈیلی گیٹ (مندوب) کی ذات کے لئے تھی،اس کے اسٹاف یا خاندان کے لئے نہ تھی،اس لئے اب کی ساتھ صرف اپنے بھتیجے اور داماد محمد ہاشم قدوائی (لیکچرر مسلم یونیورسٹی،علی گڑھ) کو بہ طور سکریٹری لے لیا،یہ ناگزیر تھا، بغیر سکریٹری کے سفر کرنا اپنے کو سخت صعوبتوں میں ڈالنا تھا۔"

مولانا دریابادیؒ نے لکھا ہے کہ اس سفر سے یہ خوشی تھی کہ لاہور میں مشہور صحافی اور مفکر محمد اسد یوروپین اور ڈاکٹر حمید اللہ مقیم پیرس سے ملاقات ہوگی،اول الذکر ایک نومسلم دانشور و مفکر تھے۔اور آخر الذکر مسلم دانشور و مفکر اور عظیم مؤرخ تھے۔

ڈاکٹر محمد اسد یوروپین،مترجم قرآن کریم اور اس مذاکرۂ علمی کے ڈائریکٹر بھی تھے۔لیکن محمد اسد صاحب اندرونی اختلاف کی بناپر ڈائریکٹری کے عہدہ سے مستعفی ہو گئے تھے۔ڈاکٹر حمید اللہ صاحب بھی نامعلوم وجوہ کی بناپر سیمینار میں شریک نہ ہو سکے۔

مولانا مرحوم نے لکھا ہے کہ اس سفر میں مولانا مفتی محمد حسن صاحب امرت سری ثم لاہوری، خلیفۂ حضرت مولانا تھانویؒ،حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ،مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ،مولانا محمد یوسف بنوریؒ صاحب،مولانا قاضی نور الحق صاحب اور مولوی رئیس احمد جعفری ندوی کے علاوہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب مولانا امین احسن اصلاحی صاحب سے بھی ملاقاتیں ہوئیں۔مولانا مودودی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> "ایک زمانہ میں ان سے تعلقات اچھے خاصے تھے۔یہ صورت ان کی الجمعیۃ (ہفت وار) کی ایڈیٹری سے لے کر ان کے ماہنامہ ترجمان القرآن کے دارالسلام پٹھان کوٹ میں منتقل ہونے تک باقی رہی پھر جب سے وہ ایک پارٹی کے لیڈر،یا امیر بن گئے،ہم دونوں کے راستے بڑی حد تک الگ ہو گئے لیکن بحیثیت متکلم واہل قلم دل میں اب بھی ان کی بڑی وقعت ہے۔ان کے بعض اجتہادات کا ساتھ ان کے قدیم سے قدیم رفیق ومخلص ہی نہیں دے پائے اور ان سے الگ ہو جانے پر اپنے کو مجبور پاتے ہیں تو یہ چیز تو الگ ہے۔باقی ان کا قلم اب بھی دین کی گراں بہا خدمات انجام دے رہا ہے۔بلکہ یہ کہنا بھی مبالغہ سے خالی ہوگا کہ تعلیم یافتہ گروہ کے بڑے حصہ کا ایمان سنبھالے ہوئے ہے اور بحیثیت مجموعی ان کی تحریروں میں خیر کا عنصر شر کے عنصر

پر کہیں غالب ہے۔"　　　　　　　　　　　　(گیارہ سفر: ص: ۲۳۵)

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے شورش کاشمیری ایڈیٹر چٹان سے بھی گہرے تعلقات و مراسم تھے پہلے سفر میں شورش کاشمیری نے مولانا دریابادیؒ کی اچھی ضیافت کی تھی۔ اور ان کے پرتکلف دعوت کی وجہ سے مولانا دریابادی کو ناگواری تھی۔ شورش نے اس سفر میں بھی دعوت دینی چاہی تو مولانا نے یہ شرط رکھی کہ دعوت میں سادگی ہونی چاہئے اور سابقہ پرتکلف دعوت سے کلی اجتناب ہونا چاہئے، شورش کاشمیری نے یہ شرط منظور کی اور کہا کہ اب کی بار سادگی رہے گی، صرف ایک قسم کا کھانا پیش کیا جائے گا۔ دعوت میں چٹان کے بھولے بھالے ناظرین اس خیال میں ہوں گے۔ کہ بس ماحضر پیش کردیا ہوگا۔ سادگی کے لحاظ سے دعوت شیراز کا نمونہ:

مولانا دریابادیؒ، شورش کاشمیری کی دعوت کا حدود اربعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> "نفس دعوت سے قبل اس کا ایک مستقل ابتدائیہ تھا، اور کھانے کے بعد اس کا ایک طویل اختتامیہ، خشک و تر میووں کی شکل میں، لذیذ و نفیس پھلوں کی صورت میں، نمکین بھنے ہوئے مغزیات اور لطیف و شیریں لوازمات کے روپ میں:—— دعوت کے یہ تکلفات کھانوں کے یہ تنوعات ہر رئیس کے حصہ نہیں آتے، کسی رئیس اعظم ہی کے حصہ کی چیز ہیں؟
>
> کھانے کی میز پر جب رسائی ہوئی تو رزاق مطلق کی نعمتوں، اور بخششوں کا ایک پورا میوزیم (ندرت خانہ) سجا سجایا نظر آیا۔ مرغ کا قورمہ اور مرغ کی بریانی مرغ مسلم اور طرح طرح کے کباب مچھلی اور انڈے کے طرح طرح کے سالن اور اب یاد نہیں کہ اور کیا کیا!—— آج کا دن شہر میں بکری کا گوشت نہ ملنے کا تھا اس کا کیا خوب توڑ سوشلزم کے اس ذہن مبلغ نے سوچ لیا اور سادگی اور کفایت کی کیا چور راہیں اس سرمایہ شکن و سرمایہ بیزار نے نکال لیں!
>
> تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی!
>
> حکومت نے بکری کے ذبیحہ پر پابندی یقیناً اس لئے عائد کی ہے کہ شاہ خرچ میزبانوں نے بکروں کو اس طرح بے دریغ کاٹنا شروع کر دیا تھا کہ اس سے نسل کے خاتمہ کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے لیکن کہیں میرے شیر نے دس بیس دعوتیں اور اسی پیمانہ پر کر ڈالیں...... تو ذرا عجب نہ ہوگا کہ حکومت کو مرغ کی نسل کے بھی تحفظ کی فکر ایسی ہی

لاحق ہوجائے!

سنا ہے کہ پچھلے سفر نامہ (۱۹۵۵ء والے) میں ان اولوالعزمیوں کی روداد پڑھ کر جٹان کے چار خریدار ٹوٹ گئے۔ عجب نہیں کہ اب کی نوبت آٹھ کی آجائے! لیکن دیکھئے کہیں دھوکا نہ ہوجائے۔ یہ سارا ذکر مذکور صرف کھلانے کا ہوا نہ کہ ''کھانے'' کا اور کھانے کا کھلانے کے درمیان جو فرق ہے ظاہر ہے بلکہ جہاں تک خود کھانے کا تعلق ہے مہمان کی شہادت عینی ہے کہ میز بان اس باب میں لاأبالی بلکہ بے نیاز سا واقع ہوا ہے۔'' (گیارہ سفر: ص: ۲۷۸، ۲۷۹)

آخر میں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے سیاحتی ادب کے ضمن میں ''سفر حجاز'' کا ذکر لازمی ہے۔ چونکہ ان کے سفر ناموں میں یہ ''سفر حجاز'' ایک شاہکار کاوش ہے۔ یہ سفر برائے سیر و تفریح نہ تھا، بلکہ مولانا مرحوم نے ۱۹۲۹ء میں حجاز مقدس کا سفر کیا تھا، سفر وسیلۂ ظفر تھا، یعنی سفر حج تھا جو بڑا مقدس سفر ہوا کرتا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ ایک صاحب اسلوب وانشاء پرداز تھے، آپ نے حرمین شریفین، اور وہاں کے مقامات مقدسہ پر ایک جامع سفر نامہ ''سفر حجاز'' کے نام سے ادب وانشا کی دنیا کے سپرد کیا ہے۔ مولانا دریابادیؒ نے وہاں کے تمام مقامات مقدسہ کا ذکر بڑے سوز وگداز کے ساتھ کیا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ وہ روضۂ اطہر کے سامنے اپنا دل چیر کر رکھ دیتے ہیں۔ وہ خود بھی آب دیدہ ہوتے ہیں، اور اپنے قاری کو بھی آبدیدہ کرتے ہیں۔ وہ ایک عبد عاجز، فرد آثم اور امت کی نشأۃ ثانیہ کے خواب دیکھنے والے ایک صاحب قلم صاحب دل عالم دین اور غمگسار امت کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔ اور ان کے سفر نامہ کو اگر ''تاسف نامہ'' کہا جائے تو بجا ہوگا۔

مولانا دریابادیؒ کا یہ سفر نامہ زبان وانشاء اور تاثیر وگداز کے اعتبار سے اردو سفر ناموں میں ممتاز ومنفرد مقام رکھتا ہے۔ اور اردو زبان میں اس پایہ کے سفر نامے کم ہی لکھے گئے ہیں۔ سفر حجاز کی تأثر آفرینی کے تعلق سے مولانا دریابادیؒ کے نام مشہور شاعر مولانا حسرت موہانی کا مندرجہ ذیل مکتوب توجہ طلب ہے۔

> سفر حجاز کے متعلق آپ کے مضامین ''سچ'' میں نظر سے گزرے تھے مگر اس وقت ان کے مطالعے میں تسلسل کا عنصر موجود نہ تھا۔ اب پرسوں محبی ظفر الملک صاحب سے لے کر ان کو ایک بار پھر کتابی شکل میں دیکھا تو آنکھوں کو کچھ اور ہی عالم نظر آیا۔ جزاکم

اللہ فی الدارین، کئی بار آنکھیں آنسوؤں سے تر ہوئیں، فالحمد للہ علیٰ ذالک،
مولانا سلیمان اشرف کی ''کتاب الحج'' اور مولوی خیر اللہ کا رسالہ ''خیر المنازل'' اگر
آپ کے پاس موجود ہو تو عاریۃً مرحمت فرمائیں۔ شاید مجھ کو بھی اس کی ضرورت ہو،
اور اسی سال ہو۔

فقط

فقیر حسرت موہانی

مشہور عالم دین مولانا مسعود عالم ندوی نے بھی مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی کتاب ''سفر حجاز'' کے سوز و گداز میں ڈوبے ہوئے اسلوب کا ذکر بڑے وقیع لفظوں میں کیا ہے۔

صبح کو امیر شکیب ارسلان کا سفرنامۂ حج، الارتسامات اللطاف فی خاطر الحاج الی الاقدس المطاف پڑھتا رہا۔ زبان و بیان کی خوبی کے کیا کہنے، مگر سوز و درد کی کمی محسوس ہوئی۔ سفر حج کی روداد یں بہت پڑھی ہیں، مگر اب تک دل و دماغ پر جو اثر مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے سفرنامۂ حج کا ہے۔ اسے امیر شکیب کی بلاغت محسوس نہیں کر سکی۔ (دیار عرب میں چند ماہ ص: ۷۰)

خطوط نگاری اور مولانا دریابادیؒ:

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کا شمار اردو زبان و ادب کے ان مایہ ناز ادیبوں اور مکتوب نگاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنے خطوط کے ذریعے گفتگو کا نعم البدل مہیا کیا ہے اور مراسلت کو مکالمہ کا رتبہ عطا کیا ہے۔ وہ اس باب میں غالب وشبلی کے ہم پلہ نظر آتے ہیں۔

مولانا دریابادیؒ کا معمول تھا کہ وہ خطوط کا جواب ضرور دیا کرتے تھے۔ ان کا جواب اگر چہ مختصر مگر جامع ہوا کرتا تھا۔ جس میں ادبیت کے ساتھ علمیت بھی ہوا کرتی تھی، اور متانت و سنجیدگی کی شیرینی کے ساتھ طنز و مزاح کی چاشنی بھی محسوس ہوتی تھی۔

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی صاحب لکھتے ہیں کہ:

> ''عم مرحوم جناب مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے تعلقات بہت وسیع تھے۔ اس لئے مراسلت کا دائرہ بھی بہت وسیع تھا، وہ خطوط کے جواب بڑی پابندی و مستعدی سے دیا کرتے تھے۔ ۱۹۵۳ء سے انہوں نے خاص خاص خطوط کی نقل رکھنے کا انتظام کیا یہ خدمت زیادہ تر مولانا کی منجھلی صاحبزادی یعنی راقم الحروف کے منجھلے بھائی حبیب احمد قدوائی کی بیگم نے انجام دی جو ان کی سب سے زیادہ مزاج شناس تھیں، اور جن کا

زیادہ تر قیام دریاباد ہی میں رہتا تھا۔ دوسری صاحبزادیوں اور نواسوں نے بھی یہ خدمت انجام دی۔ تقریباً گیارہ ہزار سے زیادہ خطوط کی نقلیں ان کاپیوں میں ملیں۔"

(مکتوبات ماجدی جلد اول ص:۴)

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے علمی، ادبی، سیاسی اور مذہبی خطوط، مکتوبات ماجدی کے نام سے تین جلدوں میں شائع ہوئے ہیں۔ جلد اول ۱۴۰۳ء مطابق ۱۹۸۲ء میں دوسری جلد ۱۴۰۷ھ مطابق ۱۹۸۷ء میں اور تیسری جلد ۱۴۲۱ھ مطابق ۲۰۰۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ ان تینوں جلدوں کے فاضل مرتب ومحشی مشہور مؤرخ اور سابق ممبر پارلیمنٹ ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی صاحب ہیں۔ ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی صاحب نے بڑی محنت وعرق ریزی کے ساتھ مکتوبات ماجدی کی تینوں جلدوں کو مرتب کیا اور عمدہ حواشی سے مزین کیا اور مکتوب الیہم کا مختصر تعارف کرایا ہے۔ یہ ضخیم جلدیں ادارہ انشائے ماجدی کلکتہ کے زیر اہتمام شائع ہوئی ہیں جس کے مالک حاجی منظور علی صاحب لکھنوی ہیں۔ جنہیں بزرگان دین بالخصوص مولانا عبدالماجد دریابادیؒ سے تعلق خاص ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ ایک منفرد اسلوب تحریر اور سحر انگیز طرز نگارش کے مالک تھے، آپ کے بعض خطوط رعایت لفظی کی صنعت کے شاہکار نمونے ہیں، اور حقائق ومعارف کا بحر ذخار، چند خطوط کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں۔ جن سے ان کی نکتہ آفرینی ومعارف بیانی، معارف آگاہی اور صناعت لفظی کا بھرپور علم حاصل ہو جائے گا۔

سید لقمان معتمد بزم صحافت، جمعیۃ الاصلاح دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے ۱۳؍جنوری ۱۹۵۵ء کو اپنے "رسالہ" کے لئے پیام کی فرمائش کی۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ ان کے خط کا جواب بڑے دلچسپ وحکیمانہ اسلوب میں لکھتے ہیں:

> "آپ تو خود "لقمان" ہیں، آپ کو حکمت کا درس کون دے سکتا ہے۔ لیکن لقمان نے دانائی نادانوں سے سیکھی تھی۔ اس لئے اپنے لکھنے لکھانے میں کچھ ہرج نہیں دیکھتا......

مولانا دریابادیؒ اسی خط میں بڑی اچھی بات لکھتے ہیں: جو جماعتی وتعمیری کام کرنے والوں کے لئے رہنما اصول کا درجہ رکھتی ہے:

> "اصلاح کا کام پیمبرانہ عزم وحوصلہ اور پیمبرانہ روحانیت ووقت نظر چاہتا ہے۔ اور اصلاحی صحافت گویا اسی کا شعبۂ تذکیر وتبلیغ ہے۔ جتنا اپنے آپ کو سیرت پیمبری میں

جذب وتحلیل کرتے جایئے گا۔ جتنا اپنے آپ کو پیمبری کے سانچے میں ڈھالتے جایئے گا تزکیۂ نفس اور تربیت ضمیر از خود ہوتی جائے گی۔'' (مکتوبات ماجدی،ص:۱۱)

مشہور ومعروف شاعر حضرت امجد حیدرآبادی پر خواجہ حمید الدین شاہد صاحب نے ایک تاثراتی مضمون کی درخواست کی اس کے جواب میں ۴؍جنوری ۱۹۵۵ء کو حضرت مولانا دریابادیؒ نے یہ پیام بھیجا۔ آپ کی تحریر، رعایت لفظی اور ضلع جگت کا شاہکار ہوتی ہے۔

''امجد'' نامورذی شان کے باب میں ''ماجد'' گم نام وبے نشاں کا کچھ عرض کرنا سورج کو چراغ ہے دکھانا۔

شہد کو اور کون سی مٹھاس ڈال کر میٹھا کیا جائے۔ اور نمک میں کون سی نمکیں ڈال کر نمکین بنایا جائے؟

وہ میرے افضل التفصیل برائے نام ہی نہیں، زندگی کے ہر صیغہ میں مجھ سے افضل ''اکرم اشرف'' اور اکمل ہیں۔'' (ص:۱۲)

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند صرف اچھے نثر نگار اور صاحب طرز ادیب ہی نہیں بلکہ ایک اچھے شاعر اور خوش فکر انسان بھی تھے۔ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب اپنی آنکھ کے آپریشن کے سلسلہ میں علی گڑھ تشریف لے گئے تھے، اس آپریشن کے دوران آنکھوں کی کہانی کے عنوان سے ایک طویل نظم لکھی اور مولانا دریابادی مرحوم کو بھیجی مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے اس کے جواب میں یہ مکتوب گرامی تحریر فرمایا:

> ''آنکھ کی کہانی'' آن محترم کا عطیہ یہاں آتے ہی پڑھ ڈالی۔ سبحان اللہ وماشاء اللہ مجھے علم نہ تھا کہ آپ کو شعر ونظم پر بھی اس درجہ قدرت حاصل ہے۔ ذلک فضل اللہ کیا کیا قافیے نکالے ہیں! کیسے کیسے مضمون باندھے ہیں۔ پیشہ ور شاعروں کے بھی چھکے چھوٹ جائیں۔ نہ کہیں سے جھول اتنی طویل میں، کہیں سے آورد نہیں، بس آمد ہی آمد۔
>
> خوش دماغ تو بہ حیثیت ایک سچے قاسم زادہ کے آپ تھے ہی اب معلوم ہوا کہ ماشاء اللہ خوش فکر بھی اس درجہ میں ہیں۔ ماشاء اللہ۔''

حلقہ ادب پاکستان لاہور کی جانب سے خواجہ حسن نظامی پر ایک پیغام کی فرمائش کی گئی، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے یکم اپریل ۱۹۶۵ء کو عابد نظامی صاحب کو یہ مکتوب گرامی ارسال فرمایا:

''تاریخ زبان اردو کے پرچہ میں اگر یہ سوال آیا کہ البیلا ادیب کون گزرا ہے تو جواب صرف ایک ہی ہوگا ـــــــ خواجہ حسن نظامی وہ مستوں کا مست، سرشاروں کا سرشار، دیوانہ یکار خویش ہوشیار، ادب کا خادم، ادیبوں کا مخدوم، سب سے نرالا، اپنی اداؤں میں البیلا، زبان والوں کا پیارا، ادب و انشاء کی آنکھوں کا تارا۔''

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ ایک صاحب اسلوب ادیب تھے۔ زبان کے بارے میں سند کا درجہ رکھتے تھے۔ مشہور جریدہ ''ہماری زبان'' کے فاضل مدیر کے نام لفظ ''چورنی'' کی تحقیق کے سلسلہ میں حضرت شاہ رفیع الدین دہلویؒ کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

> ''چوٹنے کے لئے مونث چوٹنی تو مستعمل ہے۔ لیکن چور کا مونث کہیں نظر سے نہیں گزرا البتہ شاہ رفیع الدین دہلوی قدیم مترجم قرآن کے ترجمہ قرآن مجید کے ایک ایڈیشن میں السارقۃ کے لئے لفظ چورنی نظر سے گزرا۔
>
> شاہ صاحب کا شمار اہل زبان میں ہے، اس لئے تنہا ان کی سند کافی ہے۔ لیکن اگر ایک آدھ سند کہیں اور سے مل جاتی تو دل کو مزید اطمینان ہو جاتا۔ پھر یہ امر بھی کچھ کم حیرت انگیز نہیں کہ شاہ صاحب کے ترجمہ کے میں نے پانچ مختلف ایڈیشن دیکھے، مگر یہ لفظ صرف ایک ایڈیشن میں ملا۔ اور یہ ایڈیشن تاج کمپنی (لاہور و کراچی) کا مطبوعہ چھوٹی حمائل کی صورت میں ـــــــ''

شعر و شاعری:

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ ـــــــ ممتاز صحافی، عظیم المرتبت ادیب اور جلیل القدر مفسر قرآن کی حیثیت ہی سے زیادہ مشہور ہوگئے۔ حالانکہ وہ نہ صرف شاعر تھے بلکہ ایک شاعر گر بھی تھے۔ یہ بات ضرور ہے کہ ان کے نثری سرمایوں کے مقابلے میں ان کا شعری سرمایہ کوئی زیادہ نہیں ہے۔ لیکن جو کچھ ہے اسے کلیۃً نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ آپ کے اشعار میں وہ تمام فنی خوبیاں موجود تھیں جو اچھے اشعار میں ہوا کرتی ہیں۔

مولانا دریابادیؒ نے اپنی شاعری کے بارے میں ''آپ بیتی'' کے چالیسواں باب میں ''شاعری یا تک بندی'' کے عنوان سے لکھا ہے کہ:

> ''شاعری کہئے یا تک بندی اس کا تھوڑا بہت خبط بچپن ہی سے سر میں سمایا ہوا تھا، ٹوٹے پھوٹے شعر جو ادھر اُدھر کہیں سن پاتا، یا کہیں پڑھ لیتا، بس اکثر ہی یاد

ہو جاتے ،اور انہیں موقع بے موقع پڑھ کر سنا دیا کرتا۔نو دس سال کا سن ہوگا کہ گھریلو تعلیم کے لئے جو مولوی صاحب رہتے تھے،انہوں نے ایک ننھے منے سے مشاعرہ کی طرح ڈالی،ایک چپراسی کو پکڑ کر وحشت بنا دیا۔دوسرے سپاہی کو تخلص دہشت عنایت کیا۔اور کچھ تخلص میرا بھی رکھ دیا۔خود ہی الٹی سیدھی نظمیں ہم سب کی طرف سے کہہ دیتے اور ان تک بندیوں میں جو سب سے بہتر ہوتی، وہ مجھ سے پڑھوا دیتے،میں خوب کڑک کڑک کرا سے پڑھ دیتا۔" (آپ بیتی:۳۱۸)

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اپنی باضابطہ غزل گوئی کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ:

"۱۹۱۴ء ہی تھا کہ خود بھی غزل گوئی شروع کر دی،تازہ و جائز عشق اپنی منگیتر سے پیدا ہو چکا تھا،اس نے محبت کے شاعرانہ جذبات کو بیدار کر دیا۔اور میں دیکھتے ہی دیکھتے غزلوں پر غزلیں کہنے لگا۔یوں معتقد تو اردو کے سب شاعروں سے بڑھ کر غالب کا تھا۔مگر حوصلہ ان کے رنگ میں کہنے کا کبھی بھی نہ ہوا۔کچھ گری پڑی کوشش تقلید کی، اگر کی تو مومن اور حسرت موہانی،شیفتہ،داغ،ریاض و عزیز کی کی۔اور غزلیں جو کہیں وہ زیادہ تر ان ہی کی زمینوں میں۔

تعلقات لکھنؤ،اور جوار لکھنؤ کے بعض مشہور شاعروں سے اچھے خاصے تھے مثلاً ریاض،حسرت،عزیز و ثاقب سے لیکن اپنے طبعی شرمیلے پن کا یہ عالم تھا کہ ان لوگوں کے سامنے کوئی شعر تو کیا پڑھتا۔

ان پر بھی ظاہر ہی نہ ہونے دیا کہ میں بھی الٹی سیدھی قافیہ پیائی کر لیتا ہوں۔ہاں آخر میں حضرت اکبر سے بیتابانہ کھل گیا تھا۔ان کی خدمت میں کبھی اپنی کوئی غزل اصلاح کی غرض سے بھیج دیتا۔اکثر تو حضرت بس حوصلہ افزائی ہی کے کلمے لکھ کر انہیں واپس کر دیا کرتے تھے۔اور کبھی ایک آدھ لفظ بدل دیتے،ایک بار ایک بات بڑی نکتہ کی لکھ بھیجی،سب کے کام آنے والی،فرمایا کہ غزل کہہ کر بس رکھ لیا کیجئے،اور کچھ دن بعد اسے اٹھا کر دیکھئے تو خود ہی اپنے کلام کی خامیاں نظر آ جائیں گی،یہ بات دل میں اتر گئی،ورنہ کہتے وقت تو اپنا مہمل سے مہمل شعر بھی اپنے کو خوش نما اور جاندار ہی نظر آتا ہے۔" (ص:۳۲۲)

مولانا دریابادیؒ غزل گو بھی تھے اور نعت گو بھی تھے۔ آپ کی غزلوں اور نعتوں کا مجموعہ حکیم عبدالقوی دریابادی مرحوم نے ''تغزل ماجدی'' کے نام سے آپ کی وفات کے بعد ۱۹۷۹ء میں شائع کیا تھا، اس مجموعہ میں مولانا دریابادیؒ کی بہت سی غزلیں شامل نہ ہوسکی ہیں۔ غالبًا حکیم عبدالقوی مرحوم کے علم میں نہ ہوں گی۔ورنہ حکیم صاحب ضرور شامل کر لیتے۔

آپ کی شاعری کو پروان چڑھانے میں حکیم شاعر حضرت اکبرالہ آبادی مرحوم کی حوصلہ افزائیوں اور کلمات تحسین کا بڑا دخل رہا ہے۔

آپ اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں اپنے اشعار بغرض اصلاح حضرت اکبر کی خدمت میں بھیج دیا کرتے تھے۔ حضرت اکبر توصیفی کلمات لکھ کر واپس کر دیا کرتے تھے۔ مولانا دریابادیؒ نے اپنی پہلی غزل حضرت اکبر کی خدمت میں بھیجی تھی۔ جس میں یہ ایک جاندار شعر بھی تھا۔

رہی ہر چند عقل صبر آموز
نہ گئیں بے قراریاں نہ گئیں

اسی شعر کی خاصی داد دیتے ہوئے حضرت اکبر نے لکھا تھا، آپ کی غزل دیکھ کر بہت خوش ہوا، یہ شعر ہر اعتبار سے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔

رہی ہر چند..........

کیا خوب کہا ہے۔ آپ انشاءاللہ بڑی باطنی ترقیاں حاصل کریں گے۔(خطوط مشاہیر ص:۱۷۷)

حضرت دریابادیؒ نے ایک دوسری غزل بغرض اصلاح حضرت اکبر کی خدمت میں ارسال کی تھی جس کا مطلع تھا:

جانبازیوں کو خبط سے تعبیر کر چلے
تم یہ تو خوب عشق کی توقیر کر چلے

اس شعر کو پڑھ کر حضرت اکبر پھڑک گئے تھے۔

مولانا دریابادیؒ کو لکھا تھا:

آپ کی غزل دیکھ کر تعجب کم ہوا، اور زیادہ خوشی ہوئی۔ تعجب اس بات کا کہ ابتدا ہی میں ایسے کھرے شعر آپ کہنے لگے تعجب میں کمی اس لئے کہ اچھی فطری سمجھ اور علم نے آپ کی طبیعت کو معنی کا عمدہ سانچا بنا دیا ہے۔ نقص وزیادت کو دخل نہیں۔ خوشی اس بات کی کہ ان خیالات کو میں نے پسند کیا طریقہ اظہار بھی خوب ہے..........۔

(خطوط مشاہیر ص:۱۰۲)

اس کے علاوہ متعدد خطوط میں حضرت اکبرالہ آبادی مرحوم نے مولانا دریابادیؒ کے اشعار کی تعریف کی ہے اور ان کے مرتبہ ومقام کا تعین کیا ہے۔

مولانا دریابادیؒ کی ایک غزل کے چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ فرمائیں۔

مجھ کو تو خیر غیر سے تھیں بدگمانیاں — یہ کیا ہوا کہ آپ بھی شرما کے رہ گئے

ترکیب سیرت بشری کچھ عجیب ہے — یعنی وفا بھی اس بت پیماں شکن میں ہے

اس قدر محویت معاذ اللہ — ان کے آنے کی بھی خبر نہ ہوئی

اسی طرح مولانا دریابادیؒ کی کہی ہوئی نعت کے چند اشعار مولانا دریابادیؒ کے ماضی وحال کے تناظر میں ملاحظہ فرمائیں۔

اک عمر کی گمراہی، اک عمر کی سرتابی — جز تیری غلامی کے آخر نہ مفر پایا

حکمت کا سبق چھوڑا، عزت کی طلب چھوڑی — دنیا سے نظر پھیری سب کھو کے تجھے پایا

مولانا دریابادیؒ بحیثیت ماہر فلسفہ ونفسیات:

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ جہاں اسلامی علوم وفنون کے شناور تھے وہاں فلسفہ ونفسیات کے بھی رمز شناس تھے۔ آپ کے متعلق یہ فیصلہ بے حد مشکل ہے کہ آپ کو فلسفہ سے زیادہ مناسبت تھی، یا نفسیات سے بعض اہل علم کا خیال ہے کہ آپ کو فلسفہ کے مقابلے میں نفسیات سے زیادہ گہری مناسبت تھی۔

مگر سچ یہ ہے کہ آپ کو نوعمری ہی سے دونوں موضوعات سے شغف خاص تھا۔ اور دونوں موضوعات کے تعلق سے آپ اپنے مخصوص خیالات ونظریات رکھتے تھے۔ اور بحیثیت ماہر فلسفہ ونفسیات مشہور زمانہ تھے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی صاحب نے مولانا دریابادیؒ کی فلسفہ شناسی پر ایک شاندار مقالہ تحریر کیا ہے۔ جو فلسفیانہ مصطلحات ونظریات کے ساتھ مولانا دریابادی کے فلسفیانہ خیالات وتصورات کا بھی احاطہ کرتا ہے اور یہ مقالہ کتاب میں شامل ہے۔ اس وجہ سے اس کی موجودگی میں اس عنوان پر مزید لکھنا غیر ضروری محسوس ہوتا ہے۔

البتہ جہاں تک نفسیات کا تعلق ہے اس موضوع پر بھی مولانا دریابادیؒ کے مستقل خیالات ونظریات موجود ہیں۔ نفسیات سے تو آپ کو خاص مناسبت بھی تھی۔ اور یہ مناسبت زمانہ طالب علمی ہی سے تھی۔ چنانچہ مولانا دریابادیؒ نے ابتدائی دور ہی میں نفسیات کے موضوع پر دو کتابیں

اردو میں فلسفۂ جذبات اور فلسفۂ اجتماع کے نام سے لکھیں اور ایک کتاب انگریزی میں ''سائکالوجی آف لیڈرشپ'' کے نام سے تحریر فرمائی۔ فلسفۂ جذبات ۱۹۱۴ء میں شائع ہوئی جس میں نفسیات کی تعریف، اس کی افادیت، اس کی تحصیل کے لزوم، عملی زندگی میں کامیابی کے لئے نفسیات دانی کی ضرورت اور دوسرے نفسیاتی مسائل زیر بحث آئے ہیں۔

مولانا دریابادیؒ کی دوسری کتاب فلسفۂ اجتماع ہے۔ جو ۱۹۱۵ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہوئی۔ اور ہنگامہ خیز ثابت ہوئی۔ اور تیسری کتاب سائکالوجی آف لیڈرشپ ہے جو ۱۹۱۵ء میں منصۂ شہود پر آئی، یہ تینوں کتابیں نفسیات کے مسائل وقضایا پر مشتمل ہیں۔

یہ تینوں کتابیں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے مخصوص دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ مراجعت اسلام کے بعد مولانا دریابادیؒ ان کتابوں سے خوش نہیں تھے۔ بعض کتابوں کو اپنی فہرست تصانیف سے بھی خارج کر چکے تھے۔ حالانکہ وہ ماضی میں ان کتابوں پر فخر کیا کرتے تھے۔ اور آخر میں نادم وشرمسار تھے۔ مولانا دریابادیؒ آپ بیتی میں لکھتے ہیں کہ:

> ''..... اور کئی برس بعد جب ہوش آیا اور از سرنو مشرف بہ اسلام ہوا، تو سب سے پہلے اس گندی کتاب پر لاحول پڑھی، اور اعلان کے ساتھ اس فلسفۂ اجتماع، کو اپنی فہرست تصنیفات سے خارج کر دیا۔ اللہ سے پناہ مانگتا ہوں، اس کتاب اور اس دور کے دوسرے کفریات سے۔'' (آپ بیتی: ص: ۲۷۸)

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اور تفسیر ماجدی:

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ جامع العلوم والفنون بزرگ تھے۔ موصوف اپنی دقت نظری، وسعت مطالعہ اور تبحر علمی کی بنا پر اپنے معاصرین میں بلند مقام رکھتے تھے، آپ کے علمی، تخلیقی اور تحقیقی کارناموں کا دائرہ بڑا وسیع تھا، آپ نے مختلف النوع موضوعات پر کام کیا ہے۔ اور ان کا حق بھی ادا کیا ہے۔ لیکن آپ کے علمی کارناموں کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا خاصا مشکل کام ہے کہ آپ کا سب سے بڑا علمی کارنامہ کیا ہے، اس بارے میں آپ کے تذکرہ نگاروں کے نقطۂ ہائے نظر مختلف ہیں۔ لیکن ان میں زیادہ تر تذکرہ نگاروں کا خیال ہے کہ آپ کا شاہکار کارنامہ انگریزی اور اردو تفسیر ماجدی کی تصنیف ہے۔ انگریزی تفسیر ماجدی کی ترتیب وتحقیق میں جہاں خود مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے علمی ودینی رجحان کا دخل تھا۔ وہاں ان کے خوابیدہ جذبہ کو برانگیختہ کرنے میں مولانا سراج الحق مچھلی شہری خلیفہ مولانا تھانویؒ نے اہم رول ادا کیا، مولانا

سراج الحق مچھلی شہری خانقاہ تھانہ بھون میں مقیم تھے۔ اسی دوران مولانا عبدالماجد دریابادیؒ خانقاہ تھانہ بھون میں تشریف لائے مولانا سراج الحق مچھلی شہری مولانا دریابادیؒ کے علم وفضل اور انگریزی زبان میں درک وکمال سے واقف تھے، انہوں نے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کو ایک ایسی انگریزی تفسیر قرآن لکھنے کی ضرورت کا احساس دلایا، جو جمہور امت کے عقائد کے مطابق ہو، چنانچہ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے ۱۹۳۳ء کے اواخر میں اس عظیم الشان کام کا آغاز کیا۔ اور ۱۵/اگست ۱۹۳۹ء کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا، لیکن بعض ناقابل بیان وجوہ کی بنا پر انگریزی تفسیر ماجدی ۱۹۶۱ء میں تاج کمپنی لاہور سے طبع ہوسکی۔

اس تفسیر کی تدوین وتصنیف میں جہاں آپ نے اپنے متقدمین انگریزی ترجمہ نگاروں کے تراجم وتفاسیر سے مدد لی ہے۔ وہاں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تفسیر بیان القرآن سے بھی بھرپور اخذ واستفادہ کیا۔ اور اس میں بیان کردہ نکات ومعارف کو ''مرشد تھانویؒ'' کے محبت آمیز عنوان سے لکھا۔ اور قرآن کریم کے بعض مقامات کے اشکالات کی تفہیم کے لئے مراسلت بھی کی تھی۔ تھانہ بھون میں قیام کے دوران زبانی گفتگو بھی رہتی۔ جن کی جھلکیاں حکیم الامت: نقوش وتاثرات میں جگہ جگہ نظر آتی ہیں۔

غرضیکہ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی انگریزی اور اردو تفسیر ماجدی پر مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تفسیر بیان القرآن کا گہرا اثر ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے اس کے اعتراف کرنے میں ادنیٰ تامل نہیں کیا۔ بلکہ کھلے دل سے اس کا اقرار واعتراف کیا ہے۔

پروفیسر تحسین فراقی صاحب نے لکھا ہے:

> ''ماجد (مولانا عبدالماجد دریابادی) انگریزی پر حاکمانہ عبور رکھنے کے علاوہ عربی سے بھی کافی واقفیت رکھتے ہیں۔ ان کا نقطۂ نظر کہیں بھی معذرت خواہی سے آلودہ نہیں ہوتا اور انہوں نے تفسیر نگاری میں کہیں بھی ادعائیت یا متکبرانہ تفسیر بالرائے سے کام نہیں لیا اور مستند مفسرین امت کے استناد واستشہاد کرنے کے علاوہ قرآنی اعلام ومقامات کے باب میں جدید ترین معلومات مہیا کردی ہیں علاوہ ازیں ان کو مذاہب عالم اور خصوصاً یہودیت، عیسائیت اور ان کے اہم علمی کارناموں سے حیرت انگیز واقفیت ہے، علاوہ ازیں مفسر کے لئے صنفیات، حیاتیات، طب، معاشیات، جدید نفسیات، تاریخ عالم عقیقیات واثریات اور بشریات جیسے علوم پر گہری نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ اور تفسیر

ماجدی انگریزی سے ان علوم پر ماجد کی قابل اطمینان نظر کے چند ایک نہیں، متعدد ثبوت ملتے ہیں۔" (مولانا عبدالماجد دریابادی احوال وآثار ص:۵۸۷)

ڈاکٹر تحسین فراقی صاحب مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی انگریزی تفسیر ماجدی کی فنی خصوصیات وامتیازات کے بیان کے بعد انگریزی تفسیر ماجدی او مستشرقین مترجمین ومسلم انگریزی ترجمہ نگاروں کے تراجم وتفاسیر کا تقابلی موازنہ کرتے ہوئے، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے جرأت مندانہ اسلوب اور غیر معذرت خواہانہ بیان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"ماجدی تفسیر کی ایک بڑی خوبی اس کا غیر معذرت خواہانہ انداز ہے۔ انگریزی میں ترجمہ وتفسیر کرنے والوں کی ایک عمومی کمزوری یہ رہی ہے کہ ان کے سامنے مغرب کے عقلیت پرست قاری ہوتے ہیں اس لئے جنت، دوزخ، حور، غلمان، نہر، لبن، وعسل کا ذکر کرتے وقت ان پر مرعوبیت چھا جاتی ہے۔ ان کو مجازی تعبیر کہہ کر ٹال دیتے ہیں یا سرسید، مفتی محمد عبدہ اور موجودہ مفسرین میں محمد اسد کی طرح اپنے دین سے شرمسار نظر آتے ہیں۔ لیکن مولانا دریابادیؒ ایک مومن صادق کی طرح بلکہ امام غزالیؒ کی طرح ایمان عجائز الحسی (محلّہ کی بڑی بوڑھیوں کا جیسا ایمان) کی طرح سر اٹھا کر پورے شوق واعتماد کے ساتھ ان حقائق کو بیان کرتے ہیں۔ اور ان پر اپنے ایمان وایقان کا اظہار بھی فرماتے ہیں۔ ملاحظہ ہو سورۂ دھر کی آیت "وَ اِذَا رَاَیْتَ ثَمَّ رَاَیْتَ نَعِیْمًا وَّ مُلْكًا كَبِیْرًا" اور بہشت میں جہاں آنکھ اٹھاؤ گے، کثرت سے نعمت اور عظیم الشان سلطنت دیکھو گے۔" اس کا ترجمہ دینے کے بعد فٹ نوٹ پر لکھتے ہیں:

"So beautiful and fair-Complexioned are they!"

"اس درجہ حسین اور آراستہ ہیں یہ"، جب کہ دوسرے مفسرین محمد اسد اور محمد علی سب اس طرح کی آیات کو ہر موقع پر "Symbolism of the Joys" کہہ کر منھ چھپانا چاہتے ہیں۔ (مولانا عبدالماجد دریابادی احوال وآثار ص:۵۸۹ بحوالہ ڈاکٹر مولانا عبداللہ عباس ندوی تفسیر ماجدی (انگریزی) کا ایک مطالعہ)۔

تفسیر ماجدی انگریزی کے بعد مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے اردو تفسیر ماجدی کی تصنیف شروع کی یہ تفسیر ۱۹۴۴ء میں مکمل ہوگئی تھی اور ۱۹۶۲ء میں شائع ہوئی۔ اس اردو تفسیر کا اسلوب اور طریق کار بھی انگریزی تفسیر کا ساتھا۔ لیکن اردو تفسیر قدرے تفصیل سے لکھی گئی ہے۔ ترجمے میں

مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تفسیر بیان القرآن سے بڑی مدد لی گئی ہے۔ فقہی مسائل میں بھی بیان القرآن سے استفادہ کیا گیا ہے۔ جس کا اعتراف مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے بھی کیا ہے! کیوں نہ کرتے مولانا دریابادی تھے بھی مولانا اشرف علی تھانویؒ کے عشاق میں! ترجمے اور بالخصوص تفسیری نکات اور تصوف کے مسائل کے بیان کے دوران عموماً ''مرشد تھانوی'' سے خطاب کیا ہے۔ اس کے علاوہ تفاسیر میں حضرت ابن عباسؓ کی تفسیر تنویر المقیاس، امام طبری کی تفسیر ابن جریر الطبری، جار اللہ زمخشری کی تفسیر الکشاف، عبداللہ بن عمر البیضاوی کی انوار التنزیل ابوالبرکات النسفی الحنفی کی مدارک التنزیل، علامہ ابن کثیر کی تفسیر ابن کثیر۔ علامہ فخر الدین الرازی کی تفسیر مفاتیح الغیب (تفسیر کبیر) شیخ ابن حیان کی البحر المحیط، شیخ ابن حیان کی النہر للعیط، ابن قتیبہ کی القرطین مولانا تھانویؒ کی بیان القرآن، فتح محمد تائب لکھنوی کی خلاصۃ التفاسیر، ثناء اللہ پانی پتی کی اردو ترجمہ تفسیر مظہری، امیر علی ملیح آبادی کی تفسیر مواہب الرحمٰن، علامہ قرطبی کی تفسیر الجامع لاحکام القرآن، علامہ آلوسی کی روح المعانی، قرآنی احکام ومسائل میں ابن العربی کی احکام القرآن، امام جصاص الرازی الحنفی کی احکام القرآن، لغات وقوامیس میں علامہ راغب الاصفہانی کی غریب القرآن، لسان العرب، تاج العروس، وجوہ اعراب الفرقان، المعروف بہ اعراب القرآن، اورلین کی مدالقاموس سے بھر پور استفادہ کیا گیا ہے۔ اوران کے حوالے درج ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے بڑی عرق ریزی وجگر کاوی سے یہ اردو اور انگریزی تفسیریں تصنیف کی ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی تفسیر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ مولانا متقدمین ومتاخرین مفسرین کی تفسیری آراء اور لغات وقوامیس سے ذرا بھی انحراف نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ ان کا طریق کار اور اسلوب بیان یہ ہوتا ہے کہ پہلے آیت کا ترجمہ وتفسیر اور لغوی تحقیق سلیس وشگفتہ زبان میں لکھتے ہیں پھر اسی ترجمہ وتفسیر اور لغت کی عربی عبارتیں مع حوالوں کے درج کر دیتے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں تفسیر ماجدی کا مطالعہ کرنے سے انسان کے سامنے زیر مطالعہ آیت کے متعلق عربی کی قدیم تفاسیر اور لغات کی عبارتیں موجود ہو جاتی ہیں، جس کی وجہ سے قرآن فہمی وقرآن شناسی میں بڑی مدد ملتی ہے۔ پھر مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے اسلوب بیان اور طرز نگارش کا کیا کہنا۔ قرآن کے مفاہیم ومطالب ذہن نشین ہو جاتے ہیں۔

تفسیر ماجدی انگریزی واردو کے علاوہ قرآنیات سے متعلق آپ کی متعدد کتابیں ہیں۔ مثلاً

مسائل وقصص، حیوانات قرآنی، ارض القرآن، اعلام القرآن، بشریت انبیاء اور مشکلات القرآن وغیرہ۔ یہ سب کتابیں عموماً تفسیر ماجدی کے بطن وشکم سے نکلی ہوئی ہیں، مگر ان کی علیحدہ اشاعت سے ان کی افادیت میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا ہے اللہ تعالیٰ مولانا دریابادیؒ کی تفسیری خدمات کو قبول فرمائے۔

مولانا دریابادیؒ اور تصوف:

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ ایک علمی صوفی خاندان کے چشم وچراغ تھے، آپ کے بزرگوں میں مخدوم شیخ محمد آبکشؒ (متوفی ۱۹۷۵ء) بلند پایہ صوفی اور شیخ طریقت تھے خود مولانا عبدالماجد دریابادیؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ کے مرید اور حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ترتیب یافتہ وفیض یافتہ تھے۔ جس کا ذکر حکیم الامت: نقوش وتاثرات میں ملتا ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اگر چہ موجودہ اصطلاحی معنوں میں صوفی نہیں تھے۔ لیکن فکر ونظر اور عمل کے اعتبار سے صوفی کامل واکمل تھے اور قرآنی احکام کی پابندی اور سنت نبوی کی پیروی میں فرد فرید تھے۔ مولانا دریابادیؒ نہ خود سنت کے خلاف کرتے تھے۔ اور نہ خلاف سنت امور کو دیکھ کر خاموش رہ سکتے تھے۔ اس سلسلہ میں بڑے بڑے قلمی معرکے ہوئے ہیں۔ مولانا کی یہی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔

مولانا دریابادیؒ کو تصوف کے مسائل ونظریات پر گہری نظر تھی، آپ قدیم وجدید اصطلاحات تصوف اور تصوف کے متعلق مستشرقین کی تحریروں اور ان کے رویوں سے بھی خوب باخبر تھے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی پہلی تحریر ''حکمائے مغرب اور فلسفۂ تصوف'' ہے۔ جو ۱۹۲۱ء میں ماہنامہ معارف اعظم گڑھ میں شائع ہوئی تھی۔ جس میں مغربی حکماء کے صوفیانہ نظریات وخیالات کی وضاحت کی گئی ہے۔ وحی، الہام، مراقبہ، مکاشفہ، اور اصلاح باطن اور ان کے افکار وآراء کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔ مولانا دریابادیؒ کا خیال ہے کہ مغربی حکماء محض ارباب قال ہیں۔ جن کے نزدیک ہندوؤں کے قدیم ترین یوگ سے لے کر زمانہ حال کے طریقۂ استحضار ارواح تک تمام عجائب وغرائب پر تصوف کا یکساں اطلاق ہوسکتا ہے۔ (معارف فروری ۱۹۲۱ء ص: ۱۰۰)

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے مغرب کے حکماء اور اساتذہ نفسیات اور مشرق کے صوفیا ومشائخ کے خیالات ونظریات کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے۔ ''حکمائے مغرب اور فلسفۂ تصوف'' کے علاوہ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی ایک اہم تصنیف تصوف اسلام ہے۔ جو ۱۹۲۵ء میں لکھی گئی

تھی۔ جس میں صوفیائے اسلام اور مشائخ طریقت کے صوفیانہ افکار ونظریات کا خلاصہ اور نچوڑ ہے۔ تصوف اسلام جب پہلی دفعہ ہندوستان میں شائع ہوئی تو اہل علم کے حلقوں میں کافی چرچا ہوا اور ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔ علمائے ہند اور صوفیائے ہند کے علاوہ کیمبرج یونیورسٹی کے مشہور مستشرق نکلس نے بھی ایک خط میں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کو مبارکباد دیتے ہوئے لکھا تھا کہ:

''یہ طلبۂ تصوف کے لئے ایک نہایت مفید مقدمہ ہے۔''

مولانا عبدالماجدؒ اور صحافت:

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ ایک عظیم صحافی تھے، ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری نے انہیں ''اردو کا ادیب اعظم'' کہا تھا، حقیقت تو یہ ہے کہ وہ صحافت کے شہنشاہ اعظم تھے۔ مولانا نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز ہفت روزہ ''سچ'' کے اجراء سے کیا تھا ''سچ'' اردو صحافت کی تاریخ میں اہم مقام رکھتا ہے۔ ''سچ'' کا پہلا شمارہ ۱۹۲۵ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ ظاہر بات ہے ''سچ'' زیادہ عرصہ حجاب میں نہیں رہ سکتا تھا۔

ابتداءً ہفت روزہ ''سچ'' کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ظفر الملک کا نام آیا تھا۔ لیکن اگست ۱۹۲۵ء کے شمارے میں مدیر ''سچ'' کے طور پر مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کا اسم گرامی درج ہو گیا اور ظفر الملک صاحب منیجر منتخب ہوئے۔

ہفت روزہ ''سچ'' کے سرورق پر یہ فارسی شعر مرقوم ہوتا تھا۔

راستی موجب رضائے خداست، کس ندیدم کہ گم شد از راہ راست (سعدیؒ)

''سچ'' حق وانصاف کا ترجمان اور غلبۂ فکر اسلامی کا علمبردار تھا، ''سچ'' نے بڑے بڑے ادبی معرکے سر کئے، اور اس کے صفحات پر قلمی مناظرے اور مباحثے ومناقشے کی تاریخ رقم ہوتی رہی ہے۔ کبھی مولانا ابوالکلام آزاد سے حظ وکرب یا لذت والم کی اصطلاحات پر بحث ہوتی تھی۔ کبھی ''نگار'' فتنۂ روزگار سے جنگ چھڑی ہوتی تھی۔ کبھی مولانا محمد علی جوہر کو فاسق ویزید کہنے پر خواجہ حسن نظامی مرحوم کو نصیحت کی جاتی تھی کہ ایک خادم اسلام اور عاشق اسلام کو فرعون ''نمرود'' اور ''یزید'' کے نام سے یاد کرنا نہ حضرت بابا فریدؒ کا طریقہ تھا نہ حضرت محبوب الٰہی کا، کبھی ڈاکٹر ذاکر حسین خان پر، کبھی مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے طریق کار اور فکر واجتہاد پر طنز ومزاح کے نشتر چلائے جاتے تھے۔ کبھی یگانہ چنگیزی کے خلاف محاذ آرائی کی جاتی تھی۔ کبھی امہات الامہ کی دوبارہ اشاعت سے باز رکھنے کی جدوجہد کی جا رہی تھی۔ کبھی ''انگارے'' کی فحش نگاری پر تنبیہ کی جاتی تھی۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کا بڑا جمہوری انداز تھا۔ وہ مسئلہ کو عوامی عدالت میں پیش کرنے کے فن سے واقف تھے۔ ان تمام معرکوں اور مجادلوں میں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی کامیابی وکامرانی کا واحد سبب یہی تھا، وہ ان مسائل پر اس تفصیل سے اور زورِ قلم کی شدت سے لکھتے تھے کہ بالآخر وہ مسئلہ عوامی بن جاتا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ عوامی سیلاب کو روکنا کوئی آسان کام نہ تھا۔

پروفیسر تحسین فراقی صاحب لکھتے ہیں:

> ''سچ'' کو اپنی زندگی میں بڑی بڑی لڑائیاں لڑنی پڑیں، اصلاح معاشرہ، رد بدعات، تجدد اور ترقی پسندی کی مخالفت اس کے چند موضوعات تھے، فتنۂ انکار حدیث کا مقابلہ بھی سچ نے خوب کیا۔ ۳۲۔۱۹۳۱ء میں نیاز فتح پوری کی تیسرے درجے کی ''عقل پرستی'' اور مابعد الطبیعیاتی مسائل کی ٹھیٹھ عقلی تعبیرات کے خلاف ''سچ'' نے ایک محاذ ان کے خلاف قائم کیا، ساتھ ہی نظریۂ خلافت کی تبلیغ بھی ''سچ'' کا مشن رہا۔ اور ماجد کا خلافت کے سلسلے میں موقف یہ رہا کہ تحریک خلافت کی ناکامی کا مطلب خلافت کے مشن کی ناکامی نہیں، اور خلافت ایک محدود اصطلاح نہیں ایک ہمہ گیر پروگرام ہے۔ ''سچ'' کی زبان پر بھی عوامی رنگ غالب تھا۔''

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ ''سچ''، ''صدق'' اور ''صدق جدید'' میں ''سچی باتیں'' کے عنوان سے مستقل طور پر لکھتے تھے۔ اور یہ سلسلہ زریں وصال کے چند سال قبل تک جاری رہا ہے۔ مولانا مغربی تہذیب اور اس کے مضر اثرات سے بھی ہندوستانیوں کو متنبہ کرتے رہتے تھے۔ اور مغرب کے خود ساختہ تہذیبی افکار و نظریات پر بھی تنقیدیں کرتے تھے۔ اور اپنی اسلامیت و مشرقیت پر جمنے کی تلقین بھی کرتے رہتے تھے۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اپنے عہد کے ایک دلیر و مجاہد صحافی تھے، جو شریعت و طریقت کے تحفظ کے لئے آخر دم تک یگانوں و بیگانوں سے مصلحت و مصالحت سے بلند ہو کر لڑتے رہے۔ اور امت کی سربلندی کے لئے کوشاں رہے۔

تنقید نگاری:

مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم ایک ممتاز نقاد اور ماہر لسانیات بھی تھے۔ ان کا تنقیدی شعور بڑا پختہ و مستحکم تھا ان کی تنقیدی صلاحیت کو پروان چڑھانے میں شبلی کے نظریۂ تنقید اور طرزِ تحریر کا خاصا دخل رہا ہے۔ مولانا دریابادی، حالی، شبلی، آزاد اور امداد امام اثر سے متاثر تھے۔ وہ مولانا حالی کی طرح شعر و ادب میں سادگی، صفائی اور سلاست کے خواہشمند تھے اور گل و بلبل کی شاعری سے

متنفر تھے اسی طرح ادب کے افادی اور اخلاقی تصور کے قائل تھے۔

مولانا دریابادیؒ کچھ عرصہ تک مغربی نظریہ تنقید اور فلسفہ کا دلدادہ رہے، پھر کچھ ہی دنوں کے بعد مغربی نظریہ تنقید کو سڑک کا ''غل غباڑہ'' کہہ کر مسترد کردیا تھا اور مشرقی نظریہ تنقید وفلسفہ کو اوڑھنا بچھونا بنالیا تھا۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی خصوصیات تنقید کا ذکر کرتے ہوئے مشہور نقاد ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

''مولانا عبدالماجد پر مذہب کا اثر بڑا گہرا ہے۔ وہ بغیر مذہب کا سہارا لئے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھتے ہیں، مذہب کے اسی گہرے اثر کا نتیجہ ہے کہ وہ ایسی باتوں کی طرف زیادہ راغب ہوتے ہیں جن کی نوعیت ماورائی اور مابعد الطبیعیاتی ہوتی ہے۔ وہ ہر چیز کا رشتہ عالم بالا سے جوڑنا چاہتے ہیں؟ چنانچہ یہ خصوصیت ان کے نظریۂ شاعری میں بھی نظر آتی ہے .... مذہب چونکہ ان کے نزدیک زندگی کی اعلیٰ اقدار کا حامل ہے۔ اس لئے شاعری کے متعلق ان کا یہ خیال کچھ تعجب انگیز نہیں''۔

(اردو تنقید کا ارتقاص: ۲۹۳، ۲۹۴)

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ چونکہ ایک مذہبی عالم تھے، اسی مذہبیت کی وجہ سے ان کے تمام تر تنقیدی وادبی کارناموں کو لائق اعتنا تصور نہیں سمجھا جاتا رہا ہے۔ خود ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب کی نگاہ میں ان کی مذہبیت کھٹکتی ہے، مگر جہاں تک مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی علمی وسعت، تبحر علمی اور تنقید کے شعور کا سوال ہے تو وہ بلاشبہ اپنے معاصرین میں بلند مرتبہ تھے۔

افسوس ہے کہ آپ کے تنقیدی کاموں کا ابھی تک بھرپور جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ آپ کے تنقیدی شعور وعرفان کا مطالعہ کیا جائے اور آپ کے مرتبہ ومقام کا تعین کیا جائے۔

ڈرامہ نگاری:

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے مختلف اصناف ادب پر قلم اٹھایا ہے۔ آپ نے نوعمری میں ڈرامے بھی لکھا ہے، جس کا ذکر آپ بیتی میں موجود ہے۔ آپ کے ڈرامے زود پشیمان کا ۱۹۱۶ء میں طبع ہوا تھا۔ جس پر سید سلیمان ندوی، عبدالحلیم شرر، مرزا ہادی رسوا، اور سید سجاد حیدر یلدرم کے دیباچے بھی موجود ہیں۔ ڈرامہ نگاری کی حیثیت سے ناظر بی، اے نام درج ہے۔ جو مولانا عبدالماجد دریابادی کا تخلص تھا۔

اس کے علاوہ ایک ڈرامہ ''بدسرشت'' کے نام سے بھی لکھنا شروع کیا تھا لیکن ڈرامہ مکمل نہ ہوسکا۔ ڈاکٹر محمد حسن سابق پروفیسر جواہر لال نہرو یونیورسٹی نے ایک دفعہ مولانا دریابادیؒ سے ''زود پشیمان'' کو اسٹیج کرنے کی اجازت طلب کی تو حیرت واستعجاب کا اظہار کرتے ہوئے مولانا نے لکھا کہ:

''آپ کا خط پاکر آپ کی ستم ظریفی کا قائل ہوگیا۔ تھیٹر کو فروغ دینے کی کوشش میں ترغیب وتحسین کی توقع مجھ دقیانوس ملامد پرصدق سے ع

عشق ومزدوری عشق گہ خسر کیا خوب!

زود پشیمان بالکل نوعمری کی تصنیف ہے اور وہ بھی بڑی حد تک قلم برداشتہ، شیکسپیر کا نشہ اس وقت سوار تھا، اور دو چار کتابیں فن پر الٹی سیدھی پڑھ ڈالی تھیں۔ اب اگر کتاب پر نظر ثانی کروں تو پچاس فیصدی بدل ڈالوں۔ ایسی کتاب کو آپ یاد ہی کیوں دلاتے ہیں۔ جس کے ذکر ہی سے شرمندہ ہوا جاتا ہوں۔ (مکتوبات ماجدی جلد اول ص: ۱۷، ۱۸)

یہی وجہ ہے کہ حکیم عبدالقوی دریابادی مرحوم نے تغزل ماجدی میں لکھا ہے کہ مولانا دریابادیؒ نے اپنے ڈرامے ''زود پشیمان'' کو اپنی فہرست تصانیف سے خارج قرار دیا تھا۔ (تغزل ماجدی ص: ۳)۔ حکیم صاحب کی اس روایت سے زیادہ مستند روایت اور کون سی ہوسکتی ہے۔

دینی وتعلیمی اداروں سے وابستگی:

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ ملک وبیرون ملک کے متعدد علمی تحقیقی اداروں سے وابستہ رہے ہیں۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، دارالمصنفین اعظم گڑھ، (مولانا دریابادی، مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کے پاکستان جانے کے بعد آخر تک صدر رہے) جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، مسلم یونیورسٹی کورٹ علی گڑھ، ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد اور اتر پردیش اردو اکادمی سے گہری وابستگی کے ساتھ رائل ایشیاٹک سوسائٹی (برطانیہ) ارسٹوٹیلین سوسائٹی (برطانیہ) کے ممبر رہے ہیں۔ اور تاحیات ان اداروں کو اپنے گرانقدر مشوروں سے نوازتے رہے۔

اعزازات وانعامات:

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی وسیع خدمات کے صلے میں جو بھی انعامات واعزازات دیئے

گئے ہیں۔ وہ ان کے بلند مراتب سے بدرجہا کم تر ہیں۔ اگست ۱۹۶۶ء میں حکومت ہند کی جانب سے عربی زبان وادب کی خدمات کے صلے میں صدر جمہوریہ ایوارڈ دیا گیا۔ اسی طرح یوپی حکومت نے ان کی تصنیفی خدمات کے اعتراف میں ایک موقر ایوارڈ دیا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۷۴ء میں ہندی اردو ساہتیہ ایوارڈ کمیٹی لکھنؤ نے ادبی اعزاز سے نوازا۔ پھر ۱۹۷۷ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی جانب سے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری صدر جمہوریہ ہند جناب فخر الدین علی احمد صاحب مرحوم کے دست مبارک سے دی گئی تھی۔

مولانا دریابادی کے تعلقات وروابط :

مولانا دریابادیؒ ایک خالص علمی آدمی تھے، لیکن ان کے تعلقات وروابط مختلف الفکر لوگوں سے تھے۔ علماء ومشائخ میں مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا شبلی نعمانیؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا قاری محمد طیبؒ صاحب، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا منت اللہ رحمانی، مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا محمد اویس نگرامی اور مولانا عبدالباری ندوی۔

شعراء وادباء میں حضرت اکبر الہ آبادی، علامہ محمد اقبال، مولانا حسرت موہانی، مولوی عبدالحق، منشی پریم چند، مولانا راشد الخیری، خواجہ غلام الثقلین، عبدالحلیم شرر، شوکت تھانوی اور سیاسی وملی قائدین میں مولانا محمد علی جوہر، مہاتما گاندھی، مولانا شوکت علی، جسٹس مظہر الحق، چودھری خلیق الزماں، راجہ محمود آباد، اندرا گاندھی اور ڈاکٹر ذاکر حسین خاں سے گہرے تعلقات ومراسم رہے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے علماء ومشائخ شعراء وادبا اور سیاسی زعماء سے بھی مخلصانہ روابط وتعلقات تھے۔

عطاء الرحمٰن قاسمی

چیئرمین

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادیؒ

مولانا سید انظر شاہ کشمیری ☆

مشہور انشاء پرداز، ادیب طناز، مفسر، مورخ، بزرگ صحافی، حضرت تھانویؒ کے مجاز تحریک خلافت کے مضبوط رکن، رئیس الاحرار محمد علی جوہر کے ہم نشین حق گو، حق پسند، انشاء میں بے مثل، طنز میں لاجواب، چند جملوں میں مقابل وحریف کے چھکے چھڑا دیتے، ان کا قلم، رفیع سودا کی شاعری تھی، بگڑتے تو منانا مشکل، نامور صحافی ان سے پناہ مانگتے، حیات اللہ انصاری مرحوم کے خلاف لکھنا شروع کیا تو اس چاق وچوبند صحافی نے لکھا کہ آپ کو میرے خلاف جو لکھنا ہے ایک بار لکھ دیجئے، یہ جو آپ زہر کی بوند، بوند ٹپکاتے ہیں میری برداشت سے باہر ہے۔

اپنے شیخ اول حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی ''نقش حیات'' پر تبصرہ کیا کہ میں تو منتظر تھا کہ علم شریعت پر حاوی تصنیف قلم مبارک سے تیار ہوگی یہ تو کتاب السیاسۃ ہے جو آپ کے قلم نے تیار کی۔ صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی بعض خامیوں پر بولے، تو ایک طوفان تھا جو ادھر سے ادھر نکل گیا۔ پاکستان کے چند روزہ سفر میں شورش کاشمیری مدیر ''چٹان'' نے پرتکلف دعوت کی مرحوم کو اس میں اسراف نظر آیا اپنے سفرنامہ میں تنقید کی، شورش نے جواباً لکھ دیا کہ آپ کے خلاف یہ لکھوں گا۔ وہ لکھوں گا جواب دریابادی مرحوم کا قرآن کریم کی ایک آیت تھی لئن بسطت الی الخ بس اس جواب لاجواب پر ساری شورش ختم ہوگئی۔

اکبر الہ آبادی نے دھیرے دھیرے اصلاح شروع کی جس کی انتہا حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کے دامن تربیت وتجدید سے وابستگی والہانہ تعلق ونسبت مع اللہ کی سند، اجازت تھی وہ صرف دو شخصیتوں کے ''مرید باصفا'' تھے۔ محمد علی جوہر اور حضرت تھانویؒ، سفرنامہ حجاز، نقوش وتاثرات، تفسیر وغیرہ علمی شاہ کار بطور یادگار چھوڑے، ذاتی جریدہ پہلے ''سچ'' پھر ''صدق جدید'' دیکھنے میں

☆ شیخ الحدیث دارالعلوم وقف دیوبند

بدزیب، لیکن ایک دنیا اس کا انتظار کرتی۔ اوران کے البیلے انداز، طنز کے چبھتے ہوئے نشتر قلم کی تلوار اوراس کی کاٹ کے کچھ مزہ لیتے تو کچھ تھراتے۔

اس ظلوم وجہول کوشرف مراسلت سے بار ہا سرفراز فرمایا۔ ایک بار شرف نیاز کے لئے دریاباد حاضری کی تمنا ظاہر کی تو تحریر فرمایا کہ آپ تکلیف نہ کیجئے کبھی لکھنؤ آنا ہوا تو لکھنے میں دریاباد سے لکھنؤ پہنچ کر ملاقات کروں گا، یہ احترام انورشاہ کشمیریؒ سے نسبت کا تھا ورنہ من آنم کہ من دانم، میرے مراسلے ''صدق جدید'' میں از راہ ذرہ نوازی شائع فرماتے، ایک مکتوب گرامی نامہ میں نظر سے گزرے گا کہ آپ کی حمایت میں ایک پر جوش گمنام خط آیا، اس کا قصہ یہ ہے کہ ڈاکٹر راجندر پرشاد سابق صدر جمہوریہ ہند۔ دیو بند آئے تو تصویر کسی ظالم نے خاموشی سے لی جس میں حضرت مولانا حسین احمد صاحبؒ اور مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ صاحب تصویر کے پردے میں تھے، اس پر ناراضگی کا ایک مراسلہ ''صدق جدید'' میں آیا لکھا تھا کہ ایک ندوی العلم اور تھانوی الفکر کا مراسلہ، یہ مخدوم ومکرم مولانا عبدالباری علیہ الرحمہ مجاز حضرت تھانویؒ کا تھا۔ طفولیت کی حماقت، جواب اس سیاہ قلم نے لکھا بس پھر کیا تھا ''صدق جدید'' میں رزم کا منظر تازہ ہوگیا، مخالفت اور حمایت میں خطوط چھپنے لگے۔ اشارہ مکتوب گرامی میں اسی کی طرف ہے۔ مولانا کی تفسیر اردو انگریزی میں بے نظیر ہے مولانا آزاد سے مشہور قلمی معرکہ حظ وکرب یا لذت والم، ہوا، آزاد کو ویسے بھی نہ بخشتے، ایک بار سابق صدر جمہوریہ رادھا کرشنن کی تقریر تصوف کی حمایت میں اور مولانا آزاد کی بظاہر مخالفت میں ہوئی۔ دریابادی نے ہر دو تقاریر کا اقتباس شائع کیا آزاد کی تقریر کا عنوان تھا، از سر مستی دستار از سر انداختم انداختم، اور صدر جمہوریہ کے لئے عنوان ''غم خور شیشا کہ من برداشتم، برداشتم'' ذرا دیکھئے کہ ایک شعر کے دوٹکڑے اور صورت حال کے لئے قیامت بردوش اور یہ دریابادی کے قلم کا ادنیٰ کرشمہ تھا۔

خود بوڑھے لیکن قلم سدا نوجوان مشہور شاعر جوش کو تو سکہ بند ملحد ہی بنا کر چھوڑا۔ انضباط اوقات میں حضرت تھانویؒ کی طرح بے مثل تھے۔ مرحوم کے چھوٹے چھوٹے شذرے، بڑے ذوق وشوق سے پڑھے جاتے، اور ہندو پاک کے بہت سے اخبارات میں نقل ہوتے یہ شذرے کیا تھے بس یوں کہہ لیجئے کہ ایک تجربہ کار شکاری کی فتراک تھی جس کے تیر کبھی خطا نہ کرتے۔ جنوبی ہند کے ایک اخبار کے مدیر نے مولانا کی مودودی صاحب کی تحریک ودعوت پر تنقید

واعتراض دیکھا تو مدیر صاحب مودودی صاحب کی نصرت میں مولانا سے دست وگریباں ہو گئے اپنے لب ولہجہ اور مخصوص انشاء میں اداریہ ''مولانا'' کے خلاف لکھ مارا جس میں تھا کہ ''آپ ہم پر جو چوٹ چلے ہیں'' پھر سارا اداریہ اسی رنگ ڈھنگ میں، دریابادی کہاں چوکنے والے تھے ان کی سطر سطر نقل کی اور ہر سطر پر لکھا کہ صل علی، ماشاء اللہ کیا اردو ہے کیسی بلند پایہ انشاء ہے۔

''صوفی نظیر کشمیری'' سے خوب چلتی ایک بار انہوں نے لکھا کہ آپ کو مدینۃ المصلی سے تا بخاری شریف پڑھا دوں گا صبح گاہی تفریح سے اب گیارہ بجے واپس آکر آپ کا شذرہ پڑھا اس پر یہ جواب مرسل ہے۔ مولانا نے جواب میں لکھا کہ تفریح سے گیارہ بجے واپسی آپ کی دماغی کیفیت کی بہترین ترجمان ہے، صوفی صاحب اس پر ایسے بگڑے کہ جوش میں عبا و دستار بھی پھینک دی اور تند و تیز مراسلہ بھیجا، مولانا کا جواب صرف اتنا تھا کہ آپ کو یہ سن کر رنج ہوگا کہ میں نے آپ کا مراسلہ پڑھے بغیر کوڑے کی کنڈی میں ڈال دیا۔ غرضیکہ بڑے بڑے ''شیر افگن'' بھی مولانا کے نشتر کی تاب نہ لاتے۔ کون کس وقت، مولانا کے قلم کی تیغ بے نیام سے تڑپے گا کوئی نہیں بتا سکتا سمپورنانند، سابق وزیر اعلیٰ یوپی رشی راج ٹنڈن کو تو کبھی نہیں بخشا، مولانا آزاد کے سکریٹری ہمایوں کبیر جو بعد میں مرکزی وزیر بھی ہو گئے انہوں نے ایک بار اردو کی حمایت میں کوئی بیان دیا دریابادی نے بیان پر عنوان چسپاں کیا ''دیکھ کبیرا اردو یا'' غرضیکہ وہ اردو ادب کے ستون، انشاء میں بے مثال، تیر و نشتر میں بے عدیل و بے مثل محقق تھے۔ اسی سے زائد عمر عزیز گذار کر دریاباد کی سرزمین میں یہ آسمان صحافت کا مریخ ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔

مولانا دریابادیؒ کردار سازی کے آئینے میں

مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن الاعظمی ندوی ☆

بیسویں صدی کے ادیب شہیر اور صاحب اسلوب انشاء پرداز مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی شخصیت سے کون نہیں واقف ہوگا، ان کی تحریریں، واقعہ نگاری بلکہ صحیح معنوں میں جادو نگاری کی ایک زندہ مثال کے طور پر پیش کی جاسکتی ہیں، وہ اپنے عصر کے مزاج داں اور زبان وادب کے نکتہ شناس تھے، وہ ادب کے تمام اصناف پر پوری دسترس رکھتے تھے، وہ تمدن وفلسفہ اور تاریخ وعلم الاجتماع کے راز داں بھی تھے، اور ان تمام موضوعات پر ان کا مطالعہ نہایت وسیع اور گہرا تھا، اور ان کا شمار دنیا کے عظیم ادیبوں اور ماہرین فکر وفن میں ہوتا تھا۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے قلم حقیقت نگار سے ان کے فطری اور صاحب کمال ادیب ہونے کی شہادت ملاحظہ فرمائیں:

''ایک فطری ادیب اور صاحب قلم کی پہچان یہ ہے کہ موضوع کیسا ہی سادہ وسنجیدہ، خشک وپر تقدس ہو، وہ اپنے قلم کی جولانی، خیال کی رعنائی اور طرز ادا کی دلآویزی کو روک نہیں سکتا، اور اس کے لئے اپنے ادبی ذوق اور اسلوبِ تحریر سے عاری وخالی ہوجانا ناممکن ہوتا ہے، خلافت اور ندوہ کے خطبات کا ثقہ ومتین ماحول ہو یا فلسفۂ اجتماع یا فلسفۂ جذبات کی سنگ لاخ زمین اور پُر خار وادی، یا تفسیر وتصوف کا پُر عظمت اور نازک میدان، جہاں ہر ہر قدم پر ''ہوشیار اور نگاہ روبرو'' کی آواز اور بڑے ادیبوں کے کان میں: ع

''قدم سنبھال کے رکھیو یہ تیرا باغ نہیں''

کی صدا آتی ہے، اس کا قلم گل کاری اور گلفشانی سے باز نہیں رہتا، اور یہی راز ہے کہ ادب وزبان کے رسیا اور لطف بیان کے جویا بھی یہ ''بھاری بھرکم'' تحریریں ذوق وشوق سے پڑھ لیتے

☆ مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء ومدیر البعث الاسلامی لکھنؤ

ہیں، اور گرانی محسوس نہیں کرتے، خالص ادیبوں میں یہ امتیاز مولوی محمد حسین آزاد کا ہے کہ شعراء کی محفل شعر و سخن ہو یا سلطانِ وقت کا دربار اکبری، ان کی ہر تصویر میں نیرنگ خیال اور ان کی ہر تحریر میں آبِ حیات نظر آتا ہے، عالموں اور محققوں میں مولانا شبلیؒ کی خصوصیت یہ ہے کہ "شعر العجم" اور "موازنہ انیس و دبیر" جیسی خالص ادبی و تنقیدی تصنیف ہو یا "الفاروق" و "سیرۃ النبیؐ" جیسی ثقہ پر شوکت و باعظمت موضوع یا "الکلام" و "علم الکلام" جیسا سنگین و خشک مضمون ہر جگہ ان کی تحریر کی شگفتگی و رعنائی قائم رہتی ہے اور ادب و زبان کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا۔"

مولانا دریابادیؒ نے قرآن کریم کا مطالعہ نہایت گہرائی سے کیا تھا، انہوں نے قرآن کریم کی تفسیر لکھنے کے سلسلے میں بہت سے ایسے مراجع سے بھی مدد لی تھی جو دوسری زبانوں سے تعلق رکھتے تھے، اور انہوں نے قرآن کریم میں مذکور اقوام و واقعات کے بارے میں مستند مورخین کی کتابوں کا مطالعہ کیا تھا، انہوں نے اپنے قدیم دورِ الحاد سے جدید زندگی کی طرف لوٹنے کے بعد قرآن کریم کی تفسیر لکھنے کا آغاز کیا، اور وہ "تفسیر ماجدی" کے نام سے معروف و مقبول ہے، ان کی زندگی کا یہ روشن پہلو دیگر ادوارِ زندگی پر امتیازی حیثیت رکھتا ہے، انہوں نے اسی روشنی سے نہ صرف اپنے دل و دماغ کو روشن کیا بلکہ موجودہ اور آنے والی نسلوں کے لئے زبان و ادب کی رمز شناسی اور بلاغت و بیان کی چاشنی عطا کی۔

اس وقت ہم آپ کے سامنے ان کی جملہ تصنیفات اور ان کی ادبی تحریروں کا ذکر نہیں کرنا چاہتے اس لئے کہ یہ موضوع ایک ضخیم کتاب کا متقاضی ہے، ہم آپ کے سامنے ان کی آخری تصنیف "آپ بیتی" سے کچھ ایسے اقتباسات پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں جو علم و ادب اور فکر و عمل کی راہ سے اخلاقیات عالیہ کی دعوت دیتے ہیں، اور ان کے اندر کردار سازی کی جھلکیاں پائی جاتی ہیں، اور ان کو نوجوان نسل کی تربیت اور اس کے مستقبل کو روشن کرنے کی راہ میں ایک قابل قدر رہنما اصول کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔

مولانا نے ۱۹۲۴ء کے اخیر میں اپنے خیالات کا اظہار کرنے اور معروضی اسلوب میں مضمون نگاری کو جلا بخشنے کے لئے اہل علم و ادب کی ایک جماعت کے ساتھ ایک مستقل ہفتہ وار "سچ" کے نام سے نکالا، اگرچہ ظفر الملک علوی اس پرچہ کے منیجر اور ایڈیٹر کی حیثیت سے سامنے آئے، لیکن واقعۃً اس کے مرتب اور مضمون نگار اور ایڈیٹر سب کچھ مولانا دریابادیؒ تھے، اس ہفتہ

دار کے ذریعہ مولانا نے نہ صرف ادبی ذوق کو صحیح سمت عطا کی اور بامقصد صحافت کے زریں اصول سے صحافتی طبقے کو آشنا کرایا، بلکہ اصلاح عقیدہ، رسوم و بدعات اور غیر اسلامی خیالات کی تردید میں بھی مضامین لکھ کر معاشرہ میں اخلاقیات کا شعور پیدا کیا، اور نوجوانوں میں اسلامی کردار سازی کی ذہنیت کو پروان چڑھایا، لیکن اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے بہت سے مراحل سے گذرنا پڑا، وہ لکھتے ہیں:

''شروع شروع توجہ اصلاح رسوم ورد بدعات پر تھی، اس لئے قدرتاً اہل بدعات بھی زیادہ ناخوش رہے، پھر بعض اور طبقوں کی دشمنی مول لینی پڑی، پھر ستمبر ۲۵ء میں شریفی سعودی آویزش سرزمین حجاز میں شروع ہوئی، ''سچ'' نے سعودیوں کی پہلے حمایت کی اور کئی مہینہ بعد ان پر نکتہ چینی شروع کی، پہلے وہ وہابیوں کا ترجمان سمجھا گیا، بعد کو بدعتیوں کا پشت پناہ، ایک مدت تک شیعہ حضرات اسے اپنا حریف و معاند سمجھتے رہے، تجدد، ترقی پسندی کا مقابلہ وہ ہر محاذ پر کرتا رہا، اور جمود کا بھی وہ حامی نہ رہا، فتنۂ انکار حدیث کا مقابلہ اس نے مدتوں کیا، اور ۳۱ء، ۳۲ء میں تو اس نے نیاز فتحپوری کے الحاد اور فتنۂ ''نگار'' کے مقابلہ کے لئے مہینوں اپنے کو وقف رکھا، نظریات خلافت کی بھی تبلیغ وہ مدت دراز تک کرتا رہا، حالانکہ خود تحریک خلافت ۲۵ء ہی میں بالکل مردہ و بے جان ہوچکی تھی۔ زبان شروع شروع میں ''عوامیت'' کی سطح پر قصداً لے آئی گئی تھی، یہاں تک کہ اس کی اردو پر لوگوں نے پھبتی ''کانگریسی اردو'' کی کس ڈالی، بعد کی زبان شستہ و ستعلیق اختیار کرلی گئی۔ جولائی ۳۰ء میں صوبہ سرکار نے ''سچ'' سے ضمانت طلب کیا اور پرچہ کو مجبوراً کئی مہینوں کے لئے بند رکھنا پڑا، نومبر سے پرچہ از سرنو جاری ہوا، اور جنوری ۳۱ء سے مدتوں سردار ملت مولانا محمد علی کا ماتم ہوتا رہا''

اس کے بعد حالات کی ستم ظریفی نے پرچہ کی اشاعت پر اثر ڈالا، اور مجبوراً اسے بند کرنا پڑا، لیکن دل کے تقاضے اور اس عصر میں اردو بامقصد صحافت کو رواج دینے اور اس کے اثرات سے زندگی کو نئی سمت عطا کرنے کے لئے اپنے بڑے بھتیجے اور داماد حکیم عبدالقوی صاحب مرحوم کو تیار کرلیا، انہوں نے پوری ذمہ داری اٹھالی، اور دسمبر ۱۹۵۰ء کے شروع میں یہ نیا پرچہ ''صدق جدید'' کے نام سے نکلنا شروع ہوا، اس کے مقاصد اور خدمات کے بارے میں مولانا رقم طراز ہیں:

''پرچہ کی خدمات پر اپنے قلم سے تبصرہ کرہی کیا سکتا ہوں، دین اور ضمناً علم، ادب، صحافت

کی خدمت، بری بھلی جو کچھ بھی اس ۴۰،۴۲ سال میں بن پڑی، اس کا فیصلہ خود ناظرین پر چہ کے سو پچاس نمبر پڑھنے کے بعد کر سکتے ہیں، البتہ اپنی طرف سے یہاں صرف اتنی گذارش کی اجازت چاہتا ہوں کہ:

(۱) واقعاتِ حاضرہ پر اس طرز خاص سے تبصرہ کرنا کہ پہلے نفس خبر بجنسہ نقل کر دی، اور پھر اس پر مختصر جچے تلے لفظوں میں کچھ لکھ لکھا دیا "صدق" اور "سچ" سے پہلے شاید اردو کی دنیائے صحافت کے لئے نامعلوم تھا۔

(۲) "صدق" نے طنز و تعریض کا استعمال بے شک کثرت سے کیا ہے لیکن اپنی والی کوشش ہمیشہ ذاتیات کا پہلو بچا کر اور صرف پبلک زندگی کے پہلوؤں کو پیش نظر رکھ کر۔

(۳) مروت اور شخصی تعلقات سے یہ تو نہیں کہ سرے سے اثر قبول ہی نہیں کیا گیا، البتہ اس تاثر کو ہمیشہ حدود کے اندر رکھا گیا ہے اور اسے پبلک فریفتہ احتساب پر غالب نہیں آنے دیا گیا۔

(۴) ہر حق کو حق اور ہر باطل کو باطل بلا کسی پارٹی کے خیال اور بغیر کسی تعصب و تحزب کے پیش کیا، اور جہاں کچھ بھی کہنے کی ہمت نہ ہوئی تو اس سے سکوت ہی اختیار کر لیا گیا۔

(۵) اظہار رائے اور جنبشِ قلم میں، یہ کس منہ سے کہوں کہ کبھی بھی ذاتی جذبات سے متاثر نہیں ہوا ہوں، جہاں کہیں بھی اس قسم کی لغزشیں ہوں اللہ سے دعا ہے کہ اسے معاف فرمائے اور ناظرین سے عرض ہے کہ وہ اس پر آمین کہیں۔"

اس پرچہ کے ذریعہ دین کی سربلندی اور دعوت الی الخیر کی کوششوں کے بارے میں مولانا لکھتے ہیں:

"پرچہ کی ارادی، شعوری، دانستہ کوشش ہر دور میں دین کو بلند کرنے کی رہی، اور اس کی دعوت ہمیشہ خیر ہی کی رہی، لیکن خدا معلوم کتنی بار اس کا نکالنے والا اور چلانے والا غصہ و طمع یا کسی اور شہوت نفس کا شکار ہو کر خود ہی پستیوں میں چلا گیا اور خیر کی دعوت میں شر کی آمیزش ہوتی گئی۔ **نعوذ باللہ من شرور أنفسنا و من سیئات أعمالنا**"۔

۱۹۰۸ء سے لے کر ۱۹۲۰ء کا وقفہ مولانا دریابادیؒ پر اسلام سے برگشتگی اور الحاد وارتداد کا دور کہا جا سکتا ہے، اس عرصہ میں بہت سے مد و جزر آئے اور اللہ اللہ کر کے اکتوبر ۱۹۲۰ء میں ناظر یار

جنگ کے یہاں اورنگ آباد میں قیام کا اتفاق ہوا، اور ان کے انگریزی کتب خانہ میں محمد علی لاہوری احمدی (قادیانی) کے انگریزی تفسیر وترجمہ کا پڑھنا تھا کہ کایا پلٹ گئی، اور شکوک وشبہات کے سارے غبار دھل گئے، اور دل اسی اسلام کی روشنی سے منور ہوگیا جس سے طبیعت بیزار ہوگئی تھی، اور بالآخر اللہ تعالیٰ نے مولانا کے لئے ہدایت کا راستہ نہایت روشن کردیا، اسی اثناء میں حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے کانپور میں ملاقات ہوئی اور پھر اس کے بعد مختلف اوقات میں حضرت مدنیؒ سے شرف نیاز حاصل ہوتا رہا، اور جولائی ۱۹۲۸ء میں حضرت کی وساطت سے حضرت تھانویؒ تک رسائی ہوئی، اس کا ذکر کرتے ہوئے مولانا رقم طراز ہیں:

''حضرت تھانویؒ سے جس قدر استفادہ دینی، روحانی، اخلاقی حیثیت سے ہوا وہ حد بیان سے باہر ہے، حضرت ہی کے ایک شاگرد اور بڑے صاحب کمال حاجی محمد شفیع بجنوری (متوفی ۱۱رستمبر ۱۹۵۱ء، ۸رذی الحجہ ۱۳۷۰ھ) اس درجہ مہربان ہوئے کہ بالکل عزیز قریب معلوم ہونے لگے، اللہ تعالیٰ ان سب اللہ والوں کو مرتبہ اعلیٰ سے سرفراز فرمائے۔''

ایک دوسری جگہ حضرت تھانویؒ کے بارے میں تحریر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بزرگ اور بھی بہت دیکھنے میں آئے، سب اپنی اپنی جگہ قابل تعظیم واحترام لیکن بحیثیت مصلح، مزکی، معلم ومرشد حضرت کو فرد فرید پایا، جس طرح ملی وسیاسی لیڈر کی حیثیت سے ''محمد علی'' کو پایا تھا، اپنی اس محرومی اور حرماں نصیبی کو کیا کہئے کہ اتنی رسائی ہوجانے کے بعد بھی بے مایہ و تہی دست ہی رہا، اور جو اول میں کورا تھا وہ آخر تک کورا ہی رہا، پڑھنے والے جب اس مقام پر پہنچیں تو حسبۃً للہ اس ناکارہ وننگ خلائق کے حق میں دعائے خیر فرمادیں، یہ کسی قسم کا مطالبہ نہیں ہے محض ایک بھیک ہے''

اس سلسلہ میں اور جن اللہ کے مخلص بندوں سے استفادہ فرمایا اور جن سے ایمان ویقین کو تقویت پہونچی اور جن کی صحبتوں سے دل ودماغ کو ایمان کی روشنی اور عشق رسول ﷺ کی چاشنی حاصل ہوئی، ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''لکھنؤ میں ایک صاحب دل بزرگ تھے، مولوی عبدالاحد کسمنڈوی بظاہر کلکٹری میں ملازم، لیکن صاحب باطن، ان کی خدمت میں بہت شوخ بلکہ ڈھیٹ رہا (متوفی ۱۹۲۹ء) جوار بارہ بنکی میں اور بزرگ تھے، مولوی عابد حسین فتح پوری صاحب علم، متبع شریعت وصاحب نسبت (متوفی

۱۹۲۷ء) ان دونوں سے بھی بقدر اپنے ظرف وبساط کے استفادہ رہا، سب سے بڑھ کر استفادۂ ایمانی مولانا محمد علی جوہر (متوفی ۱۹۳۱ء) سے رہا، دیکھنے میں نہ درویش، نہ عالم، نہ مصلح، لیکن حقیقت میں دس درویشوں کے ایک درویش، حرارتِ ایمانی کے دہکتے ہوئے تنور، عشقِ رسول وعشقِ قرآن کو گویا اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے، اپنے ایمان میں اگر جان پڑی تو انہیں کے فیضِ صحبت سے، اخیر ۲۳ء سے اخیر ۳۰ء تک ان سے بار بار ملاقاتیں رہیں، اکثر تو لکھنؤ اور دہلی میں اور کبھی ممبئی، علی گڑھ وغیرہ میں بھی، ہر صحبت از دیادِ ایمان ہی کا باعث ہوتی رہی۔"

حضرت تھانویؒ سے تعلق ہونے اور ان سے استفادہ کا سلسلہ جاری ہونے کے بعد ہی مارچ ۱۹۲۹ء میں مولانا کو سفرِ حج وزیارت کا موقع ملا، اور اس کے بعد تو جیسے اسلام کے حق میں تصنیفات ومحاضرات کا سلسلہ چل پڑا، اور اسلامی فکر ودعوت کو عام کرنے، اسلامی تہذیب کے خط وخال اجاگر کرنے اور علم وعمل کے میدان میں پوری سرگرمی کے ساتھ مشغول ہو جانے کے سوا، اور کوئی کام ہی نہ رہ گیا، انہوں نے فلسفہ جیسے خشک مضمون کو اور نفسیات وعلم الاجتماع کو بھی اپنی اس روحِ ایمانی سے اس قدر دلچسپ اور مفید بنا دیا کہ وہ ایک خالص اسلامی موضوع بن گیا، اور اس کی وجہ سے اسلامی کتب خانہ میں ایک وقیع اضافہ ہوا، آیئے مولانا کی زندگی کے اس اہم ترین پہلو کو اور علم وعمل کے امتزاج اور اسلامی اصول کے مطابق سیرت سازی، اور اعلیٰ اخلاقیات کی روح سے زندگی کو آراستہ کرنے کی کاوشوں کو ذرا تفصیل سے انہیں کی تحریر کے آئینہ میں دیکھیے اور اس سے مستفید ہونے کی کوشش کریں، وہ لکھتے ہیں:

"علمی وفلسفیانہ مضمون ایک زمانہ میں کثرت سے لکھے تھے، ایک صاحب نے انہیں بغیر میری اجازت کے "فلسفیانہ مضامین" کے نام سے یکجا کر کے چھاپ دیا، اور دوڑ دھوپ کر کے کتاب کو لکھنؤ یونیورسٹی میں ایم۔اے کے کورس میں داخل کرا دیا، مجھے جب اس کا علم ہوا تو میں نے اس پر نظر ثانی کر کے ایک خاص ترتیب کے ساتھ 'مبادیٔ فلسفہ' کے عنوان سے جمع کیا، اور دو حصوں میں اسے شائع کیا، پہلا ۱۹۳۱ء میں دوسرا ۱۹۳۲ء میں، عام فہم، نام ان کا "فلسفہ کی پہلی کتاب" اور "فلسفہ کی دوسری کتاب" رکھا۔

۱۹۳۲ء ہی سے اس خدمتِ عظیم کا حوصلہ ہوا، جسے حاصلِ زندگی اور توشۂ آخرت سمجھتا ہوں اور دل ودماغ کی بہترین توانائیاں اس کی نذر کر دیں، اس کا مستقل ذکر ایک اگلے باب میں انشاء

اللہ ملے گا، ۱۹۳۸ء تھا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مجلس اسلامیات نے ایک خطبہ سنانے کے لئے علی گڑھ طلب کیا، اور میں اپنے پسند کئے ہوئے عنوان ''اسلام کا پیام بیسویں صدی کے نام'' کے تحت ایک خطبہ جا کر سنا آیا، تین سال بعد ۱۹۴۱ء میں پھر اس مجلس کی طرف سے دعوت آئی، اور اب کی ''تمدن اسلام کی کہانی اس کی زبانی'' کے عنوان سے جا کر لکچر دے آیا، دونوں لکچر پسند کئے گئے، اور مجلس مذکور کی طرف سے شائع ہوئے اور خوب نکلے، اسی درمیان میں سچ کے مضمونوں اور مقالوں کی خداداد مقبولیت دیکھ کر حیدر آباد کے ایک ناشر نے تین مجموعے ''محمد علی! ذاتی ڈائری''، ''مضامین عبدالماجد دریابادی'' اور ''مردوں کی مسیحائی'' کے نام سے چھاپ ڈالے اور نقد معاوضہ برائے نام سا بھیج دیا، چند سال اور گذرے کہ ریاست حیدر آباد ہی کے ایک صاحب نے ایک مجموعہ ''سچی باتیں'' کے نام سے شائع کر دیا۔

۱۹۴۱ء کی آخری سہ ماہی تھی کہ رام پور کی رضا لائبریری نے فرمائش کی کہ ہمارے یہاں آکر کسی علمی وادبی عنوان پر علمی رنگ میں آکر مقالہ پڑھو۔ دعوت منظور کر لی، اور اسی وقت ایسی ہی فرمائش مجلس اسلامیات پشاور کی طرف سے موصول ہوئی (آہ پشاور اس وقت ہندوستان ہی کا حصہ تھا اور کٹ کر جدا نہیں ہوا تھا) اسے بھی منظور کر لیا، پہلے دسمبر ۴۱ء میں رام پور گیا، اور وہاں بعض ''قدیم مسائل جدید روشنی میں'' کے عنوان سے مقالہ پڑھا اور پھر جنوری ۴۲ء میں پشاور کا سفر اختیار کر لیا، وہاں ایک مبسوط مقالہ جدید ''قصص الانبیاء کے دو باب'' کے عنوان سے پڑھا پشاور میں وہی مقالہ دوبارہ ایک دوسری جگہ بھی پڑھوایا گیا، بعد کو یہ دونوں لکچر یکجا کر کے نظر ثانی وترمیم کے بعد کتابی صورت میں شائع کرائے اور نام ''قصص ومسائل'' رکھا، پہلا ایڈیشن چند سال میں ختم ہو گیا، جب پھر دوسرا ایڈیشن نکلا۔

فلسفہ ونفسیات پر کچھ لکھنا ایک عرصہ سے ترک تھا، ۴۵ء میں ہندوستان اکیڈمی (الہ آباد) نے فرمائش کی کہ ''پاپولر سائیکالوجی'' (عام فہم نفسیات) پر ایک رسالہ دو ڈھائی سو کی ضخامت کا تیار کر دو، ۴۶ء میں اس فرمائش کی تعمیل کر دی، اور نام ذرا عجیب سا ''ہم آپ'' رکھا، کہیں ۴۸ء میں جا کر شائع ہوئی، معاوضہ بارہ سو نقد ملا، اور فروخت پر ۱۰ فیصدی رائلٹی اس کے علاوہ، اسی زمانہ میں اپنے ادبی مقالوں کی اشاعت کا خیال آیا، صدق کے علاوہ اور بھی متعدد رسالوں میں نکل چکے تھے، پہلی جلد مرتب کر کے انشائے ماجد یا ادبی مقالات کے نام سے پبلشر (تاج آفسیٹ بمبئی)

کو بھیجی، چھپ کر آئی تو نام ''مقالات ماجد'' پڑا ہوا تھا، اب کیا کرتا! معاوضہ ایک ہزار نقد ملا اور کتاب کے کچھ نسخے بھی، دوسرا ایڈیشن لاہور کی عشرت پبلشنگ کمپنی نے شائع کیا، اور معاوضہ اس نے بھی شاید وہی ایک ہزار پیش کیا، تیسرا ایڈیشن اسی حصہ اول کا دسمبر ۶۲ء میں نکلا اور دوسرے حصہ کا پہلا ایڈیشن مارچ ۶۱ء میں یہ دونوں حصے صحیح نام ''انشائے ماجد'' سے نکلے اور انہیں نسیم بکڈپو لکھنؤ نے شائع کیا، نشری ریڈیائی تقریروں کی بھی خاصی تعداد ہوگئی تھی، ان کا مجموعہ بھی اسی نسیم بکڈپو نے مارچ ۶۳ء میں نشریات ماجد حصہ اول کے نام سے شائع کیا، وقت کے مشاہیر اہل علم، اہل شعر وادب واہل سیاست کے خطوں کا ذخیرہ اپنے پاس ایک عرصہ سے موجود تھا۔ جی میں آیا انہیں مرتب کر کے اور ان پر اپنے حاشیے بڑھا کر انہیں چھاپ دیجئے، چنانچہ پہلی جلد ''خطوط مشاہیر'' کے نام سے مولانا شبلی اور اکبرالہ آبادی اور مولانا محمد علی جوہر کے خطوں کی اپنے دیباچوں اور بہ کثرت حاشیوں کے اضافہ کے ساتھ تاج کمپنی کو پانچ سو نقد معاوضہ پر دے دی اور اس نے غالباً ۱۹۳۶ء میں چھاپ دی، مولانا شبلی کے خط تو پہلے بھی نکل چکے تھے، مولانا حسین احمد مدنی، اقبال، اور مولانا ابوالکلام کے خطوط ان کے خطوں کے مجموعہ میں نکل گئے ہیں اور مولانا سید سلیمان ندوی کے خطوط کی پہلی جلد ''مکتوبات سلیمانی'' کے نام سے ۶۳ء میں چھاپ دی اور دوسری جلد عین اس وقت (جولائی ۶۷ء) زیرطبع ہے مولانا مناظر احسن گیلانی کے خطوط ایک صاحب کو چھاپنے کے لئے مدت دراز ہوئی بھیج چکا ہوں، مہدی حسن کے خط بھی ان کے مجموعہ خطوط میں نکل چکے ہیں، اب میرے پاس شرر، ریاض خیرآبادی، مولانا شوکت علی، سید جالب دہلوی وغیرہ کے خطوط باقی رہ گئے ہیں۔

حضرت تھانویؒ کی وفات جولائی ۴۳ء میں ہوئی، اس کے کچھ ہی روز بعد خیال آیا کہ اپنے اور حضرت کے تعلقات پر حضرت کے خطوط کی روشنی میں کچھ لکھ ڈالوں، خطوط سیکڑوں کی تعداد میں محفوظ مل گئے، میرے اصل عریضے بھی اور ان ہی پر حضرت کے جوابات بھی، بڑا وقت ان کے چھانٹنے اور تاریخ وار مرتب کرنے میں لگ گیا، پر کتاب کو بھی قدرتاً ضخیم ہی ہونا تھا، خیر خدا خدا کر کے کتاب ۵۰ء میں ''حکیم الامت، نقوش وتاثرات'' کے عنوان پر تیار ہوگئی، اور ۵۲ء میں پریس سے باہر آگئی، حضرت کے نام کی برکت سے کتاب مقبول بھی خوب ہوگئی اور اب کئی سال سے اس کا کوئی نسخہ باقی نہیں رہا، لکھنؤ سے ایک بڑے پرانے مخلص مولوی سید رئیس احمد ندوی جامعی نے اسے بہت شوق سے دوسرے ایڈیشن کے لئے مانگا، لیکن خدا معلوم کیا بجوگ پڑ گیا کہ

اب تک نہ چھپ سکی، اور نہ اب کوئی جواب ہی مل رہا ہے (یہ دوسرا ایڈیشن لاہور سے ۱۹۶۵ء میں شائع ہوگیا) (عبدالقوی)) اب خیال آیا کہ مولانا محمد علی کا قرضہ تو اس سے بھی پرانا اپنے اوپر باقی چلا آرہا ہے کسی طرح اسے بھی بے باق کیجئے، مرحوم کی وفات کے بعد ہی ''سچ'' میں ان پر لکھنا شروع کر دیا تھا، اور ''محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق'' کے عنوان سے ۱۶، ۱۷ انمبر ''سچ'' میں لکھ ڈالے تھے، اب انہیں کو بنیاد بنا کر کتاب از سر نو لکھنا شروع کی، اور ۸۸ بابوں میں اور متعدد ضمیموں کے ساتھ دو جلدوں میں ختم کی، مسودہ ۴۸ء میں تیار ہو چکا تھا، دو چار سال اچھے ناشر کے انتظار میں پڑا رہا، بلکہ کچھ گشت بھی کرتا رہا۔ اخیر ۵۲ء میں پریس کو خود ہی دی، پہلی جلد ۵۴ء میں پریس سے باہر آئی اور دوسری ۵۶ء میں۔

حضرت تھانویؒ کی بہترین کتابوں میں سے ایک کا نام ''مناجات مقبول'' ہے، کچھ قرآنی اور زیادہ تر حدیثی دعاؤں کا بہترین مجموعہ، گویا قرآن و حدیث دونوں کا انتہائی عطر نکال کر پیش کر دیا ہے، اور ترجمہ بھی حضرت ہی کے ایک خلیفہ اعلیٰ کا کیا ہوا صحیح و شستہ اردو میں۔ مدت سے آرزو تھی کہ اس کی شرح عام فہم زبان میں کیجئے اور کتاب اپنے ہی عامیوں عاصیوں کے حلقہ میں پہنچایئے۔ آرزو ۵۰ء میں پوری ہوئی، اور ہلکی ہلکی سی نظر ثانی زبان ترجمہ پر بھی، اور آخر میں ایک بندہ مقبول کے معمولات میں سے ایک دعاء کا اضافہ کیا، پہلا ایڈیشن ۵۲ء میں نکلا، دوسرا ۵۵ء میں، تیسرا ۶۵ء میں، جو دعا کرنے میں خود حد درجہ بدہمت و غفلت شعار ہے عجب کیا کہ اس کی کوتاہیوں، غفلتوں، بدراہیوں کا کفارہ کسی درجہ میں اسی دعاء آموز کتاب سے ہو جائے۔

شاعروں میں سب سے زیادہ لکھنے لکھانے کا اتفاق اکبر الہ آبادی پر ہوا خدا معلوم کتنے مضمون، مقالے، نوٹ ان پر لکھ ڈالے اور نشر یئے اس کے علاوہ ۵۱ء میں نظر ثانی کر کے بہت سی تحریروں کو یکجا کر کے اور نام ''اکبر نامہ'' یا ''اکبر میری نظر میں'' رکھا اور ۵۴ء میں لکھنؤ کے ایک پبلشر نے اسے چھاپ دیا، لیکن کتاب کیا ہے مطبعی غلطیوں کی پوٹ ہے کتابیں یوں بھی میری بہت غلط چھپتی ہیں اس کا نمبر سب سے اول ہے اور شعر تو چند ہی اس میں صحیح چھپے ہوں گے پڑھ کر دلی اذیت ہوتی ہے ۵۵ء کا آغاز تھا کہ پاکستان کے گورنر جنرل جناب غلام محمد صاحب نے کراچی آنے کی دعوت دی، جی کوئی بہانہ ہی ڈھونڈ رہا تھا، تاہم منظوری بہت کچھ سوچ بچار کے بعد ہی دی، اور اپریل میں ایک مختصر قافلہ کے ساتھ جا کر لاہور اور کراچی ہو آیا، واپس آ کر

''صدق'' میں قسط وار ایک مضمون ''ڈھائی ہفتہ پاکستان میں'' کے عنوان سے لکھا، بہت سے پرچوں نے اسے نقل کیا، ختم پر نظرثانی کے بعد اسی عنوان سے ۵۶ء میں چھاپ بھی دیا۔

قرآن کریم کی تفسیر لکھنے اور اس کے لئے نہایت گہرائی کے ساتھ سیکڑوں مراجع سے استفادہ کرنے اور لغت، تاریخ، جغرافیہ، تاریخ مذاہب و ادیان، تفسیر و حدیث، فقہ و کلام غرض مختلف علوم و فنون کی کتابیں بغور پڑھنے اور ان سے نتائج و حقائق کا استنباط کرنے کی تفصیل کتنی عبرت انگیز اور اہل علم کے لئے کس قدر مفید ہے، زندگی کے اس بیش قیمت وقفہ کی کہانی بہت دلچسپ اور علمی کام کرنے والوں کے لئے بہت ہی حوصلہ بخش اور ہمت افزا ہے، مولانا نے پہلے انگریزی زبان میں تفسیر لکھ کر خراج تحسین حاصل کی، پہلے اس کی کہانی مولانا کی زبانی سماعت فرمائیں:

''۳۳ء تھا اور اپنا قیام اس وقت تھانہ بھون کئی ہفتے کی مدت کے لئے تھا کہ ایک مقیم خانقاہ مولوی سراج الحق مچھلی شہری استاذ مجیدیہ انٹرمیڈیٹ کالج الہ آباد سے ملاقات ہوئی اور تعلقات بڑھے، یہ مخلص ہونے کے ساتھ ہی صاحب فہم و نظر بھی نظر آئے، جو ایک بہت بڑی بات ہے ایک روز انہوں نے باتوں میں کہا کہ بڑے افسوس کا مقام ہے کہ ہم اہل سنت و جمہور امت کی طرف سے قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ ایک بھی موجود نہیں ہے آپ ضرور یہ کام کر ڈالئے، میں اپنے انگریزی و عربی دونوں کی قابلیت کے حدود دار بعہ سے خوب واقف تھا، ان کی فرمائش پر دنگ ہی رہا، اور جواب کچھ اس طرح کا دیا کہ آپ نے حسن ظن کی حد کر دی، کہاں میں اور کہاں اتنا بڑا کام! کچھ تھوڑی بہت مناسبت بھی تو ہو؟

لیکن وہ کہاں ماننے والے تھے، اصرار کئے گئے آخر میں بولے ''نیا ترجمہ نہ سہی'' آخر محمد علی لاہوری کا ترجمہ تو موجود ہی ہے اسی کو زمین بنا کر اسی میں ترمیم و تصرف کر کے کام چلایئے۔

اب ان کے اخلاص کی کرامت سمجھئے یا جو کچھ، بات دل میں اتر سی گئی، اپنی کامل نا اہلی کے احساس کے باوجود بھی آخر ہمت کر ہی ڈالی، اور اللہ کا نام لے کر جوں توں قلم ہاتھ میں لے لیا، کام شروع کر دینے اور تھوڑا بہت کر ڈالنے کے بعد ہی جا کر کام کی عظمت، اور پھیلاؤ کا اندازہ ہوا، یہ اگر پہلے سے کہیں ہو گیا ہوتا تو ہرگز جرأت ہی نہ کرتا، ابتدائی خیال کہ دو ایک ڈکشنریوں کی مدد سے اور دو ایک انگریزی ترجمہ سامنے رکھ لینے سے کام چل جائے گا، اب بالکل طفلانہ نظر آنے

لگا، ''سچ'' (صدق کا پُرانا نام) عارضی طور پر بند کر کے اس کے کام سے چھٹی لے لی، اور کہنا چاہئے کہ سارا ہی وقت اس خدمت قرآنی کے نذر کر دیا، بعد عصر باہر بیٹھنے کا جو معمول تھا اسے روزانہ سے سہ روزہ کرنا پڑا، اس ساری کتر بیونت کے بعد بھی معلوم ہوا کہ وقت بالکل ناکافی ہے، اور تفسیری حاشیوں کی تیاری کے لئے تو کتابوں کے انبار کی حد ہی نہیں کہ ''عشق آسان نمود اول و بے افتاد مشکلہا'' کا معاملہ، بیسیوں نہیں پچاسیوں اور پچاسوں کیا سیکڑوں ہی جلدیں، کیسی کیسی ضخیم وگراں قیمت، لغت عربی کی، لغت عربی انگریزی کی، جغرافیہ عرب کی، جغرافیہ شام وعراق ومصر کی، تاریخ اقوام عرب واسرائیل کی، تاریخ روم وایران کی، تاریخ مذاہب یہود ونصاریٰ کی، عقائد مجوس ومشرکین کی، تاریخ تمدن کی اور علاوہ تفسیر کے حدیث، فقہ، کلام وغیرہ مختلف علوم وفنون کی کتابیں منگانا اور مطالعہ کرنا پڑ گئیں اور تفسیری حاشیے الگ رہے نفس ترجمہ کا کام کتنا دشوار نکلا، شروع شروع میں دلیل راہ محمد علی لاہوری کے ترجمے کو بنانا سوچا تھا، آگے چل کر اسے بالکل ترک کر دیا، پکتھال، سیل، بیل، وغیرہ کے مکمل اور لین وسید حسین بلگرامی کے نامکمل ترجموں سے یقیناً بڑی مدد ملی، پھر بھی مشکلات ایسی ایسی پیش آئیں کہ کہنا چاہئے رو رو دیا ہوں!

لین کے عربی انگریزی لغت نے بڑا سہارا دیا، سال ڈیڑھ سال جٹ کر کام کرنے کے بعد کہیں مسودہ اول تیار ہوا، پھر نظر ثانی کی، اس کے بعد منزل ٹائپ کرانے کی آئی، جو خود بڑی طویل اور پیچیدہ ثابت ہوئی ایک مخلص سید مرتضیٰ علی بی اے دہلوی تھے، پارہ اول کی سو دو سو کا پیاں اپنے خرچ پر شملہ میں طبع کرا دیں، انہیں درمیان میں ایک ایک سادہ ورق لگا کر لوگوں کے پاس صلاح ومشورہ رائے زنی کے لئے بھیجا، شکریہ وتحسین کے خط تو بہت سے آگئے، عملی کام کے خط بہت ہی کم آئے، ایسے ایک ہی صاحب کا نام اس وقت یاد آ رہا ہے، یوپی کے رہنے والے لیاقت علی، ایم اے ایل ایل بی، بھوپال میں غالباً وزیر قانون وسیاست تھے اور انگریزی کے بڑے اچھے لکھنے والے، ان کا خط کام کا آیا، دو آدمی اسی دوران میں شدت سے یاد آتے رہے ایک مولانا حمید الدین فراہی کہ ان سے عربی عبارت کے کتنے نکتے حل ہو جاتے، دوسرے اپنے مولانا محمد علی (کامریڈ والے) کہ وہ ترجمہ کی انگریزی کو کچھ سے کچھ بنا دیتے۔

اس کے بعد اردو تفسیر کا حوصلہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوا، یہ کام انگریزی تفسیر سے زیادہ وسیع اور تفصیلی تھا اس کے لئے بھی مولانا کمر بستہ ہوئے اور اس کو پایہ تکمیل تک پہونچانے

میں اپنی ساری توانائیاں صرف کردیں وہ لکھتے ہیں:

''انگریزی کا کام کرنے سے ہمت کھل گئی، اور ابھی اسی کی نظر ثانی پوری طرح نہیں ہوئی تھی کہ حوصلہ اسی طرز وانداز میں گو اور زیادہ تفصیل و وسعت کے ساتھ اردو ترجمہ و تفسیر کا بھی ہو گیا، اور اس میں مدد سب سے بڑھ کر حضرت تھانویؒ کے ترجمہ و تفسیر ''بیان القرآن'' سے ملی، قرآن مجید کے اردو ترجمے اور بھی اچھے اچھے ہو چکے ہیں اور شاہ عبدالقادر دہلوی کا ترجمہ تو کہنا چاہئے اپنی نظیر آپ تھا، لیکن جتنی رعایتیں حضرت تھانویؒ کے ترجمہ میں جمع ہوگئی ہیں وہ اور کہیں بھی نہ مل سکیں، میرا ترجمہ تو کہنا چاہئے کہ ۷۵ فیصدی اسی ترجمہ اشرفیہ کی نقل ہے اور تفسیری حصہ میں بھی فقہیات میں نے بڑی حد تک اسی بیان القرآن سے لی ہے۔ حضرت مرحوم اس کام کے آغاز سے ۳، ۴ سال بعد تک حیات رہے اور برابر زبانی و تحریری ہر قسم کا مشورہ اس باب میں دیتے رہے، بلکہ میں خود بھی ہمت کر کے ہدایتیں حاصل کرتا رہا۔

اردو تفسیر کی ضخامت گو انگریزی تفسیر سے کہیں بڑھ گئی اور لغت اور قدیم تفسیروں کی عبارتوں کی عبارتیں اس میں کثرت سے نقل ہوتی رہیں، پھر بھی کام اپنی ہی زبان میں کرتا رہا، اس لئے اس میں وقت بھی انگریزی کے مقابلہ میں کہیں کم لگا اور کوئی چار برس کی محنت میں اس کا مسودہ تیار ہو گیا، اور ۴۳ء میں پارہ بہ پارہ اسی تاج کمپنی لاہور کے پہونچنا شروع ہو گیا، لاہور یاد کر لیجئے کہ ۴۳ء میں ہندوستان کا حصہ اسی طرح تھا جس طرح آج دہلی اور لکھنؤ ہیں اور پاکستان کا خیال محض خواب ہی خواب تھا، شیخ صاحب نے وہی تعویق و تاخیر اس کی چھپائی میں بھی شروع کی لیکن خیر اتنی طویل مدت کی نوبت نہیں آئی لشتم پشتم کام چند سال کے اندر ختم ہو گیا۔''

میں نے تفسیر کی جو مستقل کتاب لکھی تھی اور اس کی چھپائی بالکل اسی طرح چاہتا تھا جیسے کسی کتاب کی ہوتی ہے اور اس کے نمونے بھی اردو میں کئی کئی موجود تھے، لیکن ناشر صاحب نے اسے مترجم مصحف کی صورت میں طبع کیا، یعنی اصل صفحہ پر متن و ترجمہ اور تفسیری حصہ صرف بغلی حاشیہ بنا کر، تجارتی مصلحتیں ناشر صاحب کو اس سے جو کچھ بھی مدنظر رہی ہوں، تصنیفی اعتبار سے اس میں متعدد قباحتیں پیدا ہو گئیں، ان میں سے ایک تو یہی کہ میں نے جو الگ الگ پیراگراف قائم کئے تھے وہ باقی نہ رہے اور پھر نوٹ کی پوری عبارت بلا وقف و فصل متن کے مسلسل ہو گئے اور ظاہر ہے کہ چھپ چکنے کے بعد اب اصلاح کی صورت ہی کیا باقی رہی۔

اپنی نااہلی، ناقابلیت اور اپنی علمی بے بساطی پر غور کرتا ہوں تو دو دو تفسیروں کا کام بن پڑ جانے پر دنگ وحیران ہی رہ جاتا ہوں، ہزار سقم اور خامیوں کے ہوتے ہوئے بھی یہ تفسیریں وجود میں آ ئیں کیونکر! چاہئے تو یہ تھا کہ ورق ورق دو دو ورق کے بعد قلم جواب دے جاتا!

شان کریمی وکارسازی کے بس قربان جایئے کہ وہ چاہے تو کاہ سے کام کوہ کا، اور چیونٹی سے ہاتھی کا لے لے، اردو تفسیر نکلی ہی تھی کہ اس میں خامیاں، کوتاہیاں نمایاں طور پر نظر آنے اور کھٹکنے لگیں اور جی بے اختیار چاہنے لگا کہ جابجا ترمیم سے کام لیا جائے، ایک بڑی ضرورت بعض حالات خارجی نے پیدا کردی، ۴۰، ۴۲ء تک بنی اسرائیل دنیا کی ایک مغضوب ترین قوم تھی ہر ملک میں مقہور ورسوا، اس وقت قدیم تفسیروں کی طرح اپنی بھی تفسیر کی آیات متعلقہ میں ان کی اسی حالت کا اظہار ضروری تھا، ۴۵ء کے بعد سے صورت حال بدلنا شروع ہوئی، یہاں تک کہ ۴۸ء میں ان کی ایک مستقل حکومت قائم ہوگئی، اور حکومت روز بروز ترقی کرتی گئی، اب لازم ہوگیا کہ ان آیات کی تفسیر وتاویل پر دوبارہ نظر کی جائے اور حواشی متعلقہ پر حذف واضافہ، ترمیم وتصرف سے کام لیا جائے پھر خلائی پرواز وغیرہ میں جو حیرت انگیز ترقیاں ان چند برسوں کے اندر ہوئیں ان کا لحاظ بھی طبیعیات وتکوینیات والی آیتوں کی تفسیر میں کرنا ضروری تھا اور متعدد ترمیمات بھی ضروری نظر آئیں، نظر ثانی کا کام شروع کردیا اور ختم بھی ہوگیا۔"

اس کے علاوہ علمی کمالات اور دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں اسلام کی شان امتیازی کا تعارف کرانے اور عقیدہ وشریعت کے امتزاج وتوازن کا جائزہ لینے میں مولانا کا درجہ بہت بلند ہے، مولانا نے زبان وقلم کی طاقت کا استعمال کرنے اور اس کے ذریعہ مکارم اخلاق کا پیغام اہل دنیا کو پہونچانے میں بڑی احتیاط اور دقت نظر سے کام لیا ہے انہوں نے "آپ بیتی" میں زندگی بھر کے تجربات کا خلاصہ پیش کیا ہے، اس سے اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ آنے والی نسلوں کی تربیت کس نہج پر کرنا چاہتے تھے اور کردار سازی کی مہم میں وہ کتنے صریح اور حقیقت پسند واقع ہوئے تھے، ملاحظہ کیجئے!

"طبعی تقاضوں کی تکمیل کی جاسکتی ہے لیکن ہوک کی آگ بجھانے کے لئے کوئی حد ونہایت نہیں، ہوس رانی جتنی بھی کیجئے گا طبیعت بجائے آسودہ ہونے کے حریص سے حریص تر ہوتی جائے گی، آگ بجھنے کے بجائے بھڑکتی ہی جائے گی ضرر وزیاں صریح واقع ہوتا جائے گا لیکن

طبیعت کو اس کا احساس ہی سرے سے جاتا رہے گا۔

نفس امارہ بڑا منطقی، بڑا فقیہ واقع ہوا ہے ہر نفس پرستی، ہر ہوسنا کی اور اس سے پیدا ہونے والے ہر ضرر روزیاں کی کوئی نہ کوئی خوبصورت سی تاویل وتوجیہ ہر بار کرے گا اور "هل من مزيد" کا نعرہ لگاتا ہوا آپ کو برابر مغالطہ میں مبتلا اور دھوکے میں الجھائے رہے گا! لازم ہے کہ ہر خواہش نفس پر حاکم طبیعت کو نہیں عقل کو رکھئے اور عقل کی حاکمیت کا نفاذ بڑی سختی سے کرتے رہئے۔ ہیجان نفس کے وقت (عام اس سے کہ وہ ہیجان غصہ کا ہو، حب جاہ کا ہو، حرص مال کا ہو، شہوت جنسی کا ہو) عقل تک اندھی اور مغلوب ہو جاتی ہے ایسے موقع پر دستگیری شریعت سے پایئے اور پناہ احکام خداوندی میں ڈھونڈھئے، نفس کو بے لگام کسی حال میں بھی نہ ہونے دیجئے، اس شورہ پشت گھوڑے سے آپ ذرا بھی غافل ہوئے اور اس نے آپ کو زمین پر دے پٹکا۔

غصہ اور شہوانیت، یہ نفس کے دو بے پناہ حربے ہیں، اور انسانیت کے دشمن قاتل! اگر ان پر نوعمری ہی میں قابو پالیا گیا، انہیں عقل اور اس سے بڑھ کر شریعت کے تحت میں لے آیا گیا، جب تو خیر ہے ورنہ اگر یہ سنپولئے بڑھ کر اژدھے ہو گئے تو کوئی صورت ان کے عذاب سے نجات پانے کی نہ رہے گی، سن کے ساتھ ساتھ ان کی گرفت بھی سخت سے سخت تر ہوتی جائے گی انسان خمیازہ اٹھائے گا، پچھتائے گا، جھنجھلائے گا پھر بھی بس پھڑ پھڑا کر رہ جائے گا ان کے پنجہ سے رہائی کی کوئی صورت آسان نہ ہوگی۔

روپے کی محبت بھی بڑی بری بلا ہے، سن کے ساتھ ساتھ یہ گھٹتی نہیں بلکہ حرص وہوس عموماً بڑھ ہی جاتی ہے، اور وجہ جواز میں ذہن نئی نئی ضرورتیں گڑھنا شروع کر دیتا ہے ضرورت اس وقت سال پر شروع ہی سے قابو پالینے اور اپنے کو قناعت کا خوگر بنالینے کی ہے، یہ جس نے نہ کیا اسے تلخیاں قدم قدم پر پیش آتی رہیں گی، لیکن روپیہ کی محبت اور شئی ہے اور اس کی قدر اور، روپیہ کی محبت تو بے شک ہرگز نہ پیدا ہونے پائے، لیکن روپیہ کی قدر ضرور رہو، یہ نہ ہو تو دوسرا مرض اسراف کا پیدا ہو کر رہے گا، بخل واسراف: دونوں مرض ایک ہی درجہ کے ہیں اور دونوں بڑے سخت، ان کے حملے سے اپنے کو محفوظ رکھنے کی واحد صورت یہ ہے کہ قلب کو ایک طرف حب مال سے خالی رکھا جائے اور دوسری طرف روپیہ کی ناقدری سے، دل کو ریا اور نمائش سے خالی اور اخلاص سے لبریز رکھنا بھی کوئی آسان ومعمولی چیز نہیں، بڑی ریاضت اور بڑے مجاہدوں کے بعد ہی یہ دولت

ہاتھ آسکتی ہے اور پھر بھی ہر وقت ڈگمگا جانے کا دھڑکا لگا رہتا ہے، ولا یلقاھا الا ذو حظ عظیم، ایک بڑا دخل اس میں صدق دل سے دعا مانگنے کا ہے اور اسباب و ذرائع شہرت سے اپنے کو دور رکھنے کا ہے، نفس عاشق ہے جاہ کا، اور انسان ایک حد تک خوشامد پسند طبعاً ہوتا ہے راہ اخلاص کا سب سے بڑا راہزن، مداحوں، معتقدوں و مریدوں کا گروہ ہوتا ہے، ہر وقت کی داد وتحسین رضا جوئی حق کا گلا گھونٹ دیتی ہے تفسیر قرآن تک کے بظاہر سو فیصدی خالص دینی کام کو جب سوچتا ہوں اور اپنے اوپر جرح کرتا ہوں کہ اگر داد و تحسین خلق، مسرت نفس اور مالی منفعت وغیرہ سارے خارجی خیالات کو منتزع کر لیا جائے، جب بھی یہی اہتمام و انہماک کام کے لئے باقی رہے گا تو ضمیر کچھ کانپ سا اٹھتا ہے۔

علم بہ معنی لکھائی پڑھائی کتابوں کی ورق گردانی کے شوق کا مرض بچپن سے رہا ہے، اب بھی طالب علم ہی ہوں ہر وقت اپنے گرد ایک کتب خانہ چاہتا ہوں، بغیر کتابوں کے وقت کاٹنا دشوار ہو جاتا ہے، بار ہا شوق مطالعہ کے آگے دوسرے طبعی جسمانی شوقوں کو مغلوب کر چکا ہوں، لیکن پھر بار بار سوچتا ہوں کہ آخر اس سے ہوتا کیا ہے اور اس سے حاصل کیا، جب تک یہ دھن تمام رضائے حق کی خاطر نہ ہو، دنیا میں بالفرض اردو کا نامی مصنف اور گرامی اہل قلم کہہ کر پکارا بھی گیا اور حشر میں القاب کیا نفع پہونچائیں گے اور حیات ابدی کے حصول میں یہ کیا کام آئیں گے۔''

مولانا کی زندگی کی خصوصیات و کمالات میں، ان کی اسلام اور رسول اسلام ﷺ سے شدید وابستگی، اسلامی شریعت پر گہری نظر اور اس کے لئے غیرت وحمیت اور زندگی سے اس کے تعلق کو اہم ترین خصوصیت کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

مولانا کی زندگی کے اس پہلو کو مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے اپنی کتاب ''پرانے چراغ'' میں اس طرح واضح فرمایا ہے۔

''مولانا کی خصوصیات و کمالات میں سب سے بڑا جوہر ان کی اسلامی حمیت تھی، ذات نبوی اسلام، شریعت اسلامی کے لئے کوئی توہین آمیز مضمون، رسالہ یا کتاب یا فلم یورپ و ایشیا میں کہیں نکلتی یا کوئی گستاخ و بے ادب کوئی تصویر شائع کر دیتا تو سب سے پہلے مولانا ''صدق'' میں اس کا نوٹس لیتے، اس وقت ان کا خامہ گوہر بار شمشیر جوہر دار بن جاتا اور اس کا سلسلہ جاری رکھتے، یہاں تک کہ خود ناشر کی طرف سے معذرت یا تلافی کی کوشش ہوتی یا اس کے خلاف

اسلامی حلقوں میں عمومی احتجاج ہوتا، اس بارے میں ان کی عقابی نگاہ سے کم ہی کوئی چیز پوشیدہ رہ پائی، اسی دینی حمیت نے ان کو انکار حدیث کے فتنہ کے موقع پر نیاز فتحپوری اور خدا رسول اور مذہب کے خلاف دریدہ دہنی سے بیتاب ہوکر جوش ملیح آبادی اور یگانہ چنگیزی کے مقابلہ میں صف آرا کر دیا اور انہوں نے ''صدق'' کو عرصہ تک ان کی تردید اور ان کے خلاف مضامین کی اشاعت کے لئے وقف کر دیا، وہ چونکہ رسمی و اصطلاحی طور سے کسی مدرسہ کے عالم و مدرس نہ تھے، بلکہ اعلیٰ انگریزی تعلیم یافتہ، صاحب طرز ادیب و انشاء پرداز، فلسفہ و نفسیات کے فاضل اور مغرب اور اہل مغرب سے (مذہب کا مذاق اڑانے والوں سے زیادہ) واقف تھے، اس لئے ان کی تحریروں کو ''ملائے مذہبی'' کا طعنہ دے کر یا ''شعر من بمدرسہ کے برد؟'' کا فقرہ چست کر کے ٹالا نہیں جا سکتا تھا، اس بارے میں مولانا کی ذکاوت حس اتنی تیز تھی کہ کسی شاعر کے کلام یا کسی ادیب کے مضمون میں مذہب و شریعت کی توہین، یا طنز و استہزاء کا کوئی جملہ دیکھ لیتے تو فوراً اس کا نوٹس لیتے اور اس پر تنبیہ فرماتے، مولانا کی مغفرت و مقبولیت کے لئے شاید یہی دینی حمیت کافی ہوجائے جو ہزار عبادت و تسبیح سے زیادہ خدا کے یہاں وزن رکھتی ہے۔''

تفسیر ماجدی کی انفرادیت

مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی ☆

مجھے مولانا عبدالماجد دریابادی کی انگریزی تفسیر پر اپنا مطالعہ پیش کرنے کی سعادت حاصل ہو چکی ہے، اردو تفسیر و ترجمہ میں جو محاسن ہیں ان میں کچھ تو مشترک ہیں جو انگریزی تفسیر میں بھی ہیں اور کچھ اضافی خصوصیات بھی ہیں مثلاً زبان و بیان کی سلاست، حوالوں میں بجائے صرف کتاب یا مصنف کا نام لینے کے قدیم مفسرین کے بجنسہٖ الفاظ کا نقل کرنا اور اس طرح کے چند در چند امتیازی پہلو ہیں، جن کا احاطہ ایک مقالہ میں مشکل ہے، برسہا برس کی جدوجہد اور دیدہ ریزی، منٹ منٹ کا حساب رکھنے والے اور وقت کا پورا پورا فائدہ اٹھانے والے محقق کے کام کو سرسری مقالہ میں مکمل طور پر نہیں بیان کیا جاسکتا، اور نہ اس کے محاسن کے تمام پہلوؤں کا جائزہ ایک نظر میں ممکن ہے۔ "داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار" کی نوعیت ہے، تاہم مالا یُوخذ کلہ لایترک کلہ، جو سب کا سب نہ حاصل ہوسکے تو سب ہی کو کلیۃً چھوڑا بھی نہیں جاسکتا، یا أخذُ البعض خیرٌ من ترک الجمیع کچھ ہی پالینا اس سے تو بہتر ہے کہ پورے مجموعہ سے دور رہا جائے، اس کوتاہ بیں کو تفسیر ماجدی میں انفرادیت کے جو پہلو نظر آئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) مفسر کا سب سے بڑا سرمایہ اس کا اخلاص ہے، جو ہر کام کے لئے ضروری ہے اور دین کے کام کے لئے اشد ضروری اور دین کے کاموں میں بھی کتاب اللہ کی تشریح و تفہیم، وحی رسالتؐ کو دوسروں تک منتقل کرنے کی امانت عظمیٰ کی خدمت کے لئے اشد سے اشد ترین اور اہم سے اہم ترین ضرورت ہے۔

(۲) اخلاص کے بعد علم کا درجہ ہے۔ اگر اخلاص شرط ہے تو علم فرض کا درجہ رکھتا ہے۔ جس طرح نماز میں وضو شرط ہے تو اس کے ارکان فرض ہیں۔

☆ سابق استاد جامعۃ ام القریٰ مکہ مکرمہ، وسابق ناظم تعلیمات دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

(۳) اوراخلاص وعلم کے ساتھ ایک اور بات ہے جو ان کو جلا دیتی اور چمکاتی ہے وہ ہے کسی رہبر مخلص اوراس راستہ کے تجربہ کار پیر دانا کی سرپرستی اوراس کی ہدایات کا حصول۔

مفسر دریابادی کو یہ تینوں نعمتیں حاصل تھیں، جو ایک ساتھ شاذ ونادر ہی کسی کے حصہ میں آتی ہیں، ان کے اخلاص کا واضح ثبوت یہ ہے کہ وہ کسی تجدد کے داعی نہ تھے، اپنی کوئی پارٹی نہیں بنائی تھی، کسی خاص طرز فکر کے بانی نہ تھے اور مفسر ہونے سے پہلے وہ عبدالماجد دریابادی صاحب طرز انشاپرداز، کامیاب صحافی کی حیثیت سے معروف تھے، فلسفۂ جذبات اور فلسفۂ اجتماع کے مصنف، مذہبی لٹریچر کا وسیع مطالعہ رکھنے والے دانشور تھے، سوائے اخلاص کے کوئی بات ایسی نہ تھی جو ان کو تفسیر لکھنے پر آمادہ کرتی، عربی میں ان کی صلاحیت عربیت کے کسی بڑے فاضل سے کم نہ تھی۔ انہوں نے باقاعدہ اس کی تحصیل کی تھی ——— صرف ونحو کی باریکیوں پر جو ان کی نگاہ تھی اس کا اندازہ اسی کو ہوسکتا ہے جس نے ان کی تفسیری بحثیں پڑھی ہیں، اس مقالہ میں بھی چند مثالیں سامنے آجائیں گی، اور آخری بات یہ کہ اس راہ کے قدیم رہ نورد، ایک تسلیم شدہ محقق و مفسر کی رہنمائی اور وہ بھی اس طرح کہ کوئی قدم بغیر اس کی ہدایت کے نہ اٹھے۔ یہ وہ سعادت ہے جس میں کوئی شاید ہی ان کا سہیم وشریک ہوگا، اپنی فکر پر اصرار، اپنی بات پر اصرار، اور اپنی رائے پر بے لچک ہونا خواہ دوسرے معاملات میں ہو، لیکن قرآن کے معاملہ میں مفسر دریابادی، عبدالماجد دریابادی ایڈیٹر ''صدق'' سے مختلف تھے۔ مناسب ہوگا کہ اس اجمال کی تفسیر کردی جائے اور گفتگو اشاروں کے بجائے حوالوں سے ہو۔

مفسر دریابادی اپنے مرشد ومربی حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے نام اپنے مکتوب مورخہ ۲؍شوال ۱۳۵۴ھ مطابق ۲۳؍جنوری ۱۹۳۶ء میں لکھتے ہیں:

> ''بحمداللہ ترجمہ کا ایک پارہ ختم ہوچکا ہے، اب تک یہ معمول رہا ہے کہ تازہ وضو کے ساتھ دو رکعت نفل کے بعد پہلے حضرت موسیٰ کلیم علیہ السلام والی دعا ''رب اشرح لی صدری ویسرلی امری'' کسی قدر الحاح کے ساتھ کرلیتا ہوں جب ترجمہ کا کام شروع کرتا ہوں، دعا میں اکثر حضرت امام بخاریؒ کا واسطہ دیتا ہوں کہ اللہ اللہ عرب سے صدہا میل دور بخارا اور ترکستان کا ایک شخص بودھ مت ماننے والوں کی اولاد، کہاں پڑا ہوا تھا، اسے کہاں سے کھینچ کر کہاں پہنچایا گیا کہ آج کتاب اللہ کے

بعد گویا اسی کی کتاب دین کی بنیاد ہے، اسی کریم سے دعا ہے کہ اس مخلص اور مقبول کے اخلاص کا ایک شمہ اس سیاہ باطن کے اندر بھی پیدا کردے۔"

دریابادی مسترشد کی اس تحریر پر تھانوی مرشد کا جواب:

"مبارک باد قبول ہو، آپ کی دعا الہامی ہے جو مصداق ہے "ہم دعا ز تو" کا تو اس کے ساتھ "ز تو" کی کامل توقع ہے۔"

مولانا تھانویؒ نے ز تو سے اس شعر کی طرف اشارہ کیا تھا:

ہم دعا از تو اجابت ہم ز تو
ایمنی از تو، مہابت ہم ز تو

یعنی صرف تو ہی دعا کی توفیق دیتا ہے، قبولیت دعا بھی تیری طرف سے ہے، دل لرزتا تیرے خوف سے ہے اور اس کو سکون بھی تو ہی دینے والا ہے۔

مفسر دریابادی اور حضرت تھانوی کی مراسلت "حکیم الامت- نقوش وتأثرات" کے صفحات سے نقل کی گئی ہے، اسی کے چند صفحات بعد مفسر دریابادی لکھتے ہیں:

"اب مراسلت کیا ہوتی تھی، گویا حضرت کے ہاں سے تفسیر درس تحریری Corres ponding course کا سلسلہ شروع ہوگیا، اور ہر ہفتہ ادھر سے استفادہ اُدھر سے افادہ برابر شروع ہوگیا تھا۔"

اخلاص اور ایک مرشد کامل کے زیر سایہ، زیر تربیت اور زیر ہدایت کام کرنے کا ثبوت اس مراسلت سے ظاہر ہوگیا، لیکن کلام ربانی عربی زبان میں ہے، بغیر عربی میں مہارت اور احادیث نبویہ سے براہ راست استفادہ کرنے کی پختہ صلاحیت کے اس راہ میں ایک قدم بھی چلنا خطرہ سے خالی نہیں ہے، مفسر دریابادی کی عربی دانی اور دینی علوم سے وابستگی کو بتانے کے لئے کسی سند یا سوگند کی ضرورت نہیں ہے، ان کی تفسیر میں جو حوالہ جات ہیں اور جہاں پوری پوری عبارت نقل کرتے ہیں، احادیث نبویہ سے استشہاد کرتے ہیں، ان کے راویوں پر بحث کرتے ہیں، نحو وبلاغت کے دقیق مسائل اور باریک سے باریک فرق کو واضح کرتے ہیں وہ خود شاہد عدل ہیں، ان کے مآخذ جو عربی تفسیروں کے ہیں ان میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے تفسیری اقوال کا مجموعہ

تنویر المقباس، ابن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ) کی جامع البیان، لغت وادب کے مشہور امام جار اللہ زمخشری (م ۸۱۵ھ) مفاتیح الغیب تفسیر کبیر امام فخر الدین رازی (م ۶۰۶ھ) امام محمد بن احمد انصاری قرطبی (م ۶۱۷ھ) حسین ابن محمود شافعی (م ۵۱۶ھ) کی معالم التنزیل، آٹھویں صدی کے نامور محدث اور ثقہ مفسر ابن کثیر دمشقی (م ۷۷۴ھ) کی تفسیر ابن کثیر، عقائد نسفی کے مصنف محمود ابوالبرکات الحنفی النسفی (م ۸۸۶ھ) کی مدارک التنزیل قاضی بیضاوی (م ۷۹۱ھ) کی مشہور تفسیر انوار التنزیل، جو تفسیر بیضاوی کے نام سے ہر مدرسہ میں پڑھائی جاتی ہے، اس کے علاوہ اسرائیلیات اور شان نزول کثرت سے نقل کرنے والے خازن اور بغوی کی تفسیریں ان کے علاوہ چھوٹی بڑی متعدد تفسیروں سے مفسر دریابادی نے اس طرح استفادہ کیا ہے کہ اگر کسی نے ایک ضمیر کے مرجع اور لام تاکید اور لام سببیہ میں بھی اختلاف کیا ہے اس کو سامنے رکھ کر ترجیحی شکل اختیار کی ہے، لغت میں اصلاً تو "لسان العرب" اور اسی پایہ کی انگریزی میں LANE کی Lexicon اور صحاح سے کام لیتے تھے، لغات قرآن پر اصبہانی کی شرح مفردات، غریب القرآن اور ابن قتیبہ کی الفاظ القرآن اور اعراب کے لئے العکبری کی ما من به الرحمٰن من وجوه الاعراب کے بے شمار حوالے جابجا موجود ہیں۔

اس طرح وہ تین باتیں جو اوپر سطروں میں ذکر کی گئیں، اخلاص، علم اور اس کے ساتھ بحر علم کے شناور کی رہنمائی کا حصول، ایک امتیازی وصف ہے، کسی کے اخلاص سے انکار نہیں نہ کسی کے علم پر تعریض مقصود ہے، مگر ان دونوں کے ساتھ مفسر کا اپنے کو عقل کل نہ سمجھنا اور تدبر کا تنہا حقدار نہ سمجھنا، اپنے اوپر شک کرنا، اپنی تحقیق کے باوجود مرشد کی رضا کی تلاش کرنا کامیاب بات ہے جس نے مفسر عبدالماجد کو اپنی عطا بخشش سے مجد و شرف کے بلند مقام پر فائز کر دیا، دوسرا انفرادی پہلو اس تفسیر کا یہ ہے کہ مفسر نے براہ راست متن قرآن سے خود اپنا ترجمہ کیا ہے کسی ترجمہ کو اپنی تعبیر کا جامہ نہیں پہنایا ہے، متن قرآن کو سمجھنے میں خواہ ان کو جس قدر بھی دیدہ ریزی اور کاوش فکر سے کام لینا پڑا ہو، مگر خود ایک ایک فعل اور متعلق فعل، ضمیر اور اس کے مرجع کو نحو کی کتابوں اور تفسیروں کے اندر بحثوں سے اطمینان کرنے کے بعد لکھا ہے، اس میں وہ یہاں تک محتاط تھے کہ خود اپنے مرشد حکیم الامت سے مفاہمت میں ہچکچاہٹ نہیں محسوس کی، کیونکہ نحوی ترکیب کا مسئلہ بہت نازک اور وسیع ہے، جن لوگوں نے قرآن کریم کی تفسیر کے بجائے اپنے ذہن و تجربہ، ذوق و تصور کی ترجمانی کی ہے ان کو کھینچا تانی کا موقع نحوی ترکیب میں تحریف کے ذریعہ ملا ہے، اس معاملہ میں دریابادی

کا حاسہ بہت قوی بھی تھا اور شکی بھی، اور بغیر شک کے تحقیق ممکن نہیں ہے، مفسر دریابادی کس درجہ باریک بینی سے ان کو پرکھتے تھے اس کا نمونہ مرشد و مسترشد کے نامہ و پیام میں ملتا ہے۔

مفسر نے اپنے مرشد کو لکھا:

''آپ کی بیان القرآن کی پوری قدر رفتہ ہی رفتہ جا کر ہوئی ہے، جب شروع شروع اسے کئی سال ہوئے میں نے دیکھا تھا تو ایک اوسط درجہ کی کتاب نظر آئی تھی پھر جب میں نے لوگوں کو ترجمہ قرآن اس کی مدد سے پڑھانا شروع کیا تو اس کی قدر بڑھی اور پوری قدر تو اب جا کر ہو رہی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ مفسر نے ایک ایک لفظ تول کر کے لکھا ہے، لیکن بایں ہمہ چند مقامات میں جناب کا اتباع نہیں کر سکا ہوں:

(۱) "بَقَرَۃٌ" کا ترجمہ میں نے ''بیل'' سے نہیں ''گائے'' سے کیا ہے، لغت سے مجھے جھکتا ہوا پلہ گائے ہی کا معلوم ہوا۔

(۲) "مِلَّۃَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا" میں جمہور مفسرین کے اتباع میں میں نے حنیفا کو ابراہیم سے متعلق کیا ہے نہ کہ ملت سے۔

(۳) ایک اختلاف معنوی حیثیت سے بہت زیادہ اہم ہے۔ یہاں میں آپ ہی کے نہیں اکثر مفسرین کے اتباع سے ہٹ گیا ہوں، "اِنَّ الَّـذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ" میں میں نے کشاف وغیرہ کا اتباع کر کے متن ترجمہ میں سواء علیہم کو حال قرار دیا ہے یعنی ایسے کافر جن کے لئے انذار و عدم انذار سب برابر ہیں، ایمان نہیں لانے کے، البتہ حاشیہ دے دیا ہے کہ جمہور اہلِ سنت کا عقیدہ یہ ہے:

مرشد تھانوی کا جواب:

''بقرۃ کے سلسلہ میں: لغت اور نقل میں دونوں برابر [illegible] دونوں کا اختیار کرنا جائز ہے لیکن مجھ کو بیل کا ترجمہ اس لئے راجح معلوم ہوتا ہے کہ آگے آیت میں "لا ذلول تثیر الارض ولاتسقی الحرث" آیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ وصف عادی مثل فطری کے ہے تو اس کی نفی کی ضرورت تھی اور بقرۃ کا مذکر و مونث دونوں میں استعمال مصرح ہے، لیکن اگر کسی کے ذہن میں دوسرے ترجمہ کی ترجیح ہو تو گنجائش ہے۔

ملۃ ا[illegible]ھیم میں حنیفا حال ابراہیم کا میرا مرجح ہے لیکن آپ کی ترجیح میں بھی معنی کا

تغیر نہیں ہوتا۔

دوسری آیتوں کے سلسلہ میں مفسر دریابادی کو مرشد تھانوی نے کیا جواب دیا اس کے ذکر سے پہلے مناسب ہوگا یہ واضح کر دیا جائے کہ مفسر دریابادی نے کوئی ایسا اختلاف نہیں کیا تھا جس سے مفہوم میں واضح فرق ہو، یہ صرف ان کے احتیاط، تفقہ، وسیع النظری اور کمال تحقیق کی ایک مثال ہے، لہٰذا انہوں نے اس آیت کا جو ترجمہ دیا ہے اور اس پر جو حاشیہ یا تفسیر ہے اس کو بجنسہ نقل کرتا ہوں:

"قل بل ملة ابراهيم حنيفا، ترجمہ ماجدی: آپ کہہ دیجئے کہ نہیں بلکہ (ہم نے تو) ابراہیم سیدھی راہ والے کا مذہب پالیا ہے۔ تفسیر: (اس کی اصلی اور غیر محرف شکل میں) ملۃ ابراہیم یہود اور نصاریٰ، نومسلم اور نیم مسلموں کو اپنی طرف کھینچتے تھے کہ فلاح و نجات منظور ہو تو ہمارے مذہب میں آؤ، اس نئے مذہب میں کیا رکھا ہے، مسلمانوں کو تعلیم اس جواب کی مل رہی ہے کہ تمہارے یہاں کیا رکھا ہے بجز تحریفات کے، ہمارا دین تو نو پید اذرا بھی نہیں، وہ تو بس قدیم دین توحید ابراہیم علیہ السلام کا ہے، اور ہم اسی کی اصل اور غیر محرف شکل پر قائم ہیں، حنیفا ترکیب میں حال واقع ہوا ہے مضاف الیہ ابراہیم کا، اکثر اکابر تفسیر اس طرف گئے ہیں۔ زمخشری نے لکھا ہے "حالٌ من المضاف إليه" ابوسعود حیان نے لکھا ہے "هو حال المضاف إليه"۔ دوسرا قول یہ ہے کہ حنیفا صفت ابراہیم کی نہیں ملت کی ہے، اس حال میں مضاف الیہ نہیں بلکہ مضاف کا حال واقع ہوا ہے، علامہ آلوسی نے روح المعانی میں اسی کو ترجیح دی ہے، هو حال من المضاف بتأويل الدين أو تشبيها له بفعيل بمعنى المفعول، اس صورت میں ترجمہ ہوگا: ہم نے پالیا ہے مذہب ابراہیم کا جو سیدھی راہ ہے، حنیفا کے معنی بہر صورت مستقيماً مائلا الى الحق کے ہیں۔ اس جملہ کی تقدیر یوں ہے: بل نتبع ملته عليه السلام"۔

اس تفسیر کو نقل کرنے کا مقصد صرف یہ دکھانا ہے کہ مفسر دریابادی نے بلاشبہ مفسرین سلف سے ہٹ کر اپنی کوئی راہ نئی نہیں نکالی ہے اور نہ تدبر قرآن کی دعوت کو بہانا بنا کر قرآن کے پردہ میں اپنی کہی ہے جن کے بارہ میں علامہ ابن تیمیہ نے لکھا ہے: قوم رأوا رأيا وحملوه على

القرآن یعنی کچھ لوگ بات تو اپنی کرتے ہیں مگر اس کو قرآن پر ڈال دیتے ہیں۔ مفسر دریابادی نرے مقلد اور جامد متبع سلف ہیں، ان کے مرشد ان سے بھی زیادہ سخت مقلد تھے، اکابر کی راہ سے سر مو اختلاف نہیں کرتے تھے مگر یہ راہ اس لئے نہیں اختیار کی کہ اس میں تن آسانی ہے، ورنہ کیا مشکل تھا کہ دو چار ترجموں کو سامنے رکھ کر ایک نیا ترجمہ اور چند تفسیروں کو سامنے رکھ کر معمولی الفاظ کے ردو بدل سے ایک نئی تفسیر وجود میں آجاتی، مفسر دریابادی نے اجتہاد میں انقیاد کا راستہ اختیار کیا بلکہ اس راہ میں انہوں نے سالہا سال دیدہ ریزی کی ہے، ایک ایک لفظ اور ایک ایک فعل، اسم اور حرف کو خردبین لگا کر دیکھا ہے، اس کی ہوا بھی ان لوگوں کو نہیں لگی ہے جو ایک اچھوتا خیال، ایک وہمی مقصد، ایک نئی دریافت کے نام سے تفسیر لکھنے بیٹھ جاتے ہیں۔

مفسر دریابادی نے مرشد تھانوی کو ایک آیت "إن الذين كفروا سواء عليهم" کی نحوی ترکیب کے سلسلہ میں لکھا کہ میں اس میں جناب کا اتباع نہیں کر سکا ہوں بلکہ صاحب کشاف کی رائے کو ترجیح دی ہے۔ اس کا جواب مرشد تھانوی نے حسب ذیل دیا:

> ''یہاں کشاف موجود نہیں، ورنہ اس کی عبارت اور وجہ اس کے اختیار کرنے کی دیکھتا، اب آپ کی تحریر سے جو سمجھا ہوں اس کی بناء پر عرض کرتا ہوں، حال ہونے کی تقریر تو معلوم ہوتی ہے کہ ''کفروا'' میں ضمیر فاعل کی ہے، راجع موصول کی طرف وہ ذوالحال ہے اور جملہ ''سواء علیہم'' اس کا حال ہے اور ذوالحال اس حال سے مل کر فاعل ہے کفروا کا، اور کفروا ہے موصول کا، اور موصول اسم ہے اِن کا، اور ''لا یؤمنون'' خبر ہے اِن کی، بعض دوسرے مفسرین نے بھی ''لا یؤمنون'' کو اِن کی خبر کہا ہے، مگر ''سواء علیہم'' کو جملہ معترضہ یہاں علت کے لئے کہا ہے، جس کا اعراب میں کوئی عمل نہیں ہے، حال ہونے کی صورت میں اس کا ترجمہ ہونا چاہئے: یقیناً جن لوگوں نے ایسی حالت میں کفر کیا (غایت عناد کے سبب) ان کو آپ کا ڈرانا اور نہ ڈرانا برابر ہے (یعنی کسی حالت میں وہ باز نہیں آئیں گے) ایسے لوگ ایمان نہیں لائیں گے، اس ترجمہ سے حال ہونا صراحتاً معلوم ہوتا ہے، یہ تو ترکیب (نحوی) کی تقریر ہوئی، باقی وجہ اس کے اختیار کرنے کی ظاہراً ایک اشکال کا جواب دینا ہے، اشکال یہ ہے کہ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ کافر ہو گئے وہ ایمان نہیں لائیں گے، حالانکہ نزول آیت

کے بعد بھی، بہت سے کافر ایمان لے آئے تو پھر آیت کے کیا معنی ہوئے؟ صاحب کشاف اس کا جواب دیتے ہیں کہ یہ آیت مطلق کفار کے حق میں نہیں بلکہ معاندین کے حق میں ہے، پس وہ اشکال نہ رہا، اگر یہ جواب دیا جائے کہ جب عناد نہیں رہا تب ایمان لائے تو ایسا جواب بدون قید عناد بھی اشکال مذکور کا ہوسکتا ہے، یعنی جب تک کفار کفر پر رہیں گے ایمان نہ لائیں گے اور جب کفر سے باز آگئے تو مومن ہو گئے، تو دفع اشکال میں اس ترکیب کا کوئی دخل نہ ہوا، علاوہ اس کے جملۂ معترضہ ماننے میں کشاف کی ترکیب کا فائدہ حاصل ہوسکتا ہے، کیونکہ جملۂ معترضہ میں علت کی طرف اشارہ مانا گیا ہے، پس معنی یہ ہو گئے کہ کفار ایمان نہ لائیں گے کیونکہ وہ معاند ہیں، اس سے صاف معلوم ہوا کہ آیت کفار معاندین کے حق میں ہے، تو ترکیب کشاف میں کیا ترجیح ہوئی؟ اس کے علاوہ بعض مفسرین نے اشکال کا اور بھی جواب دیا ہے، مثلاً یہ کہ موصول ''الذین'' عہد کے لئے ہے، یعنی خاص کفار کے حق میں ہے جیسے ابوجہل اور ابولہب وغیرہ اس صورت میں یہ جائز ہے کہ ''سواء علیہم'' خبر ہو اور ''لایومنون'' اس کی تفسیر یا خبر بعد ہو، لیکن اگر باوجود اس کے دفع اشکال کے لئے آپ کو ذوقاً ترکیب کشاف سے اطمینان ہو تو اس کے اختیار کرنے میں مضائقہ نہیں، لیکن یہ سمجھنا صحیح نہ ہوگا کہ جمہور کی ترکیب میں اشکال دفع نہ ہوگا، اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مقصود سب کا مشترک ہے اور اس میں کوئی مختلف فیہ استشہاد معتزلہ کا نہیں ہے اس لئے حاشیہ میں تنبیہ خصوصاً اہل سنت کے عنوان سے ناظرین کو غلط میں ڈالے گا۔ واللہ اعلم۔

یہ طویل مراسلت جو مفسر دریابادی کی کتاب ''حکیم الامت'' سے نقل کی گئی ہے یہ ظاہر کرتی ہے کہ مفسر نے جس باریک بینی اور دقتِ نظر سے کام لیا ہے اور ان کے مرشد نے بھی جس درجہ اہتمام و فکر کے ساتھ رہنمائی کی ہے وہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

(۳) تفسیر ماجدی کی انفرادیت کے یہ دو پہلو جو اوپر ذکر کئے گئے وہ ایسے ہیں کہ جن کی طرف عام طور پر نگاہ نہیں جاتی، کیونکہ اصل انفرادیت جو لوگوں کو سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہو جاتی ہے وہ ہے صحف سماویہ توراۃ و انجیل سے تقابل اور بغیر کسی اعلان و ادعا کے مثبت انداز میں

توراۃ وانجیل کے محرف ہونے کو ثابت کرتا ہے۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ اس بات میں مفسر دریابادی کا کام متقدمین اور متاخرین سب سے بڑھا ہوا ہے، متقدمین کے کام سے اس لئے بڑھا ہوا ہے کہ قرآن کریم کی وہ آیات جن کا پس منظر سمجھنے کے لئے کتب سماویہ سے واقفیت اور ان کے مندرجات سے آگہی کی حاجت تھی، انہوں نے اسرائیلی روایات سے حل کی تھیں، اور اسرائیلی روایات کے قبول کرنے کی مشروط اجازت ہے، اگر وہ قرآن کریم کی تصدیق کرتی ہوں، یا معارض نہ ہوں تو ان کو قبول کیا جاسکتا ہے، اور ہر حالت میں ان کی صداقت یقینی نہیں ہے، سلف کا معمول "لانصدق ولانکذب" نہ ہم ان کی تصدیق کرتے ہیں نہ جھٹلاتے ہیں، تاہم چند ایسے مقامات قرآن مجید میں ہیں جن کی تفسیر کے لئے ابن جریر طبری سے لے کر ابن کثیر الدمشقی تک مجبور تھے کہ کعب الاحبار، وہب ابن عتبہ، عبدالملک بن عبدالعزیز بن الجریح الرومی کے حوالہ سے ان کی روایات کو تسلیم کرکے ان خاص آیات کی تفصیل کریں مثلاً "وقال لهم نبيهم ان آية ملكه أن يأتيكم التابوت فيه سكينة من ربكم" اس آیت میں "التابوت" کیا ہے؟ اس میں رازی، بغوی اور متاخرین میں آلوسی نے توراۃ مراد لی ہے کیونکہ انہوں نے وہب بن عتبہ کی روایت پر اعتبار کیا ہے، اور دوسرے مفسرین نے اس کو اسی صندوق کے معنی میں لیا ہے جس میں توراۃ اور تبرکات تھے، شیخ رشید رضا نے ان تمام روایات کو چھوڑ کر دوسرے معنی لئے یعنی تابوت کا مطلب سینہ ہے، دلیل یہ ہے کہ اسرائیلی روایات ناقابل اعتبار ہیں اور تدبر کا تقاضا یہ ہے کہ ہم یہ غور کریں کہ اطمینان وسکینت کا محل قلب ہے نہ کہ صندوق، اسی طرح آیت "ماكفر سليمن ولكن الشياطين كفروا" میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ جو پیغمبر تھے ان سے کفر کی نفی کیا معنی؟ جیسے آپ کسی حکمراں کے متعلق یہ کہیں کہ وہ دغاباز نہیں تو شبہ ہوتا ہے کہ کسی نے اس پر یہ الزام لگایا ہوگا جس کی نفی کی جارہی ہے، اس کا حل بھی اسرائیلی روایات سے کیا جاتا تھا۔ اسی طرح "ألقينا على كرسيه جسداً ثم أناب" اس کی تفسیر میں ہمارے قدماء نے بھی عجیب وغریب حکایتیں نقل کردی ہیں جو ایک پیغمبر کے کیا ایک عامی مسلمان کے بھی شایان شان نہیں ہیں، اسی بنا پر احمد امین نے فجر الاسلام میں کعب الاحبار پر سخت تنقید کی ہے اور ان کو ساقط الاعتبار قرار دیا ہے، ان مقامات کو حل کرنے کے دو ہی طریقے ہوسکتے تھے، ایک تو اسرائیلی روایات کو بجنسہٖ قبول کرلیا جائے، دوسرا طریقہ یہ کہ ان سب سے انکار کرکے محض انکل سے ایک مفہوم تجویز کردیا جائے۔ پہلا راستہ بعض مفسرین نے اختیار کیا ہے اور بعض نے متعدد روایتیں

جمع کردی ہیں اور دوسرا راستہ مفتی محمد عبدہ اور ان کے شاگرد رشید رضا اور ان کے متبعین جن میں ہمارے انگریزی کے مشہور مترجم محمد اسد اور قادیانی مترجم محمد علی عرف مولانا محمد علی لاہوری بھی ہیں۔ مفسر دریابادی کی انفرادیت یہ ہے کہ انہوں نے سلف کے مختار قول کو نقل کرنے کے بعد اس کی اصل توراۃ وانجیل کے تحریف شدہ نسخوں میں تلاش کی پھر جیوش انسائیکلو پیڈیا، انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا اور انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس میں علمائے یہود ونصاریٰ کی قدیم وجدید تحقیقات کا مطالعہ کر کے یہ دکھایا کہ قرآن ہی تنہا وہ آسمانی صحیفہ ہے جو ان مسخ شدہ روایات کی تصحیح کر سکتا ہے، مثال کے طور پر دو مقامات سورۂ بقرہ سے پیش کرتا ہوں:

"أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِي حَاجَّ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ" (الآیۃ)

(کیا تو نے اس شخص کے حال پر نظر نہیں کی جس نے ابراہیم سے اس کے رب کے بارہ میں مباحثہ کیا)۔

(منکر ومخالف کی حیثیت سے) یہ بحث ومناظرہ کرنے والا کون تھا؟ ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا کوئی معاصر بادشاہ تھا یہ تصریحات تو قرآن مجید بلکہ اس آیت کے اندر موجود ہیں، مفسرین نے اس موقع پر نمرود کا نام لیا ہے اور چونکہ اس خاص قصہ کا ذکر اہل کتاب کی کتاب میں موجود نہیں، اس لئے وہ اس روایت ہی کے ماننے میں تأمل کر رہے ہیں، حالانکہ قرآن مجید توریت کی اس طرح کی خدا جانے کتنی فروگزاشتوں کی تصحیح کرتا گیا ہے، اتنا تو بہر حال تاریخ توریت اور روایات یہود میں تسلیم ہے کہ نمرود نامی بادشاہ کا وجود تھا، بادشاہ بہت بڑا تھا، اور ساتھ ہی سخت ظالم اور مشرک اور آزر اس کا وزیر تھا، توریت میں ہے: ''اور کوش سے نمرود پیدا ہوا، زمین پر جبار ہونے لگا، خداوند کے سامنے وہ صیاد وجبار تھا، اسی واسطے مثل ہوئی کہ خداوند کے سامنے نمرود سا صیاد وجبار'' (پیدائش: ۱۰۔۸۔۹) اور کوش سے نمرود پیدا ہوا وہ زمین پر جبار ہونے لگا (ا۔تواریخ ۱۰۔۱) اور حسب روایات یہود، یہ نمرود اپنے قبیلہ والوں کی مختصر فوج سے آل یافث کو شکست دینے کے بعد زمین کا بادشاہ ہو گیا، اور آزر کو اس نے اپنا وزیر بنایا، اس کے بعد اپنی عظمت کے نشہ میں نمرود خدا سے بیگانہ ہو گیا، اور بہت سخت قسم کا مشرک ہو گیا، جیوش انسائیکلو پیڈیا، جلد ۹ صفحہ ۳۰۹، بابل (کلدانیہ) ہی کی تاریخ میں ایک اور بادشاہ کا نام آتا ہے جو بابل کا سب سے

پہلا انسانی غدا تھا بعض مؤرخین نے اسے نمرود کا مرادف قرار دیا ہے، (انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ اتھکس جلد ۶ صفحہ ۳۴۶) انیسویں صدی عیسوی کے ثلث آخر میں فرنگی مادیت وعقل پرستی اور اس کی تقلید میں ہندوستانی ''روشن خیالی'' اور ''نیچریت'' کا شدید تقاضا یہ تھا کہ ان قصوں ہی سے سرے سے انکار کر دیا جائے، لیکن جوں جوں خود فرنگی مؤرخین کے قدم آگے بڑھتے گئے، یہ تشکیک و بے اعتقادی بھی ضعیف ہوتی چلی گئی، انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا کے چودھویں اڈیشن میں اعتراف ہے کہ نصف صدی پیشتر ان قصوں کو جیسا بے اصل و نامعتبر سمجھ لیا گیا تھا، وہ خیال اب مزید تحقیق سے قائم نہیں رہا یہاں تک کہ نمرود کے ساتھ مناظرۂ ابراہیمی کا قصہ بھی جلد ۱۲ صفحہ ۱۶۵ میں موجود ہے۔ ربہ میں ضمیر ابراہیم کی طرف ہے لیکن بعض نے ''الذی حاج'' کی جانب بھی جائز رکھی ہے اور اس صورت میں ترجمہ ہوگا: اپنے رب کے باب میں "والضمير يحتمل أن يعود إلى ابراهيم ويحتمل أن يرجع إلى الطاعن والأول أظهر" (کبیر) بہرحال قابلِ لحاظ یہاں رب ہے، گفتگو رب کے بارہ میں تھی ''اللہ'' کے بارہ میں نہ تھی، باب الوہیت میں نہ تھی۔''

اس آیت کی شرح وتفسیر سے تفسیر ماجدی کا انداز واضح ہو جاتا ہے جو شروع سے آخر تک یکساں ہے، اسی طرح ایک دوسری آیت:

"وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَّأْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ" (الآية)

(اور ان سے ان کے نبی نے کہا کہ اس کی امارت کا نشان یہ ہے کہ تمہارے پاس وہ صندوق (از خود) آجائے گا)۔

(درانحالیکہ تم مدت دراز سے اپنی اس متاع عزیز سے محروم ہو) يَأْتِيَكُمْ یعنی از خود بغیر تمہاری کسی جدوجہد کے آجائے گا، التابوت اس خاص صندوق کا اصطلاحی نام تابوت سکینہ ہے، یہ بنی اسرائیل کا اہم ترین ملی وقومی ورثہ تھا، اس کے اندر اصل نسخہ توریت مع تبرکات انبیاء محفوظ تھا، اسرائیلی اس کو انتہائی برکت وتقدیس کی چیز سمجھتے تھے اور اس کے ساتھ برتاؤ انتہائی احترام کا رکھتے تھے، سفر حضر، جنگ وامن ہر حال میں اسے بڑی حفاظت سے اپنے ساتھ رکھتے، یہ کچھ ایسا بڑا نہ تھا، موجودہ علمائے

یہود کی تحقیق کے مطابق اس کی پیائش حسب ذیل تھی، طول ڈھائی فٹ، عرض ڈیڑھ فٹ، بلندی ڈیڑھ فٹ، اسرائیلی اپنی ساری خوش بختی اسی سے وابستہ سمجھتے تھے، مدت ہوئی فلسطینی اسے ان سے چھین لے گئے تھے، اسرائیلی اسے اپنے حق میں انتہائی نحوست وبدطالعی سمجھے، اس کی واپسی کے لئے نہایت درجہ بے تاب ومضطرب تھے، طالوت کے وقت میں یہ تابوت واپس آ جانے کے بعد تاریخ کا بیان ہے کہ بنی اسرائیل کے قبضہ میں حضرت سلیمان علیہ السلام (متوفی ۹۳۳ق م) تک رہا، اور آپ نے بیت المقدس میں ہیکل سلیمانی کی تعمیر کے بعد اسی میں اسے رکھ دیا تھا، اس کے بعد سے اس کا پتہ نہیں چلتا، یہود کا عام خیال یہ ہے کہ یہ تابوت اب بھی ہیکل سلیمانی کی بنیادوں کے اندر دفن ہے۔
سکینۃ من ربکم یعنی توریت کا نسخۂ شفا۔"

اس آیت کی شرح وتفسیر سے وہ شبہات تو دور ہوجاتے ہیں جو اسرائیلی قصوں نے پیدا کردیے تھے، نیز ہمارے روشن خیال اور حدیث، روایت، اور اس کے ساتھ لغت ونحو سے آزاد مفکرین اجتہاد کے علم کی بھی قلعی کھل جاتی ہے جو دعوی تدبر بے سند جو جی چاہتا ہے مطلب نکالتے رہتے ہیں۔

تفسیر ماجدی کی انفرادیت، یہ پہلو تشنہ رہے گا اگر یہ دیکھ نہ لیا جائے کہ آیا مفسر دریابادی اس میدان میں تنہا ہیں جنہوں نے توراۃ وانجیل کے بیانات سے قرآن کریم کی آیات کا تقابلی مطالعہ کیا ہے اور اگر کوئی اور ہے جو اس طرح کا کام کر چکا ہے تو تفسیر ماجدی میں اور اس کے کام میں کیا فرق ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ مفسر دریابادی اس میدان میں پہلے نو وارد نہیں ہیں، ان سے پہلے "ابن حیان" الاندلسی نے قدماء میں اور متأخرین میں مفتی محمد عبدہ اور سید رشید رضا دونوں نے یہ کام کیا ہے، اور التزام کے ساتھ نہ سہی مگر قصص کے معاملہ میں کہا جاسکتا ہے کہ ان حضرات نے بھی تورات وانجیل کے عربی ترجموں کو سامنے رکھا ہے، مولانا محمد علی لاہوری قادیانی نے بھی مغرب سے مرعوبیت کم کرنے کی بظاہر کوشش کی ہے، مگر ان تمام کاوشوں اور مفسر دریابادی کے درمیان یہ فرق ہے کہ ان لوگوں کا انداز مدافعانہ ہے، اور صرف ان ہی مقامات پر گفتگو کی ہے جن پر

مستشرقین کی طرف سے حملے ہوئے ہیں، برخلاف مفسر دریابادی کے انہوں نے خود بڑھ کر تحریف شدہ صحائف کا کھوکھلا پن دکھادیا ہے، اور یہ رنگ سورۂ فاتحہ سے لے کر اخیر تک قائم ہے، سورۂ فاتحہ کی تفسیر دیکھئے تو تفسیر ماجدی کے علاوہ کوئی تفسیر ایسی نہیں ملے گی جس میں اس کا موازنہ انجیلی دعا لارڈ پریر Lord's prayer سے کیا ہو، حضرت یوسف، حضرت مریم، عمران، یونس کے واقعات میں سے ایک ایک جزء کا موازنہ انجیلی بیانات سے کیا ہو، اور قرآن کی افضلیت کا سکہ بٹھایا ہو، لہٰذا صرف یہ کہنا کافی نہیں ہے کہ مفسر دریابادی نے مغربی علوم میں مہارت رکھنے کی وجہ سے اسرائیلی روایات کی اصلیت کھول کر بیان کردی ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے قصص کے علاوہ اور منازل وحی بھی ایسے ہیں جہاں تقابل کر کے دکھایا ہے کہ وحی کی روشنی اگر کہیں ہے تو صرف قرآن میں ہے۔

تفسیر ماجدی کی انفرادیت کا چوتھا رخ یہ ہے کہ یہ تفسیر مفسر گر ہے، اگر کسی ایک کتاب میں کسی کو دیکھنا ہو کہ قدماء نے کیا لکھا ہے اور کن الفاظ میں لکھا ہے وہ اس کو تفسیر ماجدی میں پالے گا، محققین کی تازہ سے تازہ تحقیقات معلوم کرنا ہو تو اس کا مکمل مواد اس تفسیر میں پائیں گے، ایک لفظ کے اگر متعدد معانی مختلف مفسروں نے بیان کئے ہیں، اگر ان کو کوئی یکجا رکھنا چاہے تو اس کو اس تفسیر میں مل جائے گا۔ نحوی ترکیب کے کسی گوشہ یا شوشہ میں الجھن پیش آرہی ہو تو تفسیر ماجدی میں اس کا حل ہے ــــ واعظانہ اسلوب اور دل کو نرم کرنے والے اور قلب کی سختی کو موم بنانے والے واقعات جو روح المعانی آلوسی میں ملتے ہیں وہ بھی یہاں موجود ہیں، انداز بیان تفسیر فلسفیانہ اور علمی موشگافیاں کرنے والوں کے جیسا خشک نہیں بلکہ اس میں زبان کی آب اور طرز بیان کی تب و تاب بھی ہے، ایسی مضمون آفرینی نہیں ہے جو کسی صاحب ذوق کے ذوق پر گراں ہو، نیز زبان و ادب کی چاشنی پر معانی کو قربان نہیں کیا ہے اور نہ کوئی ایسی بات لکھی ہے جو سلف کے اقوال سے متعارض ہو، اگر ارض القرآن یا جغرافیہ کے ان مقامات کو معلوم کرنا مطلوب ہے جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے تو شرح و بسط کے ساتھ اس کی تفصیل بھی سامنے ہے، قرآن کریم میں جن حیوانات کے نام آئے ہیں، ان کی کیا ساخت و نوعیت ہے اس پر اتنا لکھا ہے کہ مفسر دریابادی نے اس کو علیحدہ ''حیوانات القرآن'' کے نام سے چھاپ دیا ہے۔

اس تفسیر کی انفرادیت کا پانچواں رخ یہ ہے کہ قرآن کی عظمت کا تصور شروع سے آخر تک

قائم رہتا ہے۔ کلام الٰہی کا جلال و جمال، اس کی معنویت، اثر انگیزی، آیاتِ رحمت میں رحمت کا منظر، آیات غضب میں رونگٹے کھڑے کرنے والا جو انداز ہے اس کو دوسری زبان میں منتقل کرنا آسان نہیں، بشر پھر بھی بشر ہے، اس کے کلام میں وہ زور کہاں آسکتا ہے جو اصل میں ہے مگر اس کا کوئی شمہ کوئی معمولی سے معمولی حصہ اگر انسان اپنی زبان میں منتقل کرسکتا ہے تو اس کی نمائندگی تفسیر ماجدی کرتی ہے۔

اس تفسیر کی انفرادیت کا آخری باب، اس کم سواد کی نظر میں یہ ہے کہ مذاہب منحرفہ اور فرق باطلہ کا ابطال مناظرانہ انداز میں اور سلبی اسلوب میں نہیں ہے مگر ایجابی انداز میں وہ سب کچھ کہہ دیا ہے، جس سے کسی باطل پرست کو موشگافی کا موقع نہیں مل سکتا، مثلاً جو لوگ احادیث نبویہ کے منکر ہیں ان کو ایسی آیات کی شرح میں باور کرادیا ہے کہ بغیر دامانِ رسالت کے سایہ کے محراب قرآن میں رسائی محال ہے، صرف مثال کے طور پر سورۂ توبہ کی وہ آیت رکھئے: وَعَلَى الثَّلَاثَةِ الَّذِينَ خُلِّفُوا" قادیانیت کی ساری دیوار "وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ" کی تفسیر میں منہدم ہوجاتی ہے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ انہوں نے نام لے کر کسی فرد یا گروہ کو مطعون نہیں کیا ہے، لیکن تفسیر میں اقوال سلف اس طرح کے جمع کردیے ہیں کہ ان کا بھرپور ابطال ہوجاتا ہے۔

حاصل یہ کہ تفسیر کا ہشت پہل نگینہ اپنی جامعیت، معنویت، لفظی محاسن اور معنوی خوبیوں سے آراستہ ہے، اور یہ کام جو در اصل بیسوں تفسیروں کا عطر ہے مفسر دریابادی کو رازی، زمخشری، سیوطی، قرطبی، بیضاوی اور آلوسی کی طرح تادیر زندہ رکھے گا، یوں بقا و دوام صرف اللہ کی ذات کے لئے ہے۔!

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ — آپ بیتی کی روشنی میں

مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی ☆

مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام اور کام سے اہلِ علم اچھی طرح واقف ہیں۔ بہت سی کتابوں کے مصنف صاحب طرز انشا پرداز اور مفسر قرآن ہیں۔ راقم الحروف کو طالب علمی کے زمانے سے ہی ان کے ہفت روزہ اخبار ''صدق جدید'' کے مطالعہ کا چسکا پڑ گیا تھا۔ ان کے چھوٹے چھوٹے فقرے، حالاتِ حاضرہ پر تیکھے تبصرے، صدق جدید میں شذرات کا کالم شاید اس کا سب سے زیادہ دلچسپ اور مفید حصہ ہوتا تھا۔ اُس زمانے میں مولانا سے خط وکتابت بھی ہوتی رہی۔ چھوٹے چھوٹے حرفوں میں وہی چھوٹے چھوٹے جملے اکثر اپنے قلم سے ہی جواب دیا کرتے تھے۔ ملاقات تو کبھی نہیں ہو سکی مگر اس تحریری ملاقات میں ان کی شخصیت کے ساتھ ایک لگاؤ ضرور پیدا ہو گیا۔ اسی تعلق کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۶۲ء میں جب مکہ مکرمہ جانا ہوا اور قیام مدرسہ صولتیہ میں ہوا تو شیخ سلیم صاحب کے خصوصی کمرے میں ہمارے ساتھ مولانا کے بھتیجے اور داماد حکیم عبدالقوی صاحب (بی اے) بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ اکثر و بیشتر ان سے مولانا دریابادی کے بارے میں گفتگو ہوتی تھی اور وہ مختلف نشستوں میں مولانا کے واقعات اور حالات سناتے رہتے تھے۔

ان کی تصانیف میں یوں تو بہت سی کتابیں ہیں اور تفسیر قرآن کی ان کی خدمت بڑی وقیع خدمت ہے لیکن مجھے ان کتابوں کی افادیت کے اعتراف کے ساتھ خود مولانا دریابادی کو سمجھنے کے لئے ان کی کتاب آپ بیتی کئی اعتبار سے منفرد نظر آئی۔ اور اُس کی روشنی میں ان کی شخصیت بڑی دل آویز نظر آتی ہے۔

جیسا کہ مولانا نے اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے کہ ان کی ولادت ۱۵/ مارچ ۱۸۹۲ء (شعبان

☆ سرپرست دارالسلام اسلامی مرکز مالیر کوٹلہ (پنجاب)۔

۱۳۱۰ھ) کو ہوئی۔ ان کی تاریخ وفات ۶ رجنوری ۱۹۷۷ء ہے۔ اس لحاظ سے ان کی عمر تقریباً ۸۵ رسال ہوتی ہے۔ اس ۸۵ سالہ زندگی کی روداد اپنے واردات اور تجربات جس خوبصورت ڈھنگ سے اور جس سچائی اور حقیقت پسندی کے ساتھ انہوں نے آپ بیتی میں جمع کئے ہیں، اس کی مثال خودنوشت سوانح کی تاریخوں میں کم ہی مل سکے گی۔

صنعتی انقلاب کا اثر تمدن و معاشرت پر کیا پڑا اس کا نقشہ کھینچتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں کہ:

''پردے کا رواج ہندو گھرانوں میں بھی شرافت واعزاز کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ اور مسلمانوں کے اونچے خاندانوں میں تو پردہ شدت سے ہی نہیں افراط کی حد تک رائج تھا اور تعلیم مسلمان عورتوں اور لڑکیوں کی برائے نام ہی تھی اور شرم وحیا حدود شریعت وعقل سے تجاوز کئے ہوئے تھی۔ چنانچہ کوئی شریف بیوی اپنے شوہر کا نام کسی حال میں اپنی زبان پر نہیں لاسکتی تھی دیکھتے ہی دیکھتے صورت حال بالکل بدل کر رہ گئی۔ بڑی بڑی شریف بیویاں یہی نہیں کہ بے تکلف باہر بے پردہ گھومنے لگیں بلکہ بے پردگی کے ساتھ بے حجابی بھی عام ہوتی گئی بلکہ نوبت بے ستری کی بھی پہنچ گئی۔''

گویا صنعتی انقلاب کوئی محدود انقلاب نہ تھا کہ بگھی کی جگہ کار اور رکشا کی جگہ اسکوٹر آ گیا بلکہ اس کا اثر انسانی زندگی کے ہر شعبے پر پڑا اور صنعتی انقلاب کے ساتھ زندگی کا نقشہ ہی بدلنے لگا۔

آزادی کے بعد جو دوسرا دور آیا اُس نے معاشرت کے ساتھ زبان وادب کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا اس کا ذکر کرتے ہوئے مولانا دریابادی لکھتے ہیں کہ:

''اردو کا زور ۴۷ء تک رہا آزادی ملتے ہی ہندی والوں کا تعصب اردو پر ٹوٹ پڑا کچہریوں، دفتروں، سڑکوں کی تختیوں سے اردو حروف چھیل چھیل کر کھرچ کھرچ کر مٹائے گئے۔''

یہ تو زبان کی بات تھی۔ انقلاب کے اثرات ہمہ گیر تھے مولانا دریابادی لکھتے ہیں کہ:

''۲۲ء تک خلیفۃ المسلمین کے نام کا بھرم دلوں میں قائم تھا اور ہندوستان کی خلافت کمیٹی نے خلافت اسلامیہ کا جوش ازسرِ نو دلوں میں تازہ کر دیا تھا ۱۹۲۴ء میں مصطفےٰ کمال نے باقاعدہ یہ منصب عظیم ہی مٹا دیا۔ محمد علی یہاں، بہت چیخے چلائے تڑپے نتیجہ کچھ نہ نکلا۔''

مغربی تہذیب کے غلبے کا کیا حال تھا اور کس طرح وہ زندگی کے ہر گوشے میں داخل ہو چکی تھی اور ذہنی غلامی کس حد کو پہنچی ہوئی تھی اس کا نقشہ کھینچتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں کہ:

''انیسویں صدی عیسوی کا آخری دہا ہے، برطانیہ اور پھر ملکہ وکٹوریہ کے عہد واقبال کا برطانیہ آج بعد از زوال کوئی اس عہد کی تصویر کھینچنا بھی چاہے تو کیونکر کھینچے۔ ہندوستان پر برطانیہ کے تسلط واقتدار کا عین شباب تھا محض سیاسی ہی حیثیت نہیں علمی، مجلسی، تمدنی، تعلیمی غرض دنیوی زندگی کے ہر ادارے اور ہر تنظیم پر حاوی ومحیط بلکہ ایک خاصی حد تک دینی زندگی کے بھی مختلف شعبوں میں بھی جاری وساری۔''

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ:

''دین وعقیدت کے دائرے میں یہ مرعوبیت تکلیف دہ حد تک بڑھ چکی تھی۔ یورپ کی ہر بات پر آمنا وصدقنا بقول شہنشاہِ ظرافت اکبر الہٰ آبادی:

مرزا غریب چپ ہیں ان کی کتاب ردی

بدھو اکڑ رہے ہیں ''صاحب'' نے یہ کہا ہے

نئے فیشن کی پیش قدمی پوری تیزی سے جاری تھی قدیم وجدید کی آویزش قدم قدم پر تھی اور قدیم ہر محاذ پر اور ہر میدان میں شکست پر شکست کھا رہا تھا۔ زک پر زک اٹھا رہا تھا، سارے شعار اسلامی ایک ایک کر کے رخصت ہو رہے تھے۔

اپنے ذہنی اور فکری انقلاب کا ذکر مولانا نے بڑی تفصیل سے کیا ہے اور یہ تفصیلات ایسی ہیں کہ ان کا مطالعہ قوموں کے عروج وزوال پر نظر رکھنے والوں کے لئے بہت کچھ عبرت کا سامان اپنے اندر رکھتا ہے۔

مولانا لکھتے ہیں کہ:

''کالج کی زندگی میں قدم رکھتے ہی عقائد کی دنیا کہنا چاہئے کہ زیر وزبر ہونا شروع ہو گئی دیکھتے ہی دیکھتے اس مسلمان قالب کا قلب باضابطہ مرتد ہوئے یا کوئی دوسرا مذہب قبول کئے بغیر اسلام وایمان سے یکسر خالی ہو گیا دو سال کے اندر اندر یہ نوبت آ گئی تھی کہ اپنے آپ کو مسلمان کہلانے میں تکلف ہونے لگا تھا۔ بلکہ اس انتساب سے اپنے کو ایک طرح کی شرم آنے لگی تھی۔''

اپنی ذہنی کیفیت کے ساتھ مولانا نے اپنی شادی کے واقعات کا ذکر بڑے دلچسپ انداز میں کیا ہے۔۲؍جون ۱۹۱۶ء کو ان کی شادی ہوئی لکھتے ہیں کہ:

''نکاح فرنگی محل کے مولوی محمد اسلم نے پڑھایا۔ میری لامذہبی کے پیش نظر بعض عزیزوں نے چاہا کہ ایجاب وقبول سے پہلے مجھ سے کلمۂ شہادت پڑھوا کر تجدید ایمان کرالی جائے۔ بڑی خیر گذری کہ نکاح خواں نے اس کی ضرورت نہ سمجھی۔ ان کا فرمانا تھا کہ جب کسی نے اپنا نکاح مسلمانوں کے طریق پر پڑھوانا چاہا تو اس کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ اسلام کا قائل ہے۔ اب خواہ مخواہ بدگمانی کرکے اس کی چھان بین کیوں کرائی جائے اس طرح یہ بات ٹل گئی اور میں ایک بڑی آزمائش سے بچ گیا۔''

نکاح کے موقع پر مہر کا تصور ہندوستان میں بڑا اگبڑا ہوا ہے۔ اس کی جو شرعی اہمیت ہے وہ ذہنوں سے بالکل اوجھل ہے۔ خود اپنا واقعہ بھی مولانا لکھتے ہیں کہ:

''مہر کی رقم اب کچھ نہ پوچھئے کہ کیا تھی میرے لکھنے سے بھی شاید کسی کو یقین نہ آئے ہزاروں کی نہیں لاکھوں کی ٹھہری اور لاکھوں بھی چاندی کے روپے (زرسفید) نہیں سونے کی اشرفیاں (زرسرخ) اس وقت خاندانی بڑائی ہم شریفوں میں یہی سمجھی جاتی تھی کہ رقم کی تعداد بس ایک فرضی وافسانوی حیثیت رکھے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ ہو۔ جسٹس کرامت حسین مرحوم ایک ثقہ بزرگ میری مسند سے متصل بیٹھے تھے وہ بے چارے ارے ارے یہ کیا غضب ہے کہتے ہی رہ گئے سب نے ان کی بات سُنی اَن سنی کردی اور میں نے دل ہی دل میں نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز پڑھتے ہوئے اسے کھٹ سے منظور کرلیا۔ مہر کی شرعی اہمیت کسی درجے میں بھی دل میں تھی ہی کب؟''

مولانا سید سلیمان ندوی بھی اس محفل نکاح میں شریک تھے ان کا ذکر بھی مولانا نے بڑے دلچسپ انداز میں کیا ہے لکھتے ہیں کہ:

''حضرت سلیمان ندوی نے پہلے مجھے جب دیکھا کہ سرپر ریشمی زرق برق صافے کے ساتھ فاتحانہ انداز میں محفل عقد کی طرف جارہا ہوں تو کہا کہ غازی محمود سومنات فتح کرنے چلا ہے۔ اور پھر تین رباعیاں بھی ارشاد فرمائیں (اس وقت وہ کھل کر شاعری کے میدان میں نہیں آئے تھے) ان میں سے ایک یاد رہ گئی۔

لایا ہے یہ پیام خوشی کا قاصد
نوشہ بنے ہیں آج عبدالماجد
وہ روز سعید بھی خدا لائے جلد
بن جائیں وہ جب کسی کے والد ماجد"

مولانا ادیب اور فلسفی تھے اور قلم کے دھنی فکر میں بڑی رسائی تھی۔ اور ان کی آپ بیتی سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کے حالات بیان کرنے میں سچائیوں سے گریز نہیں کیا۔ آپ بیتی لکھنا آسان ہے لیکن سچائی بیان کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ ازدواجی زندگی کے تعلق سے مولانا کی تحریر کا اقتباس بڑا اہم ہے لکھتے ہیں کہ:

''بیوی کی شکل وصورت کا سوال شادی پر چند سال گذر جانے پر کچھ زیادہ اہم نہیں رہ جاتا۔ درجہ ثانوی پر آ جاتا ہے۔ ناک نقشہ ہر جوان عورت کا مرد کے جذبۂ شوق کو تسکین دینے کے لئے کم وبیش یکساں ہی ہوتا ہے۔ فطرت کہنا چاہئے کہ ہر جوان عورت کے چہرے پر ماء الشباب کا غازہ مل کر اُسے مرد کے لئے قبول صورت بنا ہی دیتی ہے۔ اور اکیلا چہرہ کیا معنی اس کی ساری ہی جسمانی ساخت کا تقریباً یہی حال ہے۔ سابقہ پڑنے پر صورت سے بڑھ کر سیرت کو اہمیت حاصل ہو جاتی ہے اور سیرت کا مفہوم بڑا وسیع ہے۔ رہنے سہنے کے سارے ڈھنگ اور حسن معاشرت کی ساری صورتیں اس کے اندر آ گئیں میاں بیوی کا سابقہ دنیا کے سارے سابقوں سے نرالا ہے۔ باہمی الفت ومحبت جتنی بھی ہو یہ ناممکن ہے کہ روزانہ زندگی کے بے شمار جزئیات میں دونوں کے سوچنے کا ڈھنگ بالکل ایک سا ہو۔ فہم اور اختلاف مذاق تو لازمۂ بشریت ہے اور پھر سابقہ اکثر صورتوں میں بیوی کو تنہا میاں سے نبھانا نہیں ہوتا بلکہ سارے سسرال والوں اور سسرال والیوں سے نبھانا ہوتا ہے۔ ان میں بڑے بھی ہوتے ہیں اور چھوٹے بھی عورتیں بھی مرد بھی خود اپنی اولاد بھی اور خوشحال گھرانوں میں نوکر چاکر بھی۔ یہ امتحان دنیا کے سخت ترین امتحانوں میں سے ہے اور بڑی ہی قابل داد اور قابل تہنیت ہیں وہ بیویاں جو اس مرحلے کو کامیابی سے طے کر جائیں۔''

پھر اپنی ازدواجی زندگی کے نشیب وفراز کا تذکرہ کرنے کے بعد مولانا لکھتے ہیں اور بڑے کام کی بات لکھتے ہیں کہ:

''اچھے اور بعض نامور علماء ومشائخ کی صحبت پہلے ہی رہ چکی تھی لیکن یہ زندہ احساس حضرت تھانوی ہی کے پاس بیٹھ کر ہوا کہ بیوی بھی اپنے مستقل حقوق رکھتی ہے۔ محض مطیع ومحکوم بن کر نہیں آتی کوئی محض خادمہ وکنیز کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ رفیق وشریک کا مرتبہ رکھتی ہے۔ فرائض خدمت اکیلے اسی کے ذمے نہیں شوہر کے ذمے بھی ہیں اور مسلمان کو اگر اللہ کی رضا کی طلب اور اپنے حسن عاقبت کی فکر ہو تو عمل ایک لازمی جز بیوی کے ساتھ حسن سلوک اور اس کے حقوق کی ادائی ہے۔''

مولانا دریابادی کی کتاب ''آپ بیتی'' کا سب سے اہم حصہ وہ ہے جس میں انہوں نے اپنے فکری الحاد اور ارتداد کی تفصیل بیان کی ہے کہاں سے ان کی گمراہی شروع ہوئی کیا کیا نشیب وفراز آئے اور پھر کس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو دوبارہ ہدایت عطا فرمائی ان کی فکری بے رخی کا زمانہ تھوڑا بہت نہیں تقریباً دس سال ہے جو کہ ۱۹۰۹ء سے شروع ہو کر تقریباً ۱۹۱۸ء تک رہا ان کی اس داستان میں بہت سے پہلو غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں مگر آج بھی ہمارے لئے ان میں رہنمائی کا سامان موجود ہے۔ مولانا لکھتے ہیں کہ:

''پیدائش مذہبی گھرانے میں اور تربیت دینی ماحول میں ہوئی ماں اور بڑی بہن کو تہجد گذار پایا، اور والد ماجد کو بھی پابند صوم وصلوٰۃ اور اچھا خاصا دیندار بڑے بھائی بھی تارک نماز یا لا مذہب نہ تھے۔ دینداری کے ساتھ علم دین کا چرچا بھی گھر میں تھا۔ دادا صاحب مفتی اور فقیہ صاحب فتویٰ اور نانا صاحب کے بھی علمی اور دینی کارناموں کے شہرے شروع ہی سے کان میں پڑتے رہے۔ چچا صاحب نے وضع قطع بالکل بچپن ہی میں مولویانہ کرا دی تھی۔''

اب ذرا دیکھئے کہ فکری لائن کہاں سے بدلتی ہے تعلیم وتربیت کے موضوع سے تعلق رکھنے والے کے لئے یہ بڑا اہم نکتہ ہے۔ مولانا لکھتے ہیں کہ:

''جولائی ۱۹۰۸ء میں کیننگ کالج میں داخل ہو گیا لکھنؤ آنا کچھ اور پہلے ہو گیا تھا اور یہاں ایک عزیز کے ساتھ ایک انگریزی کتاب محض اتفاق سے دیکھنے میں آگئی اب کیا بتایا جائے جوں جوں آگے بڑھتا گیا گویا ایک نیا عالم عقلیات کا کھلتا گیا اور عقاید واخلاق کی پوری دنیا جیسے زیر وزبر ہوتی چلی گئی کتاب مذہب پر نہ تھی نہ بظاہر اس کا کوئی تعلق ابطال اسلام یا ابطال مذاہب سے تھا۔ اصول معاشرت وآداب معاشرت پر تھی۔ نام تھا Element of Social Science اور

مصنف کا نام اس ایڈیشن میں غائب تھا۔ بجائے نام اس کی طبی ڈگری ایم ڈی (.M.D) درج تھی۔ بعد کے ایڈیشنوں پر نام ڈاکٹر ڈریسڈیل Dr. Dyresdalf نکلا اور بعد کو یہ بھی کھلا کہ وہ اپنے وقت کا ایک کٹر ملحد تھا۔ کتاب کیا تھی ایک بارود بچھی ہوئی سرنگ تھی۔ حملے کا اصل ہدف وہ اخلاقی بندشیں تھیں جنہیں مذہب کی دنیا اب تک بطور علوم متعارفہ کے پکڑے ہوئے ہے اور ان پر اپنے احکام کی بنیاد رکھے ہوئے ہے۔ مثلاً عفت وعصمت، کتاب کا اصل حملہ انہی بنیادی اخلاقی قدروں پر تھا اس کا کہنا تھا کہ یہ جنسی خواہش تو جسم کا ایک طبعی مطالبہ ہے۔ اسے مٹاتے رہنا اور اس کے لئے باضابطہ عقد کا منتظر رہنا نہ صرف فعل عبث ہے بلکہ صحت کے لئے اور جنسی قوتوں کی قدرتی بالیدگی کے لئے سخت مضر ہے۔ انداز بیان بلا کا زوردار اور خطیبانہ تھا۔ مذہب کی حمایت اور نصرت میں اب تک جو قوت جمع کی تھی وہ اتنی شدید بم باری کی تاب نہ لا سکی اور شک وبدگمانی کی تخم ریزی مذہب واخلاقیات کے خلاف خاصی ہوگئی۔ شک کی یہ تخم ریزی ہو ہی چکی تھی کہ عین اسی زمانے میں لکھنؤ کی لائبریری میں ایک ضخیم کتاب کئی جلدوں میں International Lisrary of famaus Literature کے نام سے دکھائی دی اس کی ایک جلد میں ذکر قرآن اور اسلام کا ہے اور اسی جلد میں ایک پورے صفحے کا فوٹو بھی بانی اسلام کا درج ہے۔ اور نیچے مستند حوالہ کہ فلاں قلمی تصویر کا یہ عکس ہے گویا ہر طرح سے صحیح اور معتبر اور ظالم نے شبیہ مبارک ایک عرب کے جسم پر عبا سر پر عمامہ اور چہرے مہرے پر بجائے کسی قسم کی نرمی کے تیوروں پر خشونت کے بل پڑے ہوئے ہاتھ میں کمان شانے پر ترکش کمر میں تلوار نعوذ باللہ گویا تمام تر ایک ہیبت ناک وجلاد قسم کے بدوی سردار قبیلہ کی۔"

اب یہ فکری الحاد کس طرح شباب کو پہنچا اس کا ذکر کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں کہ:

"ایک شخص گذرا ڈاکٹر ماڈسلی Maudesly اس کی دو موٹی موٹی کتابیں اس زمانے میں خوب شہرت پائے ہوئے تھیں ایک Mental Physiology (عضویات دماغی) دوسری Mental Pathology (مرضیات دماغی) اس دوسری کتاب میں اختلال دماغی اور امراض نفسیاتی کو بیان کرتے کرتے یک بیک وہ بد بخت مثال میں وحی محمدی کو لے آیا اور اسم مبارک کی صراحت کے ساتھ ظالم کہہ گیا کہ مصروع شخص کے لئے یہ بالکل ناممکن ہے کہ وہ اپنا کوئی بڑا کارنامہ دنیا کے لئے چھوڑ جائے!—— ایمان کی بنیادیں کھوکھلی تو پہلے ہی ہو چکی تھیں اب ان کم

بحث "ماہرین فن" کی زبان سے اس قسم کی تحقیقات عالیہ سن کر رہا سہا ایمان بھی رخصت ہو گیا، اور الحاد وارتداد کی منزل تکمیل کو پہنچ گئی!"

اس کے بعد مولانا نے مختلف مذاہب کا مطالعہ شروع کیا۔ بدھ مت اور ہندو فلسفے کے مطالعے سے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ کائنات کی مادی توضیح کے علاوہ روحانی توضیح بھی بڑا وزن رکھتی ہے۔ ۱۹ء میں ان کو مثنوی مولانا روم کے مطالعہ کا موقع ملا لکھتے ہیں کہ:

"کتاب شروع کرنے کی دیر تھی کہ معلوم ہوا کہ کسی نے جادو کر دیا ہے کتاب چھوڑنا چاہوں بھی تو کتاب مجھے نہیں چھوڑ رہی ہے۔"

مثنوی مولانا روم کے بعد انہوں نے قرأت قرآن مجید کے مختلف انگریزی ترجموں کا مطالعہ کیا۔ اور ۲۳ء میں انہیں مکتوبات مجدد سرہندی کے مطالعے کی توفیق ہوئی لکھتے ہیں کہ:

"مثنوی اور مکتوبات دونوں کا احسان عمر بھر بھولنے والا نہیں۔ راہِ ہدایت جو کچھ بھی نصیب ہوئی کہنا چاہئے کہ انہی دونوں کے مطالعہ کا ثمرہ ہے۔"

کتابوں کے مطالعہ کے علاوہ مولانا کی ملاقات لکھنؤ میں ایک صاحب دل بزرگ مولوی عبدالاحد کسمنڈوی سے ہوئی۔ جولائی ۱۸ء میں انہی کی وساطت سے رسائی حضرت تھانوی تک ہوئی لکھتے ہیں کہ:

"حضرت تھانوی سے جس قدر استفادہ دینی، روحانی، اخلاقی حیثیت سے ہوا وہ حد بیان سے باہر ہے۔"

مولانا کے اس واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انگریزی نظام تعلیم کس چالاکی کے ساتھ مسلمانوں کے عقیدوں اور ایمان کو غارت کر رہا تھا اگر اس وقت یہ علماء دین دین کو بچانے کے لئے کھڑے نہ ہوتے اور دینی تعلیم کو رواج نہ دیتے تو آج شاید اس ملک میں کوئی اسلام کا نام لیوا باقی نہ رہتا۔ آج الحمد للہ دین باقی ہے تو یہ انہی علماء کی قربانیوں کا طفیل ہے۔ پھر ان لوگوں نے کس حکمت کے ساتھ تربیت کی ہے وہ بھی ان حضرات کی بصیرت اور فہم و فراست کی بات ہے اگر دریابادی صاحب کو حکیم الامت حضرت تھانوی جیسا حکیم نہ ملتا تو دریابادی صاحب گمراہی کی لہروں میں بہہ چکے تھے۔

جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا کہ مکہ مکرمہ میں کافی دنوں تک مولانا دریابادی کے بھتیجے اور داماد حکیم عبدالقوی صاحب کے ساتھ رہنے کا موقع ملا جہاں تک یاد پڑتا ہے۔انہوں نے ہی مجھے یہ واقعہ سنایا تھا کہ مولانا دریابادی کا تعلق جب حضرت تھانوی سے قائم ہوا تو شروع میں جب خانقاہ جا کر حضرت تھانوی کے یہاں قیام کیا تو مولانا دریابادی سگریٹ پینے کے اتنے عادی تھے کہ چین سموکر بن گئے تھے۔رات کو کسی وقت سگریٹ ختم ہوگئی اور دریابادی صاحب بے چینی کے ساتھ ٹہلتے رہے۔تھانہ بھون چھوٹا سا قصبہ ہے رات کے وقت کسی دوکان کے کھلنے اور وہاں سے سگریٹ ملنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔حضرت تھانوی نے دیکھا تو سمجھ گئے چپکے سے اٹھے لالٹین لے کر ایک بنئے کی دوکان پر پہنچے اس کو گھر سے بلا کر دوکان کھلوائی اور سگریٹ ماچس لاکر چپکے سے دریابادی صاحب کے تکیے کے نیچے رکھ دی دریابادی ٹہل کر واپس آئے تو تکیہ اٹھا ہوا دیکھا اس کے نیچے سگریٹ ماچس رکھی ہوئی تھی سمجھ گئے کہ مرشد تھانوی کے علاوہ کون ایسا کرسکتا ہے؟اسی وقت سب سگریٹیں توڑ کر پھینک دیں اور تہیہ کرلیا کہ آئندہ اس کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔

اصلاح کا یہ حکیمانہ انداز مصلح امت ہی کا ہوسکتا ہے جنہوں نے دریابادی صاحب جیسے کام کے آدمی کو دین کی خدمت پر لگادیا اور ان کے قلم سے تفسیر ماجدی جیسی اردو اور انگریزی میں تفسیر قرآن آج بھی لاجواب ہے۔

آدمی ہمیشہ دنیا میں نہیں رہتا مگر اس کا کام اس کو زندہ رکھتا ہے۔دریابادی صاحب اپنے کام کی بدولت مرکر بھی زندہ ہیں۔

فرصت ملے تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنجہائے گرانمایہ کیا کئے

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی شخصیت ——
خطوط کے آئینے میں

پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شیروانی ☆

میں نے مولانا عبدالماجد دریابادی کی تحریریں اس وقت سے پڑھنا شروع کیں جب سے مجھے پڑھنا آیا۔ ان کا اخبار صدق میرے دادا صاحب مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام آتا تھا اور میں ان کی عدم موجودگی میں ان کی میز سے اٹھا کر پابندی سے پڑھتا تھا۔ اس طرح مولانا عبدالماجد سے میرا پہلا تعارف صحافی کی حیثیت سے ہوا لیکن میں زیادہ متاثر ان کے حسنِ انشاء ہی سے ہوا۔ ان کی انشاء میں طنز کا لطیف امتزاج اسے اس قدر دلچسپ بنا دیتا تھا کہ بار بار پڑھنے کو دل چاہتا تھا۔ جب میں یونیورسٹی میں آ گیا تو ڈائری لکھنے لگا تھا اور ڈائری میں اس دوران جو کتابیں پڑھتا تھا ان کے نام اور ان کے بارے میں مختصر تاثرات درج کر لیتا تھا۔ میری ۲۳ر فروری ۱۹۴۵ء کی ڈائری میں، جب کہ میں بی۔اے۔ کا طالب علم تھا، جن کتابوں کے مطالعے کا ذکر ہے ان میں ''مولانا عبدالماجد دریابادی کے مضامین کا ایک مجموعہ'' بھی درج ہے اور ان کے بارے میں لکھا ہے: ''مولانا دریابادی مدظلہم العالی کے مضامین کی کیا بات ہے۔ وہ مضمون نہیں لکھتے، گل ریزی اور گوہر باری فرماتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے، عام فہم اور سلیس جملوں میں معانی و مطالب کے دفتر بھر دیتے ہیں۔ عبارت کی روانی اور دل آویزی قابلِ صد تحسین و آفرین ہوتی ہے۔ ان کا طنز ان میں تیر و نشتر سمو دیتا ہے اور پھر اس سب سے بڑھ کر مولانا کا مذہبی ولولہ اور دینی جوش ان کے مضامین کی اثر آفرینی میں بدرجہا اضافہ کر دیتا ہے اور وہ پڑھنے والے کے دل پر براہ راست اثر انداز ہوتے ہیں۔ میں ان کے ہفتہ وار صدق کا عرصے سے حلقہ بگوش ہوں اور اس کا مطالعہ بالالتزام کرتا ہوں اور اسے پڑھ کر ہمیشہ محسوس کرتا ہوں کہ

☆ سابق صدر شعبۂ عربی کشمیر یونیورسٹی۔

میں نے کچھ حاصل کیا، زباں دانی میں بھی اور مذہبی عرفان وآگہی میں بھی۔"

صدق کے مطالعے کا اسی زمانے کا ایک دلچسپ لیکن ساتھ ہی عبرت انگیز واقعہ بھی ہے۔ شروانی خاندان کے جو طالب علم علی گڑھ میں زیرِ تعلیم تھے انہوں نے اپنا ایک کلب قائم کیا تھا جہاں مباحثے، کھیل اور مطالعہ سب کچھ ہوتا تھا۔ اس کے ریڈنگ روم کے لئے اخباروں اور رسالوں کی خریداری کا مسئلہ زیرِ گفتگو تھا۔ وہ مسلم لیگی سیاست کا دورِ عروج تھا۔ اور جو چیز سکہ بند مسلم لیگی نہیں تھی، قابلِ قبول نہیں تھی۔ جب میں نے صدق کا نام لیا تو اس کی مخالفت ہوئی۔ میں نے کہا کہ وہ تو سیاسی پرچہ نہیں ہے، جواب ملا اسی لئے تو اس کی خریداری منظور نہیں ہے لیکن میں کہاں ماننے والا تھا، منظوری حاصل کر کے رہا۔

رسمی طالب علمی کی زندگی ختم ہونے کے بعد یہ جرأت پیدا ہوئی کہ صدق کے بعض مندرجات پر اظہارِ خیال کروں۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کا دستور تھا کہ وہ کوئی رائے یا سوال کبھی لکھنے والے کے نام سے شائع کرتے تھے اور کبھی بغیر نام کے لیکن دو، ایک جملوں میں جواب سب کا دیتے تھے اور بالعموم ان کے وہ جملے اطمینان بخش ہوتے تھے۔ میرے ساتھ یہ سلسلہ ۱۹۵۳ء سے شروع ہوا اور اب صدق، صدق جدید میں تبدیل ہو چکا تھا۔ مولانا نے آیۂ کریمہ: **وَاِنَّ رَبَّکَ لَذُو مغفرة للناس علٰی ظلمهم** کی تشریح کرتے ہوئے تحریر فرمایا تھا "مغفرت کی بشارت کس کو دی جا رہی ہے؟...... یہاں تو پروانۂ مغفرت الناس کو مل رہا ہے۔ شرط توبہ کی بھی لگی ہوئی نہیں۔ تائب کے لئے تو مغفرت دوسرے دلائل سے بجائے خود ثابت ہے۔ یہاں تو ذکر ان انسانوں کا ہے جو مغفوریت کے لئے صرف بنیادی شرط ایمان کو پورا کر رہے ہیں۔" یہ تو معلوم ہے کہ مولانا دریابادی اہلِ ایمان کی مغفوریت کے معاملے میں بہت وسیع الخیال تھے، یہاں تک کہ وہ بعض ایسے فرقوں کو بھی ناجی قرار دیتے تھے، جن کے ناجی نہ ہونے پر تقریباً دوسرے سب علماء کا اتفاق ہے۔ لیکن جس مذکورہ بالا آیت کی انہوں نے تشریح فرمائی تھی اس میں لفظ الناس آیا تھا، ایمان کا کہیں ذکر نہیں تھا۔ میں نے مولانا کو یہی لکھ کر بھیجا کہ "آیت کا جو ٹکڑا نقل کیا گیا ہے اس میں "مغفوریت کی بنیادی شرط ایمان" کا کہیں دور دور ذکر نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ ایمان کی شرط آپ نے کسی اور جگہ سے لگائی ہے۔ تو پھر توبہ کی شرط کیسے اٹھائی جا سکتی ہے...... اس تضاد کو دور فرما کر شکر گزار کریں۔" (میرا مراسلہ طویل ہے، یہاں میں نے مختصر کر دیا

ہے)۔ مولانا نے میرا مراسلہ چھاپنے کے بعد تحریر فرمایا: ''صرف ایک لفظ بنیادی کا استحضار رہے تو سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ ایمان تو مغفرت کی بنیادی شرط ہے، تو یہ کا یہ حال نہیں۔'' یہاں مولانا نے یہ وضاحت بھی فرمادی تھی کہ یہ تنہا ان کی رائے نہیں ہے بلکہ ''اکابر مفسرین اہل سنت نے بجا طور پر اس اطلاق وعدم اشتراط سے بھی پورا فائدہ اٹھایا ہے۔'' اس کے بعد وقفوں کے ساتھ میرے چند مزید مراسلات اور مولانا کے جوابات صدق جدید میں شائع ہوئے۔ میں مولانا کی جناب میں کبھی کبھی کسی قدر شوخی سے بھی کام لے لیتا تھا لیکن ان کی بڑائی یہ تھی کہ وہ اسے اچھے معنی پہنا دیتے تھے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی پر انگریزی میں Ten Cammandments (احکام عشرہ) نامی فلم بنی تو ایک صاحب کا مراسلہ صدق جدید میں شائع ہوا جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ اس فلم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے حواریوں کے دریائے نیل میں گھوڑے ڈالنے کے موقع پر نیل کا پانی پھٹ جانا اور فرعون اور اس کی فوج کے داخلے پر اس کا پھر اپنی جگہ واپس آجانا اور ان کا غرقاب ہوجانا اپنی آنکھوں سے دیکھ کر قرآن مجید میں مذکور اس واقعے پر ایمان تازہ ہوگیا۔ مولانا دریابادی نے اپنی عادت کے خلاف یہ مراسلہ بغیر کسی ریمارک کے شائع فرمادیا۔ میں نے انہیں لکھا کہ اس فلم میں کسی اداکار نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کردار بھی ادا کیا ہوگا۔ کیا کسی پیغمبر کا روپ بھرنا اور ان کا کردار ادا کرنا شرعاً جائز ہے؟ اس بارے میں آپ نے کچھ تحریر نہیں فرمایا۔ مولانا نے میرا مراسلہ شائع کرکے براہ کرم تحریر فرمایا کہ خدا کا شکر ہے کہ صدق جدید کے قارئین میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اس کی غلطی پر اسے ٹوک دیتے ہیں، ہمارا مقصد تو یہ تھا کہ جب فلم بن ہی گئی ہے تو اس سے عبرت حاصل کرنی چاہئے۔

میرا آخری مراسلہ صدق جدید میں ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا تھا اور وہ مولانا دریابادی کی ناگواری کا باعث بنا تھا۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

مولانا سے براہ راست مراسلت کا سلسلہ یوں تو ۱۹۵۰ء میں قائم ہوگیا تھا لیکن پہلا خط بہت مختصر تھا اور ایک ضروری کام کے بارے میں لکھا گیا تھا۔ باقی خطوط ۱۹۶۹ء اور ۱۹۷۲ء کے درمیان کے ہیں، یہ تعداد میں سات ہیں۔ ان میں سے بعض خطوط خاصے مفصل ہیں۔ لیکن مختصر کوئی بھی نہیں ہے۔ پہلے مولانا خطوط خود تحریر فرماتے تھے لیکن کچھ مدت کے بعد غالباً انہیں احساس ہوا کہ مکتوب الیہ کو ان کا خط پڑھنے میں دشواری ہوتی ہوگی۔ اس لئے انہوں نے یہ طریقہ

ایجاد کیا کہ اوپر خود لکھتے اور نیچے غالباً اپنی کسی صاحب زادی سے اُسے نقل کرا دیتے۔ وہ یہ بھی کر سکتے تھے کہ خطوط املا فرما کر اس پر دستخط کر دیتے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اس سے ان کے کردار پر بہت اچھی روشنی پڑتی ہے کہ وہ مکتوب الیہ کے جذبات کا کس قدر خیال رکھتے تھے۔ انہیں اپنی ذمہ داری کا کتنا احساس تھا اور وہ کتنی احتیاط برتتے تھے۔ جب یہ گرامی نامے آج سے ۳۵ سے ۳۲ برس پہلے تک موصول ہوئے تو عرض نہیں کر سکتا کہ بالخصوص ان مکاتیب کے پڑھنے میں جو تنہا مولانا کے قلم کے لکھے ہوئے تھے کتنی دشواری محسوس ہوتی تھی لیکن اب پڑھتا ہوں تو واقعی بہت مشکل سے پڑھے جاتے ہیں، اس لئے اگر بعض الفاظ کی قرأت صحیح نہ ہوئی ہو تو اس کی ضمانت نہیں دے سکتا اور اس کے لئے پیشتر معذرت خواہ ہوں۔ لیکن مولانا کے مفہوم میں ان شاء اللہ معمولی سا رد و بدل بھی نہیں ہوگا۔

ان میں سے زیادہ تر خطوط دو موضوعات سے متعلق ہیں پہلا گرامی نامہ ۲ راگست ۱۹۶۹ء کا ہے۔ وہ یوں شروع ہوتا ہے "تو یہ کہئے کہ آں عزیز بھی صدق کے پڑھنے والوں میں بلکہ شاید پُرانے پڑھنے والوں میں نکلے، یہ میرے علم میں اضافہ ہوا۔ خوش ہوا کہ حلقۂ صدق میں ایسے اہل اخلاص بھی موجود ہیں۔ مومن کے لئے سچی دوستی اور خیر خواہی یہی ہے۔ آپ کے سوال کے مضمرات کو تسلیم کر کے صدق میں اس کا اعتراف ہی کرتا لیکن آں عزیز کا استقراء تام نہیں اور استفسار میں چوک ہوگئی۔ اس لئے قائل آپ کی ذہانت کا ہوا، تحقیق کا نہیں۔"

اس کے بعد ذکر ملک و ملت کی بعض ممتاز شخصیتوں کا ہے یہ شخصیتیں مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر ذاکر حسین اور رفیع احمد قدوائی صاحب کی ہیں۔ میں نے غالباً مولانا دریابادی کو لکھا ہوگا کہ صدق جدید کے بعض شماروں میں مولانا آزاد اور ذاکر صاحب کا ذکر جس طرح آیا ہے وہ مناسب نہیں محسوس ہوتا۔ اب یہ یاد نہیں آتا کہ قدوائی صاحب کا ذکر کیسے آیا تھا۔

مولانا آزاد کے بارے میں تحریر ہے: "مولانا ابوالکلام مرحوم پر جو کچھ عرض ہوا تھا متعدد ثقہ راویوں کی روایت پر مبنی تھا۔ اب اگر وہ روایتیں ہی غلط ہیں تو اللہ مجھے معاف فرمائیں۔ مولانا کی روح سے پیشتر ہی معافی مانگ چکا ہوں۔ اللہ قلم کو کسی بھی مسلمان پر اتہام سے آلودہ نہ کریں۔"
ذاکر صاحب کے متعلق لکھا ہے: "ذاکر صاحب مرحوم کا معاملہ اس سے کہیں بڑھ کر اور اشد ہے۔ راویوں کے بیان کا نہیں۔ پبلک ہے۔ آں عزیز ان واقعات ہی کی اگر تردید فرمادیں تو دل سے

شکر گزار ہوں گا۔ ظاہر ہے کہ کسی مسلمان اور پھر دوست اور مخلص اور محسن پر تنقید کرنا معاملہ تفریح اور دل لگی کا نہیں۔" قدوائی صاحب کے بارے میں مولانا دریابادی نے رائے اچھی ہی ظاہر کی ہے جس سے اختلاف کسی کو بھی مشکل ہی سے ہو سکتا تھا۔ مولانا آزاد اور ذاکر صاحب سے متعلق جو کچھ تحریر ہوا ہے اس میں ایک طرف مولانا دریابادی کا محتاط رویہ اور دوسری طرف ان کے انشاء کی خصوصیت یعنی طنز خفی قابلِ لحاظ ہے۔ لیکن یہ قصہ یہاں ختم نہیں ہوتا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا گرامی نامے میں مولانا دریابادی نے جو کچھ تحریر فرمایا تھا کم سے کم مولانا آزاد کی حد تک وہ خود اس سے مطمئن نہیں تھے۔ اس کے بعد کے تین گرامی نامے، جو بالترتیب ۲۹ر اگست، ۱۹ر ستمبر اور ۲۷ر ستمبر ۱۹۶۹ء کے لکھے ہوئے ہیں، اسی موضوع سے متعلق ہیں۔ پہلے خط میں تحریر فرمایا ہے: "آپ سے اس خط میں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ مولانا ابوالکلام مرحوم سے متعلق کوئی مراسلہ میرے پاس آئے (نام سے یا بغیر نام کے) تو اس سے صدق میں اظہار خیال میں مجھے سہولت ہو جائے۔" اس خط میں ذکر ذاکر صاحب اور رفیع احمد قدوائی صاحب کا اس طرح آیا ہے: "عجیب اتفاق ہے جس ڈاک سے آپ کا خط پہنچا عین اسی ڈاک سے ایک لمبا سا مضمون حیدرآباد سے موصول ہوا، بالکل آپ سے متضاد، ذاکر دشمنی میں ڈوبا ہوا۔ اس کے بعد ایک مکتوب آیا، اس پر برہم کہ رفیع قدوائی مرحوم کی اتنی مدح بھی صدق میں کیسے نکل گئی۔" شاید میں نے دریافت کیا ہو گا کہ مولانا آزاد سے متعلق مراسلے میں کیا لکھا جائے کیوں کہ ۱۹ر ستمبر کے خط میں مرقوم ہے: "بس اگر اس مفہوم کا (عبارت جو کچھ بھی ہو) مختصر سا مراسلہ کہ حال میں معلوم ہوا ہے کہ آپ کی جو رائے مولانا ابوالکلام آزادؒ (یہاں آزاد کے بعد "ؒ" مولانا دریابادی ہی کے ہاتھ کا تحریر کردہ ہے) سے متعلق تھی اس میں کچھ ترمیم ہوئی ہے۔ اگر یہ روایت صحیح ہے تو کیا اچھا ہو کہ صدق میں اس کا اظہار ہو جائے۔" تعمیل ارشاد کی گئی لیکن اس اضافے کے ساتھ کہ جن روایتوں کا ذکر مولانا دریابادی نے اپنے پہلے مکتوب گرامی میں کیا تھا ان کا بھی حوالہ دے دیا گیا۔ (یہ روایتیں "نماز کی عدم پابندی" اور "ان مجالس شبانہ" سے متعلق تھیں "جن کے محرم راز آصف علی وغیرہ تھے") خط کے آخر میں بجائے نام کے غالباً "ایک معتقد خصوصی" لکھ دیا تھا۔ ۲۷ر ستمبر کے گرامی نامہ کی عبارت ہے: "ایک معتقد خصوصی" کے مراسلے پر نوٹ لکھنے بیٹھا تھا بلکہ کچھ سطریں لکھ بھی ڈالی تھیں کہ خیال آیا پہلے اپنے مضمون کو دیکھ تو لیا جائے کہ آخر میں اس میں کون کون سی باتیں قابل ترمیم و اعتذار ہیں۔ فائل نکال کر دیکھا تو اس میں کل ایک مضمون دو نمبروں میں ملا اور

ایک چندسطری نوٹ ''آہ ابوالکلام'' کے عنوان سے۔ان تحریروں میں تو کوئی اہم بات قابل ترمیم سرے سے ملی ہی نہیں۔ان کے علاوہ کوئی اور تحریر ہو تو آں عزیز اس سے مجھے مطلع فرمائیں۔'' دستخط کے بعد مزید لکھا ہے: ''ایک نجی خط شورش کے نام ان کی ہی فرمائش کی تعمیل میں تھا کہ آخر مولانا مرحوم پر لوگوں کے کیا کیا اعتراضات ہیں۔آپ مجھے لکھ بھیجیں۔اگر وہ مقصود ہو تو وہ میرے پاس موجود نہیں اور نہ وہ صدق خوانوں تک پہنچی تھی۔'' دراصل ان روایتوں کا ذکر مولانا آزاد کی وفات کے بعد ان پر شائع شدہ بعض رسائل وجرائد کے خصوصی شماروں پر تبصروں میں آیا تھا۔ بہرحال صدق میں مولانا آزاد پر مولانا دریابادی کا نوٹ شائع ہوا جس میں وہی سب کچھ تھا جو میرے نام ان کے ۲۲راگست کے گرامی نامے میں تحریر تھا۔اس فرق کے ساتھ کہ اس نوٹ میں ''ثقہ راویوں کی روایت'' کا ذکر نہیں تھا۔بس یہی لکھا تھا کہ مولانا آزاد کے بارے میں صدق میں اگر کوئی ایسی بات شائع ہوئی ہو جو نامناسب ہو (صدق کا وہ شمارہ اس وقت پیش نظر نہیں ہے،اس لئے صرف مفہوم عرض کررہا ہوں) تو اللہ معاف فرمائیں اور مولانا کی روح بھی معاف کرے۔

ایک مسئلہ رحمۃ اللہ علیہ کی علامت ''ر۔ح'' کا بھی تھا۔آغا شورش کاشمیری مدیر ہفت روزہ چٹان لاہور نے مولانا عبدالماجد دریابادی کو لکھا تھا کہ آپ دوسرے مرحوم علماء کے نام کے ساتھ ''ر۔ح'' لکھتے ہیں جب کہ مولانا آزاد کے نام کے ساتھ نہیں لکھتے ہیں۔شورش کی روایت ہے جو انہوں نے چٹان میں نقل کی کہ مولانا نے اس کا جواب دیا تھا کہ ضروری نہیں ہر شخص اللہ کی رحمت کا مستحق ہو۔جب میں نے مولانا سے اس بارے میں استفسار کیا تو موصوف نے تحریر فرمایا تھا کہ انہیں یاد نہیں کہ انہوں نے شورش کو ایسا کچھ لکھا ہو کیوں کہ صدق تو ہر مسلمان کی مغفرت کا قائل ہے، پھر مولانا آزاد کے بارے میں بخل کیسے روا رکھا جاسکتا تھا۔تاہم اگر لکھا ہوگا تو ''عقیدت میں غلو کو کم کرنے کے لئے'' لکھا ہوگا۔اپنے ۱۹۷۱ء کے مراسلہ مطبوع صدق جدید اور اس کے بعد کے مولانا کے بعض ذاتی مکاتیب گرامی کے بارے میں کچھ لکھنے سے قبل ان کا کسی قدر پس منظر بیان کرنا ضروری ہے۔جب مشرقی پاکستان میں پاکستان سے علیحدگی اور ایک جداگانہ مملکت بنگلہ دیش کے قیام کی تحریک شروع ہوئی اور حکومت پاکستان نے سختی سے اس کی مزاحمت کی تو قاضی محمد جلیل عباسی وزیر اتر پردیش نے اخباروں کو ایک بیان اس تحریک کی حمایت اور حکومت پاکستان کی مخالفت میں جاری کیا۔مولانا دریابادی نے انما المؤمنون اخوۃ کے اصول کے تحت قاضی صاحب پر اعتراض کیا اور حکومت پاکستان کی تائید فرمائی۔میں نے مندرجہ

بالا مراسلے میں استفسار کیا کہ انما المؤمنون اخوۃ کا اصول مسلم عوام پر عائد ہوگا یا مسلم حکام پر۔ جو لوگ تحریک چلا رہے ہیں وہ بھی مسلمان ہیں اور جو اس کی شدت سے سرکوبی کر رہے ہیں وہ بھی مسلمان ہیں۔ مولانا نے جواب دیا کہ دونوں پر اور ساتھ ہی یہ بھی تحریر فرمادیا کہ اب یہ بحث ختم کی جاتی ہے۔ ۲ر دسمبر ۱۹۷۱ء کو ذاتی خط بھی تحریر فرمایا جس میں لکھا کہ ''مضمون کی گنجائش اسی نمبر میں نکل آئی — اگر پورا نہیں تو آدھا تو بہر حال اس نمبر میں انشاء اللہ نکل جائے گا معہ میرے مختصر جوابی حاشیوں کے اور آئندہ کے لئے معذرت کردی ہے۔'' اس خط میں اس موقع پر لکھنؤ میں منائے جانے والے ''جشن فتح'' کا ذکر مولانا نے بہت غم و غصے کے ساتھ کیا ہے لیکن مولانا کے حسنِ انشاء اور حمیت دینی کا بہت اچھا نمونہ ہے۔ لکھا ہے: ''جشنِ فتح یہاں خوب دھوم دھام سے منایا گیا۔ آتش بازی، گولے (نعروں کے ساتھ ساتھ) اس کثرت سے اور اتنی دیر تک چھوٹتے رہے کہ نیند آنا دشوار ہوگئی۔ پھر دن میں جلوس اور مٹھائی کی تقسیم .... جمعیۃ العلماء والے الگ رہے، مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر سید محمود اور مجید خواجہ بھی اگر ہوتے تو شرافت کے ان مظاہروں کو روکنے کی سکت نہ پا کر میرے ساتھ آنسو بہا کر رہتے۔'' اس خط میں اس کے علاوہ بعض اور امور کا بھی ذکر ہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ندوۃ العلماء سے میرے دادا صاحب مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی سوانح لکھوا رہے تھے اور اس کے لئے مولوی (اب ڈاکٹر) شمس تبریز خاں کو مامور کیا تھا اس کے بارے میں تحریر فرمایا ہے کہ وہ مولانا سے ملے تھے اور کچھ لکھ کر دینے کے لئے کہا تھا جو مولانا نے بعد میں ڈاک سے عنایت فرمادیا تھا۔ لیکن اس وقت تک رسید موصول نہیں ہوئی تھی جس سے ''دل دھڑک رہا ہے کہ خط ڈاک میں ضائع نہ ہو گیا ہو۔'' پھر تحریر ہے: ''لائف کا نام کیا رکھا گیا۔ مجھ سے کچھ نہ کہا۔ میں لکھتا تو نام صرف ''صدر یار جنگ'' رکھتا۔'' میں نے مولانا علی میاں کو لکھ دیا تھا کہ کتاب کے نام کے بارے میں مولانا عبدالماجد صاحب کی یہ رائے ہے۔ چنانچہ اس کا نام ''صدر یار جنگ'' ہی رکھا گیا۔

آخر میں تحریر فرمایا: ''اشتراک انگریزوں کے ساتھ کیا جاسکتا ہے یا ہندوؤں کے ساتھ یہ تو تمام تر ایک اجتہادی جزئی مسئلہ تھا۔ اصلی شے دینی حمیت و حرارت ہے۔ جب یہ نہیں دیکھتا ہوں تو دل پھٹ جاتا ہے۔'' میرے نزدیک مسئلہ انگریزوں یا ہندوؤں کے ساتھ اشتراک یا عدم اشتراک کا نہیں تھا بلکہ غلامی اور آزادی کا تھا اور بقول مولانا ابوالکلام آزاد اسلام غلامی کی زندگی گزارنے پر راضی نہیں ہوسکتا تھا۔ ادب مانع تھا۔ اس لئے میں نے اس خط کا جواب نہیں دیا اور نہ

لکھتا کہ اگر مولانا محمد علی حیات ہوتے تو اس خیال سے ہرگز اتفاق نہ کرتے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، میرا جو مراسلہ ۱۹۷۱ء میں قاضی جلیل عباسی صاحب کے بیان اور اس پر مولانا دریابادی کے ردعمل کے سلسلے میں صدق جدید میں شائع ہوا تھا اس پر جوابی حاشیے لکھنے کے بعد مولانا نے اخبار میں یہ بحث ختم کردی تھی اور مولانا کا ارشاد تھا کہ ہمدردی مسلم عوام اور مسلم حکام دونوں کے ساتھ ہونی چاہئے وہ دونوں اس حد تک برسرپیکار ہی کیوں نہ ہوں جس حد تک اس وقت کے مشرقی پاکستان اور بعد کے بنگلہ دیش میں تھے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ ایسی صورت میں ہمدردی کسی ایک ہی کے ساتھ ہوسکتی ہے۔ چنانچہ میں نے اس بارے میں ایک مضمون روزنامہ ''قومی آواز'' لکھنؤ میں شائع کرایا۔ مولانا کو یہ بات ناگوار گزری کہ یہ قضیہ ''قومی آواز'' تک کیوں پہنچا۔ قومی آواز، یہ الفاظ دیگر حیات اللہ انصاری صاحب، مولانا دریابادی کی بعض تحریروں سے اکثر اختلاف کرتا رہتا تھا۔ چنانچہ مولانا نے ۱۱رجنوری ۱۹۷۲ء کے گرامی نامے میں مجھے تحریر فرمایا: ''یہ بہت خوب آپ نے کیا کہ قومی آواز میں مضمون نگاری شروع کردی۔ ظاہر ہے کہ اس میں جو بھی چاہیں بلاغل وغش لکھ سکتے ہیں۔ میں آپ کی شان جلالی سے واقف نہ تھا۔ اب واقف ہوگیا۔ (واقف ہونا شروع ہی سے چاہئے تھا، شروانی بھی بہرحال ''خاں صاحب'' ہی ہوتے ہیں۔'') اس کے بعد مولانا نے موضوع تبدیل فرماکر اس واقعے کا ذکر کیا ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایم۔اے (اردو) کے نصاب میں سجاد انصاری مرحوم کی کتاب ''محشر خیال'' داخل تھی مولانا مصنف مرحوم کے بعض نظریات کی بنا پر چاہتے تھے کہ اسے نصاب سے خارج کردیا جائے لیکن کامیابی نہیں ہورہی تھی۔ تحریر فرمایا ہے: ''آخر میں صدر یار جنگ صدر دینیات کمیٹی کو توجہ دلائی۔ مہینوں بلکہ برسوں کے بعد کتاب کورس سے خارج ہوئی صدق کا تراشہ نقل کرکے ملفوف ہے۔ ساتھ ہی مرحوم (مراد نواب صدر یار جنگ) کے دو کارڈ محفوظ مل گئے تھے، وہ بھی۔'' اور پھر دادا صاحب مرحوم کی سوانح کا ذکر فرمایا ہے کہ ''اگر میں نام رکھتا تو ''صدر یار جنگ'' رکھتا اور اپنے تاثرات کا عنوان ''حبیب کی محبوبیت'' لیکن ظاہر ہے کہ دوسروں کو dictate کرنے والا میں کون؟

خط کا ابتدائی حصہ پڑھ کر مجھے ندامت ہوئی لیکن تیر کمان سے نکل گیا تھا اور اب واپس نہیں آسکتا تھا۔ جو عبارت اوپر نقل ہوئی اس میں مولانا کی زلف کا بکھر بکھر کر سنورنا آپ نے ملاحظہ

فرمایا۔ غصہ آیا لیکن شفقت قائم رہی۔ یہ بھی یاد دلا دیا کہ بزرگوں سے مراسم کیسے رہے تھے۔ غصے میں بھی حسنِ انشاء اور طنز تھی۔ جو مولانا کے قلم کے جوہر تھے، میں فرق نہیں آیا۔ ''محشر خیال'' کے ایم۔اے (اردو) کے نصاب سے خارج کئے جانے کا واقعہ مولانا نے اپنے اس مضمون میں بھی تحریر فرمایا ہے جو نواب صدر یار جنگ کی وفات پر معارف، اعظم گڑھ کے خصوصی شمارے میں شائع ہوا تھا اور پھر اس سے جمہور، علی گڑھ نے اپنے خصوصی شمارے میں نقل کیا تھا۔ اسے آپ میری بدتوفیقی کہئے کہ میں نے جمہور میں اس معاملے میں بھی مولانا دریابادی اور نواب صدر یار جنگ دونوں سے اختلاف کیا تھا۔ یا تو میری وہ تحریر مولانا کی نظر سے نہیں گزری تھی یا یاد نہیں رہی تھی۔ یہ واقعہ پروفیسر آل احمد سرور نے بھی اپنی خودنوشت ''خواب باقی ہیں'' میں اپنے انداز میں بیان کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ انہیں ''محشر خیال'' کو نصاب سے خارج کرنے پر مجبور ہونے کا افسوس ہی تھا۔

جیسا کہ معلوم ہے، ندوۃ العلماء لکھنؤ سے نواب صدر یار جنگ کی جو سوانح عمری شائع ہوئی اس کا نام مولانا دریابادی کے ارشاد کی تعمیل میں مولانا علی میاںؒ نے ''صدر یار جنگ'' ہی رکھوایا۔ مضمون لکھتے وقت ''صدر یار جنگ'' پر نظر ڈالی تو اس میں مولانا دریابادی کا وہ مکتوب موجود ہے جس کا ذکر انہوں نے اپنے ایک مذکورہ بالا گرامی نامے میں فرمایا ہے اور یہ اندیشہ ظاہر کیا ہے کہ ڈاک میں ضائع نہ ہو گیا ہو۔ مصنف نے اس مکتوب گرامی کا الگ سے کوئی عنوان تو قائم نہیں کیا ہے لیکن اس میں بھی ''حبیب کی محبوبیت'' کی ترکیب موجود ہے۔ اور یہ اس ضمن میں ہے کہ ندوۃ العلماء کے ۱۹۱۱ء کے اجلاس میں جب مولانا دریابادی نے مولانا شروانی کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا، ندوہ کے بعض اکابر میں شدید اختلاف تھا۔ مولانا شروانی ''علانیہ مولانا شبلی کی پارٹی کے آدمی تھے'' لیکن وہ منظورِ نظر مخالفین شبلی کے بھی تھے۔ ان کی ''مرجعیت، مقبولیت، ہر دل عزیزی کا یہ عالم تھا کہ قیام مخالف پارٹی کے لیڈر منشی احتشام علی کاکوروی کے یہاں فرمایا تھا، تعلقات اسی درجے کے دوستانہ اور مصالحانہ دوسرے مخالف لیڈروں ...... سے بھی استوار رکھے تھے۔ یہ تھی حبیب کی محبوبیت۔'' لیکن مولانا دریابادی ایک موقع پر ناراض مولانا شروانی سے بھی ہو گئے اور انہوں نے ان سے ملنا جلنا اور خط لکھنا چھوڑ دیا تھا۔ خود ان کی روایت ہے کہ کسی سلسلے میں علی گڑھ میں جمع وہ اور ذاکر صاحب ہو گئے تھے۔ جب ذاکر صاحب کو مولانا کی اس ناراضی کا علم ہوا تو انہوں نے اصرار کر کے مولانا کو حبیب منزل بھیجا کہ وہاں جا کر مولانا شروانی سے ملیں کہ وہ ان کے بڑے ہیں۔ مولانا دریابادی وہاں تشریف لے گئے اور معاملہ ختم ہو گیا۔ مولانا دریابادی نے یہ واقعہ ذاکر

صاحب پر اپنے ایک مضمون میں ان کی تعریف میں لکھا ہے:

مولانا عبدالماجد دریابادی عمر میں میرے دادا صاحب مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی سے تقریباً ۲۷ برس چھوٹے اور مجھ سے کوئی تیس برس بڑے تھے میرے والد مولوی عبیدالرحمٰن خاں شروانی سے کچھ ہی چھوٹے تھے لیکن ان کا احترام کرتے تھے۔ مولانا شروانی ان کے بزرگ تھے اور وہ میرے مخدوم تھے یہ حُسنِ اتفاق ہے کہ ان کی مراسلت دادا، پوتے دونوں سے رہی، اس فرق کے ساتھ کہ دونوں بڑوں میں بیشتر اتفاق رائے رہتا تھا اگر چہ مثالیں اختلاف کی بھی مفقود نہیں اور اس چھوٹے کو اکثر مولانا سے اختلاف رائے کی جرأت ہوتی تھی لیکن بس وہ ناراض ایک ہی مرتبہ ہوئے تھے۔ جس طرح ذاکر صاحب نے مولانا کو حبیب منزل جا کر مولانا شروانی سے ملنے پر آمادہ کیا تھا اسی طرح میرے دوست ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی نے مجھے مولانا کی خدمت میں آخری مرتبہ مسلم یونیورسٹی کے اس پنڈال میں پیش کیا جس میں یونیورسٹی نے ان کی خدمت میں ڈاکٹر آف تھیالوجی کی اعزازی ڈگری پیش کی تھی۔ وہ اس وقت علیل اور کمزور تھے لیکن میں نے اللہ کا شکر ادا کیا تھا کہ ان کی زیارت ہوگئی۔ اسے بھی حسن اتفاق ہی کہا جائے گا کہ مسلم یونیورسٹی ان سے پہلے ڈاکٹر آف تھیالوجی کی اعزازی ڈگری مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو بھی تفویض کر چکی تھی اور اس نے یہی ڈگری بعض دوسرے حضرات کے علاوہ مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمت میں بھی پیش کی تھی۔ مسلم یونیورسٹی سے دینیات میں اعزازی ڈاکٹریٹ حاصل کرنے والے علماء ان چاروں کے علاوہ بس دو چار ہی اور ہوں گے۔

ماہر علم وادب، خادم دین متین

مولانا محمد ولی رحمانی ☆

کیا کہا جائے، اہل قلم حضرات نے الفاظ کا اتنی سخاوت سے استعمال کیا، اور اس سرمایہ کو اتنا بے دریغ خرچ کیا ہے، کہ جملوں کی ساخت اور الفاظ کے آہنگ تو ہیں، ان کی معنویت ماند پڑ گئی اور اہمیت بہت کم ہوگئی ہے، اب کسی بڑی شخصیت پر کچھ لکھا جائے تو کس طرح؟ کہا جائے، تو کیونکر؟ شخصیت پر کچھ لکھئے، ان کی عظمت کو بتایئے تو سہارا انہیں الفاظ کا لینا پڑے گا، جن کو بار بار نہیں ہزاروں بار بڑی بے دردی کے ساتھ قلم سے روندا گیا اور زبان سے مسلا گیا ہے، احساسات کی ترجمانی میں دل کو ہمیشہ لفظوں کی تنگ دامانی کا شکوہ رہا ہے، مگر یہ تو بعد کا مرحلہ ہے، پہلے جو مرحلہ آتا ہے وہ یہ ہے کہ جو خزانہ لفظوں کا ہے اس کی معنویت اتنی مدھم ہو چکی ہے کہ حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی کی طویل خدمت کی عظمت کو اجاگر نہیں کر پاتا، اور مجبوری یہ ہے کہ سہارا انہیں پامال لفظوں کا لینا ہے اور بات انہیں گھسے پٹے جملوں میں کہنی ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی مفکر تھے، فلسفی تھے، ادیب تھے، بڑے نقاد اور طنز نگار تھے، مفسر قرآن تھے، شریعت کے بڑے پابند اور طریقت کے لذت آشنا تھے، وہ بہت کچھ تھے، ان کے علم میں گہرائی اور گیرائی تھی، جس نے ان کے سادہ جملوں میں نکھار اور روشنی بخش دی تھی، فلسفہ سے انہوں نے شعوری زندگی کی بسم اللہ کی، اور قرآن پاک پر ان کے فکر وقلم نے تمت بالخیر لکھی، اس لئے ان کے علم وقلم کے نمونوں میں غور وفکر، تلاش وتحقیق کے ساتھ زبان وادب کی بڑی حسین ہم نشینی نظر آتی ہے، پر جس چیز کا لوہا سبھوں نے مانا، بڑے بڑوں نے داد دی، اور جس امتیاز نے انہیں میر مجلس بنا دیا، وہ ان کی ادبی حیثیت ہے، تحریر کا وزن ہے، لکھنے کا چوکھا انداز ہے۔ وہ لفظوں

☆ سجادہ نشین خانقاہ رحمانی، مونگیر (بہار)

کے رمز شناس تھے، جملوں کو انداز اور ادا دینے والے تھے، انہوں نے اپنے قلم سے لفظوں کے برتنے کا فن سکھایا اور جملوں کی ترتیب کی تہذیب بنائی۔

محسوسات، معلومات، خیالات کی حیثیت روح کی ہے، الفاظ اور جملے ان کا جسم ہیں، یہ نہ ہوں تو وہ غیر مرئی ہیں، نظر نہ آئیں، لیکن یہ نظر نہ آنے والا سر مایہ فکر وفن نہ ہو، تو جملے شکوہ الفاظ کا نمونہ تو ہو سکتے ہیں، عظمت معنی سے خالی ہوں گے، جسم بلا روح کی طرح، جیسے کاغذی پھول، خوشبو اور نعومت سے نا آشنا! مولانا دریابادی نے علم و دانش کے سرمایہ سے دل اور دماغ آباد کیا، غور وفکر کی عادت ڈالی، حکمت و ہدایت کی پرتوں اور سلوٹوں کا بھری نظر اور گہری نگاہ سے جائزہ لیا، اور جس نتیجہ تک پہونچے انہیں کاغذ پر محفوظ کر دیا، وہ پوری زندگی علم و تحقیق، فکر ونظر کے سمندر سے موتی چنتے رہے اور سادہ الفاظ میں اچھی ترتیب وترکیب کے ساتھ صفحات پر جڑتے اور دلوں پر نقش کرتے رہے، انہوں نے علم وفن کا، زبان وادب کا، بے بہا اور سدا بہار خزانہ جمع کر دیا، ان کی کتابیں ہی نہیں سچ اور صدق کے صفحات بھی اس کی گواہی دیتے ہیں۔

تفسیر وحدیث کی بحث، فلسفہ اور کلام کی ژولیدگی کو چھوڑ یئے، زبان وادب کے معاملات پر انہوں نے جو کچھ یہاں وہاں لکھا ہے، اس کی گہرائی، لسانیات پر ان کی قدرت، زبان پر ان کی گرفت کا شاہکار ہے...... اچھی زبان کون لکھا پڑھا شریف انسان لکھنا نہیں چاہتا، لیکن یہ اچھی زبان ہے کیا، کیا معیار ہے اس کا؟ ذرا سنئے: ''عبارت دقیق ہو ثقیل نہ ہو، سادہ ہو پھیکی نہ ہو، سلیس ہو سپاٹ نہ ہو، سنجیدہ ہو خشک نہ ہو، عام فہم ہو عامیانہ نہ ہو، لطیف ہو رکیک نہ ہو، ٹھوس ہو ٹھس نہ ہو، فکر انگیز ہو مگر بور کرنے والی نہ ہو، پرزور ہو مگر پرشور نہ ہو'' (شبلی، انسان، مصنف، مصنف گر ــ بموقعہ گولڈن جوبلی دار المصنفین اعظم گڑھ)۔ یہ آہنگ ہے مولانا دریابادی کا، کیسا تعارف انہوں نے اچھی عبارت، اچھی زبان کا کرایا، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ لفظوں کو چن چن کر چن رہے ہیں، نگینہ کی طرح جڑ رہے ہیں، اور کاغذ پر ہی نہیں، دل میں لفظوں کا تاج محل کھڑا ہو رہا ہے، اور لگتا ہے دھیرے سے آواز آرہی ہے ۔

دریا کے کنارے تو ہے توہین محبت
ہم تاج محل دل میں ہی تعمیر کریں گے

وہ چاہے خالص ادبی تحریر ہو، کسی ڈے منانے والوں کے نام پیغام ہو، ریڈیائی گفتگو ہو،

کتابوں پر تبصرہ ہو، کلام اور فلسفہ کی دقیق بحثیں ہوں، یا قرآن وحدیث کی تشریح وتعبیر، وہ کچھ لکھیں لفظوں کی ترتیب اور جملوں کے ساخت سے بات پیدا کرتے ہیں، ان کی تحریروں میں شکوہ معنی ہے جلوہ الفاظ کے ساتھ، اور الفاظ کا یہ نکھار کچھ اسی انداز کا ہے جیسے کسی آرٹسٹ کا برش مختلف رنگوں کی لکیروں سے جاذب نظر تصویر کو سامنے لاتا ہے، اب ذرا ''سنجیدہ ہو خشک نہ ہو، عام فہم ہو عامیانہ نہ ہو، لطیف ہو رکیک نہ ہو، ٹھوس ہو ٹھس نہ ہو'' پر بار بار غور کیجئے، انہوں نے سادہ لفظوں کی ترتیب ایسی رکھی ہے، کہ سادہ لفظوں کی قیمت بڑھ گئی، مفہوم کھل گیا، جملوں کا وزن دوبالا ہو گیا، کلام کا حسن نکھر گیا اور مولانا دریابادی کی زبان پر بے پناہ گرفت جھانکتی نظر آنے لگی۔

ایک ساتھ رہنے والوں میں گلے شکوے ہوتے رہتے ہیں، امیدیں ٹوٹتی ہیں، تو مایوسی بھی ہوتی ہے، توقع کے خلاف کوئی کچھ کر دے، تو جھنجھلاہٹ ہونا ہی ہے، آرزوؤں پر کوئی پورا نہ اترے، تو لگتا ہے کہ فاصلے خود بیچ میں کھڑے ہو گئے ہیں، مولانا بھی انسان تھے، بڑے تھے، بڑوں سے رابطہ تھا، شکایت تھی تو وہ بھی بڑی تھی، محبت تھی تو وہ بھی بلند، اور اونچے مقاصد کے لئے، اپنے لئے نہیں، قوم وملت کے لئے، علم وحکمت کی خاطر..... مولانا کے قریبی تعلقات ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے تھے، نائب صدر اور صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین سے ان کی کچھ کھٹاس تھی، اور ترشی تدریجاً کڑواہٹ سے قریب ہوتی گئی۔ یہ بھی واقعہ ہے، کہ ڈاکٹر صاحب کے دل میں ملت کے لئے فکرمندی بھی تھی، دردمندی بھی، مگر یہ احساس پڑھے لکھوں میں عام رہا ہے کہ ملت کی خدمت کا صفحہ ان کے دور صدارت میں سادہ ہی رہا، مولانا دریابادی اس احساس میں شریک تھے، صدق کی فائلوں میں اس احساس کی لہریں ملتی ہیں، اس پس منظر کے ساتھ مولانا کو سنئے:

''رہے صدر محترم ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب تو ان کی شرافت نفس کے اتنے اور نئے اور تازہ نمونے دیکھنے میں آئے (جشن شبلی جوبلی دارالمصنفین اعظم گڑھ کے موقعہ پر) کہ دل اگر ان پر نکتہ چینی کرنا چاہے تو بھی اس کی ہمت کہاں سے لائے اور زبان اس پر کیونکر کھل پائے۔'' (ایک جشن جوبلی بحوالہ انشائے ماجد)

اگر اسے طنز کہئے، تو طنز دلخراش نہیں دلنواز ہے، اور اگر ہجو سمجھئے تو دائرہ شرافت میں، احتیاط کے پردہ میں، ایسا کثیف کہ سب کچھ نظر نہ آئے اور اتنا لطیف کہ بہت کچھ دکھائی دے۔ یہ ان کا آرٹ ہے، زبان وبیان کی مہارت ہے!

بات پرانی ہے، پورے پچھتر سال پرانی، مشہور صحافی اور ادیب سید جالب دہلویؒ پر لکھتے لکھتے جو لکھ گئے ہیں، بس پڑھئے اور سر دھنئے، یاد رہے یہ تحریر صحافی اور صحافت سے متعلق ہے، اور دور شرافت کی ہے، اب عہد تجارت ہے، مولانا کی پھیلائی ہوئی روشنائی آج بھی بالکل تازہ لگتی ہے...... "ان کمالات کے باوجود جالب صاحب موجودہ جرنلزم کے اہل نہ تھے، نہایت بامروت اور بڑے وضعدار تھے، سخت کلامی اور دشنام نگاری جانتے نہ تھے، دھمکا دھمکا کر اور ڈرا ڈرا کر تحصیل زر کے فن سے بیگانہ محض تھے، مزاج میں سادگی تھی، تکلفات سے بری تھے، طبیعت کے بھولے تھے، بزرگوں کا ادب ولحاظ اور چھوٹوں کے لئے شفقت ومحبت دل میں رکھتے تھے، جن کے دوست ہوتے حاضر وغائب یکساں اس کے ہوا خواہ رہتے، بڑے ہو کر چھوٹوں کا مشورہ قبول کر لینا گناہ نہیں سمجھتے تھے، مشرقی معاشرت اور اسلامی آداب کے دلدادہ تھے، بیسویں صدی کی چلت پھرت اور روشن خیالیوں سے عاری تھے، غرض فن صحافت جدید کے جو ہنر سمجھے جاتے ہیں، ان سب سے قطعاً ویکسر کورے تھے۔" (سید جالب مرحوم، انشائے ماجد ص:۲۷۶)

جالب صاحب مرحوم کی جو تعریف ہوئی، وہ تو مقصد تھا، اس تعریف کے پردہ میں جدید صحافت کا جو تعارف کرایا، وہ بھی تین چوتھائی صدی پہلے، یہ دور اندیشی، یہ پیش بینی، اور تعریف کا یہ انداز بس مولانا کا حصہ تھا، اور زبان دیکھئے تو کل تو تازہ تازہ تھی ہی، آج بھی بالکل تازہ ہے، ساتھ ہی مفہوم صداقت سے لبریز، بلکہ لبالب!

مولانا دریابادی کی تحریروں کی ایک ادا یہ بھی ہے کہ مضمون کسی سے متعلق ہو، موقعہ کی مناسبت سے کسی خاص مسئلہ پر اپنی رائے چند جملوں میں دے دیتے تھے...... الفاظ کے ذخیرہ میں کچھ تو بالکل عریاں گھٹیا قسم کی ہیں ان کی بات نہیں ہے، لیکن عام طور پر جنہیں گھٹیا لفظ سمجھا جاتا ہے، مولانا دریابادی حضرت اکبر الہٰ آبادی کی اوٹ میں کہتے ہیں۔ "حق یہ ہے کہ زبان کا کوئی لفظ بھی بجائے خود نہ مبتذل ہے نہ خلاف متانت، اصل شے اس کا موقع ومحل استعمال ہے اور اکبر الہٰ آبادی اس موقع شناسی کے بادشاہ تھے، الفاظ سے گزر کر یہی سلوک محاوروں، مثالوں کے ساتھ کرتے رہتے، بازار میں چلتے پھرتے کہیں سے محاورہ یہ بتیالائے کہیں سے وہ، بلاغت کے سانچہ میں ڈھال، رنگ روپ ان کھلونوں کو کچھ اس طرح کا دے دیا، کہ جس کی نظر پڑی، لٹو ہو گیا (پیام اکبر، انشائے ماجد ص:۳۶) مولانا کے ان جملوں پر گہری نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ

انہوں نے نہ صرف اپنی رائے ظاہر کردی بلکہ بعض لفظ کا استعمال ایسا کیا جس سے دلیل بھی ہاتھ کے ہاتھ مل گئی۔

مولانا دریابادی کی میراث کا خاصا بڑا حصہ وہ ہے جو کتابوں کے تبصرہ کی شکل میں سچ اور صدق کے صفحات میں مدفون ہے، سہولت پسندی کے دور میں فائلوں کو پھٹکنا، چھاننا اور کام کی بات نکالنا ٹیڑھی کھیر ہے، کچھ لوگ اس سمت میں بڑھے، ان کا ذوق طلب اور جوش عشق جوان رہے، اس کی دعاء ہی کی جاسکتی ہے،......مولانا کے یہ تبصرے بڑے جاندار اور زبان وادب کے نمونے ہیں، ان تبصروں میں اچھی کتابوں پر لفظوں کی بخشش وہ ضرور دیتے، مگر غلطیوں پر بخشائش کسی کی نہیں ہوتی تھی، ہاں! ان کا خاص انداز نپا تلا، لفظوں میں احتیاط، طنز ایسا کہ منھ میلا نہ ہو، چوٹ ایسی کہ مار کھائے سہلا نہ سکے، حقیقت بیانی ایسی کہ سچ بھی باحوصلہ لگے، مختصر جملوں میں جہانِ معنی کو سمیٹنا مولانا کے تبصروں کا امتیاز ہے، آخری دور میں یہ تبصرے زیادہ مختصر ہوتے تھے، ماضی بعید میں اکثر مفصل۔

مرحوم شوکت تھانوی کو کون نہیں جانتا، انہوں نے شوخ نگاری کو فن کا درجہ دیا، "شیش محل" ان کی کتاب کوئی ساٹھ سال پہلے چھپی تھی، اس پر مولانا دریابادی کے تبصرہ کا ایک حصہ یہ ہے "شیش محل ان کے مطالعہ بشری کا ثمرہ ہے، اپنے ملنے والوں میں سے ۱۱۲ کے چہرے حروف تہجی کی ترتیب سے انہوں نے اس قلمی آئینہ میں دکھادیئے ہیں، سب کے سب کسی نہ کسی حیثیت سے ادب ہی سے تعلق رکھنے والے ہیں، یہ اور بات ہے کہ افراط نازک خیالی سے کہیں صرف کتب فروش کو بھی اس تعلق کے لئے کافی سمجھ لیا گیا ہے۔"......دیکھئے مولانا نے معیار انتخاب پر کس طرح کس کے تنقید کردی، مگر انداز ایسا ہے کہ پڑھئے مگر منھ نہ لگئے، مولانا آگے لکھتے ہیں: "یہ قلمی کارخانہ یوں کہئے کہ عجائب خانہ ہے، بعض ان مشاہیر میں اتنے مشہور، کہ ان کا تعارف بھی ان کی توہین، بعض ایسے گمنام کہ اتنی تعریف وتعارف کے بعد بھی مجہول کے مجہول، ان میں ہندو بھی ہیں مسلمان بھی، بوڑھے بھی ہیں اور جوان بھی! بعض ایسے ہیں جو سب کچھ ہیں، بعض ایسے ہیں جو کچھ بھی نہیں، ایسے بھی جن کا پیچھا شہرت نہیں چھوڑتی، ایسے بھی جو شہرت کی تلاش میں دوڑتے دوڑتے تھک چکے ہیں۔"

مرحوم شوکت تھانوی بڑے پختہ کار تھے، ایک تفریحی صنف ادب کو فن کی عظمت بخشی، مولانا

دریابادی نے ان کے کام اور ان کی کتاب کے وزن کو یوں بڑھایا یہ چیز محض تفریح اور دل لگی کی نہیں، بلکہ اسی سے بڑے بڑے سنجیدہ مؤرخ خوشہ چینی کریں گے، آخر آج بھی کتاب الاغانی کے حوالے کس شدومد کے ساتھ مغرب ومشرق کے بڑے بڑے سنجیدہ مؤرخ دے رہے ہیں، پھر کیا یہ ادیب اور شاعران گویوں کے سازندوں اور ڈھاڑیوں سے بھی گئے گذرے ہو گئے ۔''—اس بلندی پر پہونچانے کے بعد مولانا نے ایک کمی یہ بتائی، کہ جب بڑے چھوٹے، اونچے نیچے، کہ مہ، سب زیب داستاں ہیں، شوکت تھانوی نے کیا قصور کیا تھا، کہ اسی کا چہرہ اس کے قلم سے بچارا اس کی نگاہ سے چھپا رہا— '' کمی اور بڑی کمی اس کتاب میں یہ ہے کہ نگار خانہ خود مصور کے مرقع سے خالی ہے، مجنوں کا ڈرامہ بغیر مجنوں کے پارٹ کے، برات بغیر نوشہ کے، عرضی دعویٰ بغیر بقلم خود کے؟ ظریف کی ستم ظریفی!''۔ (شیش محل، صدق جدید نومبر ۱۹۴۲ء بحوالہ انشائے ماجد ص:۳۸۶)

میں نہیں جانتا کہ مولانا کو لفظوں میں جان ڈالتے وقت کتنی مشقت اٹھانی پڑتی تھی، اور جملوں کو سجانے میں کتنا وقت لگتا تھا، ان کی تحریر کا جو سادہ مگر بے پناہ انداز ہے، اس کی نقالی کیجئے تو پتہ چلے گا کہ آسان لکھنا بڑا کٹھن ہے، مختصر لکھنا وقت طلب ہی نہیں وقت طلب بھی ہوتا ہے، ہوسکتا ہے، مولانا کو دل کی بات کاغذ پر اتارنے میں دیر لگتی ہو، مگر میرا احساس یہ ہے کہ اس طرز ادا کے لئے ان کا دماغ اور حافظہ عادی ہو گئے تھے، ان کے دو چار خطوط جو مجھے لکھے گئے تھے اور بہت سارے خطوط جو والد بزرگوار مولانا منت اللہ صاحب رحمانیؒ کے نام آئے تھے، اس میں یہ طرز وانداز بہت نمایاں تھا، میں نے ان کے آخری دور کے خطوط دیکھے ہیں، ان کا پڑھنا گرچہ آسان نہ تھا، مگر کٹے ہوئے حروف بہت کم نظر سے گذرے، نہیں کے برابر۔ جس انداز سے وہ لکھتے تھے گفتگو میں بھی وہ لہجہ وہ آہنگ جھلکتا تھا۔ مجھے یاد ہے دارالمصنفین کے جشن (سلور جوبلی) کے موقعہ پر مولانا کے ساتھ ساتھ والد ماجد جلسہ گاہ جا رہے تھے، میں بھی ساتھ تھا، انہوں نے سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھا، جیسے پوچھ رہے ہوں ''بڑوں میں یہ چھوٹا کون ہے؟'' والد صاحبؒ نے بتایا یہ میرا لڑکا ہے، محمد ولی، فوراً میرے کانوں میں مولانا کی آواز پہونچی: ''ولی، ولی زادہ''۔

اس دراز نفسی کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ وہ صرف زبان وادب کے مولانا تھے، زبان وادب پر ان کی بڑی گرفت اور دور تک دسترس ضرور تھی، انہوں نے گیسوئے اردو سنوارا، اردو کے

رخ تاباں کومشرقی حیا کا زیور اوراسلامی سوچ کی عظمت سے مالا مال کیا،مگران کے مطالعہ اور فکری زندگی کا سفر بر کلے کے کلام سے شروع ہوکر کلام اللہ تک پہونچا،اورعلامہ شبلی کی زبان میں ''خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہوتا تھا'' وہ شک وشبہ کے مرحلے سے گذرکر،ارتداداورالحاد کی گلی کوچوں سے ہوکر شاہراہ حقیقت تک پہونچے،انہوں نے تجدید ایمان بھی کیا،تجدید بیعت بھی کی،دین متین کو سمجھا بھی،سمجھایا بھی،تقویٰ اورسلوک کی راہ پسند کی،اس کی تربیت حاصل کی،ان مرحلوں سے گذرے،جن سے ایک مسترشد گذرتا ہے،اورمرشد بنتا ہے،مرشد تھانوی نوراللہ مرقدہ کے قدموں میں بیٹھ کر حکمت دین کی تمازت،یقین پر استقامت،تقویٰ کی حلاوت اور زندگی کی مقصدیت پائی۔

پختگی کے دور کا یہ رنگ مولانا دریابادی کا اصلی رنگ ہے،اس عہد میں مولانا نے اپنے بے پناہ قلم سے جہاں زبان وادب کے نمونے تراشے،وہیں علم وقلم سے دین کی خدمت انجام دی،ان کے مقالات،ان کی کتابیں،خاص طور پرتفسیر ماجدی اور مشکلات القرآن کے علاوہ ان کے قلم سے نکلے صدق کے شذرات،سچی باتیں،خبروں پر تبصرے اوران کی تحریروں پر ایمان کی گہری چھاپ ملتی ہے اور یقین کا پرتو نظر آتا ہے......مولانا اس زمانہ کے بی اے تھے،جب ہزاروں میں ایک آدھ میٹرک پاس ملتے تھے،جب کلرکی معیاری ملازمت سمجھی جاتی تھی،اور مائیں بچوں کوڈپٹی کلکٹر بننے کی دعائیں دیتی تھیں،اس زمانہ کا بی اے بڑی چیز تھی،اور کالج کی تعلیم کو معیاری علم کا سمبول مانا جانے لگا تھا،اس عہد کا پروڈکٹ ہونے کے باوجود جب منزل پر منزل مارتے مولانا''علم'' کے آشنائے راز ہوئے تو لکھا:

''سنتے آئے ہیں،کہ ہر درد کی دواعلم ہے،خاک سے پاک کرنا علم کا کام ہے،محتاج کوغنی کرنا علم کا فیض ہے،بیمار کوتندرست کرنا علم کی مسیحائی ہے،کہیں اور کبھی بیشک یہی ہوتا ہوگا،لیکن اپنے نصیب کو کیا کہہ کر روئیے،کہ یہی تریاق زہر بن گیا ہے،ہمیں سابقہ جس علم سے اس دور میں پڑا ہے،وہی تو امراض کا مورث ہے،مفاسد کی اصل اور بدبختیوں کا منبع،جسے شربت کا نام دیا گیا،وہی جام زہر نکلا،جسے رہبر کہہ کر پکارا گیا وہی رہزن ثابت ہوا،جس نظام کو ہم نے نام علم اور تعلیم کا دے رکھا ہے،وہی تو عین جہل ہے،یہ تو عین وہی علم ہے،جس کا مقصود دلوں میں حُب دنیا راسخ و پختہ کرنا ہے،خیال عقبیٰ وآخرت کے لئے اس تعلیم کے نصاب میں کوئی جگہ نہیں،نصاب

تعلیم کا فلسفہ خدااور رسول کے اعتقاد سے نا آشنا، اس کا سائنس مادیات کے اوپر کچھ دیکھنے سے اندھا‘‘ ـــــ (پیام اکبر، انشائے ماجد ص:۹۸)

علم برائے معدہ اور مادہ، یا علم برائے قلب ونظر، اصلاح وعمل، اس بحث کو کسی دوسرے سیمینار میں طے کیجئے گا، یہاں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ تحویل قبلہ کے بعد پختگی کے دور میں مولانا مرحوم کا نقطہ نظر کیا تھا، زندگی کے دوسرے دور میں علم کے ساتھ تصوف سے ان کا شغف بڑھتا گیا، انہوں نے حکیم الامت لکھی جو راہ سلوک کے طالبوں کے لئے مستقل راہ نما ہے، اور ان کے صوفی مشرب ہونے کا کھلا ثبوت، لیکن اس کتاب سے ہٹ کر خود تفسیر قرآن میں جہاں تھوڑی سی بھی گنجائش نظر آئی، انہوں نے تفسیری نوٹس میں تصوف کے مسائل کی طرف بڑے سلیقہ سے اشارہ کیا، کہیں تشریح زبردست، کہیں استدلال باوزن، اور کہیں لفظوں اور جملوں کی صنعت سے انہوں نے مفہوم اور معنیٰ کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا ہے۔ پڑھئے اور عش عش کیجئے۔

قرآن مجید میں ہے کہ حضور ﷺ کی مجلس میں بعض بیٹھنے والے بے دھیان رہتے تھے، اس لئے انہیں فائدہ نہیں ہوتا تھا۔ **ومنهم من يستمع اليک حتى اذا خرجوا من عندک قالوا للذين اوتوا العلم ماذا قال انفا** (سورۂ محمد آیت:۱۶) مولانا دریابادی نے تفسیر کرتے ہوئے لکھا ’’محض صحبت وہم نشینی بڑے سے بڑے مرشد کے پاس بھی بے اثر رہتی ہے، جب تک بیٹھنے والے کے دل میں قصداً استفادہ نہ ہو (تفسیر ماجدی ص:۱۰۱۶) مجلس نبوی ﷺ میں بے دھیانی کے نتیجہ کو سامنے رکھئے اور دیکھئے مولانا مرحوم نے تصوف کے سبق ’’صحبت شیخ‘‘ میں ’’اصلاح نیت‘‘ کے لئے کیسا لطیف استدلال کیا ہے۔

قرآن مجید کے تھوڑے تھوڑے حصے نازل ہو رہے تھے کفار نے مسئلہ یہ کھڑا کیا، کہ یہ کتاب ایک ہی بار کیوں نہیں اتار دی جاتی؟ قرآن مجید نے وضاحت کی یہ ٹھہر ٹھہر کر اتارنا اس لئے ہے تاکہ آہستہ آہستہ نازل ہونے کی وجہ سے حضور پاک ﷺ کا دل جما رہے، **لنثبت به فؤادک** (سورۂ الفرقان:۳۲) ـــــ بظاہر یہاں تصوف کا کوئی مسئلہ نہیں ہے، مگر حضرت دریابادیؒ کی تشریح دیکھئے کیا استدلال کیا اور بات کہاں پہونچی: ’’ایک بڑی مصلحت اس تدریجی نزول قرآن میں تو رسول کی تقویت قلب ہے، مشائخ نے کہا کہ ثمرات ومقامات میں جو تاخیر اور تدریج ہوتی ہے اس میں بھی یہی حکمت ہے، کہ ثبات ورسوخ حاصل ہوتا جائے، جو چیز جلد آتی

ہے وہ جلدی نکل بھی جاتی ہے، سالک کو دیر ہونے سے تنگ نہ ہونا چاہئے بلکہ صبر کرنا چاہئے، علماء کے یہاں تعلیم کا سبقاً سبقاً ہونا اور مشائخ کے یہاں افادہ وافاضہ میں تدریج اسی آیت سراپا حکمت کی ماتحتی میں ہے۔ (تفسیر ماجدی ص:۷۳۵)

''ظاہر اور باطن ایک ہونا چاہئے'' یہ تصوف کی بنیادی تعلیم ہے، اور ایک صوفی کی ذمہ داری بھی ــــــ حضرت علامہ شبلی نعمانیؒ کو تصوف سے مناسبت نہیں تھی، مگر علامہ شبلی پر لکھتے لکھتے انہوں نے تصوف کا نام لئے بغیر تصوف کی ایسی تعلیم دی کہ بے نام لئے تیرا ہم تجھ کو پکار آئے کا منظر سمجھ میں آگیا۔ لکھتے ہیں: ــــــ ''ان کا سب سے بڑا راحت کدہ ان کا کتب خانہ ہی تھا، یہ ذوق ان کی اصل طبیعت اور سرشت بن گیا تھا، اور چونکہ یہ حال تھا محض قال نہ تھا، آمد تھی، آورد نہ تھی، اور تکلف وتصنع کو اس میں دخل نہ تھا، اس لئے ان کا ذوق متعدی بھی تھا، اور دوسروں کو قوت کے ساتھ متاثر کرتا رہتا، اور جو ان کی صحبت میں اٹھا بیٹھا وہ خود اگر مصنف نہیں، تو مضمون نگار تو بن ہی گیا، جمال ہم نشین درمن اثر کرد کی تصدیق .....'' (انسان، مصنف، مصنف گر، بحوالہ انشائے ماجد ص:۴۸۶)

ظاہر اور باطن کی یکسانیت اور ہم نشینی کی برکت علامہ شبلیؒ کے ذوق مطالعہ اور شوق کتب خانہ کے درمیان تلاش کر لینا مولانا دریابادیؒ کے مزاج تصوف کا تصرف ہے...... دیکھا گیا ہے کہ وادی تصوف سے گذرنے والا جب قلم اٹھاتا ہے تو زبان سادہ نہیں سپاٹ ہوجاتی ہے، مگر دیکھئے مولانا نے جو زبان استعمال کی ہے، وہ نہ صرف دل کو چھو لینے والی ہے، بلکہ جملہ کو نیا آہنگ نئی تہذیب دینے والی ہے، یہ بھی ہوتا ہے کہ منجھا منجھایا قلم جب علم وتحقیق کی راہوں سے گذرتا ہے تو زبان بڑی اکھڑ کھابڑ ہوجاتی ہے، مگر مولانا مرحوم جب بھی ان مرحلوں سے گذرے کامیاب گذرے ہیں، انہوں نے قرآن پاک کی تشریح وتفسیر لکھی، بڑے نازک اور مشکل مرحلے آئے مگر وہ خوب گذرے، تفسیر میں کوئی نئی بات کہاں سے پیدا کرے مگر انہوں نے بحث وتحقیق کا حق ادا کیا، اور زبان وبیان کا سکہ وہاں بھی جمائے رکھا، ذرا تیور ملاحظہ کیجئے۔

سورۂ بقرہ (۱۲) میں ہے الا انهم هم المفسدون ولكن لايشعرون کے ذیل میں لکھتے ہیں: "اَلا کلمہ تنبیہ ہے، عربی میں خبردار ہوجاؤ آگاہ رہو کے معنی ہیں، لفظ "اجی" میں اگر متانت کی کمی نہ ہوتی تو اردو میں اس مفہوم کے لئے یہی بہترین لفظ ہوتا"۔ (تفسیر ماجدی ص:۹)

سورۂ اعراف (۹۰) میں ہے انکم اذا لخاسرون تشریح کچھ ایسی ہے ''جملہ خاص زور دینے کے لئے ہے جیسے اردو میں کہیں کہ بس تم بالکل ہی چوپٹ ہوکر رہے۔'' (تفسیر ماجدی ص:۳۴۵) سورۂ البقرہ (۱۸۳) میں ہے لعلکم تتقون، مولانا کی تشریح سنئے ــــ ''ایک عجیب جامعیت کا دولفظی ننھا سا فقرہ ہے جس کے اندر ساری ظاہری اور باطنی اور انفرادی اور اجتماعی فضلیتیں آ گئیں، گویا مقصود صرف حصول تقویٰ ہے، تقویٰ نفس کی ایک مستقل کیفیت کا نام ہے، جس طرح مضر غذاؤں اور مضر عادتوں سے محتاط رہنے سے جسمانی صحت درست ہو جاتی ہے، بھوک کھل جاتی ہے، خون صالح پیدا ہونے لگتا ہے، مادی لذتوں سے لطف و انبساط کی صلاحیت زیادہ پیدا ہو جاتی ہے، اسی طرح اس عالم آب وگل میں تقویٰ اختیار کئے رہنے سے آخرت کی نعمتوں سے لطف وانبساط کی صلاحیت انسان میں پوری طرح پیدا ہو کر رہتی ہے۔'' (مشکلات القرآن ص:۳۹)

کسی زبان کی بلیغ تعبیر اس زبان کی خصوصیت ہوتی ہے، زبان تدریجاً پروان چڑھتی ہے، اور آہستہ آہستہ مخصوص پس منظر میں محاورے، کہاوتیں، تعبیریں جنم لیتی ہیں، ان کا ترجمہ کرنا بہت مشکل ہے، اس مفہوم جیسے الفاظ ڈھونڈے جاسکتے ہیں، ہم معنی کلمات بھی مل سکتے ہیں، مگر وہ پس منظر وہ تاریخی روایتیں اور اظہار خیال کی وضع کہاں سے لائی جاسکتی ہے؟ ترجمہ خاصا دشوار کام ہے، خاص کر ترجمۂ قرآن زیادہ مشکل کام ہے، مولانا دریابادیؒ نے اپنی تفسیر میں ترجمہ تو حضرت تھانویؒ کا رکھا، ساتھ ہی، مولانا مرحوم نے عربی تعبیر کے لئے اردو جامہ کہیں تراشا ہے، کہیں تلاشا ہے اور کہیں متبادل اردو تعبیر سے مفہوم کو سمجھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

سورۂ یوسف (آیت ۷۳) میں حضرت یوسفؑ کے بھائیوں کا جملہ نقل کیا گیا ہے: قالوا لقد علمتم ماجئنا لنفسد فی الارض، مولانا لکھتے ہیں: ''خطاب یہاں عہدہ داران سرکاری سے ہے۔ اور ''تاء'' قسم اور لقد کی دہری تہری تاکید سے اپنے دعویٰ پر انتہائی زور دینا مقصود ہے، جیسے اردو میں کہتے ہیں کہ ''یہ خیال ہی آپ کو کیسے پیدا ہوا''۔ (تفسیر ماجدی ص:۵۰۱)

بندہ خدا کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے، مانگتا ہے تو خدا بندہ سے بہت قریب ہوتا ہے، و اذا سألک عبادی عنی فانی قریب اُجیبُ دعوۃ الداع اذا دعان فلیستجیبوا لی ولیومنوا بی لعلھم یرشدون (البقرہ ۱۸۵) دھیان دیجئے، مولانا فرماتے ہیں ــــ ''اس ایک آیت کے اندر ضمیر متکلم کتنی بار عنی میں، فانی میں، اجیب میں، دعان میں، لی میں، بی میں،

صیغہ واحد میں آئی ہے، زبان کے نکتہ سنجوں اور بلاغت کے رازآشناؤں کا قول یہاں پہونچ کر پھر یاد کر لیجئے، کہ ضمیر جمع متکلم جس طرح دلالت کرتی ہے، قدرت عظمت وقوت پر، اقتدار وحکومت پر، ضمیر واحد متکلم اسی طرح مخصوص ہے، التفات اختصاص اور یگانگت کے لئے، خوش نصیب بندے تیرا پروردگار تجھ کو کتنا اپنے قریب کھینچتا جارہا ہے۔'' (مشکلات القرآن ص:۴۱)

یہ بحث خالص علمی ہے، تفسیری ہے، اور مسئلہ نحو کا ہے، جس کی خشکی لو ہا بے عرق جیسی ہوتی ہے، مگر مولانا کے سدابہار قلم نے اس دقیق بحث میں زبان کی شگفتگی کو کملانے نہیں دیا ہے، اور تفسیری لحاظ سے جو بات انہوں نے لکھی ہے، وہ گرچہ نئی نہیں، مگر پڑھئے تو ایسا لگتا ہے جیسے ابھی ابھی پہلی مرتبہ یہ نکتہ سامنے آرہا ہے، یہ ہے انداز بیان کی چستی اور چابک دستی، اور یہ بھی امتیاز ہے مولانا دریابادیؒ کا!

مولانا دریابادیؒ کی تحریر میں جو رچاؤ جو کشش ہے، جو حسن معنی اور جلوہ صورت ہے، جو دلوں کو کھینچ لینے والی کیفیت ہے، اسے صرف صنعت لفظی نہیں کہا جاسکتا، تاثیر کا تعلق تدبیر سے نہیں، دل کی قوت اور عمل کی طاقت سے ہوتا ہے، وہ آبگینۂ دل کو چھوتے تھے اور حسن تحریر کا گنج گرانمایہ کاغذ پر اتر آتا تھا، وہ اپنی تحریروں کو خون دل پلاتے، جو کہتے دل کی گہرائی سے! اور دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے، اور دل سے جو بات نکلتی ہے جواں رہتی ہے! ان کی تحریر پُر تاثیر، ہمہ دم جواں، ہمیشہ پُر بہار۔

تفسیر ماجدی ـــــ امتیازات وخصوصیات

مولانا عمید الزماں قاسمی کیرانوی ☆

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ متنوع کمالات کی جامع شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک فلسفی، ممتاز صحافی اور صاحب طرز انشاء پرداز تو تھے ہی، انگلش پر کامل دسترس رکھنے کے ساتھ ساتھ عربی زبان کی باریکیوں پر گہری نظر رکھنے والے جدید علوم سے بہرہ ور ایک عظیم محقق اور وسیع المطالعہ عالم دین بھی تھے۔ اسی کے ساتھ ''تفسیر ماجدی'' کی شکل میں ان کا جو عظیم علمی کارنامہ سامنے آیا، وہ ان کی اس موضوع سے گہری وابستگی، رسوخ وتعمق اور اعلیٰ بصیرت وآگہی پر دلالت کرتا ہے۔ تفسیر قرآن کی خارزار راہوں پر آبلہ پائی اور پھر گوہر مقصود تک رسائی حاصل کرلینا، ان کی فکری استقامت اور روحانی بالیدگی کی بھی غمازی کرتا ہے۔ اپنی تفسیر کے آئینے میں وہ بلاشبہ موجودہ عہد کے مفسرین کی اگلی صفوں میں کھڑے نظر آتے ہیں۔

جناب مولانا ماہر القادریؒ فاران میں شائع شدہ اپنے ایک مضمون میں ان کے بارے میں لکھتے ہیں: ''مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اردو زبان وادب کے گنے چنے، بلند پایہ، اہل قلم میں ممتاز اور نمایاں مقام رکھتے تھے۔ طنز نگاری کے بادشاہ زبان روزمرہ کے مستند ومعتبر استاد، فلسفی، صوفی، مبلغ اخلاق، مفسر، نقاد، طناز! ان کی شخصیت گوناگوں کمالات کی جامع تھی، اشعار اور خاص طور پر مصرعوں کا اس قدر موزوں اور برجستہ استعمال اور کسی اہل قلم کے یہاں دیکھنے میں نہیں آیا۔ مغربی تمدن وتہذیب پر طنز ان کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔'' (یادرفتگاں جلد دوم ص: ۸۰)

یہ ایک ایسے فاضل معاصر ادیب کی رائے ہے جو مولانا دریابادیؒ کے علم وادب کے خوشہ چیں مداحوں میں تو تھے لیکن نقاد ایسے کہ جب جوش ملیح آبادی جیسے بلند پایہ شاعر نے اپنی خود نوشت سوانح عمری ''یادوں کی برات'' ان کو اس تحریر کے ساتھ بھیجی: ''حضرت ماہر لیجیے، بکرا حاضر

☆ جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت۔

ہے، شوق سے ذبح فرمایئے۔ سرِ دوستاں سلامت.....'' تو انہوں نے ۲۸ صفحات پر مشتمل ایسا تبصرہ کیا کہ ذبح ہی نہیں بلکہ مابعد ذبح لوازمات کا فریضہ بھی ادا کرڈالا۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی متنوع الجہات شخصیت کا سب سے اہم اور روشن پہلو بلاشبہ ان کی قرآنی خدمات ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر دور میں قرآن کی ظاہری ومعنوی سطح پر حفاظت، اس کی تعلیمات وہدایات کی اشاعت اور ان کے ذریعہ بھٹکی ہوئی انسانیت کی رہنمائی کے لئے ایسے رجال کار کو سامنے لاتا ہے، جو اللہ کے منصوبے کے مطابق، یہ گراں قدر فریضہ انجام دیتے ہیں۔ قرآن کے نزول سے لے کر قیامت تک کے لئے یہ سلسلہ جاری ہے اور حقیقت یہ ہے کہ قرآنی ارشاد: "انا نحن نزلنا الذكر وانا له لحافظون" (ہم ہی نے (اس) ذکر یعنی قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں) اور ثم ان علینا بیانه (پھر اس کا بیان کرادینا بھی ہمارا ذمہ ہے) کا تقاضا بھی یہی ہے۔ اس تاریخی اور علمی صداقت کا اعتراف ایسے لوگوں نے بھی کیا ہے جو اسلام کے تئیں اپنے تعصب میں مشہور ہیں۔ ولیم میور بھی انہی میں سے ایک ہے، لیکن اسے مجبور ہوکر یہ کہنا پڑتا ہے کہ جہاں تک اس کی معلومات ہیں دنیا بھر میں ایک بھی ایسی کتاب نہیں جو قرآن کی طرح آج تک ہر قسم کی تحریف سے پاک رہی ہو۔

بعض لوگوں کے ذہنوں میں اس شبہے کا گزر ہوسکتا تھا کہ جب اللہ تعالیٰ نے قرآن کی حفاظت کا وعدہ کیا ہے تو پھر حفظ وغیرہ کے ظاہری انتظامات کی ضرورت آخر کیا تھی؟ مولانا دریابادیؒ اس شبہے کو رفع کرنے کے لئے لکھتے ہیں: ''حفاظ وغیرہ انسانی مدد سے قرآن کا محفوظ رہ جانا، یہ وعدۂ حفاظت الٰہی کے منافی نہیں، عین اس کی تعمیل کا ذریعہ ہے''۔

اگرچہ سلسلۂ کلام دراز ہوتا ہے لیکن تفسیر قرآن کے کام کو اس کے صحیح اور مکمل تناظر میں دیکھنے کے لئے چندان کوششوں کا تذکرہ خاص طور پر ضروری معلوم ہوتا ہے جنہوں نے وہ نقوش چھوڑے جو آنے والوں کے لئے مشعل راہ ثابت ہوئے۔ چنانچہ تاریخ کے اس دور میں جب لفظی بلاغت کو اعجاز کا درجہ دیا جاتا تھا اور حق وصداقت کا نشان تصور کیا جاتا تھا اللہ نے زمخشری، باقلانی، جرجانی وغیرہ کو پیدا کیا۔ جنہوں نے بجا طور پر یہ ثابت کردکھایا کہ قرآن اپنے لفظوں کے نظم وترتیب، ساخت اور بندش میں اس مقام پر ہے جہاں کسی بڑے سے بڑے ادیب واہل قلم کی رسائی ممکن نہیں۔

اسی طرح جب علمی دنیا فلسفیانہ موشگافیوں کی بھول بھلیوں میں کھوئی ہوئی تھی، امام رازی جیسی نکتہ رس اور اعلیٰ دماغی قابلیت رکھنے والی شخصیت میدان میں آئی جس نے اس خس وخاشاک سے فہم قرآنی کے راستے کو صاف کیا اور ان عقل پرستوں کا ناطقہ بند کر دیا جو قرآن پر یونانی فلسفہ طرازیوں کی آڑ میں شبہات واعتراضات وارد کرتے تھے۔ امام رازی کی تفسیر سے متعلق بعض لوگوں کا قول ہے کہ فیه كل شيء إلا التفسير جوان کے ساتھ سراسر ظلم وناانصافی ہے۔

اب دور جدید میں ہندوستان کی طرف آجائیں تو ایک سے ایک گراں قدر کوششیں وقت اور ماحول کے پیدا کردہ چیلنجوں کے جواب میں سامنے آتی ہیں۔ جیسے بیان القرآن، معارف القرآن، تدبر قرآن وغیرہ۔ حضرت تھانویؒ کی بیان القرآن نے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی فتح الرحمٰن کے بعد ہندوستان میں قرآن فہمی کے دروازے کو کھولنے میں سب سے بڑھ کر کردار ادا کیا۔ قرآن کے تعلق سے ہمارے علما کی حمیت کی ایک اہم مثال وہ ہے کہ جب سرسید احمد خاں بانی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے تفسیر القرآن لکھ کر نیچریت پسندی کے اپنے نظریے کو فروغ دینے کی کوشش کی تو اس وقت مولانا عبدالحق حقانی دہلوی نے فتح المنان کے نام سے قرآن کی تفسیر لکھی جس نے سرسید کے طلسم ہوش ربا کے اثر کو زائل کرنے میں بے نظیر کردار ادا کیا۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے بھی ایسے ہی ماحول میں آنکھیں کھولیں۔ جب انگریزی تسلط کے زیر اثر عقل پرستی کا غلبہ تھا۔ سائنس وٹیکنالوجی کی نت نئی دریافت اور انکشافات نے طرز فکر کو بدل دیا تھا اور سوچنے کی نئی راہیں وا کی تھیں۔ مرعوب اور مغلوبیت پسند اذہان الہیاتی وماورائی حقائق کو بھی مغربی تلاش وتحقیقات کے آئینے میں دیکھنے کے عادی تھے۔

اس ماحول کے تقاضوں کے لحاظ سے مولانا دریابادیؒ کی ذات ریگستان میں سرسبز وشاداب قطعہ ارضی (Oasis) کی تھی۔ کیوں کہ وہ مغربی علوم ونظریات اور فلسفے کی نہ صرف واقفیت بلکہ اس میں بصیرت رکھتے تھے۔ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انہیں مخالفین کو قائل ومطمئن کر دینے والے اسلوب وانداز سے بھی نوازا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس ذمہ داری کی ادائیگی کے لئے کمر ہمت کسی اور اس میں کامیاب اور فائز المرام رہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ تفسیر ماجدی کے مقدمہ میں لکھتے ہیں: ''اب یہ نیا دور تھا، عقلی علوم اور فلسفہ یونان کے بجائے تجرباتی علوم، سائنس، بالخصوص طبیعیات کا دور دورہ تھا، ہر شعبہ میں نئے نئے انکشافات وتحقیقات ہو رہی تھیں..... اب ان جدید معلومات وتحقیقات کی

روشنی میں اعجاز قرآن اور صداقت قرآنی کو اسی طرح عیاں اور عالم آشکارا کرنا تھا، جیسا کہ قدیم علماء و متکلمین اور مفسرین قرآن کو اپنے زمانہ میں یونانی فلسفہ اور حکمت اور الحاد و باطنیت کا مقابلہ کرنا پڑا تھا۔ اس کارِ عظیم کو انجام دینے کے لئے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے کمر ہمت باندھی اور انگریزی اور اردو میں اپنے تفسیری نوٹس کے ذریعہ اس خدمت کو انجام دیا۔ اس کام کی تکمیل کے لئے ہمارے علم میں وہ موزوں ترین آدمی تھے، اس لئے کہ وہ جدید علوم میں بصیرت رکھتے تھے، ان کو مطالعہ کا شوق نہیں بلکہ عشق تھا، ان کی نظر میں غیر معمولی وسعت اور ثقافت میں تنوع تھا، وہ جدید طبقہ کی نفسیات اور ذہنی ساخت سے واقف تھے، علم کے تیز رفتار رواں دواں قافلہ سے وہ کبھی بچھڑنے نہیں پائے، اور اس تفسیری خدمت کے دوران میں تو انہوں نے خاص طور پر اس کا اہتمام رکھا کہ کوئی ایسی کتاب ان کی نظر و مطالعہ سے بچنے نہ پائے جس سے قرآن مجید کے بیانات کی تصدیق میں کچھ بھی مدد ملتی ہو، سالہا سال کی اس کوشش و مطالعہ اور عرق ریزی کا نتیجہ ان کی انگریزی اور اردو تفسیر ہے۔''

اس کے بعد دو طویل پیراگراف کے بعد حضرت مولانا علی میاں صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''ہمارے محدود علم میں اللہ تعالیٰ نے ہندوستان کے ایک محقق اور فاضل یگانہ اور خادم دین مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کو توفیق دی کہ وہ تقابل مذاہب اور تقابل صحف سماوی کا منظم، وسیع اور مخلصانہ مطالعہ فرمائیں، اور کم سے کم انگریزی میں شائع ہونے والی تنقیدی، احتسابی و تقابلی کتابوں، موسوعات، انسائیکلوپیڈیاز اور وقتاً فوقتاً شائع ہونے والے مضامین و مباحث کا مطالعہ جاری رکھیں اور ان کے حوالہ و نشان دہی سے بدیہی حقائق کی طرح قرآن مجید کے اعجاز اور اس کی محفوظیت اور تورات و انجیل کی تحریفات، خارجی اضافات اور ذات خداوندی کے خلاف بیانات اور نسبتوں سے پردہ اٹھائیں۔ یہ ایک خادم دین مترجم و مفسر قرآن کا وہ کارنامہ اور اس کے اخلاص و بلند ہمتی کا شاہکار ہے، جس میں راقم حروف کی نظر میں ان کا اس عہد میں نہ صرف ہندوستان بلکہ کسی اسلامی ملک میں بھی کوئی ہمسر اور نظیر نظر نہیں آتا۔''

اسی طرح اللہ تعالیٰ مختلف زمانوں میں اپنے نیک بندوں میں ایسے متبحر علماء پیدا کرتا ہے جو انتہائی اخلاص و لگن اور سخت جانفشانی کے ساتھ عصری تقاضوں کے مطابق اپنی تفسیروں کے ذریعہ قرآن کی ابدی صداقت و حقانیت کو آشکارا اور معترضین کے اعتراضات کے جواب دینے کا فریضہ انجام دیتے ہیں کہ ان سے پیدا ہونے والے تمام شبہات و اشکالات رفع ہو جاتے ہیں اور قرآن کے بیان کردہ حقائق کی صداقت و ابدیت واضح ہو جاتی ہے۔

تفسیر ماجدی کے تعلق سے یہاں مولانا سید محمد رابع ندوی کی رائے گرامی کو نقل کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے، جس سے تفسیر کی اہمیت اور صاحب تفسیر کی شخصیت اور علمی قد آوری پر روشنی پڑتی ہے۔ تفسیر ماجدی کے شروع میں "عرض ناشر" کے عنوان کے تحت تحریر فرماتے ہیں: "قرآن مجید کی تفسیر کے سلسلہ میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی محنت کی، انہوں نے اس میں خاص طور پر دو باتوں کا پورا اہتمام کیا، ایک تو یہ کہ عام اہل حق مفسرین نے قرآن مجید کے الفاظ ومضامین کی جو تشریح کی ہے اس کو نظر انداز نہ کریں اور نہ اس کے برخلاف کوئی رائے قائم کریں، دوسرے یہ کہ اپنے اس غیر معمولی مطالعہ سے جو انہوں نے عربی، اردو پھر انگریزی میں کیا اس میں ان کے متعلقہ مضمون پر جو مواد ملا اس سے پورا فائدہ اٹھائیں، اس کی ایک مثال یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دیئے جانے کے دعویٰ کی حقیقت کا اپنے اسی طرح کے مطالعہ سے قیمتی سراغ لگایا جس سے "ولٰکن شبہ لھم" کی بہت اطمینان بخش وضاحت ہوتی ہے...... وہ اگر ایک طرف علوم دینیہ سے اشتغال رکھنے والے شخص کی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں، تو دوسری طرف عصری ذہن کو جو علم کے معروضی مطالعہ تک محدود رہتا ہو، متاثر کرتے ہیں۔"

اس سیاق میں مولانا عبداللہ عباس ندوی کی توضیح اس پہلو کو مزید روشن کر دیتی ہے۔ وہ تفسیر ماجدی کی جلد اول کے آخر میں "تفسیر ماجدی کی خصوصیات اور اس کی انفرادیت" کے زیر عنوان ایک انفرادیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "اصل انفرادیت جو لوگوں کو سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہو جاتی ہے، وہ صحف سماویہ توراۃ وانجیل سے تقابل اور بغیر کسی اعلان وادعاء کے مثبت انداز میں توراۃ وانجیل کے محرف ہونے کو ثابت کرنا ہے، انصاف کی بات یہ ہے کہ اس بات میں مفسر دریابادی کا کام متقدمین اور متاخرین سب سے بڑھا ہوا ہے۔"

تفسیر ماجدی کے جن امتیازات وخصوصیات کا ذکر اب تک ہو چکا ہے ان کے علاوہ حسب ذیل امور بھی اس کی خصوصیات میں شامل ہیں:

☆ علماء متقدمین کی تفسیری تشریحات مع عبارتوں کے نقل کی گئی ہیں۔

☆ محققین کی تازہ تحقیقات کا وافر وکافی مواد اس میں ملتا ہے۔

☆ ایک لفظ کے اگر متعدد معانی مختلف مفسروں نے بیان کئے ہیں تو اس کی تفصیل دی گئی ہے۔

☆ بعض آیات کی ترکیب نحوی کی الجھنوں کو سلجھایا گیا ہے۔

☆ انداز بیان فلسفیانہ اور علمی موشگافیاں کرنے والوں جیسا خشک نہیں، بلکہ اس میں زبان کی آب اور طرز بیان کی تب وتاب ہے۔

☆ ایسی مضمون آفرینی نہیں ہے جو کسی صاحب ذوق کے ذوق پر گراں ہو۔

☆ زبان وادب کی چاشنی پر معانی کو قربان نہیں کیا گیا ہے۔

☆ ارض قرآن یا جغرافیہ کے وہ مقامات جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے ان کی تفصیل شرح وبسط کے ساتھ دی گئی ہے۔

☆ قرآن کریم میں جن حیوانات کے نام آئے ہیں، ان کی کیا ساخت ونوعیت ہے اس پر اتنا لکھا ہے کہ صاحب تفسیر نے اس کو علیحدہ ''حیوانات القرآن'' کے نام سے چھاپ دیا ہے۔

☆ مذاہب منحرفہ اور فرق باطلہ کا ابطال کیا گیا ہے لیکن مناظرانہ انداز یا سلبی اسلوب اختیار نہیں کیا گیا بلکہ ایجابی انداز میں وہ سب کچھ کہہ دیا گیا جس سے کسی باطل پرست کو موشگافی کا موقع نہیں مل سکتا۔

''تفسیر ماجدی کی خصوصیات اور اس کی انفرادیت'' کے زیر عنوان مولانا عبداللہ عباس ندوی کی جس تحریر کا ایک حصہ اوپر نقل کیا جاچکا ہے اسی سے مذکورہ خصوصیات بھی مستفاد ہیں جن کو ضرورت اختصار کے پیش نظر معمولی حذف وتصرف کے ساتھ نکات کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔

مختلف ادوار میں بدلے ہوئے حالات اور تقاضوں کے مطابق مختلف مفسرین اہل حق کی تفسیری خدمات کے سرسری ذکر، اور ''تفسیر ماجدی'' کی خصوصیات وامتیازات کے بعض پہلوؤں سے آگہی کے بعد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اب بات کچھ بات ترجمہ سے متعلق بھی کی جائے۔

احقر کو چونکہ خود ایک عرصہ تک متعدد زبانوں میں ایک سے دوسری زبان میں ترجمہ سے سابقہ رہا ہے، اس لئے تجربہ کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ عام طور پر صورت حال یہ ہے کہ جس زبان میں ترجمہ کیا جائے اس میں زیادہ مہارت کی ضرورت ہوتی ہے بنسبت اس زبان کے جس سے ترجمہ کیا جائے، اس زبان سے اتنی واقفیت کافی ہوتی ہے کہ مترجم اس کا مطلب سمجھ جائے۔ لیکن ترجمہ طلب تحریروں کے درجات اپنی ظاہری ومعنوی اہمیت کے اعتبار سے جوں جوں بڑھتے

جاتے ہیں انہی کے بقدر مذکورہ قاعدہ بھی بدلتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب بات آتی ہے "ترجمۂ قرآن کریم" کی تو مذکورہ قاعدہ بالکل ہی بدل جاتا ہے۔ اس کے ترجمہ کا حق صرف اسی کو پہنچتا ہے جو عربی زبان چاہے بول نہ سکتا ہو لیکن زبان کی باریکیوں پر گہری نظر رکھتا ہو، معنی وبیان کے جو نکتے ودقیقے اسلوب عربی میں رائج ہوں ان کا شناسا ہو اور علماء متقدمین کی تفاسیر سے استفادہ کرنے کی مکمل اہلیت وصلاحیت رکھتا ہو۔

ترجمہ کی مشکلات کے ضمن میں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اپنی تفسیر کے مقدمہ میں لکھتے ہیں: "اردو وعربی کے درمیان فرق صرفی، نحوی، اسلوبی انشائی حیثیت سے گویا مشرق ومغرب کا ہے۔ عربی میں جو اسلوب بیان فصاحت کے اعلیٰ معیار پر ہے۔ وہ اردو میں آکر کہیں کہیں غیر فصیح ہی نہیں، مہمل بن جاتا ہے، عربی میں زور وتاکید کے موقع پر ضمیر کو بے تکلف مکرر بلکہ تین تین بار لے آتے ہیں جیسے إنه هو يُبدئ ويعيد – انک انت العزيز الحكيم – انا سمعنا – إنني انا الله – انا نحن نحيي الموتىٰ – نحن نزلنا عليک – اب اگر لفظی ترجمہ کی دھن میں اس قسم کی ترکیبوں میں ضمیر غائب "وہ" یا ضمیر حاضر "تو" یا ضمیر متکلم "میں" یا "ہم" دہرا کر یا تہرا کر لائی جائے تو اردو عبارت تو غارت ہی ہوجائے، لازماً اردو میں اس مفہوم کو لانے کے لئے کہیں "ہی" سے کام لیا جائے گا کہیں "تو" (بہ واؤ مجہول) لگادیا جائے گا اور کہیں "ہی" اور "تو" دونوں کو ملا کر کام لیا جائے گا۔"

جس طرح ہر زبان کی کچھ اپنی خصوصیات ہوتی ہیں اسی طرح عربی کی بہت سی خصوصیات ہیں بلکہ میں تو کہوں گا کہ عربی کی خصوصیات کچھ زیادہ ہی ہیں مثلاً مفعول مطلق جیسے محوته محوا یاقُتّلوا تقتيلا کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے یا تمیز جیسے زاده علما یازادهم الله مرضا ایسی ترکیبیں جن میں مفعول مطلق یا تمیز کا استعمال ہوتا ہے عربی زبان میں بکثرت استعمال ہوتی ہیں اور قرآن کریم میں پچاسوں ترکیبیں اس طرح کی آئی ہیں۔ بلاشبہ یہ ترکیبیں عربی زبان کی خصوصیات میں شامل ہیں جن کے بڑے بڑے فوائد ہیں اور بسا اوقات معنوی فوائد کے علاوہ زبان میں فصاحت کے اعلیٰ معیار کے تقاضوں کو پورا کرتی ہیں، لیکن اردو میں اگر ان کا ترجمہ لفظ بہ لفظ کردیا جائے تو عبارت انتہائی بے تکی ہوجاتی ہے۔

ایک مترجم کو ان کے علاوہ بھی اور بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے مثلاً عربی میں

مفرد و جمع کے درمیان دو کے لئے افعال کے صیغے اور ضمائر بالکل الگ ہیں، پھر خاص طور پر قرآن میں انتشار ضمائر کا مرحلہ بڑا مشکل نازک اور حساس ہوتا ہے، ایک ہی آیت، بلکہ جزو آیت کے اندر ایک ہی طرح کی ضمیر کا مرجع ابھی کچھ تھا ابھی کچھ اور ہو گیا۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے بقول "ایسے موقع پر اگر خود سیاق کلام کے بعد رہنمائی حدیث و آثار سے نہ مل جائے تو مترجم غریب کا تو کام ہی تمام ہو جائے۔" اسی طرح جیسے ہر زبان میں صلات (Preposition) یا عربی کی تعبیر کے مطابق "حروف جر" کا استعمال ہوتا ہے، عربی میں بکثرت ہوتا ہے، جس طرح مثلاً انگلش میں ایک ہی فعل کے معنی صلات کے بدل جانے سے بدلتے رہتے ہیں اسی طرح عربی میں بھی صلات کی تبدیلی سے افعال کے معانی میں زبردست تبدیلیاں ہو جاتی ہیں بلکہ بعض اوقات ایک ہی فعل صلہ کی تبدیلی کے ساتھ بالکل متضاد معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسے اس کی ایک مشہور مثال رغب فیه اور رغب عنه ہے پہلے کے معنی کسی چیز کا خواہش مند ہونا ہے تو دوسرے کے معنی اس کو ناپسند کرنا یا اس سے متنفر ہونا ہے۔ اس سلسلہ کی ایک اور بہت اہم چیز یہ ہے کہ عربی میں ایک صلہ جب مختلف افعال کے ساتھ استعمال ہوتا ہے تو دوسری زبان میں اس کے مزاج کے اعتبار سے مختلف انداز سے ترجمہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے کسی بھی صلہ کے ایک ہی معنی متعین کرنا مناسب نہیں جیسے عربی میں کثرت سے استعمال ہونے والا ایک حرف جر "الی" ہے، یہ صحیح ہے کہ ذهبت الى المسجد اور خرجت إلى الحديقة وغیرہ ترکیبوں میں اس کا ترجمہ "تک" یا "طرف" ٹھیک ہی رہتا ہے لیکن اس کا یہی ترجمہ متعین کر دینا غیر ضروری بلکہ نامناسب ہے مثلاً "والذين يؤمنون بما انزل اليك" میں انزال کے ساتھ "الی" کے استعمال کی صورت میں مذکورہ متعین کردہ معنی کا التزام کرتے ہوئے یوں ترجمہ کرنا "وہ لوگ جو ایمان لائے اس پر کہ جو کچھ نازل ہوا تیری طرف" ایک ایسا التزام ہے جو غیر ضروری لگتا ہے اور بے وجہ اس سے اردو زبان میں اجنبی پن سا پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کا ترجمہ اگر "جو کچھ اتارا گیا تم پر یا آپ پر" کیا جائے تو اس سے اردو کے اسلوب کی رعایت بھی ہو جاتی ہے اور معنی میں ادنیٰ سی تبدیلی کے امکان کا اندیشہ بھی نہیں ہے۔ چونکہ طلبہ مدارس دینیہ کو عام طور پر "الی" کے معنی "تک" یا "طرف" یاد کرا دیے جاتے ہیں اس لئے غالباً ہمارے بہت سے اکابر مفسرین نے عربی اور اردو دونوں کے رموز و دقائق پر نظر رکھنے کے باوجود مدارس کے عام ماحول کی رعایت ہی میں اس طرح کے التزامات کیے ہوں گے۔

آیت کریمہ کے اس جز کے ترجموں کے چند نمونے حسب ذیل ہیں: ''اور جولوگ ایمان لاتے ہیں ساتھ اس چیز کے کہ اتاری گئی ہے طرف تیری (حضرت شاہ رفیع الدین دہلویؒ) اور وہ لوگ جو ایمان لائے اس پر کہ جو کچھ نازل ہوا تیری طرف (شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ) اور جو لوگ ایمان لاتے ہیں اس پر جو آپ کی طرف اتارا گیا (مولانا محمد جونا گڑھی) اور ان کی (رہنما ہے) جو ایمان لاتے ہیں اس پر جو کچھ کہ آپ پر نازل کیا گیا ہے (مولانا ابو محمد عبدالحق حقانی) نیز وہ لوگ جو اس سچائی پر ایمان رکھتے ہیں جو تم (یعنی پیغمبر اسلام پر) نازل ہوئی۔'' (مولانا ابوالکلام آزادؒ)

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے بھی اس موقع پر ''الی'' کا ترجمہ آخر الذکر مفسرین کی طرح ''پر'' سے کیا ہے، وہ ترجمہ کرتے ہیں: ''اور جو لوگ ایمان رکھتے ہیں اس پر جو آپ پر اتارا گیا''۔ مولانا دریابادیؒ مفسر سے پہلے ایک بلند پایہ اردو کے ادیب ہیں نکتہ آفرینیاں ان کے قلم کو ہر بار کا خاصہ رہی ہیں، انہوں نے سرچشمۂ فصاحت و بلاغت قرآن کے کلام معجز بیان کے ترجمہ میں اس عظمت کو برقرار رکھنے کی مقدور بھر بشری کوشش تو کی ہے لیکن ادب کی بیبا کی کو بے لگام نہیں ہونے دیا، پوری احتیاط کے ساتھ اصل توجہ معانی پر رہی ہے۔ اردو زبان وادب کی رعایت کو ثانوی درجہ میں ہی رکھا لیکن معانی کے اعتبار سے تمام تر قیود کی رعایت کے باوجود ترجمہ کی زبان نہایت رواں اور شستہ ہے، بلاشبہ یہ بھی تفسیر ماجدی کی ایک خصوصیت ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی رحمہ اللہ اپنی تفسیر کے مقدمے میں ترجمہ کی مشکلات کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں: ''ایک بڑا مرحلہ مترجم کے لئے لغات اضداد کا ہے، عربی میں متعدد لفظ ایسے ہیں جو متضاد مفہوموں کے لئے آتے ہیں مثلاً ''شراء'' کہ خریدنے کے لئے بھی آتا ہے اور فروخت کرنے کے لئے بھی یا ''رجاء'' کہ امید و بیم دونوں معنی میں آتا ہے یا ''قرء'' کہ اس کے مفہوم میں پاکی بھی داخل ہے اور ناپاکی بھی۔ چنانچہ عربی میں مستقل کتابیں لغات اضداد پر موجود ہیں۔ قرآن مجید میں ایسے الفاظ کی بہتات تو نہیں کہی جاسکتی پھر بھی جہاں کہیں ہیں، وہاں مترجم کو قدم پھونک پھونک کر رکھنا ہوتا ہے، اور سہارا سیاق کلام کا لینا ہوتا ہے۔''

الفاظ کی تحقیق کے سلسلہ میں جو قوامیس و معاجم مولانا دریابادیؒ کے پیش نظر رہی ہیں مقدمہ میں ان کی تفصیل موجود ہے جن کی تعداد نو ہے یہ سب ہی عربی زبان کے اہم مراجع ہیں لیکن حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زیادہ تر ''لسان العرب'' اور ''صحاح'' سے کام لیتے تھے۔ اسی

طرح لغات القرآن کے سلسلہ میں بھی پانچ اہم کتابوں کے نام مقدمہ میں مذکور ہیں لیکن حوالوں میں زیادہ تر ابوالقاسم الراغب الاصفہانی کی المفردات فی غریب القرآن اور ابن قتیبہ الدینوری کی مشکلات القرآن و غریبہ کا تذکرہ ملتا ہے۔ اعراب کے سلسلہ میں بھی پانچ اہم مراجع پیش نظر رہے ہیں لیکن زیادہ تر حوالے العکبری کی اعراب القرآن کے ملتے ہیں۔

تفسیر لکھنے کے دوران عربی اردو کی جو تفسیریں مولانا کے پیش نظر رہی ہیں ان کی فہرست بہت طویل ہے اور حوالوں کے ساتھ جو عربی عبارتیں تفسیری نوٹس کے ساتھ نقل کی ہیں ان میں بھی بہت زیادہ تنوع ہے۔

یہ درست ہے کہ اس ''تفسیر سے ایک عصری تعلیم کے حامل، ایک عام ثقافت کے مالک اور علوم دینیہ کے ایک طالب علم سب ہی کو یکساں فائدہ حاصل ہوتا ہے۔'' مولانا دریابادیؒ نے مختلف تفسیروں سے جو عبارتیں نقل کی ہیں ان میں، اس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ اگر یہ عبارتیں نکال بھی لی جائیں تو اردو عبارتوں میں لفظی و معنوی طور پر کوئی خلل واقع نہ ہو۔ لیکن پھر بھی بعید نہیں کہ یہ چیز ان لوگوں کے لئے باعث ثقل ہوتی ہو، جو عام تعلیم یافتہ ہیں جن کا عربی یا علوم دینیہ سے کوئی اشتغال نہیں۔

مولانا دریابادیؒ مختلف تفسیروں سے حوالوں کے ساتھ جو عبارتیں نقل کرتے ہیں ان میں انتہائی اختصار سے کام لیا گیا اگر ایسا نہ کیا جاتا تو تفسیر کی ضخامت بہت زیادہ ہو جاتی۔ جب علوم و معارف کے گنجہائے گرانمایہ کھلے ہوئے ہوں اور مفید مطلب تحقیقات کی بہتات ہو ان میں سے اقل قلیل کا انتخاب کر لینا کوئی آسان کام نہیں یہ کام وہی انجام دے سکتا ہے جو انتخابی رجحان (Selective Mind) کا حامل ہو اور یہ کام بلاشبہ مولانا نے بہت ہی خوبی کے ساتھ انجام دیا ہے جو اپنی جگہ پر خود ایک کمال ہے لیکن یہ ایں ہمہ طلبۂ مدارس دینیہ اور علماء کرام جو اس تفسیر کے ذریعہ یہ جاننے میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں کہ مختلف مفسرین نے کیا لکھا ہے اور کن الفاظ میں لکھا ہے ان کے لئے بسا اوقات منقولہ عبارتوں میں حد درجہ اختصار موجب تشنگی بن جاتا ہے۔

میرے خیال میں اگر ان مقامات پر جہاں حد درجہ اختصار موجب تشنگی ہے اصل مراجع سے عبارتوں میں ضروری اضافہ ہو جائے اور مکمل ترکیب نحوی بھی شامل کر دی جائے تو یہ تفسیر جو آج بھی اہل مدارس کے لئے مفید ہے، مفید تر بن جائے۔

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں............

پروفیسر طاہر محمود☆

ہمارے وطن عزیز کے ممتاز فلسفی اور صحافی مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم ومغفور کے نام نامی سے راقم الحروف کے کان اوائل عمر ہی سے اچھی طرح آشنا تھے۔ میرے والد ماجد، خدا انہیں غریق رحمت فرمائے، مولانا کی تحریروں کے گویا عاشق صادق تھے۔ میرے بچپن میں ان کا رسالہ ''صدق جدید'' پابندی سے آتا تھا اور اس کے ہر شمارے کی کئی کئی بار باقاعدہ خواندگی ہوتی تھی، گھر کے اندر اہل خانہ کے ساتھ اور باہر ملاقات کے لئے آنے والوں کے ساتھ، اور میں ان سبھی مجالس میں ذوق وشوق سے شامل رہتا تھا۔ والد مرحوم کے تمام اہل خاندان بلکہ حلقہ احباب میں بھی حضرت دریابادیؒ کی گوناگوں عظمت کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ حضرت دریابادیؒ اور میرے والد مرحوم دونوں ہی کے پیر ومرشد تھے اور شاید دونوں کے دلی تعلق میں اس نسبت سعید کا بھی دخل تھا۔ بہت کم عمری ہی میں مجھے صاحب ''صدق جدید'' کی کئی مستقل تصانیف بھی مطالعے کے لئے دی گئی تھیں جن میں ان کی تفاسیر قرآنی کے علاوہ حکیم الامت مولانا تھانویؒ اور رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر کی سوانح حیات بھی شامل تھیں۔ گھریلو محفلوں میں ان کتابوں پر بھی اکثر گفتگو ہوتی تھی جن کا اثر ظاہر ہے کہ میرے دل ودماغ پر بھی ہوتا تھا۔ نہ جانے کتنی بار یہ واقعہ پڑھا اور سنا، اور ہر دفعہ نئے تاثرات کے ساتھ، کہ کس طرح مولانا دریابادیؒ اولاً بیعت کے ارادے سے مولانا حسین احمد مدنیؒ کے پاس دیوبند گئے تھے لیکن کس طرح حضرت مدنیؒ نے ہی خود انہیں تھانہ بھون لے جاکر اپنی حکمت عملی سے حکیم الامت کے حلقہ ارادت میں شامل کر دیا تھا۔ اس واقعہ کے مختصر مگر انتہائی موثر بیان میں مولانا کا ایک جملہ ''مقدس سازش بے نقاب ہوگئی'' نہ جانے کب تک ذہن میں محفوظ رہا تھا اور اب بھی ہے۔ ''ذاتی ڈائری کے چند اوراق'' نے بھی، جسے میں نے بار بار پڑھا تھا، مجھے بے حد متاثر کیا تھا۔

☆ سابق صدر شعبۂ قانون دلی یونیورسٹی۔

انہی دنوں کی ایک دلچسپ بات یہ یاد آرہی ہے کہ معروف مزاح نگار شوکت تھانویؒ ہجرت کر کے پاکستان گئے تو انہوں نے اپنی ایک تحریر میں اس بات پر قدرے اطمینان ظاہر کرتے ہوئے کہ اردو کو پاکستان میں بقول ان کے ''مشرف بہ اسلام'' نہیں کیا گیا تھا ہندوستان میں جاری اسمائے معرفہ تک کے ہندی ترجمے کرنے کی مشق ستم پر ظریفانہ اعتراضات کئے۔ اس ضمن میں انہوں نے مزید یہ لکھتے ہوئے کہ ناموں کو ہندیانے کی یہی رفتار رہی تو جلد ہی اردو کے ادیبوں اور صحافیوں کی بھی باری آجائے گی ان میں سے بعض معروف ہستیوں کے اسمائے گرامی کے ممکنہ ہندی ترجمے بھی پیش کئے تھے۔ ان میں پہلا ہی نام تھا ہمارے ممدوح مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کا جن کا ہندی نام شوکت تھانویؒ صاحب نے ''شری بھگوان داس جی ندیاپوری'' تجویز کیا تھا۔ شوکت تھانویؒ کی اس تحریر کو میں والد محترم کے علم میں لایا تو بہت محظوظ ہوئے اور ملک میں زور و شور سے جاری لسانی تعصب کے رجحان پر افسوس کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا کہ ''شاید مولانا کی نظر نہیں پڑی ورنہ صدق میں نہلے پر دہلا لگاتے۔''

دسمبر ۱۹۷۵ء میں جب والد محترم نے مکہ معظمہ کی مقدس سرزمین میں وفات پائی تو مولانا دریابادیؒ نے اپنے رسالے ''صدق جدید'' میں ''خوش نصیب مسلم'' کے عنوان سے ایک شذرہ تحریر فرمایا تھا جس کا ایک اقتباس میں نے بعد میں والد مرحوم کی زندگی اور کارناموں پر اپنی تصنیف ''حیات محمود'' میں شامل کیا تھا:

> ''جناب سید محمود حسن وکیل سے یوپی کی مسلم پبلک خوب واقف ہے، خصوصاً اودھ کی دینی تعلیمی کانفرنس کے سلسلہ میں ان کی سرگرمیوں سے...... اس سال حج کو گئے اور ۱۴ ذی الحجہ کو ارکان و نوافل و مستحبات سب ختم کر چکے تھے کہ داعی اجل کو لبیک کہہ دیا...... حج مقبول کے بعد حاجی تو طفل نوزائیدہ کے مانند ہو جاتا ہے...... مرحوم ہر طرح دھل دھلا کر جنت نشین ہو گئے۔''

اب سے تقریباً نصف صدی قبل میں نے مولانا کی جو معنی خیز تحریریں ''صدق جدید'' میں پڑھی تھیں ان میں سے کئی اپنی اعلیٰ ظرافت کے باعث آج تک ذہن کی پرتوں میں محفوظ ہیں۔ ایک دفعہ جبکہ آزادی کا سورج طلوع ہوتے ہی اس کثیر اللسان ملک کی شیریں ترین زبان اردو شدید تعصبات کی نذر ہو کر بعض بڑے بڑے سیاست دانوں کی بے اصولی مخالفت جھیل رہی تھی

مولانا کو اپنی ایک تحریر میں ان معزز دشمنان اردو میں سے دو کا خصوصی ذکر کرتا تھا۔ ان میں سے ایک پرشوتم داس ٹنڈن تھے جو حال ہی میں دنیا سے سدھار چکے تھے اور دوسرے سمپورنانند تھے جو کہ اس وقت غالباً یوپی کے وزیراعلیٰ تھے۔ مولانا نے ان شہسواران تعصب لسانی کو ان الفاظ میں یاد کیا تھا: "بابو پرشوتم داس ٹنڈن آں جہانی اور بابو سمپورنانند ایں جہانی"۔ یہ "آں جہانی" کی نسبت سے مؤخر الذکر کے نام کے ساتھ جو "ایں جہانی" کی صفت کا اضافہ کیا گیا تھا اس ظرافت میں دل کا کیسا کرب مستور تھا اس کو سمجھنے والے سمجھ سکتے ہیں۔ اور میں تو اس کرب کو آج تک محسوس کرتا ہوں۔

مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین کے تعلق سے مولانا کی کئی تحریریں ذہن میں اب تک محفوظ ہیں۔ ان میں سے دو اس زمانے کی ہیں جب موصوف کو بہار کی گورنری سے سبکدوش کر کے ملک کا نائب صدر بنایا گیا تھا۔ پہلی تحریر میں مولانا دہلی میں ان سے اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے کسی صاحب کا یہ سوال نقل کرتے ہیں کہ "کہئے مولانا آپ نے گورنر بہار اور نائب صدر جمہوریہ ہند میں کوئی فرق پایا؟" اور پھر اپنا جواب دہراتے ہیں کہ "میں نے تو پرنسپل جامعہ اور نائب صدر جمہوریہ میں بھی کوئی فرق نہیں پایا۔" اس سلسلے کی دوسری تحریر اس وقت کی ہے جب ذاکر صاحب دار المصنفین کی کسی بڑی تقریب میں شرکت کے لئے اعظم گڑھ گئے تھے۔ جمعہ کی نماز کے لئے ایک مقامی مسجد میں عین نماز کے وقت موصوف کی آمد کا مسحور کن نقشہ کھینچتے ہوئے مولانا نے لکھا تھا:

> "نمازیوں کا ہجوم ہے اور پیچھے جوتوں کا انبار۔ جماعت کھڑی ہو چکی ہے کہ ایک موٹر کار بھاگم بھاگ مسجد کے دروازے پر پہونچتی ہے اور آنے والا پیچھے ہی اپنے لئے جگہ بنا کر نماز میں شامل ہو جاتا ہے۔ پہچانا آپ نے صف نعلین کے اس نمازی کو؟ جمہوریہ ہند کا نائب صدر ڈاکٹر ذاکر حسین۔"

پانچ برسوں بعد ملک کا نقشہ بدلا اور ذاکر صاحب ملک کی کرسی صدارت پر جلوہ افروز ہوئے تو سیاست کی نہ جانے کن مجبوریوں سے انہیں دہلی کے بعض ہندو مذہبی پیشواؤں کے پاس ان کی نیک خواہشات لینے جانا پڑا۔ اس واقعے پر مولانا کے جو تاثرات انکی تازہ تحریر میں دیکھنے کو ملے میں نے ان کا تفصیلی ذکر ابھی حال ہی میں "درمیان خدایگان و خداوندان" کے عنوان سے شائع انگریزی میں اپنی خودنوشت سوانح حیات میں کیا ہے، جس کا ترجمہ نذر قارئین ہے:

''ایک بار مرکزی دہلی میں میرے دفتر کے باہر اچانک پولیس گاڑیوں اور سائرنوں کا شور ہونے لگا تو دفتر کے سب بابو کھڑکیوں سے جھانک کر دیکھنے لگے کہ کیا ہو رہا ہے۔ یہ جنوری ۱۹۶۸ء کی ۳۰ رتاریخ تھی اور صدر جمہوریہ ذاکر حسین بابائے قوم مہاتما گاندھی کی سمادھی پر نذرانۂ عقیدت پیش کرنے جا رہے تھے۔'' وہ وہاں کیا کرے گا؟'' ایک بابو نے حقارت سے بہ آواز بلند پوچھا تو دوسرے نے اسی طرح جواب دیا'' قرآن پڑھے گا اور کیا۔'' یہ سوال و جواب سن کر میری یادداشت مجھے دو سال پہلے کے منظر تک لے گئی جب ذاکر صاحب کا بہ حیثیت صدر انتخاب ہوا تھا اور بعض ہندو مذہبی رہنماؤں نے اس پر اعتراض کرتے ہوئے کھلے عام کہا تھا کہ'' وہ ہندوستانی ثقافت کی نمائندگی نہیں کر سکیں گے'' تو انہیں مطمئن کرنے کے لئے ہمارے صدر کو شاید وزیر اعظم وقت کے مشورے پر ان معزز رہنماؤں کی خدمت میں ان کی دعائیں لینے جانا پڑا تھا۔ تب ہی ملک کے معروف صحافی و فلسفی مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے اپنے اخبار صدق جدید میں لکھا تھا کہ'' دہلی میں بڑے بڑے اولیاءاللہ اور بزرگان دین کی درگاہیں بھی ہیں معلوم نہیں صدر محترم نے وہاں بھی حاضری دی کہ نہیں۔'' فصیل بند شہر میں میرے مالک مکان، محمد مسلم نبیرہ ڈپٹی نذیر احمد مرحوم، ان دنوں اپنا ایک شعر جس میں انہوں نے ذاکر صاحب کو'' ذاکر مردود'' کہا تھا بڑے چاؤ سے سنایا کرتے تھے اس دعوے کے ساتھ کہ جب انہوں نے یہ شعر مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کو سنایا تو انہوں نے'' ذاکر مردود'' کو'' مومن مجبور'' سے بدل لینے کا مشورہ دیا لیکن انہوں نے وہ مشورہ قبول نہیں کیا اور الزام '' مردودیت'' پر قائم رہے۔''

قارئین کرام! ذرا غور فرمائیں کہ حضرت دریابادیؒ کے جو فرمودات اس اقتباس میں شامل ہیں ان کی بلندیٔ خیالات اور شستگی جذبات کے کیسے کیسے اشارے پوشیدہ ہیں۔

دہلی کی شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ نے حال ہی میں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ پر جو سیمینار کیا تھا اس میں حاضری کے دوران مجھے ایک ایسی اطلاع دی گئی جو کہ یقیناً میرے لئے باعث فخر ہے۔ معلوم ہوا کہ مرحوم کی صاحبزادی نے، جو کہ ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی صاحب مدظلہ العالی کی

رفیق حیات تھیں اور سیمینار کی تاریخ سے چند روز قبل ہی رفیق اعلیٰ سے جاملی تھیں، اپنے صاحبزادے کو خصوصاً تاکید کی تھی کہ اس ننگ اسلاف دناکارہ ملت کو مذکورہ سیمینار میں شرکت کے لئے ضرور بلایا جائے۔ شاید ان کے عظیم پدر بزرگوار سے میرے والد ماجد مرحوم ومغفور کے قلبی تعلق کی بات کبھی ان کے کان میں پڑی ہو۔ بہرحال اللہ تعالیٰ مرحومہ کے درجات بلند فرمائے۔ رہے ان کے والد محترم تو وہ تو اس دنیا میں بھی دینی و دنیوی علوم وفنون کی بلندیوں پر فائز تھے اور آخرت میں بھی یقیناً اسی مقام محمود میں ہوں گے جس پر ان جیسے نادر الوجود علماء وفضلاء کا حق ہوا کرتا ہے، بلکہ اس کی بھی اعلیٰ ترین بلندی پر، کہ ان قد آور ان علم وفضل میں بھی کم ہی نے ملک وملت کی ایسی زبردست خدمت اور اپنی تحریروں سے فرزندان ملت کی ایسی تربیت کی ہوگی جو مولانا مرحوم کا خاصہ ہے۔

غالباً ۱۹۶۲ء کی بات ہے۔ میں علی گڑھ سے، جہاں میں ان دنوں زیر تعلیم تھا، گرمیوں کی تعطیل میں اپنے وطن آبائی بہرائچ گیا ہوا تھا۔ ایک دن سہ پہر کے وقت ایک ملازم نے آکر بتایا کہ کوئی "مولوی صاحب" آئے ہیں اور "وکیل صاحب" یعنی میرے والد مرحوم کو پوچھ رہے ہیں جو کہ اتفاقاً اس دن شہر سے باہر تھے۔ میں اٹھ کر باہر گیا اور آنے والے کا تعارف حاصل کیا تو معلوم ہوا کہ وہ کوئی "مولوی صاحب" نہیں بلکہ دنیائے علم وصحافت کی وہی نابغۂ روزگار ہستی تھی جس کی تحریروں کے نقش نہ جانے کب سے گھر کے درودیوار اور گھر والوں کے دل ودماغ پر کندہ تھے۔ مولانا کی یوں بلا اطلاع آمد اور ان کے سراپے اور طریق گفتگو کی سادگی میرے لئے انتہائی حیران کن تھی، کہ میرے تصور میں تو ان کی عالمانہ طرز تحریر اور بیباک صحافت کے پیش نظر ایک بالکل مختلف تصویر چھائی ہوئی تھی۔

مولانا کی پہلی زیارت کا برسوں پہلے کا یہ منظر میری یادداشت میں آج تک من وعن محفوظ ہے، اور اس کے تعلق سے تصور کی دنیا میں اکثر مولانا کو آنجہانی فراق گورکھپوری کے ایک شعر میں الفاظ کی تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ یہ فرماتے ہوئے سنتا ہوں کہ:

آنے والی نسلیں تم پر فخر کریں گی فرزندو

جب تم ان کو بتلاؤ گے تم نے ہم کو دیکھا تھا

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ۔۔۔ مردِ حق گفتار

پروفیسر منشاءالرحمٰن منشاء☆

آئین جوانمرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

علامہ اقبالؒ کے اس شعر کے مصداق مجھے اپنے اس مقالے میں اللہ کے ایک عظیم شیر کی جرأت وجسارت کا ذکرِ خیر کرنا مقصود ہے۔ جس کا نام نامی عبدالماجد ہے۔ اور جو ایک عظیم الشان علمی، ادبی و مذہبی شخصیت کا حامل ہے۔ بلاشبہ مولانا موصوف کی شخصیت نہایت پہلودار، جامع الکمالات شخصیت تھی۔ آپ ایک صاحب طرز ادیب، ایک منفرد اسلوب کے انشاء پرداز، ایک بے باک صحافی، ایک بے مثال مفسر قرآن اور ایک صاحب نظر تنقید نگار تھے۔ حق گوئی وحق بیانی آپ کی امتیازی خصوصیت شمار کی جاتی ہے آپ اپنے قلم حق نگار کے ذریعے لاتعداد ادبی نگارشات، دل نشیں مقالات اور رسائل وتصنیفات چھوڑ گئے ہیں۔ درحقیقت مولانا عبدالماجد کی شخصیت اپنے گوناگوں خصائص کی بنا پر زندگی کے مختلف شعبوں میں لوگوں کی نظر وتوجہ کا مرکز رہی ہے۔ آپ کی تصنیفی زندگی کا آغاز ایک فلسفی اور شعروادب کے ایک نقاد کی حیثیت سے ہوا تھا۔ اُس زمانہ کے مختلف باکمال اربابِ قلم کی صحبت اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ انشاء وتحریر کا ایک خداداد منفرد اسلوب ان سب نے مل کر انہیں اردو زبان کا ایک ممتاز ادیب ومصنف بنا دیا تھا۔ آپ میدانِ صحافت میں قدم رکھ کر اپنی حق گوئی، حق بیانی اور حق پسندی کے خوب جوہر دکھائے ہیں۔ صدق گفتاری ایک ایسی نعمت خداوندی ہے جو بغیر توفیق الٰہی ہر کسی کو حاصل نہیں ہوتی۔ راستی کو موجب رضائے خدا کہا گیا ہے۔ بفضل خدا مولانا عبدالماجد کی صدق گفتاری اور صدق نگاری اپنی جگہ بالکل منفرد و بے مثال تھی اپنے موقر جریدہ "سچ" اور "صدق" میں سچی چبھتی ہوئی باتیں

☆ سابق صدر شعبہ اردو ناگپور یونیورسٹی، (ناگپور)

سپردقلم کر کے تلخی کام ودہن کی آزمائش کا سامان بحسن وخوبی فراہم کر دیا کرتے تھے۔مگر کسی کی دل آزاری یا توہین مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا قلم ہمیشہ ان کے ضمیر کی آواز اور الہامی صداقتوں کا ترجمان ہوتا تھا۔بقول مولانا محمد علی جوہر"صرف وہی لوگ زندہ رہتے ہیں جو باہمت اور صدق گفتار ہوتے ہیں۔" یہی جرأت، جسارت، صداقت، بے باکی اور راست گوئی اور اعلائے کلمۃ الحق جو مولانا محمد علی جوہر کے جوہر خاص تھے۔ مولانا عبدالماجد کی صحافت، انشاء پردازی، تصنیف وتالیف اور تنقید وتفسیر کے بھی رہنما اصول تھے۔ آپ نے خدمت خلق اور تنقید روزگار کو اپنا مشغلۂ حیات بنالیا تھا جو صدق جدید کی بدولت تادم آخر قائم ودائم رہا۔ اور ادبی دنیا میں غیر معمولی شہرت ومقبولیت کا حامل بنا رہا۔ آپ نے ۱۹۲۵ء میں "سچ" کے نام سے ایک دینی اور اصلاحی ہفتہ وار پرچہ کی ادارت کا کام سنبھالا ان کے شعور کی بیداری، فطری دینداری اور طبعی جدت پسندی کے باعث یہ پرچہ مقبول خاص وعام ہوتا چلا گیا اور ۱۹۳۲ء تک سات سال برابر جاری رہا پھر دو سال کے عرصہ تک نامساعد حالات کے باعث بند ہوگیا آپ نے ۱۹۳۴ء میں "سچ" کو "صدق" کے نام سے بدل کر دوبارہ لکھنؤ سے شروع کیا۔ ان اخبارات کی سچی باتیں اور تنقیدی نوٹ ہر شخص کو اپنی طرف متوجہ کر لیا کرتے تھے۔ ان میں دور جدید کے فتنوں اور آئین نو کی خامیوں کے تذکرے بھی ہوتے تھے اور ان پر کی گئی نکتہ چینیاں بھی، ان دونوں اخباروں میں شائع ہونے والی سچی باتوں کا ایک مجموعہ سچی باتیں کے زیر عنوان کتابی شکل میں شائع ہو کر مقبول خاص وعام ہو چکا ہے۔

یہ کتاب اعلیٰ بے لوث تنقید اور انشائے ماجد کا بہترین نمونہ ہے۔ زور بیان اور جوش اظہار کے پہلو بہ پہلو مرصع نگاری اور ندرت استدلال سادگی اور بے ساختگی، متانت وشگفتگی، دلآویزی اور معنویت اشاریت اور نشتریت کی کج ادائی کے علاوہ صداقت وانفرادیت مولانا موصوف کے طرز تحریر کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ان کے طرز انشاء، صدق گفتاری اور ادب عالیہ کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:

عیدالاضحیٰ کے موقع پر فروری ۱۹۶۸ء میں آل انڈیا ریڈیو سے نشر شدہ ایک مختصر سی تقریر کے چند جملے دیکھئے: "پھر دن چڑھا اور نمازیوں کی ٹولیاں صاف ستھرا نفیس لباس پہنے عیدگاہ اور مسجدوں کی طرف چل پڑیں۔ بوڑھے اور بچے سب ساتھ ہیں۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ

واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد، کے زمزموں سے اور نغموں سے راستے بھی گونج رہے ہیں اور مسجدوں کے درو دیوار بھی۔ کیا دھن ہے اور کیا مستی ہے ہر ایک کی زبان پر یہی نعرۂ خدا پرستی ہے۔ مسلمان ان تینوں دنوں میں جتنا گوشت کھائے گا اس سے بڑھ کر دوسروں کو کھلائے گا اور غریبوں اور مفلسوں کو بھی۔ امیروں اور رئیسوں کے دسترخوانوں کا مزہ ایک بار تو حاصل ہو ہی جائے گا۔''

مولانا موصوف کی صدق گفتاری اور حق گوئی میں ایک استواری، استقامت، استقلال اور وضع داری پائی جاتی ہے جو ان کی قوت ایمانی اور غیر متزلزل عزم کی آئینہ دار ہے۔ مولانا کی سچی باتیں بالخصوص اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، سیکولرزم، اقلیتیں، تعلیمات دین، احتساب نفس اور تزکیۂ باطن پر مشتمل ہوتی تھیں۔ وہ نہ کسی سے مرعوب ہوتے تھے اور نہ کسی کی خوشامد کرتے تھے۔ نہ کسی سے کوئی توقع رکھتے تھے نہ کسی سے شکایت کرتے تھے۔ فقر و درویشی، گوشۂ تنہائی اور مطالعۂ کتب ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ مولانا موصوف صدق جدید کے اداریتی نوٹوں یعنی سچی باتوں میں مسلمانوں کو بہت مخلصانہ تنبیہ کرتے رہتے تھے۔ اور تعلیمات اسلامی کے وہ نکتے بیان کرتے تھے جو دوسرے خطیبوں، واعظوں اور مولویوں کے بیان کردہ مسائل سے، بہت مختلف ہوتے تھے مولانا کے طریقۂ کار اور انداز استدلال سے قومی یکجہتی اور میل ملاپ کا جذبہ پیدا کرنا مقصود ہوتا تھا اس سے وحدت در نگارنگی میں یک رنگی پیدا کرنا۔ زندہ رہو اور زندہ رہنے دو کے اصول اپنانے میں مدد ملتی ہے۔ مولانا کو اس بات کا شکوہ ہے کہ ہم لوگ قرآن کی تعلیم سے کوسوں دور ہیں ورنہ اس کتاب لا ریب فیہ میں مسلمانوں کے خوف وحزن کا علاج بھی موجود ہے اور ان کی بدحالی اور شکستہ قلبی کا تدارک اور معالجہ بھی۔ مولانا موصوف شاعروں اور قصہ گویوں یعنی افسانہ نگاروں کی لفاظیوں کے خلاف برابر آگاہی دیتے رہتے تھے ان کا خیال تھا کہ ہمارے شعراء باستثنائے چند شہروں کی بولی بولتے ہیں۔ شراب خوری کی دل بھر کر ترغیب دیتے ہیں۔ عشق بازی کا شوق دلاتے ہیں اور فرشتوں، نیک متقی لوگوں، انبیاء اولیا حتیٰ کہ خدا کی شان میں بھی گستاخیاں کرتے ہیں ملت کے مزاج فاسد کی اصلاح کے لئے وہ اپنی سچی باتوں میں اسلامی قدروں کی طرف توجہ کرانا ضروری سمجھتے تھے۔ شاعرانہ ہرزہ سرائیوں، نیز مشاعروں کو بھی وہ اسفل وادنیٰ جگہ دینے کے قائل تھے۔ اس ضمن میں شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی کے رسالہ کلیم دہلی پر ۱۹۳۶ء میں ان کا تبصرہ ملاحظہ ہو:

''جوش صاحب اب تک شاعر انقلاب تھے اب کلیم کے صفحات میں داعیٔ انقلاب کی حیثیت سے نظر آ رہے ہیں۔ پہلے ہی نمبر میں اردو ادبیات میں انقلاب کی ضرورت پر ایک پُر جوش مقالہ سپردِ قلم فرمایا ہے اس کو یوں شروع کرتے ہیں:''نوعِ انسانی کے مصلح بننے کا خیال کس قدر مضحکہ خیز خیال ہے۔'' آگے ہنود و مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں میں تمہاری صفوں میں آندھی کی طرح گذروں گا۔ تمہارے بے مغز سروں پر کڑی کمانوں کی طرح کڑکوں گا اور طوفانی بادلوں کی طرح گرجوں گا تم پر میرا غیظ و غضب بپھرے ہوئے دیوتاؤں کا غیظ و غضب ہے۔ اے مورکھ ہندو وائے نادان مسلمانو دین دھرم کا کلیجہ پیپ ہوا جاتا ہے ان جھوٹی اور کھوکھلی آوازوں سے۔ اے دھوتی اور پاجاموں کے گڑ ہوائے لوٹے اور بدھنے کی انجمنو، اے داڑھی اور چوٹیوں کے ادارو تمہاری کس کس حماقت پر رحم کروں۔'' اس پر مولانا لکھتے ہیں یہ جوش و خروش، غیظ و غضب اگر محض جوشؔ تخلص کی مناسبت سے ہے اور یہ گرج اور چمک اور یہ ہوش ربا تجلیات آتشیں اور سب سے بڑھ کر بقول ایک صاحب کے یہ ''لن ترانیاں اگر اس میں کلیم کی شاعرانہ رعایت سے ہیں تو اس حسن ادا کی داد نہ دینا ظلم ہو گا لیکن اگر ان کے سوا کوئی اور صنعت ملحوظ رکھی گئی ہو تو اسے سمجھنے کے لئے استاد دماغ رسا کوئی کہاں سے لائے۔''

مولانا کی سخن فہمی، نکتہ رسی اور شعر و سخن سے دلچسپی کی ایک مثال دیکھئے نعیم صدیقی کی ایک غزل کے متعلق سچی باتیں کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

رنگینیٔ گفتار سے مسحور ہے محفل
اور غایتِ گفتار خدا دیکھ رہا ہے

نعیم صدیقی کے اس شعر سے متاثر ہو کر کہا ہے ''اور اس آپ بیتی اور جگ بیتی دونوں کے کتنے نقشے نظر کے سامنے کر دیئے ہیں۔ گفتار، حسن گفتار بلکہ صدق گفتار سے بھی غایت گفتار کس درجہ مختلف ہوتی ہے قوال بہترین شاعر کا بہترین کلام پیش کر رہا ہے۔ کلام دل میں نشتر چبھو رہا ہے۔ ساری محفل لوٹ پوٹ ہوئی جارہی ہے لیکن قوال کی نظریں محفل کی جیبوں پر ہیں اس کا مطلوب و مقصود جو کچھ بھی ہو بس محفل کی نذریں ہیں۔ واعظ شیوا بیان بہترین نکتہ بیاں میں لا رہا ہے منہ سے نکلے ہوئے بول دلوں کو کھائے جا رہے ہیں۔ واعظ کی دل کی گہرائیوں میں نہ اللہ کا خوف ہے نہ اللہ کی رضا کی طلب، سامعین خود قبلۂ مقصود بنے ہوئے ہیں۔ معتقدین کا حلقہ جتنا

بھی بڑھ جائے اچھاہی ہے اور حصول جاہ کے ساتھ ساتھ حصول مال کی بھی کوئی صورت نکل آئے تو کیا برا ہے۔" مولانا مجاہد صاحب کو ادیبوں اور شاعروں سے فطری محبت تھی۔ وہ خوش فکری کی قدر کر سکتے ہیں لیکن توہین صداقت کسی حال میں بھی جائز قرار نہیں دے سکتے۔ مولانا کے مزاج میں خوش طبعی اور شگفتگی بھی بدرجہ اتم موجود تھی۔ وہ سراپا سنجیدگی ہونے کے باوجود بعض اوقات اپنے رنگین جملوں اور دلکش فقروں اور معنی خیز الفاظ سے محفل احباب کو زعفران زار بنا دیتے تھے خود بھی محظوظ ہوتے تھے اور دوسروں کو بھی خوش وقت کرتے تھے۔ آپ بڑے حاضر جواب اور نکتہ رس واقع ہوئے تھے ان کے چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑے بڑے نکتے پوشیدہ رہتے تھے۔

ایک مرتبہ مولانا ہاشم فرنگی محلی نے کچھ پنیر جس کو انگریزی میں Cherse کہتے ہیں مولانا کو بطور تحفۂ درویش بھیجا اس کے جواب میں مولانا نے عندالملاقات فرمایا "آپ نے کیا چیز اس ناچیز کو بھیجی ہے۔" ایک موقع پر نابینا شاعر میاں جرأت کے دیوان کا ایک نسخہ جس کا سرورق نہایت خوبصورت اور جاذب نظر تھا مولانا موصوف کو پیش کیا گیا آپ نے ارشاد فرمایا: "ایک اندھے کا دیوان اور اتنا روشن"۔ ایک شادی کے موقع پر بعد مغرب بجلی کا نظام درہم برہم ہو گیا بعد میں ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ اتنے میں جناب امیر حسن نورانی بھی اس طرف آنکلے۔ صاحب سلامت ہوتے ہی مولانا نے فرمایا "نورانی کی موجودگی میں یہ تاریکی۔"

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے جلسۂ تقسیم اسناد میں جو ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم صدر جمہوریہ ہند کی صدارت میں ہو رہا تھا ادارہ کی زبوں حالی کا شکوہ بہت کھلے الفاظ میں کیا مولانا ماجد نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے صدق جدید میں لکھا "خوب ہوا جو رشید کے یہ ارشادات مرشد کے سمع ہمایوں تک براہ راست پہنچ گئے۔" مولانا موصوف اسلامی، ادبی، نفسیاتی اور اخلاقی دنیا کے علاوہ صحافتی دنیا میں بڑے وسیع مطالعہ اور سوجھ بوجھ کے مالک تھے ان کی نظریں ملکی وغیر ملکی اردو انگریزی اخبارات ورسائل پر رہتی تھیں اور ان ہی سے کام کی باتوں کے اقتباسات اکثر و بیشتر بڑے دلکش اور جاذب توجہ عنوانات کے ساتھ بچی باتوں کا موضوع ہوا کرتی تھیں۔ مولانا کے تبصرے اور تنقیدیں ان اخبارات کے تراشوں میں برمحل نصائح کے مواقع نکال لیتی تھیں اور روزمرہ کے پیش پا افتادہ واقعات سے اخلاقی نکتے اور صحت مند نتائج اخذ کر لیتی تھیں جن کو پڑھ کر عقل انسانی دنگ رہ جاتی تھی اور ان کے حسن استدلال پر سبحان اللہ کہنا

ہی پڑتا تھا۔ مولانا مرحوم کی صدق گفتاری کی زد میں ایوب خاں، یحییٰ خاں بھی آتے تھے اور ذاکر حسین خاں بھی، حیات اللہ انصاری بھی آتے تھے اور آل احمد سرور بھی۔ علی یاور جنگ بھی آتے تھے اور جوش ملیح آبادی بھی۔ آر، ایس، ایس اور جن سنگھ کے اعلیٰ منتظمین بھی آتے تھے اور مجلس مشاورت کے قائدین ملت بھی۔ لیکن ان کی طنز نگاری اور حق گوئی میں ذاتی حملوں اور شخصی کمزوریوں کا کوئی شائبہ یا تذکرہ نہیں ہوتا تھا نہ مقصد کسی کی تذلیل یا توہین ہوتی تھی وہ بےلاگ تبصرہ کرتے تھے اور غیر مراعاتی انداز میں اپنی رائے صاف صاف لکھتے تھے وہ صحافت وانشاء کو ایک جرأت مندانہ باوقار مشغلہ بنائے ہوئے تھے۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنی صداقت شعاری اور حق گفتاری کی بدولت غیر معمولی شہرت ومقبولیت حاصل کرلی تھی۔ ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ — ایک ہمہ جہتی وعبقری شخصیت

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی ☆

نامور مفسر قرآن اور مشہور ومعروف عالم دین، اردو کے عظیم المرتبت، جلیل القدر ادیب، لاثانی طرز انشاء اور منفرد اسلوب بیان کے مالک، عظیم محقق، اعلیٰ پائے کے مصنف اور اردو کے صف اول کے منفرد صحافی، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نابغۂ عصر تھے اور ہمہ جہتی وعبقری شخصیت کے حامل۔ علمی دنیا اور اردو ادب میں ان کی بڑی ہی اعلیٰ اور برتر حیثیت ہے۔ مذہب، فلسفہ نفسیات، اخلاق، تمدن، تفسیر، سیرت نبوی، اسلامی تصوف، سوانح نگاری، تبصرہ نگاری، مرقع نگاری، تعزیت نگاری، طنز نگاری، ترجمہ، سفرنامے، انشاء پردازی، یہ سب موضوعات ان کے علمی فتوحات کے دائرے میں آتے ہیں ان کی تصانیف جن کا شمار ساٹھ (۶۰) سے متجاوز ہے ان کی اردو تصانیف میں ادب اور انشا کا ذوق اتنا رچا اور بسا ہوا ہے کہ وہ ان کا امتیازی وصف بن گیا ہے اس خصوصیت سے ان کی خالص مذہبی اور فلسفیانہ تصانیف بھی خالی نہیں۔

ان کے اسلوب اور طرز ادا کا امتیازی پہلو یہ ہے کہ اردو کے پرانے یا کلاسیکی ادب میں جو خصوصیتیں الگ الگ پائی جاتی ہیں وہ سب ان کے یہاں پائی جاتی ہیں۔ ایک عظیم ادیب اور صاحب طرز انشاء پرداز کی پہچان یہ ہے کہ موضوع کیسا ہی سادہ، سنجیدہ، خشک اور پر تقدس ہو وہ اپنے قلم کی جولانی اور خیال کی رعنائی، طرز بیان، اور اسلوب بیان کی دل آویزی کو نہ روک سکے۔ اور اس کے لئے ممکن نہیں کہ وہ ان موضوعوں پر اپنی تحریر میں اپنے مخصوص طرز انشا اور اسلوب بیان کو جگہ نہ دے۔ مولانا دریابادیؒ کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی کوئی بھی تحریر ادب اور زبان کی چاشنی سے خالی نہیں، اور کہیں بھی ان کا اسلوب تحریر اور طرز انشاء ان کا ساتھ نہیں چھوڑتا مثلاً بکل کی ہسٹری آف مارلس کا اردو ترجمہ فنی اصطلاحات اور ترجے کی مشکلات کی وجہ سے بڑا مشکل

☆ سابق ایم پی، سابق استاد شعبۂ سیاسیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

کام تھا لیکن مولانا اس کتاب کا ترجمہ کرنے میں پوری طرح سے کامیاب ہوئے اور پوری کتاب میں کہیں بھی ثقالت، خشکی اور ترجمہ پن نظر نہیں آتا خواہ خلافت یا ندوہ کے خطبات ہوں، خواہ فلسفہ اجتماع اور فلسفۂ جذبات کی سنگلاخ زمین اور پر خار وادی ہو یا تفسیر و تصوف کا پر عظمت اور نازک میدان، ان کا قلم گلفشانی سے باز نہیں آتا۔ ٹھوس، سنجیدہ، علمی ادب لطف زبان وانشا، طنز ومزاح ضلع جگت، رعایت لفظی سب پر ان کے قلم کی حکمرانی یکساں ہے اور اسی لحاظ سے وہ اپنے دور کے سب سے بڑے ادیب ہیں۔

ان کے طرز انشاء یا اسلوب بیان کی اہم ترین خصوصیت جس کی وجہ سے وہ منفرد انشا پرداز صاحب طرز ادیب ہیں یہ ہے کہ وہ اپنی تحریروں کے درمیان سوالات کرتے جاتے ہیں اور اس طرح بحث طلب امور کے متعلق جتنے موافق یا مخالف سوال ہو سکتے ہیں سب کا احاطہ کر لیتے ہیں۔ پڑھنے والے کو بہت زیادہ لطف اس جگہ آتا ہے جہاں وہ بول چال کے وہ الفاظ لے آتے ہیں جو اظہار غم کے لئے مخصوص ہیں۔ مثلاً ''کیسے کیسے افسانہ گر، افسانہ نویس آئے اور کیسی کیسی مزے دار کہانیاں سنانے بیٹھے مگر دیکھتے ہی دیکھتے خود ان کی زندگی افسانہ بن گئی؛'' مرزا رسوا کے قصے کچھ ادھر سے کچھ ادھر سے۔''

دوسری اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے جملوں میں جچے تلے لفظوں میں جو کچھ کہنا چاہتے ہیں، پیش کرتے ہیں اس لحاظ سے بھی وہ منفرد انشا پرداز ہیں کہ انہوں نے اپنی تحریروں میں ڈیش یا واوین، کاما اور سوالیہ نشان کا استعمال کیا ہے جو اردو میں بالکل نئی خصوصیت ہے۔ یہ خصوصیتیں دوسرے انشاپردازوں یا ادیبوں کی تحریروں میں نہیں ملتیں۔

بحیثیت طنز نگار ان کی ایک الگ پہچان ہے۔ طنز نگاری دشوار ترین صنف ادب ہے۔ اس میں وہی ادیب اور صاحب قلم کامیاب ہو سکتا ہے جو اہل زبان ہو، زبان کا ادا شناس ہو۔

زبان کے معاملے میں مولانا دریابادیؒ پر گرفت ناممکن ہے بعض دفعہ ان کا صرف ایک فقرہ، ایک شذرہ پوری کتاب کا کام کر جاتا ہے اور کسی وقت ان کا محض ایک جملہ مخاطب یا مشارالیہ کے لئے ایسا بھاری پڑ جاتا ہے کہ اس کا رکھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے اور اٹھانا بھی۔

انہوں نے ادبیت کی شرائط کو برتتے ہوئے مواد اور ہیئت دونوں میں طنز کو جس کامیابی کے ساتھ برتا ہے اس کی مثال اردو ادب میں ملنی دشوار ہے۔ انہوں نے نگاہ غائر، زبردست طرز

استدلال، دلیرانہ اور بے باک طرزِ تحریر سے بے شمار موضوعوں اور واقعات پر اپنے تینوں ہفتہ وار اخباروں سچ، صدق اور صدق جدید میں طنز کیا ہے مثلاً سائنس اور سائنسی ہلاکت آفرینیوں کے بارے میں وہ لکھتے ہیں: "حادثہ یعنی ہندوستانی فوج کے ایک تربیتی طیارے کا شہر کی گھنی آبادی میں ٹوٹ پڑنا نمونہ ہے اس حقیقت کا کہ سائنس جہاں حیات آفرین ہے۔ وہیں وہ ہلاکت آفرین بھی کتنی ہے۔ یوں بالکل بیٹھے بٹھائے ختم ہوجانا اب تک تو صرف زلزلہ یا بجلی وغیرہ کے گرنے کے ساتھ مخصوص سمجھا جاتا تھا اب اس مرگ ناگہانی کے امکانات کیسے زیادہ ہوگئے ہیں" (صدق جدید ۲۷ اگست ۱۹۷۰ء) یا سرکاری دفتروں میں اہل کاروں اور بابوؤں کی کام چوری اور ذمہ داری کے بجائے تفریح یا کام کے بجائے ہر موضوع پر گفتگو پر کس بلا کا طنز کیا ہے "دفتر کھلا اور بابو جی اگر جلد آ گئے تو بھی اس کے آدھے گھنٹے کے بعد تو بہر حال اور کم سے کم دس منٹ تک تو اپنے ڈیسک کے کاغذات اور فائلوں کو ٹھیک ٹھاک کرنے میں صرف کئے۔ سست رفتاری تو جیسے ان بابو صاحب پر ختم ہے اور بہ ظاہر اب ان کا کام چالو ہوا کہ چائے نوشی کے دور اول کا وقت آ گیا اور ۲۵ منٹ اس دور نے لئے اور یہی رفتار کام کی آفس کے آخر وقت تک چلتی ہے۔ ہر تھوڑی دیر کے بعد چائے کا دور چلتا ہے۔ کچھ دیر اور گذرتی ہے کہ لنچ آور (کھانے کا گھنٹہ آجاتا ہے) خدا جانے انگریزی دور میں عملے والوں کی یہ بھوک کہاں چلی گئی تھی اس کی مدت کہنے کو تو آدھے گھنٹے کی ہے لیکن عملاً یہ ایک گھنٹے سے زیادہ لمبا ہوتا ہے پھر ساتھیوں اور دوستوں کے پاس ان کے ڈیسک پر جانا اور گپ زنی تو بھی لازمی ہے اور گفتگو سیاسیات سے لے کر دنیا کے ہر پبلک اور نجی موضوع پر ہوتی ہے، اپنے کام اور ذمہ داری کے بجائے تفریح، لاابالی پن، بےفکری پن کا سایہ شروع سے آخر تک چھایا رہتا ہے۔ دفتر کے بند ہونے میں ابھی آدھا گھنٹہ باقی ہے کہ اور ابھی ساڑھے چار ہی بجا ہوتا ہے کہ بابو صاحب فائلوں کو اٹھا کر گھر چلنے کی تیاری شروع کر دیتے ہیں اور دن بھر کی کاہلی اور سستی کا کفارہ، اس وقت کی چستی اور مستعدی سے دیتے ہیں اور اگر کوئی آفت کا مارا ضرورت منداس وقت نازل ہوگیا تو اس کے لئے یہ تر شا ترشایا ہوا جواب رکھا ہوا ہے کہ بس اب کل آئیے گا آج تو بہت دیر ہوگئی۔" (صدق جدید ۹ فروری ۱۹۶۸ء)

اردو ادب کی طرح طنز نگاری کے بقائے دوام کے دربار میں وہ ہمیشہ صف اول میں نظر آئیں گے اور وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تحریروں سے دلچسپی، مقبولیت اور افادیت میں اضافہ ہوتا ہی جائے گا، ان کا طنز تلخ حقیقت پر مشتمل ہوتا ہے اور یہ تلخ حقیقت بڑی ہی موثر

ہوتی ہے۔

ان کا اسلوب موضوع کے عین مطابق ہوتا ہے۔ مذہبی و دینی تحریروں اور تفسیر قرآن میں ان کا انداز عالمانہ اور وقیع ہوتا ہے لیکن سادگی اور سلاست کے ساتھ نہ یہ تحریریں مغلق ہوتی ہیں نہ ان میں مغلق الفاظ کی بھرمار ہوتی ہے۔

مثلاً سورۂ فاتحہ کی آخری آیت کی تفسیر وتشریح کرتے ہوئے مولانا رقم طراز ہیں ''جس طرح مقصود و مطلوب محبوبین اور مقربین کے طور طریقوں کی اتباع ہے اس طرح ممنوع و ناجائز منکروں اور نافرمانوں کی ہم مسلکی ہے۔''

سورۂ یونس کی آیت نمبر ے کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''یورپی تہذیب کا جزء اعظم یہی ہے کہ جنت و دوزخ کا خیال کبھی دل میں آئے ہی نہیں، ذکر و فکر آخرت کی طرف سے بالکل بے اعتنائی تہذیب جدید کی روح ہے، دنیوی ساز و سامان اور مادی علوم و فنون وصنائع کی طرف رہنمائی اور التفات تہذیب فرنگی کا جزء اعظم ہے، بھلا اعلیٰ اور مہذب محفلوں میں حشر و نشر، برے اعمال دوزخ و برزخ وغیرہ کا کوئی ذکر کر کے دیکھے۔''

عالمانہ اور فلسفیانہ تحریروں میں ان کی شان ایک عالم اور فلسفی کی نظر آتی ہے، فلسفیانہ تحریروں کے دو اقتباسات ملاحظہ کیجئے جو ان کی ایک مقبول تصنیف ''فلسفۂ جذبات'' سے لئے گئے ہیں۔

''ایک اور وجہ متمدن افراد کے زیادہ متاثر ہونے کی یہ ہے کہ چونکہ ان میں عقل، دوراندیشی، پیش بینی، زیادہ ہوتی ہے اس لئے بہ نسبت وحشیوں کے وہ نتائج اور افعال کا اندازہ ان کے وقوع سے بہت پیشتر کر لیتے ہیں اور اس بنا پر یہ بالکل قدرتی ہے کہ وقوع واقعات سے بہت پیشتر وہ ان کے نتائج کا اندازہ کر کے انبساط یا انقباض سے متاثر ہونے لگتے ہیں۔

ایک بکری ذبح کرنے کے لئے خریدی جاتی ہے مگر چونکہ وہ اپنی قسمت سے ناواقف ہوتی ہے عین ذبح کے وقت بھی اسے کوئی غم نہیں ہوتا بہ خلاف اس کے انسان کی یہ حالت ہے کہ جس وقت اسے پھانسی کا حکم سنا دیا جاتا ہے وہ اس وقت سے بھاگنے لگتا ہے اس طرح انسان جوں جوں علم و عقل میں ترقی کرتا چلا جاتا ہے اس کے ساتھ وہ اپنے آلام ولذات دونوں کے اسباب بڑھاتا جاتا ہے اور اکثر حالات میں اصل واقعات غم و مسرت سے زیادہ ان دونوں چیزوں کا تصور روح

فرسایا خوش آئند ہوتا ہے۔'' (فلسفۂ جذبات ص: ۲۷ طبع دوم)

''ایک اور طریقے سے فلسفے کی ماہیت یوں بھی سمجھائی جاسکتی ہے کہ جس علم میں کسی مسئلے پر بحث کرتے ہوئے اس کے عوارض انفرادی ومختصات شخصی (نوعی) تمام یا تقریباً حذف کر دیئے جائیں اور اس مسئلے کی طرف کلی، عمومی حیثیت سے سروکار رکھا جائے تو اس کا نام فلسفہ ہے۔ زید کو کھانا کھاتے ہوئے دیکھ کر کوئی شخص اگر یہ سوال کرے کہ زید کب کھاتا ہے، کیا کھاتا ہے کس طرح کھاتا ہے وغیرہ تو اس کی فکر ایک عامیانہ فکر سے زیادہ بلند نہیں لیکن اگر کوئی شخص کھانے والے کے عوارض ذاتی، مختصات شخصی کو نظر انداز کر کے صرف عمومی حیثیت سے اس مسئلے پر اور ان سوالات پر غور کرنے لگے کہ غذا کی طلب انسان کو کیوں ہوتی ہے۔ حیات انسانی پر غذا کے کیا اثرات ہوتے ہیں غذا کے کیا کیا اقسام و مدارج ہوتے ہیں تو اسے ایک سائنٹفک موضوع بحث سے تعبیر کیا جائے گا اس لئے کہ ان سوالات میں مختصات شخصی فنا ہو گئے ہیں۔ زید و عمر کی شخصیت سے کوئی بحث نہیں تاہم مختصات نوعی اب بھی قائم ہیں لیکن اب اگر ان سے بھی قطع نظر کر لیا جائے اور مسئلے میں انتہائی تعمیم پیدا کر دی جائے یعنی یہ سوالات پیش نظر ہو جائیں کہ خود بدل یا تحلیل کی کیا حقیقت ہے اور سائنس داں جو اس کے لازمی اور ضروری ہونے پر زور دیتا ہے تو خود لزوم و ضرورت کا کیا مفہوم ہے تو اب یہ سوالات فلسفے کے دائرے میں آ جائیں گے جو شخص غور و فکر سے کام لیتے وقت تشخصات و تعینات کو جوں جوں زیادہ مٹاتا جائے گا اسی نسبت سے بہ حیثیت ایک فلسفی کے وہ زیادہ دقیقہ رس اور نکتہ رس سمجھا جاتا ہے۔'' (مبادی فلسفہ ص: ۱۵ و ۱۶)

سیرتی و سوانحی تحریریں:

سیرت اور سوانح پر مولانا کی پانچ کتابوں میں سے تین۔ حکیم الامت نقوش و تاثرات، محمد علی ذاتی ڈائری اور آپ بیتی یعنی مولانا کی خودنوشت مقبول ترین ہیں۔ یہ تینوں کتابیں ان کے لاثانی طرز انشا کی آئینہ دار ہیں۔ حکیم الامت کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''قافلہ مختصر سا تین آدمیوں کا اسٹیشن پر اترا (یعنی تھانہ بھون اسٹیشن پر) تین میں ایک فرد نامور لیڈر اور شیخ الحدیث حضرت مولانا حسین احمد مدنی باقی دو میں سے ایک عالم و مولانا کے پرانے عزیز دوست اور رفیق مولانا عبدالباری ندوی اور دوسرا میں خود (یعنی خود مولانا) اس وقت ٹاؤن اسٹیشن (یعنی قصبہ تھانہ بھون کا کھلا نہ تھا) وہی پرانا

اسٹیشن جواب عوام کی زبان پر جلال آباد کے نام سے مشہور ہے یہاں سے قصبہ تھانہ بھون کا فاصلہ کوئی تین میل کا ہوگا تانگہ کرایہ پر لیا اور سنسان راستوں سے گذرتے ہوئے کوئی آدھ گھنٹے کے اندر قصبے کے اندر پہنچ گئے۔ جذبات میں جب قرار کے بجائے مدوجزر اور خیالات میں تلاطم ہو تو یہی آدھا گھنٹہ گھنٹوں کے برابر معلوم ہونے لگتا ہے۔ عقیدت تازہ بھی تھی اور تیز بھی۔ تخیل خوب خوب نقشے پیش کرتا ہے۔ تانگہ خانقاہ امدادیہ کے دروازے پر اترا۔ رات ہو چکی تھی خانقاہ کا پھاٹک قدرۃً بند ملا۔ مولانا حسین احمد صاحب کی رفاقت پھر کام آگئی۔ چند منٹ کی تلاش کے بعد حکیم الامت کے ایک خادم کو ڈھونڈ نکالا۔ وہ بے چارے سوتے سے اٹھ آئے اور ایک پڑوس کے چھوٹے سے مکان کے صحن میں تین چارپائیوں کا انتظام کر دیا اب بقیہ رات کسی طرح گذارنا تھی یکم جولائی کی سی مختصر رات اس کے گھنٹے ہی اب کے باقی رہ گئے تھے، عقیدت کا جوش اتنے گھنٹے بھی کب سونے دیتا ہے۔ حکیم الامت ولی کامل ہیں ساری رات جاگتے ہوں گے اولیاء اللہ بھی کہیں سوتے ہیں اس وقت بھی قطعاً جاگ رہے ہوں گے۔ صاحب کشف بھی یقیناً ہوں گے اس وقت کے مسافروں کی آمد کا حال ان پر بالکل روشن ہوگا۔ آمد کیا معنی دلوں کے اندر تک کے بھید ان سے کون چھپا سکتا ہے ضرور ان پر سب کچھ روشن ہوگا۔ یہ اللہ والے بھی اللہ کی طرح دانا اور بینا ہوتے ہیں اور یہ اینٹ اور چونے کی دیواریں اور مسافتیں ان کی غیب بین نگاہ کی راہ میں حائل تھوڑے ہی ہو سکتی ہیں۔ خوش عقیدگی کے خیالات اس طرح کے کچھ صحیح اور زیادہ تر مہمل دماغ اور دل پر مسلط رہے اس وقت عقیدے تھے بھی ایسے ہی۔ ساتھ ہی جسم بھی خوب تھکا ہوا تھا کچھ سوتے کچھ جاگتے باقی رات بھی کٹ گئی اور نماز فجر کا ابھی بالکل ہی اول وقت تھا کہ ہم لوگ دیدار اشرف کے لئے تیار ہو گئے۔ مولانا تو خیر ان کے بڑے پرانے ملنے والے اور رفیق ہی تھے۔ میرے ساتھی مولانا عبدالباری ندوی بھی چند سال قبل زیارت سے مشرف ہو چکے تھے نادیدہ مشتاق بالکل انیا ع

اے اسیران قفس میں نوگرفتاروں میں ہوں

کی تسبیح پڑھنے والا بس یہی ایک نامہ سیاہ تھا۔

جس مکان میں حضرت حکیم الامت اس وقت قیام فرما تھے اس سے خانقاہ، اور مسجد (مسجد کو خانقاہ حلقے میں لئے ہوئے) کوئی سوگز کے فاصلے پر ہوگی اور جہاں ہم لوگ ٹھہرائے گئے تھے وہ حضرت کے کاشانے سے کوئی دس ہی گز کے فاصلے پر تھا اور حضرت کا راستہ اسی طرف سے تھا۔ میں اشتیاق کا مارا بہت تڑکے گھر سے نکل کر عین راستے پر ذرا کنارے ہٹ کر کھڑا ہو گیا کہ زیارت جمال پہلے یہیں ہو جائے، چند ہی منٹ گذرے ہوں گے کہ آرزو پوری ہوئی ایک بزرگ ادھر سے گذرے لیکن خوش رو نظریں نیچی، چال متین، نورانی چہرہ، نورانی داڑھی، زیادہ سفید کچھ سیاہ اور شاید اپنی نورانیت کی مناسبت سے لباس بھی خوب سفید براق، سر پر نازک سی گول ابھری ٹوپی، جسم پر لمبا کرتہ نازک و نفیس غالباً تن زیب کا۔ تاریکی ابھی کچھ باقی تھی اور ذرا فاصلہ بھی تھا۔ نگاہ سے نگاہ ملنے کا کوئی موقع نہ تھا اور کہنا چاہئے کہ صرف جھلک ہی دیکھنے میں آئی اس پر بھی دل کشی ورعنائی، وزیبائی بہ حیثیت مجموعی ایسی محسوس ہوئی کہ زبان نہ سہی دل تو بے اختیار آواز دے ہی اٹھا۔ ع

قربان یک نگاہ تو عمر دراز ما

کم وبیش ۱۶ سال اس منظر پر گذر چکے اور معلوم ہو رہا ہے کہ بات کل کی ہے دماغ پر نقش اتنا گہرا اور دل پر تاثر اتنا زبردست کم ہوتا ہے۔"

مولانا کی خودنوشت "آپ بیتی" کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"بسم اللہ اب کیا بتایا جائے کہ یہ متبرک رسم اس وقت کیا تھی مسلمانوں ہی میں کتنے اس رسم کے جاننے والے اور سمجھنے والے رہ جائیں گے۔ انیسویں صدی کے آخر بیسویں صدی کے اوائل تک یہ دستور ہر پڑھے لکھے گھرانے میں تھا کہ بچہ ادھر پانچ سال کا ہوا کہ ادھر اسے عام پڑھائی شروع کرانے سے قبل ایک چھوٹے مجمع میں اسے بٹھایا اور بغدادی قاعدہ نامی ایک پرانی دھرانی کتاب اس کے ہاتھ میں تھما دی لفظ بسم اللہ پر اس کی ننھی سی انگلی کسی متبرک شخص کی زبان سے پوری بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اس سے دہروادی جاتی تھی مولوی صاحب ایک ایک ٹکڑا الگ الگ کہتے جاتے اور بچہ اسے دہراتا جاتا۔ تبرکاً ایک آدھ دعا بھی پڑھادی جاتی تھی بسم اللہ کرانے والے کی خدمت میں حسب توفیق کچھ نذرانہ پیش کیا جاتا۔ حاضرین محفل کو

شیرینی تقسیم کرادی جاتی اور سب لوگ والدین کو مبارک باد دیتے بغیر بسم اللہ کی اس تقریب کے تعلیم شروع ہی نہ ہوسکتی تھی اس اسلامی تہذیب وثقافت کی ایک جھلک کہ ہر صبح سونے سے اٹھنے والا کیا بچہ، کیا بوڑھا کلمہ ہی پڑھتا ہوا اٹھے۔

زمانہ یہی کوئی اخیر ۱۸۹۵ء کا ہوگا کہ ایک سہ پہر کو بعد عصر لکھیم پور میں ایک زنانہ مکان کے صحن میں تخت پر فرش بچھادیا گیا اور میں مولوی صاحب کے سامنے بسم اللہ پڑھانے بٹھادیا گیا اور زندگی کی پہلی رسوائی کا تماشہ اب شروع ہونے کو ہوا ارد گرد عزیز دوست ملازمین کچھ کھڑے ہوئے کچھ بیٹھے ہوئے۔ والدہ وہمشیرہ وغیرہ چلمنوں کی آڑ میں ادھر آنکھیں لڑائے، سب کے چہروں سے مسرت ٹپکتی ہوئی لیکن یہ کیا دیر ہوتی چلی جاتی ہے اور ضدی لڑکے کی زبان پر بسم اللہ نہیں آتی۔ مزاج میں شرمیلا پن پیدائشی اس وقت اور کیسی بری گھڑی رنگ لایا۔ جھٹ سے فرفر سنادیتا الگ رہا۔ یہ بھی نصیب نہ ہوا کہ اٹک اٹک کر کچھ تو زبان سے نکالتا ایک دم چپ ہوگیا اڑ گیا مولوی صاحب بے چارے ہزار چمکار رہے ہیں، بڑھاوا دے رہے ہیں دلاسا دے رہے ہیں اور کھڑے بیٹھے جتنے بھی ہیں سب ہی شاباشی کی تھپکیاں دے رہے ہیں لیکن چاروں طرف جتنا اصرار ہورہا ہے اسی قدر اپنی زبان گنگ سے گنگ تر ہوتی جارہی ہے والد مرحوم بڑے ہی حلیم المزاج تھے لیکن آخر انسان تھے غصہ کب تک نہ آتا بھرے مجمع کے سامنے یہ منظر بالکل خلاف توقع دیکھ کر جھنجھلا اٹھے بالآخر ایک پتلی سی چھڑی اٹھا کر میرے جھاڑ دی ضدی بچے نے مار گوارا کرلی لیکن زبان کھلنا نہ تھا نہ کھلی، لوگوں نے سمجھا کر الگ کیا اور کچھ دیر کے لئے مجھے مہلت دلا دی اور خوش دلی ومسرت کی تقریب ایک عجیب قسم کی بے لطفی وادای پر ختم ہوگئی کچھ دیر کے بعد وہی ان پڑھ کھلائی بالآخر کام آئیں اور مجھے گود میں اٹھایا، خوب باتوں میں لگایا اور خوب بہلایا اور جب دیکھ لیا کہ بھوت سر سے پوری طرح اتر چکا ہے تو آخری تیر یہ چلایا کہ شاباش کیا ہمارے بھیا کو بسم اللہ کہنی نہیں آتی اچھا ذرا پکار پکار کر مولوی صاحب کو تو سنادے اب کیا تھا اوا اس چہرے بحال ہوئے خوشی کی لہر گھر بھر میں دوڑ گئی، مٹھائی کی تقسیم دھوم دھام سے ہوئی ابھی ابھی فقرہ زبان قلم سے ادا ہوا ہے کہ بوا نے مجھے گود میں اٹھالیا یہ فقرہ آج ۱۹۶۷ء میں ۷۴-۷۵ سال کے پیر سال خوردہ کی زبان سے ادا

ہوا ہے۔ ہائے وہ دایہ کی گود میں جانے کی لذت اب کیا بیان ہو وہ لذت جس کا بدل نہ کبھی جوانی کی گرمیاں دے سکیں نہ بڑھاپے کی خنکیاں۔

پڑھنے والے اس مقام پر پہونچ کر ایک پیر نابالغ پر ہنسنے اور مضحکہ کرنے میں جلدی نہ کریں عجب نہیں کہ اس سن پر پہونچتے پہونچتے انہیں بھی بچپن کی ساری معصومانہ شرارتوں کی یاد تازہ ہو جائے۔ غضب کی حسرت ناک سچائی بھر دی ہے کسی نے اس مصرع میں ع

دو دن کو اے جوانی دے دے ادھار بچپن کو

محمد علی ذاتی ڈائری کا ایک اقتباس:

نومبر میں حکم سنا دیا گیا۔ دو دو برس کی سزا سب ملزموں کے ساتھ محمد علی کو بھی۔ محمد علی سارے ملک میں بھی گھوم پھر چکے تھے، مارے مارے پھرتے بہت دن ہو چکے تھے اب مشیت تکوینی کے حاکم کا حکم ہوا کہ مدت دراز کے لئے ایک جگہ جم کر بیٹھو ان ہی کی زبان میں

سو دیکھئے اب یہ گردش تقدیر
کہیں آنے کے نہیں اور نہ جانے کے

اللہ اللہ کیا سماں تھا— آکسفورڈ کا گریجویٹ، انروز پایا ہوا گریجویٹ، کامریڈ کا ایڈیٹر، ملک کا معروف ترین لیڈر، ڈاکوؤں اور خونیوں کے ساتھ قفس میں بند اور جس کے ملنے والے میں ابھی کل تک گورنر اور لفٹنٹ گورنر، راجے مہاراجے، ایگزیکٹیو کاؤنسلر اور خود وائسرائے بہادر تھے، اس کی عزت جیل کے ادنیٰ پہرے داروں اور برقندازوں کے رحم و کرم پر تھی۔ گدے اور قالین کی جگہ زمین کا کھر آفرش اور غذا مل رہی ہے جو کبھی اس کے چاکروں اور خدمت گاروں نے بھی کیوں کھائی ہو۔

اور یہ سب کچھ دعوئی اسلام کے جرم میں، محبت اسلام کی پاداش میں۔ فرد جرم جو لگی تھی اس میں آزادی ہند اور سوراج کا کہیں نام نہ تھا۔ الزام یہ تھا کہ قرآنی احکام اور احادیث رسول اللہ ﷺ قتل مسلم کی وعید میں ہیں۔ انہیں مسلمان سپاہیوں تک پہونچانے کی کوشش کیوں کی۔ تاریخ ملکے پیمانے پر سوا تیرہ سو برس کے بعد اپنا اعادہ کر رہی تھی ادھر محمد علی جیل گئے ادھر بچے بچے کی

زبان پر ـــــ

محمد کہہ رہے ہیں کراچی کے قیدی
ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

کا ترانہ آ گیا، جس پر اپنے بیوی بچوں اور دوستوں سے دو چار دن کی بھی جدائی شاق تھی اسے ۲۴ مہینوں تک سب سے الگ قید فرنگ میں بند رہنے کا حکم ملا۔ اللہ اللہ کیا شان بے نیازی ہے۔ اپنے عاشقوں کے امتحان کیسے کیسے کرائے جاتے ہیں'' محمد علی ذاتی ڈائری جلد اول ص ۱۰۳، ۱۰۴۔ مولانا کے دل آویزادبی شاہ کاروں میں اردو کا بدنام شاعر، مرزا رسوا کے قصے کچھ ادھر سے کچھ ادھر سے، اور 'نیا آئین اکبری' ہیں۔

اردو کا بدنام شاعر یا گنہ گار شریف زادی، کا تمہیدی حصہ ملاحظہ ہو۔

''لکھنؤ ہے اور واجد علی شاہ جان عالم کا لکھنؤ، زمانہ بھی انیسوی صدی کے وسط کا۔ ہر لب پر گل کا افسانہ، ہر زبان پر بلبل کا ترانہ، ہر سر میں عشق کا سودا، ہر شام میلوں کا ہجوم، ہر رات گانے بجانے کی دھوم، یہاں رہس کا جلسہ، وہاں اندر سبھا کی پریوں کا پرا، ادھر زبان پر ضلع جگت اور پھبتیاں، ادھر گلے سے نکلی ہوئی تانیں اور ہاتھوں سے بجتی ہوئی تالیاں، گلی گلی جنت نگاہ اور فردوس گوش، چپہ چپہ دامان کف گل فروش، بڑے بڑے متین اور ثقہ گویوں اور سازندوں کی سنگت میں، اچھے اچھے مہذب اور مقطع بھانڈوں اور ڈہاڑیوں کی صحبت میں، سفید پوشاک کے دامن عبیر د گلال کی پچکاریوں سے لالوں لال، جبے اور عمامے والے پیشواز ون کی گردش پر نثار، غرض یہ کہ آج کی اصطلاح میں ہر طرف آرٹ، فائن آرٹ کا دور دورہ عشق کا چرچہ، حسن کا شہرہ اس فضا میں ایک صاحب حکیم تصدق حسین نامی آنکھیں کھولتے ہیں کوئی عالم دین نہیں، صوفی و درویش نہیں، واعظ و مصلح نہیں، چونچلوں کے آدمی، یار باش، زندہ دل، رند مشرب اہل بزم کے خوش کرنے کو شعر و شاعری کا ساز لئے بیٹھے تو انگلیاں انہیں پردوں پر پڑیں جن کے نغمے کانوں میں رچے ہوئے تھے اور منھ سے جو بول نکلے وہی جن کے نقش دلوں میں جمے ہوئے تھے۔

حکیم صاحب کی حکمت وطبابت سے یہاں غرض نہیں، شاعری کی دنیا میں حکیم صاحب کا نام نواب مرزا ہے۔ اور تخلص شوق اور ان کے نام کو قائم رکھنے والی غزلیں نہیں مثنویاں ہیں۔

تذکروں میں ہے کہ خواجہ آتش کے شاگرد تھے، ہوں گے، لیکن یہ یقیناً یا تو استاد کے بعد کہی ہیں۔ یا ان کی زندگی میں ان سے چرا چھپا کر ورنہ آتش کی نظر پڑنے کے بعد عجب نہیں کہ نذر آتش ہو جاتیں خواجہ آتش کی متانت کب اس کی روادار ہوتی کہ سعادت مند شاگرد، آوارگی اور تماش بینی کی بولی ٹھولی میں وہ نام پیدا کر جائیں کہ تہذیب کی آنکھیں ان کا نام آتے ہی نیچی ہو جائیں اور عریاں نگاری کے وہ شرارے چھوڑ جائیں کہ ان کی یاد کی چمک دمک، قائم رہے بھی تو اسی روشنی میں۔

مرزا رسوا کے قصے کچھ ادھر سے کچھ ادھر سے کا، ایک اقتباس:

''ناول نویسی کی عمر اردو میں مرزا رسوا کی عمر سے بڑی ہے، سرشار اور شرر اور دوسرے حضرات اپنے رنگ میں اس چمن کی آبیاری کر چکے تھے۔ کہنا چاہئے کہ انیسوی صدی کے ساتویں اور آٹھویں دہے میں انگریزی ناول خاص تعداد میں اردو میں منتقل ہو چکے تھے تب کہیں جا کر مرزا محمد ہادی رسوا نے انیسوی صدی کے نویں دہے میں اس کوچے میں قدم رکھا۔ آدمی بڑے صاحب علم شریف خاندان تھے۔ شمار شہر کے متین، ثقہ طبقہ اہل علم میں تھا۔ ناول نویسی کا مشغلہ اس حد تک کچھ ایسا معزز نہ تھا غرض کچھ وضع قدیم کا پاس کچھ اپنے علمی وقار کا لحاظ، داستان سرائی کرنے بیٹھے تو چہرے پر مرزا رسوا، کا نقاب ڈال لیا حالانکہ یہ نقاب تھا اتنا باریک کہ جو چاہے وہ ایک ایک خط دخال، ایک ایک بال باہر سے گن لے۔ اردو میں ناول بہتوں نے لکھے، اچھے اچھوں نے لکھے پر ان کا رنگ سب سے الگ، ان کا انداز سب سے جدا، نہ ان کے پلاٹ میں 'سنسنی خیزیاں' نہ ان کی زبان میں غرابت زائیاں، نہ ان کے اوراق میں 'برق پیمائیاں' اور نہ 'کوہ تراشیاں' نہ ان کے الفاظ ترنم ریز، نہ ان کی ترکیبیں 'ارتعاش انگیز، نہ ان کی تصویر رزم میں 'برق پاشیاں' نہ ان کی داستان بزم میں، ابتسام آرائیاں، پلاٹ وہی روز مرہ صبح وشام کے پیش آنے والے واقعات جو آپ ہم سب دیکھتے ہیں زبان وہ گھر و باہر کی ستھری اور نکھری بول چال جو ہم آپ سب بولتے ہیں۔ قصے کے مقامات نہ لندن نہ ماسکو، نہ برلن نہ ٹوکیو، بس یہی لکھنؤ، فیض آباد، دہلی، الہ آباد افسانے کے اشخاص، نہ لندھور نہ سند باد جہازی بس یہی حکیم صاحب اور شاہ صاحب راجہ صاحب اور نواب صاحب، میر صاحب اور مرزا صاحب، عسکری بیگم، عمدہ خانم، امراؤ جان اور بوا نیک قدم۔ کہتے ہیں کہ صاحب کمال لاولد رہ جاتا ہے۔ اس کی نسل آگے نہیں چلتی، اپنے طرز کا

موجد بھی ہوتا ہے اور خاتم بھی وہی۔ مرزا رسوا کا بھی کوئی خلف معنوی آج تک پیدا نہ ہوا۔

مرنے کے دن قریب ہیں شاید کہ اے حیات
تجھ سے طبیعت اپنی بہت سیر ہوگئی

جس نے موت کو دعوت ان الفاظ میں ۳۱۔۳۲ سال قبل دی تھی اس کی شمع حیات واقعۂ اکتوبر ۱۹۳۱ء میں گل ہوکر رہی۔ موت کو جب آنا ہوتا ہے جب ہی آکر رہتی ہے۔ شاعر کی طبیعت ممکن ہے کہ حیات سے اسی وقت سیر ہو چکی ہو لیکن خود حیات اس وقت تک شاعر سے سیر نہیں ہوئی تھی۔ موت تو جبھی آئی جب اسے آنا تھا اور جب آئی تو بہتوں نے یہ بھی نہ جانا کہ کس نام کے رسوا اور شعر و ادب کے رسیا کو اپنے ہمراہ لیتی گئی۔ سدا رہے نام اللہ کا۔ بقا نہ کسی شاعر کو ہے اور نہ شاعری کو، نہ ادب کو نہ ادیب کو، کیسے کیسے افسانہ گو اور افسانہ نویس آئے۔ اور کیسی کیسی مزے دار کہانیاں سنانے بیٹھے مگر دیکھتے دیکھتے خود ان ہی کی زندگی افسانہ بن گئی باقی رہنے والا بس جو ہے وہی ہے۔

ذات معبود جاودانی ہے
باقی جو کچھ کہ ہے وہ فانی ہے

جو رونق محفل ہوتے ہیں وہ ایک ایک کر کے اٹھتے جاتے ہیں لیکن محفل کی رونق جوں کی توں، بلسان العصر اکبر الہ آبادی کے الفاظ میں۔

دنیا یوں ہی ناشادیوں میں شاد رہے گی
برباد کئے جائے گی آباد رہے گی

نیا آئین اکبری کا ایک اقتباس:

''آئین اکبری تو وہی ایک ہے سب کا جانا ہوا، خوب پہچانا ہوا، شہنشاہ اکبر کے انتظامی خط و خال کا آئینہ، اب اس میں کوئی جدت کیا پیدا کرے گا، پرانے کو نیا کیوں کر بنائے گا۔ اور اطلس میں گزی گاڑھے کا پیوند کہاں سے لاکر لگائے گا؟۔ لیکن اکبرا کیلئے ایک شہنشاہ ہی کا تو نام نہیں۔ اقلیم سخن کا بھی ایک تاج دار اسی نام کا گذرا ہے، صدیوں قبل نہیں ابھی حال میں اور کہیں بہت دور نہیں آپ کے شہر سے نزدیک الہ آباد میں (نوٹ از مقالہ نگار جنوری ۱۹۳۲ء لکھنؤ میں وکٹوریہ

پارک (چوک سے متصل) ایک بہت بڑی سرکاری نمائش منعقد ہوئی تھی اور ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کا اسی نمائش گاہ میں اجلاس منعقد ہوا تھا اور یہ مقالہ مولانا نے اسی اجلاس میں پڑھا تھا) وہ قدیم آئین اکبری تھا اقلیم ہند کے ایک فرماں روا کا کوکبۂ جلال یہ آج کا جدید آئین اکبری ہے اقلیم معانی کے ایک تاج دار کا پرتو جمال۔ البتہ وہاں داستان گو تھا ایک نام کا ابوالفضل اور یہاں عرض پرداز ہے ایک سراپا جہل۔ خیر نمائش کے عجائب زار میں ایک اعجوبہ کا اضافہ اور سہی، ادبی کانفرنس میں ادیبوں اور شاعروں کے مجمع میں سخن گویوں اور سخن فہموں کے جلسے ایک کم سواد قصباتی کی جسارت اللہ اکبر۔ بس یوں سمجھئے کہ گھوڑ دوڑ کے میدان میں جہاں بازیاں بڑے بڑے شہ سواروں کی لگ رہی ہیں وہیں ایک گوشے میں ایک نعل بند بھی کیل کانٹے سے لیس اپنا تھیلا لئے موجود۔

ظرافت کلام اکبر کی سب سے بڑی نقیب بھی رہی ہے اور کمال اکبر کے خش میں سب سے گہری نقاب بھی۔ یہ بالکل صحیح کہ ان کے نام کو قہقہوں نے اچھالا، ان کی شہرت کو تالیوں نے چمکایا، لیکن یہ بھی اس قدر صحیح کہ دنیا انہیں محض ایک دل لگی باز سمجھ ان کے لطیفوں پر مٹی رہی، ان کی شوخیوں پر ہنستی مسکراتی، ان کے چٹکلوں پر لوٹتی کھلکھلاتی رہ گئی، ادھر نظر کسی کی نہ گئی اور کسی ایک آدھ کی گئی تو وہ شمار میں نہیں کہ جس ساز سے یہ نغمے نکل رہے ہیں وہ خود کتنے سوز میں ڈوبا ہوا ہے۔ یہ سب نے دیکھا کہ ایک پیر مرد شکر میں لپٹی ہوئی گولیاں سب کو تقسیم کرتے جاتے ہیں اور کھانے والے ہیں کہ فرط لذت اور حلاوت سے ہونٹ چاٹتے رہ جاتے ہیں۔ یہ کسی نے نہ پوچھا کہ گولیاں جراثیم کش کیسی زبردست ہیں اور ان میں تریاقیت کس غضب کی ہے۔

'صاحب مثنوی مولوی معنویؒ کے اس رمز سے تو سب ہی آگاہ ہیں کہ وہ سر دلبراں حدیث دیگراں میں ادا کر جاتے ہیں۔ حضرت اکبر نے بھی کچھ سوانگ اس طرح کا بھرا اور کچھ زمانے کے کڑے تیوروں کے لحاظ سے کھل کر نہ کہہ سکے اسے قہقہوں کے شور اور تالیوں کی گونج میں سنا گئے اور خود عذر خواہی یہ کرتے گئے۔

سرد موسم ہے ہوائیں چل رہی ہیں برف بار
شاہد معنی نے اوڑھا ہے ظرافت کا لحاف

فرمانے کو تو خدا جانے کیا کیا فرما گئے ہیں، مذہب اور روحانیت، اخلاق اور معاشرت، تعلیم

وسیاسیات کا کوئی گوشہ ان کے دائرہ التفات سے باہر کب رہنے پایا ہے۔ اس ساری داستان کے دہرانے کی قوت ہے کس میں؟ اور کوئی ہمت کر بھی جائے تو سننے والوں کو اتنی فرصت کہاں؟ لیکن اکبر اپنا ایک مخصوص پیام بھی لے کر آئے تھے، ہیر پھیر کر الٹ پلٹ کر منادی اسی کی کرتے رہے کوئی سنے یا نہ سنے یا سنے اور سن کر بھی نہ سمجھے بہرحال اپنا پیام انہوں نے سنا سب کو دیا اس پیام کا نام اگر آئین اکبری رکھ دیا تو کچھ بیجا ہوا؟

پیام کچھ دقیق اور پیچیدہ نہیں، کوئی غامض فلسفہ نہیں، سیدھی سادی بات صرف ایک لفظ میں ادا ہوسکتی ہے پیام خودداری کا ہے۔ مشرقی سے کہتے ہیں کہ مشرقی رہ، ہندی کو تعلیم دیتے ہیں کہ ہندی ہی بنا رہ، مسلمان کے لئے یہ تلقین ہے کہ خبردار اسلام سے نہ ہٹ اسی ایک ترانے کو خدا جانے کتنے دلکش نغموں، کتنے دل آویز سروں میں بے شمار بار دہرایا۔

ترجمے کا ایک نمونہ:

سرہنری بکل مشہور عام تصنیف ہسٹری آف سویلزیشن کا ترجمہ دو جلدوں میں انجمن ترقی اردو ہند نے شائع کیا اس کی جلد دوم کا ترجمہ مولانا دریابادیؒ نے کیا اس ترجمہ کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

"حقیقت یہ ہے کہ بغیر برک کے تذکرے کے جارج سوئم کے عہد کی تاریخ سرسری طور پر مکمل نہیں کہی جاسکتی یہ عجیب و غریب شخص نہ صرف سیاسیات کے اصول و فروع پر حاوی تھا بلکہ کہہ سکتے ہیں کہ جملہ علوم و معارف کی ایک زندہ دائرۃ المعارف تھا۔ اس کے بڑے بڑے نامور معاصرین اس کے کمالات کی جامعیت کے قائل تھے اور ہمیں تو رابرٹ پال کا یہ قول حرف بہ حرف سچ معلوم ہوتا ہے کہ "برک کے کمالات لاتعد ولاتحصیٰ تھے۔ اس کا دماغ عامۃ الورود تھا اور وہ ہر علم سے بہرہ رکھتا تھا۔

قانون وفنون لطیفہ بہ ظاہر متناقض نظر آتے ہیں لیکن برک کی ذات دونوں کی جامع تھی چنانچہ جہاں ایک طرف وکلاء و مقننین کی جماعت اسے اپنا پیر و مرشد مانتی ہے دوسری طرف تاریخ و علم لاتعد وجنہیں ہم بالکل جدید علم سمجھتے ہیں میں برک امام کا درجہ رکھتا ہے۔ اقتصادیات کا آدم ہم اپنے خیال میں آدم اسمتھ کو سمجھے ہوئے تھے حالانکہ خود اسمتھ کو اعتراف ہے کہ جب وہ لندن آیا تو یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ جن نتائج پر وہ سالہا سال کی مشقت و ریاضت کے بعد پہونچا تھا اور جن نظریات کو تمام تر اپنے اجتہاد فکری کے ثمرات سمجھ رہا تھا برک وہ سب منازل طے کر چکا تھا۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ سائنس کے متعدد اصناف کا بھی پورا عالم تھا اور یہ تمام علوم اس کے خزانے میں نہ صرف محفوظ ہی تھے بلکہ ایک خاص خوش سلیقگی کے ساتھ مرتب تھے گویا اس کے دماغ میں متعدد خانے تھے اور ہر خانے میں ایک ایک علم موجود تھا جس سے وہ جب چاہتا کام کے لئے نکال سکتا تھا۔ پھر لطف یہ ہے کہ تدبر، عاقبت اندیشی اور عملیت گویا اس کا ضمیر تھے۔

مولانا دریابادیؒ کے مرقعے بھی قابل داد وتحسین ہیں جس چیز کا بیان کرتے ہیں اس کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پیش کرتے ہیں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس کی سیر آپ ان کی چشم قلم سے کیجئے ''وہ دیکھئے نواب محسن الملک فصاحت کے دریا بہار ہے ہیں اور اب دیکھئے شمس العلماء مولانا نذیر احمد بلاغت کے جوہر دکھا رہے ہیں وہ دیکھئے قاری شاہ سلیمان پھلواروی آئے اور آپ جب چاہیں گے رلا دیں گے، پردہ اور ہٹا اب اسٹیج پر علی امام کا قبضہ ہے، اب صاحبزادہ آفتاب احمد خاں اپنی تقریر سے دل دہلائے دے رہے ہیں اور یہ شوکت علی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے گرج رہے ہیں، ادھر محمد علی دلوں کو گرما رہے ہیں، مولانا شبلی کا فاضلانہ خطبہ ابھی ختم ہوا ہے اور اب حالی کی زارنالی ہے دلوں کے پتھر پسیجیں گے۔ صدر ہمیشہ کوئی نہ کوئی چوٹی ہی کا منتخب ہوتا، سر آغا خان، جسٹس امیر علی، نواب صاحب ڈھاکہ، راجہ محمود آباد سید حسین عماد الملک بلگرامی، جسٹس بدرالدین طیب جی اپنے اپنے جلوے دکھا کر رخصت ہو گئے ایک ایک صدر کے جلسہ صدارت کو سننے کو لوگ ایک دوسرے پر پلے پڑتے تھے۔ (صدق ۱۴ جولائی ۱۹۶۷ء)

مولانا دریابادیؒ بڑے معرکے کے انشائیہ نگار تھے ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

اکنی۔ نئی دہلی سے ایک سرکاری اعلان ''اکنی بہ طور قانونی سکہ یکم جنوری ۱۹۶۴ء سے ختم کر دی جائے گی۔ دنیا کی ہر چیز کی طرح سکوں کی بھی ایک عمر ہوتی ہے، دینار، درہم، تنکہ، فلوس، دہیلی پاؤن کو آنا کوئی جانتا ہے؟ اور آنہ اور پائی ادھنا اور دونی اور پیسے اور گنڈا اور دہیلا اور کوڑی تو ہمارے آپ کے سامنے مردہ ہوئے ہیں۔

اکنی کا شمار کوئی بہت پرانے سکوں میں نہیں بلکہ زیادہ عمر کے لوگوں کو تو اس کا اجراء یاد ہوگا ۱۹۰۷ء ہی سے تو چلی لارڈ کرزن نے رفاہ خلق کے خیال سے اس کے اجرا کی تحریک ۱۹۰۶ء میں کی تھی، پہلے کوڑی اور پھر بعد کو دہیلے کا دور ختم ہونے کے بعد اب غریب، غربا، متوسط الحال لوگوں کے لئے سب سے زیادہ محبوب اور مرغوب، کار آمد اور چلتا ہوا سکہ یہی تھا۔ اور کتنی خوش گوار یادیں

بچپن سے لے کراب تک کی نکل کے اس چھوٹے سے سکے سے وابستہ ہیں۔ایک آنے کی مونگ پھلی سے جیب کیسی بھر جاتی تھی۔ایک آنے کی مٹھائی اتنی مل جاتی تھی کہ کئی کئی حصے اس میں لگ جاتے تھے،ایک پلیٹ فارم ٹکٹ ایک آنے کا،اخبار کا پرچہ ایک آنے کا،ریلوے ٹائم ٹیبل ایک آنے میں،کباب روٹی کا ناشتہ ایک آنے میں،لسی کا گلاس ایک آنے میں،چائے کی پیالی ایک آنے میں،برف کی قلفی ایک آنے میں،قلی کی مزدوری ایک آنے،یکہ کا کرایہ ایک آنہ غرض ہمہ وشمہ کا حاجت روا ایک آنہ اشرفی،ساورن اور گنی جس طرح دیکھتے دیکھتے عنقا ہو گئیں۔اسی منزل کی طرف اکنی چلی اور چند روز میں بس اس کا نام سکوں کی تاریخ میں باقی رہ جائے گا اور شکل شاید عجائب خانوں کی الماریوں کے اندر ہی نظر پڑے،غم اس کے جانے کا نہ کیجئے جو چیز آتی ہے جانے ہی کے لئے تو آتی ہے،خواہ جلد خواہ بدیر یا سوچئے کہ یہ بے شمار اکنیاں جو آپ کے ہاتھ سے نکلیں وہ کس مد میں انھیں موقع خیر پر یا اس کے برعکس؟ ایسی جو آپ کے لئے دائمی راحت ومسرت کا باعث ثابت ہوں گی یا کم سے کم یہ کہ ان کے صرف سے متعلق کوئی باز پرس نہ ہوگی یا یہ کہ خدانخواستہ آپ کے لئے وبال جان اور موجب حسرت وحرماں نکلیں گی۔

دو نمونے تبصرہ نگاری کے ملاحظہ ہوں:

شرح درد:

خواجہ محمد شفیع دہلی کے رہنے والے ہیں اور نئی دہلی کے دور میں پرانی دہلی کی یاد تازہ رکھنے والے خواجہ میر درد کے کلام کی یہ شرح شرح درد اپنے رنگ میں خود انہیں کے قلم کی ہے۔کلام کی شرح تو خیر ایک چیز ہی ہے شارح کی نثر بجائے خود ایسی ہے کہ فصاحت لوٹی جاتی ہے۔دیباچے کی ابتدا کھجور کے درخت سے ہوتی ہے جی ہاں کھجور کے درخت سے ان رسیلی اور شربتی ٹپکتی ہوئی لالوں لال کھجوروں کا مزہ تو بعد میں چکھئے گا ابھی ذرا ہری ہری ٹہنیوں،خوشبوؤں سے لدی ہوئی ڈالیوں کی سیر کرتے چلئے۔

صحرائے عرب کا نخل،کھجور،ہر برگ وریشہ کام کا،پھول پتی کارآمد،پھل غذا گٹھلی دوا،جڑیں مضبوط،بلند وبالا،بادسموم کے تھپیڑوں سے جھک جائے،دم کے دم پھر سیدھا مرکز سے جنبش نہیں اپنی بقا کے لئے کم از کم کا طالب دوسروں کی بقا کے لئے زیادہ سے زیادہ حیات بخش فروعات سے معریٰ چوٹی پر ایک گتھا ہوا گلدستہ،پھول پھل سب ایک جگہ،یک جہتی اور سلوک کا نمونہ سایہ دور

دور پھینکے، جگہ کم سے کم گھیرے برگ وبار کی ہر فصل یانسل اس کو پوری سر بلند کر جائے خود سپردگی خاک ہو کھاد بن جائے، آنے والوں کے لئے بلند تر مقام کی بناء بنے۔

ازمولانا دریابادیؒ:

بارہ کی اس گنتی میں ماہ ربیع کی بارہویں کی بہار، بارہ برجوں کے خالق کی قدرت کا رمز اس سے آشکار، نئی تشبیب اور نئی گریز، مجاز سے حقیقت کی طرف آیئے اور لفظی بندشوں میں معنویت کی مٹھاس پایئے۔

جس خطے نے ان خصوصیات کا متحمل درخت پیدا کیا اسی دیس سے ایک دین چلا، قوی الاساس راستی وراست بازی کا حامل، دب دب کر ابھرنے والا لیکن تعلیم ورضا کا طلب گار، فرقہ بندی سے غیر متاثر، وحدت کا پرستار، مرکزیت کا دلدادہ، اتفاق کا حامی، رسم ورواج کی پہنائیوں سے معریٰ، ہلکا پھلکا دور رس، ترقی کا راستہ دکھانے والا فنا میں بقا کا درس دینے والا یہ وہ مذہب تھا جو رسول عربیؐ لے کر آئے (شرح درد ص:۱۱)

زبان کی ان لطافتوں ادب کی ان نزاکتوں کی جو قدر نہ کرے، وہ یقیناً اردو سے، بارہ پتھر باہر۔

رسالہ کلیم دہلی ماہوار ایڈیٹر جوش ملیح آبادی۔

جوش صاحب اب تک شاعر انقلاب تھے اب کلیم کے صفحات میں داعی انقلاب کی حیثیت سے نظر آ رہے ہیں پہلے نمبر میں اردو ادبیات میں انقلاب کی ضرورت پر ایک پر جوش مقالہ سپرد قلم فرمایا ہے اس کو شروع یوں فرماتے ہیں، نوع انسانی کے مصلح بننے کا خیال کس قدر مضحکہ خیز خیال ہے انسان انسان کی اصلاح کر سکتا ہے؟ کیا یہ واہمہ نہیں، (ازمولانا دریابادیؒ) لیکن یہ ارشاد نہ ہوا کہ دعوت اصلاح اگر تمام تر مضحکہ خیز ہے تو دعوت انقلاب کو سنجیدگی اور حقیقت سے کس قدر تعلق ہے۔

دعوت انقلاب بار بار پڑھنے کے بعد بھی انقلاب ادبی کا کوئی نمونہ اس صحیفۂ انقلاب کے اندر نہیں ملتا اگر یہ کہا جائے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی جگہ بہ نام قدرت وحیات کو رائج کر دینا کیا کوئی تھوڑا انقلاب ہے؟ تو عرض ہے کہ قوت یا شکتی اور حیات کو مستقل دیویاں تو مشرک قومیں

مدتوں سے مانتی چلی آرہی ہیں اور ہندوستان میں ان کی پرستش ہزار ہا ہزار سال سے چلی آرہی ہے اس میں انقلاب کی کیا بات ہوئی زیادہ سے زیادہ ارتجاع یا ارتداد کہہ لیجئے اور نیم برہنہ زنانی تصویریں سو یہ شرف بھی لاہور، دہلی وغیرہ کے بعض رسالوں کو مدت سے حاصل ہے انقلابیت اس مدت میں کچھ نہ ٹھہری مدیر کلیم کی نثر میں تازہ کلام کا اندازہ اقتباس ذیل سے ہوگا ہندو اور مسلمان دونوں کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں ''میں تمہاری صفوں سے آندھی کی طرح گذروں گا تمہاری بے مغز سری پر کڑی کمانوں کی طرح کڑکوں گا طوفانی بادلوں کی طرح گرجوں گا تم پر غیظ وغضب بھرے ہوئے دیوی دیوتاؤں کا غیظ وغضب ہے یہ جوش وخروش اگر محض تخلص کی مناسبت سے ہے اور یہ گرج اور چمک اور ہوش ربا تجلیات آتشیں سب سے بڑھ کر بقول ایک صاحب یہ لن ترانیاں اگر اسم کلیم کی شاعرانہ رعایت سے ہے تو اس حسن ادا کی داد نہ دینا ظلم ہے لیکن اگر ان کے سوا کوئی اور صنعت ملحوظ رکھی گئی تو اتنا ر ساد ماغ کوئی کہاں سے لائے۔

مولانا دریابادیؒ بہ حیثیت مقدمہ نگار:

تقریب عروس ادب ہفتہ ہوش بلگرامی مطبوعہ ۱۹۲۵ء

ہوش ذی ہوش میرے پرانے عنایت فرما ہیں۔ حیدرآباد میں ان کے عروج وزوال، دونوں کا تماشا ان آنکھوں نے دیکھا ہے اور حاشیہ نمبر ۲ میں مولانا رقم طراز ہیں۔ اب مضمون کی نظر ثانی کے وقت ۱۹۴۳ء میں تیسری باران کے کمال عروج کا نظارہ کر رہا ہے ہوشیار ہمیشہ سے تھے اب چشم بددور نواب ہوش یار جنگ ہیں ۱۸۔۱۹۱۷ میں ایک وقت وہ تھا کہ جب ہوش کی ہوشمندی کا ہر طرف چرچا تھا۔ ذخیرہ کی کنجی ان کے ہاتھ میں تھی اس زمانے میں ہوش صاحب اسی نام سے ایک ماہوار رسالہ نکال رہے تھے) اور ذخیرہ زبان وادب کا ذخیرہ یا یہ کہئے کہ پورا گودام بنا ہوا تھا ایک وقت وہ بھی آیا کہ ہوش معہ اپنی ہوش ربا کے اس جنت ارضی سے رخصت کر دیئے گئے اور ایک ظریف کو برجستہ یہ مصرعہ یاد آ گیا ع

ہوش رخصت ہوا ایک آہ کے ساتھ

ایسے ہی واقعات عبرت سے ہم جیسے بے ہوشوں کے ہوش اڑ جاتے ہیں۔

مزاج عاشقانہ پایا ہے اس لئے گردش تقدیر بھی کچھ عاشقوں کی سی لازمی تھی ارض فلک نما پر

خسرو دکن کے الطاف کریمانہ سے سرفراز تھے، یمین السلطنت مہاراجہ شاد کی عنایتوں سے شادکام تھے عماد الملک سید حسین بلگرامی کے سایۂ تربیت میں پروان چڑھ رہے تھے کہ دفعتۂ یہی زمین ان کے حق میں آسمان بن گئی فلک کج رفتار کے فرضی افسانے شاعری کی دنیا میں خدا معلوم کتنی بار سنا چکے تھے اب وہ آپ بیتی تھے بالآخر سرزمین رام پور کی کشش نے انہیں اپنا لیا سنا ہے کہ یہاں افواج ریاست کے بخشی ہونے کی عزت انہیں بخشی گئی ہے انہیں تو بخشی اردو کے لشکر کا ہونا تھا، ان کی فوج میں تو انشاء کی تلواریں چمکتی تھیں، زبان کے پیادے بھرتی ہوتے تھے، ادب کے رسالے نکلتے تھے فصاحت کی پلٹنیں آراستہ ہوتی تھیں، بلاغت کے قلعے تعمیر ہوتے تھے، شاعری کے معرکے سر ہوتے تھے اور مشاعروں کی توپیں ڈھلتی تھیں۔

عماد الملک سید حسین بلگرامی تو بے ہوشوں کو ذی ہوش بناسکتے تھے چہ جائیکہ اس کو جو مجسم ہوش ہو، مرحوم نے یہی نہیں کہ مدتوں مثل اپنے عزیز کے رکھا بلکہ ان کے ادبی مضامین کو اپنی اصلاح سے مشرف فرمایا اور غالباً ہوشمندی کے انداز کے بعد ہی تخلص، ہوش، بھی عنایت فرمایا خدائے ہوش سے دعا ہے کہ اس ستارۂ بلندی کی تابش میں اضافہ کرتا رہے۔

فاضل دوست مولوی عبدالحق کا ارشاد ہے کہ ہوش کے مزاج میں غضب کی جلدی ہے، جلدی ہو یا نہ ہو، تیزی تو یقیناً ہے، دل تیز، ہاتھ تیز، سوجھ بوجھ تیز، قلم تیز، خیریت یہ گذری کہ زباں نہیں تیز ورنہ ہر شے میں تیز اور محض تیز ہی نہیں تیز اور طرار، ان کی تیزی اور طراری شوخی ورنگینی کے جلوؤں کی آئینہ داری اگر مدنظر ہو تو بسم اللہ عروس ادب کے چہرے سے نقاب الٹ کر ملاحظہ فرمائیے، خدائے پاک انہیں زیادہ فرصت وفراغت نصیب کرے کہ زباں اور ادب کی زیادہ گراں مایہ خدمات انجام دے سکیں اور جس عروس کا ڈولہ اپنے گھر لائے ہیں اس کا اور ان کا دونوں کا نصیب بلند ہو۔

مولانا دریابادیؒ کے ادبی شاہ کاروں اور جواہر پاروں کی جھلک ان کے پیامات اور مکتوبات کی روشنی میں:

ایڈیٹر "صداقت" حیدرآباد نے اپنے اخبار کے بابائے اردو نمبر کے لئے مولانا سے مضمون مانگا تھا اس پر مولانا نے حسب ذیل پیام بھیجا۔

دریاباد ۶ رمئی ۱۹۶۰ء

''ہمارے مخدوم ومکرم مرزا محمد ہادی مرزا لکھنوی، رسوانہیں، مرزا رسوا تو انہوں نے بدنامی سے بچنے کے لئے ایک نقاب ناول نویسی کے لئے تیار کرلیا تھا۔ ورنہ شاعری کی دنیا میں محض مرزا تھے شعر بڑے مزے کے کہتے تھے ان کی ایک غزل کا شعر ہے۔ ؎

ہو کوئی حوروں پر فدا کوئی بتوں پر شہید

ڈھونڈھ ہی لیتا ہے انسان خدا ایک نہ ایک

ہمارے بزرگ بابائے اردو نے اپنا خدا اردو ڈھونڈ نکالا۔ وہی ان کا مرجع، وہی ان کا ملجا وہی ان کا مقصود، وہی ان کا مسجود، وہی ان کی عبادت، وہی ان کی ریاضت، وہی ان کا معبد، وہی ان کا مصلی نہ بیوی، نہ بچے، ساری خانگی الفتوں اور دلچسپیوں کا وہی ایک مرکز ومحور، ۱۹۱۲ء سے جب انجمن ترقی اردو کس مپرسی میں پڑی ہوئی ان کے حوالے ہوئی ہے دیکھئے کیسی نکھر گئی ہے۔

اورنگ آباد ہو کہ حیدرآباد، دہلی ہو یا کراچی، جہاں کہیں بھی رہے، سوتے جاگتے یہی ایک دھن ان پر سوار، جوان سے ادھیڑ ہوئے اور ادھیڑ سے بوڑھے اسی ایک عشق میں، عجب نہیں کہ جب کبھی گنگناتے ہوں تو اپنے اس محبوب کو مخاطب کر کے ؏

اے تو افلاطون و جالینوس ما

دولت لٹائی تو اسی کی خاطر، دست گدائی پھیلایا تو اسی کے لئے، آج اس سے لڑے، کل اس سے ملے سب اسی جفا پرور کے لئے، اتنے مجاہدے دین ومذہب کی خاطر کرتے تو عجب کیا جنید وبایزیدؒ کی صف میں شمار ہوتے۔

عابد نظامی صاحب حلقہ ادب پاکستان لاہور نے خواجہ حسن نظامی صاحب پر پیام مانگا تھا جواب میں مولانا نے حسب ذیل پیام بھیجا۔

دریاباد

یکم اپریل ۱۹۶۵ء

''تاریخ زبان اردو کے پرچے میں اگر یہ سوال آیا کہ انیلا ادیب کون گذرا ہے تو جواب صرف ایک ہی ہوگا خوجہ حسن نظامی۔

''وہ مستوں کا مست، سرشاروں کا سرشار، دیوانہ بکار خویش ہوشیار، ادب کا خادم ادیبوں کا مخدوم، سب سے نرالا، اپنی اداؤں میں البیلا، زبان دانوں کا پیارا، ادب و دانش کی آنکھوں کا تارا۔

مکتوب بنام حاجی مقتدا خاں شروانی علی گڑھ

مکتوب الیہ علی گڑھ کے رہنے والے صدر یار جنگ مولوی حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے خاص لوگوں میں یا ہم نشینوں میں تھے اردو کے بڑے اچھے لکھنے والے تھے، ان کی تحریریں بڑی ہی شگفتہ اور رعایت لفظی کا شاہ کار ہوتی تھیں مولانا ان کی تحریروں کے بڑے قدر دان تھے۔ مکتوب الیہ نے مولانا کو یہ لکھا کہ میں نے اپنے لڑکے کو جوتے کی دکان رکھوا دی ہے اور اس کا نام شوشو کمپنی رکھا ہے اور ایک نظم کیلو، روشنائی کے متعلق ''داستان کیلو'' اس خط میں بھیجی۔ مولانا نے صدق میں اپنی بدخطی کے متعلق لکھا تھا اس پر اسی خط میں مکتوب الیہ نے مولانا کو سوزن رقم لکھا کیلو روشنائی سے متعلق نظم کے ہر شعر کے آخر میں سیاہی، تباہی ماہی وغیرہ استعمال کئے تھے۔

دریاباد

۷/اپریل ۱۹۵۶ء

والامناقب وعلیکم السلام

'جمار صاحب زادے کے لئے یہ 'شوشو' کا شوشہ آپ نے خوب چھوڑا اور اس ضلع میں ایک بات نوک کی رکھ لی زمانے کے سر پر ایک ٹھوکر جمادی۔

داستان 'کیلو' کا کیا کہنا — پڑھنے والے کو چارہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ شروع سے آخر تک ہر شعر پر، 'ہی ہی' کرتا رہے۔ رقیبوں حریفوں کے چہرے پر خوب ہی سیاہی مل دی یا کیلو کی مناسبت سے یوں کہئے کہ ان کے تابوت میں کیل ٹھونک دی۔

اس بدخط کو سوزن رقم کا خطاب دے کر آپ نے ادھر تو یکسوئی حاصل کرلی، ہر معترض کا گلا ناپ دیا

مکتوب بنام حاجی مقتدیٰ خاں شیروانی علی گڑھ

دریاباد

۲۴/فروری ۱۹۶۰ء

مخدوم و مقتدا

السلام علیکم

آپ کے اشہب قلم نے ضلع کے سبزہ زار میں ماشاء اللہ وہ جولانیاں دکھائی ہیں وہ کلیس بھری ہیں، وہ کاوے کاٹے ہیں، وہ طرارے بھرے ہیں میری ہمت تو تقلید کی بن نہیں پڑتی، اس میدان کے غازی مرد تو آپ ہی ٹھیرے، میرا ابلق خامہ اگر داد کی منھ زوری کا حوصلہ کرے تو پہلے ہی قدم پر ٹھوکر کھائے، ایک ہی گردنی میں درست ہو جائے، نعل در آتش ہو کر زبان بند کرتا ہوں، قافیہ تنگ ہے، نہ یہاں آگے قدم بڑھانے کی ہمت نہیں کرتا اللہ آپ کا کارساز ہے۔ والسلام

بہ حیثیت تعزیت نگار:

تعزیت نگاری مولانا دریابادیؒ کے طرز انشاء کا شاہ کار ہے ان میں بلا کی اثر آفرینی ہے، اس کے چار نمونے ملاحظہ ہوں پہلا مولانا کی شریک حیات کے انتقال پر بوڑھی محبوبہ کے نام سے ہے، دوسرا ان کے محبوب ترین دوست اور مشہور اور معروف قومی رہنما مولانا محمد علی کے انتقال پر، تیسرا مولانا محمد علی کے بڑے بھائی اور مشہور رہنما مولانا شوکت علی کے سانحۂ ارتحال پر اور چوتھی قوم پرور مسلم رہنما تصدق احمد خاں شروانی کی موت پر۔

'بوڑھی محبوبہ'

جون ۱۹۱۶ء میں اس تباہ کار کے عقد ازدواج میں آئی تھیں، ۵۲ سال کی مدت رفاقت کچھ تھوڑی نہیں ہوتی جب کہ رفاقت محض رسم وضابطہ کی نہ ہو بلکہ اس کی بنیاد بھی الفت ومحبت پر قائم ہوئی ہو پیمان وفا کا عمر بھر کا تھا لیکن خود عمر کی پائداری کتنی! ؎

عمر بھر کا تونے پیمان وفا باندھا تھا
عمر کو بھی تو نہیں ہے پائے داری ہائے ہائے

شادی جس دن ہوئی طرفین ۷۰-۷۵ کے بوڑھے کھوسٹ نہ تھے ایک طرف شوخ، قبول صورت نوجوان لڑکی بیس اکیس سال کی اور وقت کے اعتبار سے خاص پڑھی لکھی، انگریزی کی شد بد سے واقف اور ملک کے اونچے معاشرے کی تربیت یافتہ اور دوسری طرف چوبیس سالہ نوجوان انگریزیت میں غرق، دین ومذہب سے بیزار، عقلیت، (ریشنلزم) کا پرستار، لڑکی کہیں باہر کی نہیں، اپنے خاندان ہی کی ساتھی، حقیقی خالہ کی پوتی، رسم ورواج خاندان کے برخلاف اسے

چاؤ وشوق سے فدا مست کاری کر کے لانے والا، نیم اسلامی حدود کے اندر رہ کر راہ ورسم یار محبوبی کے قدم ایک ایک کر کے اٹھتے رہے تا آنکہ شوہر کو دو چار سال بعد از سر نو سعادت اسلام نصیب ہوئی، دونوں نے ۱۹۲۹ء میں حج کیا اور آخر سن کے تقاضے سے وہ وقت بھی آ گیا جب زلفوں کی سیاہی سفیدی میں تبدیل ہوگئی، دانتوں کی جمی ہوئی لڑی ساری ایک ایک کر کے بکھر گئی، چہرے پر جھریاں پڑ گئیں، قد و قامت میں کوئی شائبہ رعنائی کا نہ رہا۔ حسن و جمال کی جگہ صرف نور عصمت کی جگمگاہٹ باقی رہ گئی۔

اے حقیقت مزاج اب یہ کھلا ہے راز
سب ہے فریب آب و گل، حسن و جمال کچھ نہیں

مسلسل اور مستقل بیماریوں نے معذور اور تقریباً فریش بناڈالا پر اس رشتۂ محبوبیت میں ذرہ برابر بھی فرق نہ آیا اور بدبخت شاعر اور افسانہ نویس حقیقت حال سے منزلوں دور اور بیگانہ ہیں جنہوں نے الفت و محبت کے کرشموں کو صرف جدائی کے چند برسوں تک محدود کر رکھا ہے۔

اپنے عزیز ترین اور محبوب ترین دوست عظیم المرتبت اور جلیل القدر قومی رہنما مولانا محمد علی کی موت پر مولانا دریابادیؒ نے جو معرکۃ الآرا نثری مرثیہ لکھا ہے وہ اثر آفرینی میں اپنی مثال آپ ہے اور اس میں تضاد کے ساتھ مقابلے کا حربہ بھی استعمال کیا گیا ہے جس سے اس مضمون میں بڑا زور پیدا ہوگیا ہے۔

''شب برات ایک خیر و برکت والی رات ہے، کسے خبر تھی کہ یہ شب شب قیامت بھی بن سکتی ہے، مسلمان تو اس رات کو جاگ جاگ کر کے گذارتے ہیں، کون کہہ سکتا تھا کہ اس رات ان کا نصیبہ سلا دیا جائے گا، زندگیاں مانگتے ہیں، صحتوں کے لئے گڑگڑاتے ہیں کسے خیال تھا کہ عین اس وقت وہ اٹھا لیا جائے گا جس کے وجود سے ملت اسلامیہ کا وجود تھا۔

اے کمزوروں اور ناتوانوں کے دلوں کی خبر رکھنے والا انصاف کہ تیرے حبیب اور محبوب کو اس عالم ناسوتی سے کوچ کرتے دیکھ کر جب حضرت عمر فاروقؓ پر جدائی کا قلب تاب نہ لا سکا تو تیرے حبیب کے ہم نام غلام کی مفارقت میں اگر ہم کم ظرفوں کی زبانیں لڑکھڑانے لگیں تو ہماری فطرت سے کچھ بعید نہیں۔

یہ دستور بھی شروع ہی سے قائم ہے کہ جس نے دعویٰ محبت کا کیا اس کا امتحان بھی ہو کر رہا کسی کو سولی پر چڑھنا پڑا، کسی کو آرے سے چیر دیا گیا، کسی کو دہکتی ہوئی آگ میں کودنا پڑا، کسی سے اولاد کی قربانی مانگی گئی، کسی کے خاک وخوں میں لوٹنے اور تڑپنے کا تماشہ دیکھا گیا، کسی کو جلاوطنی نصیب ہوئی، کسی کا جسم کوڑوں سے لہولہان کردیا گیا اور کسی کو قید خانے کی بوجھل زنجیروں سے گراں بار کیا گیا محمد علی کے لئے کیا یہ قانون بدل دیا جاتا اور جس نے یہ کہا تھا:

ہر رنگ میں راضی بہ رضا ہو تو مزا دیکھ

دنیا ہی میں بیٹھے ہوئے جنت کی فضا دیکھ

اسے یوں ہی بے امتحان وآزمائش کے چھوڑ دیا جاتا؟ محبوبوں کے ساتھ معاملہ جو کچھ بھی ہوتا مجبوں اور عاشقوں، سوختہ جانوں اور دل فگاروں کے لئے تو یہی ایک قاعدہ مقدر ہے ذلت ورسوائی، قید وبند، قتل وخون نا کامی ونامرادی، شکست وشکست نفس۔

محمد علی تو جا اور خوش خوش جنت میں اپنی جگہ لے تجھے آنا کون مردہ کہتا ہے غریب الوطنی کی موت بجائے خود ایک درجۂ شہادت رکھتی ہے اور پھر تیرے شہید وصدیق ہونے پر تو اس کا کلام شاہد ہے، **والذین آمنو باللہ ورسولہ اولئک ھم الصدیقون والشھداء عند ربھم اجرھم ونورھم** تو اس وقت اپنے ماتم کرنے والوں سے کہیں زیادہ منزلت وآزادی کے ساتھ اپنا روشن چہرہ لئے ہوئے عالم برزخ میں جنت کی سیر کررہا ہے۔

بدنصیب قوم تو رو اور ساری عمر روتی رہ آج تو بیوہ ہوگئی، تیرا والی وارث چل بسا، تیرا سہاگ لٹ گیا، خفتہ بخت ملت آج تو یتیم ہوگئی، تیرے سر سے سایۂ پدری اٹھ گیا شفقت پدری سے تو محروم ہوگئی محمد علی کی عمر کل ۵۳ سال کی ہوئی حضور انور، نے اس عمر میں مکہ سے ہجرت فرمائی تھی آقا کی مکی زندگی کا عکس وفادار غلام کی زندگی کے آئینے میں صاف نظر آرہا ہے۔

تیسرا نمونہ مولانا شوکت علی کے سانحۂ ارتحال پر:

محض جیل جانے والے، تختۂ دار پر چڑھ جانے والے اب بھی یقیناً بہت سے پیدا ہوتے رہیں گے لیکن ملت اسلامیہ کے فروغ وبرتری کے لئے، دین الٰہی کی نصرت کے لئے اپنا کاروبار مٹا دینے والا، جاہ ومال دونوں کو ذبح کردینے والا، اپنے سینہ کو گولیاں کھانے کے لئے پیش

کر دینے والا اب کون اٹھے گا ؏

وہ بات کوہ کن کی، گئی کوہ کن کے ساتھ

بزرگوں نے کہا ہے کہ اللہ والا وہ ہے جسے دیکھ کر اللہ یاد آجائے، شوکت مجذوب کی خصوصیت یہ تھی کہ شکل دیکھتے ہی اللہ اکبر کی آواز کانوں میں گونج جاتی، اس کے نام کو پکار پکار کر اتنی بار جپا، اللہ کے نام کی بڑائی اتنی بار خود پکاری، دوسروں سے پکروائی کہ خود ہی اللہ اکبر کا ایک مجسمہ ہو کر رہ گئے تھے۔

کہاں کہاں تیرا عاشق تجھے پکار آیا

شوکت علی زہد و تقویٰ کا پیکر نہ تھا، اس راہ کا مسافر نہ تھا، مست و دیوانہ تھا، رند و قلندر تھا لیکن دیوانہ اپنے اللہ کے نام کا اور مست اپنے مولیٰ کے پیام کا، عمر بھر لڑتا ہی رہا۔ آج اس سے جنگ ہے اور کل اس سے اور دشمنوں سے زیادہ خود دوستوں سے لڑا لیکن یہ ساری لڑائی بھڑائی یہ سارا شوق جنگ جوئی اس محبوب کی خاطر جو ہر قدرت والے سے بڑھ کر قادر اور ہر توانا سے زیادہ توانا ہے، مدت ہوئی، میر تقی میر کا ایک شعر مثنوی زہر عشق کی دھن میں ایک صاحب کو پڑھتے سنا تھا

دل پر خون کی ایک گلابی سے

عمر بھر ہم رہے شرابی سے

الحمد للہ ایسے شرابی کا نمونہ دیکھنے میں بھی آگیا۔

خوش نصیب اور نامور کرکٹر فلاح امت اور خدمت ملت کے میدان میں تیری باونڈریاں اور باونڈریاں قیامت تک زندہ رہیں گی اور مدت کے بعد روح تو ادھر اعلیٰ علیین کو سدھاری ادھر جسم کو جگہ کہاں ملی جامع مسجد دہلی کے سامنے کا میدان، پشت کی طرف لال قلعہ شاہان اسلام کی دنیوی عظمت و جلال کی آخری یادگار، رخ کی طرف مسجد کے در و دیوار، گنبد و مینار شاہان اسلام کی دین داری کا نشان سبحان اللہ و بحمدہ

چوتھا نمونہ:

قوم پرور مسلم اور کانگریسی رہنما تصدق احمد خاں شیروانی کی موت پر اپنے تعزیتی مضمون، خوش نصیب گول کیپر میں لکھتے ہیں:

''مرنے والا مر چکا، جینے والے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیں کتنے ایسے ہیں جو ایسے امتحانوں میں ثابت قدم نکلیں گے، ماں باپ نے تعلیم میں ہزار ہا روپے بے دریغ اسی دن کے واسطے اٹھائے تھے؟ کالج میں یہی ارمان دل میں تھے؟ ولایت اسی غرض سے گئے تھے؟ بچپن کے ساتھیوں اور نوجوانی کے دوستوں میں آج کوئی جج تھا، کوئی ہائی کورٹ کا جج، کوئی ہزار ہا کما رہا تھا کوئی ہزار ہا لٹا رہا تھا کوئی صوبے کا منسٹر، کوئی ایگزیکٹیو کا ڈنسلر کیا اس غریب کی قسمت میں یہی دن کاٹنے تھے؟ اور یوں ہی ساری عمر بسر کرنی تھی؟ اس کے پہلو میں دل کی جگہ پتھر کا کوئی ٹکڑا تھا؟ اس کے دل میں امنگیں باقی نہیں رہی تھیں، کیا وہ بھی کوئی ہندو سنیاسی یا مسیحی راہب بن چکا تھا؟ کیا اس کے بیوی بچے دوست، عزیز، بھائی بند نہ تھے، کیا ان سب کے ساتھ ہنسی خوشی، رہنے سہنے، دنیا کا چین کرنے، زندگی کا سکھ اٹھانے کی آرزوئیں دل میں مردہ ہو چکی تھیں؟ کیا اس کے بشری جذبات کا سرچشمہ خشک ہو چکا تھا؟ کیا تکلیف اس کے لئے تکلیف اور راحت اس کے لئے راحت رہ ہی نہیں گئی تھی؟ ہو سکے تو سوچنے والے سوچیں، جمعہ کے دن کی موت، عین نماز فجر کے وقت ہر ایک کے نصیب میں آتی بھی تو نہیں، اور پھر ہزار ہا مسلمانوں کی دعائیں خوش نصیب گول کیپر دنیا اور آخرت دونوں جگہ بازی لے گیا۔

بحیثیت صحافی

مولانا دریابادیؒ منفرد جلیل القدر صحافی تھے وہ تقریباً پچاس سال صحافت سے اپنے تینوں ہفتہ واروں سچ، صدق اور صدق جدید کے ایڈیٹر کی حیثیت سے منسلک رہے اور انہوں نے اردو صحافت میں بڑی ہی درخشاں اور تابناک روایتیں قائم کیں اور بہ حیثیت صاحب طرز صحافی انہوں نے ایک بااصول ممتاز ترین صحافی ہونے کالوہا منوالیا۔ ان کا ایڈیٹوریل سچی باتوں کے نام سے ہوتا تھا اور مختلف قسم کے عنوانوں پر ہوتا تھا۔ سچی باتوں میں بعض اوقات اتنا گہرا اور شدید طنز ہوتا تھا کہ مخالف تلملا اٹھتے تھے۔

مذہب، وطنیت اور صحافت کے بارے میں وہ ایک خاص نقطۂ نظر رکھتے تھے اور ان کے اخباروں میں اسی نقطۂ نگاہ اور مسلک کی ترجمانی ہوتی تھی، ان پرچوں میں عام ملکی سیاست، بین الملکی آویزشوں، سیاسی جماعتوں، مالی اور اقتصادی، معاشی مسئلوں اور سیاسیات عالم پر نہ خود لکھتے تھے اور نہ ان امور کے بارے میں مراسلے اور مضامین شائع ہوتے تھے لیکن جن معاملوں کا

تعلق مسلمانوں سے،ان کے کلچر سے،ان کے مذہب سے،ان کے تشخص سے،ان کی تعلیم سے ہوتا تھا یا مغربی تہذیب، جنسی جرائم اور تعصب کی باتیں ہوتی تھیں تو سچ،صدق اور صدق جدید کے کالموں میں اپنے نقطۂ نظر کے ماتحت طنز سے بھر پور شذرات لکھتے تھے ان کے الفاظ میں صدق کا دائرہ موضوع بہت ہی محدود اور تنگ چھوٹے بڑے ہر پبلک مسئلے پر رائے زنی کرتے رہنا اس کا شعار نہ پہلے تھا اور نہ اب ہے (صدق جدید ۲۶ / مارچ ۱۹۶۵ء) اور صدق جدید ۹ ستمبر ۱۹۶۱ء میں انہوں نے اپنے پرچے کی پالیسی واضح کی اور صحافت کو تجارت نہیں بلکہ ایک قسم کی عبادت قرار دیتے ہوئے انہوں نے ہفتہ وار صحافت کے یہ آداب متعین کئے ہیں ''مقصود دین وملت کی خدمت رکھئے، عام خدمت خلق بھی اسی تحت میں آجاتی ہے، ملک کے مذاق وجذبات کی اصلاح کیجئے، وطن کا بھی بڑا حق ہے جس طرح پڑوسی کے، استاد کے اور اہل خاندان کے ہوتے ہیں البتہ مسلمان پرستار وطن کا نہیں ہوسکتا، عبودیت کا یہ خصوصی تعلق صرف ذات حق کے لئے مخصوص ہے، اپنی مقبولیت کے جذبے کو اپنے اوپر غالب نہ آنے دیجئے، کسی کی دل شکنی نہ کیجئے، مروت کے حدود قائم کرتے جائیں۔

ہفت روزہ میں اپنے تبصرے سے یا کم از کم خبر کی سرخی ہی سے ہر چیز کو با مقصد بنا کر پیش کیجئے، ملک کی اکثریت اور قانون کا لحاظ رکھتے ہوئے مرعوبیت اور احساس کمتری کی حد تک نہ پہونچئے صلح اور سازگاری دوسری چیز ہے اور بزدلی وخوشامد بالکل دوسری، ذاتیات پر نہ اتر آیئے مزاح اور پھکڑ بازی کے فرق کو نظر میں رکھئے، اپنی غلطی کا اعتراف کرنے میں ہرگز نہ شرمائیے۔

مولانا کے طنز نے ان کے انداز تحریر کو منفرد اور ان کی صحافت کو ایک مخصوص طرز کی صحافت بنا دیا۔

ان کے ہفتہ وار میں ان کی شائع شدہ تحریروں میں متعدد امتیازی خصوصیتیں پائی جاتی تھیں ایک تو ان کے شذرات اور مضامین کی سرخیاں، دوسرے انتہائی دلچسپ اور موثر انداز میں رعایت لفظی کا استعمال اور یہ استعمال بعض اوقات بڑے بڑے طویل مضمونوں کا کام کر جاتا تھا مختصر جملے اور مختصر تبصرے، تبصرے کے آخر میں برمحل شعر بھی ہوتے تھے، ان کی دی ہوئی سرخیوں کی کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں، ''سارے گلے تمام ہوئے جواب میں'' ''دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے'' شیر وشیر قالین، فتح سنگھ کی فتح، دانا کی نادانی، مظلوم کا ظلم، بزدل سورما، جدت کی قدامت، ڈاکٹر

ذاکر حسین کی ایک مختصر کتاب پر ایک ریڈیائی تقریر کی سرخی دیتے ہیں ذکر حسینؒ ذاکر حسین کی زبان سے، ایک مرتبہ لاہور میں مولانا ظفر علی خاں کا جشن منایا گیا اور مولانا سے پیام مانگا گیا مولانا نے حسب ذیل پیام بھیجا جس میں صرف یہ مصرعہ لکھا ہوا تھا ع

کیا کم ہے کہ یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں

ایک مرتبہ علی گڑھ جاتے ہوئے پروفیسر آل احمد سرور کا ٹرین میں ساتھ ہوگیا اس سفر اور قیام علی گڑھ کی روداد بیان کرتے ہوئے صدق میں لکھتے ہیں جب "سرور، رفیق سفر ہو تو اب غم کیا۔

شذرات کے دو نمونے ملاحظہ ہوں:

لکھنو میں پتنگ بازی کے مقابلے پر تبصرہ کرتے ہوئے "داغ اپنی جمائے جاتا ہے، شاباش لکھنؤ اور زندہ باد ملت اسلامیہ، ایسے میدانوں کے مرد میدان سوا خیر امت کے اور کہاں مل سکتے ہیں ہوش ربا گرانی نے نیم فاقہ کشی کا چکھا دیا ہو خطرہ قحط کے بگل پر بگل بجتے جا رہے ہیں بے فکروں کے ہاتھ سے پتنگ کی ڈور نہ چھوٹنے پائے۔

محشر میں خلق اپنی مصیبت میں مبتلا

اور داغ کو یہ دھن کہ آئے کوئی خوب رو پسند

صدق جدید ۱۷ اردسمبر ۱۹۶۵ء

ایک نئے طائفے کی سرفرازی، ہندوستان میں سوویٹ یونین کے ایک ثقافتی دن کی آمد کے سلسلے میں ناچ مجرے کی محفلیں، کوئی راجہ، مہاراجہ نواب گرم رکھے تو گردن زدنی لیکن انڈ وسوویٹ فیسٹول رکھ کر ایک سوشلسٹ اسٹیٹ جو کچھ بھی کرے قابل داد و تحسین۔

(صدق جدید ۱۳ رمئی ۱۹۶۶ء)

مولانا دریابادیؒ مفسر قرآن، عظیم المرتبت لاثانی صاحب طرز انشاء کے مالک اور جلیل القدر انشا پرداز ماہر فلسفہ و نفسیات، طنز نگار، اعلیٰ پائے کے مصنف، اور منفرد صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک مخصوص مشن اور پیام کے علم بردار تھے۔ یہ مشن اردو کے حکیم شاعر حضرت اکبر الہ آبادی کا مشن تھا وہ حضرت اکبر الہ آبادی کے نظم کا نثری حصہ ہیں حضرت اکبر آبادی کا یہ مشن یا پیام مولانا دریابادیؒ کے لفظوں میں کچھ دقیق اور پیچیدہ نہیں، کوئی غامض فلسفہ نہیں سیدھی سادھی

بات صرف ایک لفظ میں ادا کی جاسکتی ہے، پیام خودداری کا ہے، مشرق سے کہتے ہیں کہ مشرقی رہ، ہندی کو تعلیم دیتے ہیں کہ ہندی ہی بنا رہ، مسلمان کے لئے تلقین ہے کہ خبردار اسلام سے نہ ہٹ"۔

مولانا دریابادیؒ اس مخصوص مشن یا پیام کے آخر تک زبردست علم بردار رہے یہ مشن مغربی یا یوروپین تہذیب جو تمام تر مادیت پر مبنی تھا کا سخت ترین اور شدید مخالف بلکہ دشمن تھا اور اس کے ساتھ وہ شاہ ولی اللہ اسکول کے علماء کی طرح اس زمانے کی مغربیت اور یوروپین تہذیب سے پوری طرح مرعوب اور مغلوب مسلم ساجی مصلحین علی الخصوص انگریزی تعلیم کے علم برداروں کے موقف اور نظریوں کا شدید ترین مخالف تھا کہ ہندو مسلمان یوروپین تہذیب کو اختیار کر لیں اور اپنی خودداری اور تشخص کو ختم کر دیں مولانا دریابادیؒ کا یہ عظیم ترین کارنامہ ہے کہ وہ حضرت اکبر کے اس عظیم مشن اور پیام کی اپنے ہفتہ وار اخباروں کے ذریعے انتہائی پرزور انداز سے تبلیغ کرتے رہے اور دجالی مغربی تہذیب کی بنیادی ضلالتوں اور گمراہیوں کے خلاف آخر دم تک قلمی جہاد کرتے رہے اور ان کے تینوں ہفتہ وار کی فائلیں اس کی گواہ ہیں اس کے ساتھ وہ مشرقی اور اسلامی تہذیب کے بقا اور تحفظ کے لئے آخر دم تک ساعی رہے۔

سورۃ النساء کی چند آیات تفسیر ماجدی کی روشنی میں

پروفیسر بدرالدین الحافظ☆

مندرجہ ذیل مضمون میں خاکسار نے صرف ان آیات قرآنی کو تفسیر ماجدی کی روشنی میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو عصر حاضر کے سلگتے ہوئے سوالات کہے جا سکتے ہیں اور قرآن کریم میں ان کا معقول جواب اور سنجیدہ حل پیش کیا گیا ہے۔

دوسری ایسی آیات ہیں جو عمومی سماج اور خاص طور پر مسلم معاشرہ کی اصلاح کے لئے بہترین رہنما اور کلیدی ہدایات کہی جا سکتی ہیں۔ اور ان کی تشریح و تفسیر میں مولانا دریابادی مرحوم نے غیر اسلامی افکار و اعتراضات کے جواب بھی پیش کئے جو ان کی اہم خصوصیت ہے۔

اب اس سلسلہ میں سب سے پہلے ہم سورۃ النساء کی ابتدائی آیات سے بات شروع کرتے ہیں جو ہر مسلمان کے خطبۂ نکاح میں اس لئے پڑھی جاتی ہیں تا کہ نئی ازدواجی زندگی کے آغاز میں پورا دستور العمل سامنے آجائے کہ اب اس نئے جوڑا کو کس طرح قرآنی عہد و پیان کے لحاظ سے زندگی گزارنی ہے۔ فرمایا گیا یا ایھا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ۔ ''اے لوگو! اپنے پروردگار سے تقویٰ اختیار کرو جس نے تم کو ایک ہی جان، یعنی ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام سے پیدا کیا۔'' اس کی تفسیر میں مولانا فرماتے ہیں ''وحدت نوع انسانی کا یہ سبق اپنے عملی اور دور رس نتائج کے لحاظ سے نہایت اہم ہے، یعنی آخری جد اعلیٰ ہر گورے اور کالے کے، ہر وحشی اور ہر مہذب کے، ہر ہندی اور چینی کے، ہر حبشی اور ہر فرنگی کے ایک ہی ہیں اور وہ آدم ہیں، یہ نہیں کہ فلاں نسل کے مورث اعلیٰ کوئی اور تھے اور فلاں نسل کے کوئی اور اور نہ یہ کہ برہمن ذات والے برہما جی کے منہ سے پیدا ہوئے اور چھتری نسل والے ان کے سینے سے اور ویش جاتی والے ان کے پیٹ سے اور شودر ذات والے ان کی ٹانگوں سے نہیں بلکہ اصلاً انسان انسان سب

☆ سابق صدر شعبہ عربی، بنارس ہندو یونیورسٹی۔

ایک ہیں۔

یہاں خلقکم میں مسئلہ ارتقاء کس حد تک کس معنی میں صحیح ہے قرآن مجید کو اس سے مطلق سروکار نہیں، انسان بہر حال خلق ضرور ہوا ہے، قرآن انسان کی مخلوقیت کو بار بار نمایاں کررہا ہے اور ہر اس نظریہ اور عقیدہ کی تردید کررہا ہے جو انسان کی تخلیق کے منافی ہے۔"

یا ایھا الناس: یہاں مخاطب ساری نوع انسانی ہے، خواہ کوئی کسی نسل، کسی رنگ، کسی جنس، کسی ملک کا ہو، ایمان اور ایک درجہ میں تقوٰی کے مکلف سب ہیں، قرآن کا پیام سارے ہی بنی آدم کے لئے ہے۔ جن مفسرین نے اسے اہل مکہ کے لئے خاص سمجھا ہے، ان کے پاس اس تخصیص کی کوئی دلیل نہیں ہے، خصوصاً جب کہ سورۃ مکی ہے بھی نہیں بلکہ بالاتفاق مدنی ہے اور لفظ ناس ہے بھی نوع بشر کے لئے۔

اتقوا ربکم: پروردگار سے ڈرنا، اس کے احکام کی مخالفت سے ڈرنا ہے، ورنہ پروردگار عالم بجائے خود کوئی خوف کھانے کی چیز نہیں، وہ تو تمام تر محبت اور عظمت والی ہستی ہے۔

لفظ رب میں خود اشارہ موجود ہے کہ جن احکام کی مخالفت سے ڈرایا اور روکا جارہا ہے خود ان کی غایت بھی بندے کی ربوبیت اور پرورش ہی ہے۔

و خلق منھا زوجھا: اور اسی سے اس کا جوڑ یعنی حضرت حواء کو پیدا کیا۔

اس آیت کے ذیل میں مولانا نے تخلیق حواء کی تفصیلی کیفیت اور اس پر مختلف اقوال پیش کئے ہیں جن کا تذکرہ خاکسار کے خیال میں یہاں ضروری نہیں ہے۔

اس کے بعد آیت کا آخری حصہ یہ ہے: **و اتقوا اللہ الذی تسآءلون به و الارحام:** یہاں ارحام رحم کی جمع ہے اور اس کا اطلاق بڑا وسیع ہے، سارے عزیز وقریب اہل خاندان اس کے اندر آجاتے ہیں، یہ ہے قرابت یا رشتہ داری کی اہمیت اسلام میں۔ اور درحقیقت امت کے نظام اجتمائی کا سنگ بنیاد شریعت نے قرابت یا رحم ہی کو قرار دیا ہے۔

پھر عزیزوں قریبوں خاندان اور برادری والوں کے ساتھ حسن سلوک اسلام میں کوئی دوسرے درجہ کی چیز نہیں ہے اول درجہ کی اہمیت رکھنے والی ہے، اور اسی معنی میں یہ حدیث بھی آئی ہے، **الرحم معلقة بالعرش تقول ألا، من وصلنی وصله اللہ و من قطعنی قطعه اللہ**

(رحم بھی عرش الٰہی سے معلق دعا کرتا رہتا ہے کہ جو مجھے جوڑے رکھے اللہ اسے جوڑے رہے اور جو مجھے کاٹے اللہ اُسے کاٹے)۔

فقہاء اس پر متفق ہیں کہ قرابت کا لحاظ واجب ہے اور اسے قطع کرنا جرم ہے۔

اس کے بعد ان اللہ کان علیکم رقیبا: بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے اوپر نگراں ہے۔ پھر اس آیت کی تفسیر میں مولانا کا ایک ہی جملہ بڑا معنی خیز ہے، یعنی تمہارے ذاتی، خانگی، اجتماعی سارے ہی معاملات میں اگر اس کا استحضار رہے تو آج افراد امت کی خانگی زندگیاں کس قدر خوشگوار ہو جائیں۔

اس کے بعد یتامیٰ سے متعلق آیات کو میں نے اس لئے منتخب کیا ہے کہ یہ بچوں کے موجودہ مسائل سے مناسبت رکھتی ہیں جیسا کہ آئے دن اخبارات میں بچوں کے استحصالی مسائل سرخیوں میں آتے رہتے ہیں، اور یہ کوئی نئے نہیں ہیں صرف نوعیت بدلی ہوئی ہے۔

قرآن کریم نے اسی ظلم وزیادتی کو ختم کرنے کے لئے اس دور کے خاص وراثتی معاملات کے تحت اس کو بیان کیا ہے، جس سے بچوں پر ظلم واستبداد کو ہمیشہ کے لئے ختم کیا جائے اور یہ بات باور کرادی جائے کہ بچوں کو کسی بہانے سے بھی نقصان پہونچانا بہر حال ظلم ہے۔

اس مضمون کو مولانا نے واتوا الیتامیٰ اموالھم کے تحت فرمایا: یتیم یعنی بن باپ کے بچوں بچیوں کا مسئلہ ہر قوم میں اہم اور نازک رہا ہے، قرآن کریم اس باب میں ہدایات دے رہا ہے کہ ان یتیموں کے بالغ ہونے پر ان کی جائداد، ان کا سامان ان کے حوالے کردو، اور اس کے لئے یہ ہرگز ضروری نہیں کہ یتیم اپنی جائداد کا مطالبہ کرے بھی۔ اور یہ خطاب یتیموں کے اولیاء اور سرپرستوں سے ہے کہ یتیموں کی جائداد ان کے سپرد بالغ ہونے کے بعد ہی کرنی چاہئے اس سے قبل نہیں مگر ایسا نہ ہونے پائے کہ ان کی اچھی چیز نکال کر اپنے مال میں ملالی اور اپنی طرف سے کوئی گھٹیا چیز ان کے حصہ میں شامل کردی، یہاں تک کہ یتیموں کے حصہ کو اپنے حصہ کے ساتھ خلط ملط کر کے بھی نہ کھاؤ کیونکہ یہ بڑا گناہ ہے، مزید مولانا نے لکھا ہے کہ ڈاکٹر رابرٹ رابنس مسلم نہیں منکر ہیں مگر اس کے قائل ہیں کہ قرآن اور پیمبر نے یتیموں کے حقوق کے تحفظ کا بہترین انتظام کردیا ہے۔

اس کے بعد قرآن کریم نے ان یتیم لڑکیوں کے بارے میں حکم دیا جن کو جاہلی دور میں ان کے مالک اس لئے اپنے نکاح میں لے لیتے تھے کہ کوئی دوسرا ان کی طرف سے دین مہر کا مطالبہ کرنے والا نہ پیدا ہو جائے اور ان کے حقوق مار لینا آسان رہے، ان سے نکاح کر کے ان کی جائدادوں پر بھی قبضہ کر لیتے تھے، اور دوسرے طریقوں سے بھی ان کے اداء حقوق کی طرف سے بے التفاتی برتتے تھے۔ اس سلسلہ میں قرآن نے کہا کہ نکاح کے باب میں کوئی تنگی نہیں ہے، اپنی زیر نگرانی، یتیم لڑکیوں کو زیر عقد لانے میں اتلاف حقوق کا اندیشہ ہو تو اس خیال کو جانے دو، اور بجائے ان کے باہر والی آزاد عورتوں میں سے اپنے حسب پسند انتخاب کر لو، ایک ہی کا نہیں بلکہ ایک سے لے کر چار تک کی گنجائش ہے۔

خاکسار کے خیال میں ان آیات کی تشریح کرتے ہوئے مولانا نے موجودہ دور کے بعض اہم معاشرتی اور ازدواجی مسائل سے متعلق متوازن حنفی مسلک کی ترجمانی کی ہے۔ ان میں پہلا مسئلہ عورت کے انتخاب کا ہے یعنی کیسی ہو، اور کیا مرد کو مخطوبہ کی طرف دیکھنا بھی جائز ہے یا نہیں، پھر یہ کہ عورت کسی خاص ذات برادری کی ہونی ضروری ہے یا من پسند کوئی بھی ہو سکتی ہے، اس کے بعد تعداد کتنی متعین ہے۔

ان سوالات پر گفتگو کرتے ہوئے مولانا دریابادی فرماتے ہیں: ماطاب لکم سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ حسن و جمال کے معیار سے بھی طبیعت کے مقتضیٰ پر عمل کی پوری اجازت شریعت میں موجود ہے، اور ''ما'' یہاں ''من'' کے معنی میں ہے اور کلام عرب میں دونوں لفظ ایک دوسرے سے ادل بدل کر آتے رہتے ہیں جس کے نظائر خود قرآن کریم میں موجود ہیں جیسے والسماء وما بناها اور یہاں بجائے من کے ما اس لئے آیا ہے کہ مقصود یہاں صفات نساء کا ذکر ہے، یعنی جس قسم کی بھی عورتیں پسند ہوں، نہ کہ ان کی ذات یا شخصیت کا ذکر، کیونکہ جب کسی کی ذات یا شخصیت سے متعلق سوال مقصود ہوتا ہے تو پوچھتے ہیں من هذا الرجل، اور جب سوال اس کی صفات سے متعلق کرنا ہوتا ہے تو کہتے ہیں ماهذا الرجل اس کے بعد تعداد کے مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں کہ مثنیٰ وثلث وربٰع میں واؤ عطف کا نہیں تخییر کا ہے اور او کے مرادف ہے اور یہاں اسی معنی میں ہے اور آیت کے ان الفاظ سے بعض فرقوں نے کہا جاتا ہے کہ ۲+۳+۴ کے مجموعہ یعنی نو ازواج کا جواز نکالا ہے اور بعض نے یہ میزان ۱۸ ارتک پہونچا دی ہے،

بلکہ بعض نے تو بغیر قید عدد کے نفس تعدد کا جواز نکالا ہے۔

اور فقہ کی کتابوں میں تو مستند اکابر اہل سنت مثلاً امام ابن ابی لیلیٰ اور امام ابراہیم نخعی کی جانب بھی منسوب دیکھا گیا ہے، لیکن حدیث رسول اور اجماع امت دونوں نے اس شبہ کو بالکل رد کر دیا ہے اور تعداد جواز وقت واحد میں چار تک محدود کر دی ہے۔

اس کے بعد مولانا وضاحت کے لئے فرماتے ہیں کہ اگر نو ہی تعداد منظور تھی تو صاف یہی کیوں نہ ارشاد ہو گیا، اس قدر گھوم پھیر کر بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی، پھر یہ تعدد ازدواج کی اجازت ہرگز کوئی ایسی چیز نہیں جس پر کسی مسلمان کو شرمانے اور طرح طرح کی تاویلیں کرنے کی ضرورت محسوس ہو۔

اور اصل میں دیکھا جائے تو مرد کے قویٰ اور جسمانی ساخت کے لحاظ سے اُسے ایک سے زائد بیویوں کا حق ہونا ہی چاہئے، پھر استقرار حمل کے بعد سے ولادت بلکہ مدت رضاعت تک عورت کی بے رغبتی کے باعث صحت مند مرد کو بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو تعدد ازدواج کا متقاضی ہے اس لئے ایسے حالات کے پیش نظر وہ قانونی نظام کامل نہیں ناقص ہے جو مرد کی طبعی ضرورتوں کی طرف سے آنکھ بند کر لے اور عورت کی طبعی معذوریوں کا لحاظ کر کے مرد کے لئے کوئی سہولت جائز نہ رکھے۔

اس کے علاوہ یورپ وامریکہ میں آج عقد نکاح کو درمیان میں لائے بغیر جو شہوانی اندھیر کھلے بندوں ہو رہا ہے اس کی نقل وحکایت کی بھی تاب ان صفحات میں نہیں۔ اسلام نے یک طرف تو یک زوجی کی قید اڑا کر تعدد کو سند جواز دے دی اور دوسری طرف اس کی مناسب حد بندیاں بھی کئی کئی طرح کر دیں۔ اور یہی ایک حکمت کا کمال ہے۔

اس کے بعد فان خفتم ان لا تعدلوا فواحدة کے تحت عدل کی دو قسمیں کرتے ہوئے فرماتے ہیں اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی پر بس کرو۔

یعنی بیویوں کے درمیان عدل نہ کر سکو گے اور ان کے حقوق واجب ادا نہ کر پاؤ گے۔

عدل سے یہاں مراد ادائے حقوق واجب ہیں یہاں عدل ومساوات ہے جو انسان کے قصد واختیار کے اندر کی چیز ہے مثلاً یہ کہ کوئی بیوی بغیر کھانے کپڑے، مکان کے نہ رہے، باقی

جہاں تک طبعی اور تعلق قلب کا سوال ہے اس میں مساوات قدرت بشری سے باہر ہے اور اس باب میں شریعت نے کوئی گرفت نہیں رکھی ہے۔

اس کے بعد عدل واجب میں بھی یہ لازم نہیں ہے کہ ہر معاملہ مساوات عددی کے ساتھ کیا جائے، کیونکہ ایک افریقی بیوی بالکل دوسری چیزوں کی خوگر ہوگی اور امریکی دوسری چیزوں کی، عمر دراز اور ادھیڑ عمر کی بیوی کی ضرورتیں، خواہشیں، دلچسپیاں ایک کم عمر بیوی کی ضرورتوں خواہشوں سے مختلف ہوں گی۔

یہاں مقصود یہ نہیں کہ ساری بھینسیں بے تحاشا ایک ہی لکڑی سے ہانکی جانے لگیں۔ مقصود ہر ایک کو بقدر اپنے امکان اور بہ لحاظ اس کی مرغوبات، مالوفات کے راحت پہونچانا ہے، اور عمر صحت، ماحول عادت کے اختلافات پر نظر رکھنا بہر حال ضروری ہے۔

اس طرح مولانا دریابادی مرحوم نے مسلمانوں پر چھپتے ہوئے سوالوں کے جوابات نہایت معقول اور مدلل انداز میں پیش کیے ہیں جن کی اور بھی مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

عبقری عالم، نامور ادیب، صاحب طرز انشاپرداز

مولانا عزیزالحسن صدیقی ☆

مولانا عبدالماجد دریابادی محتاط و متقی عالم دین تو تھے ہی آسمان علم وادب کے آفتاب و ماہتاب بھی تھے۔ ان کی تعریف وستایش کرنا آفتاب کو چراغ دکھانا ہے۔ ان کی رحلت پر چوتھائی صدی گذر چکی ہے مگر علمی مجالس میں وہ آج بھی زندہ ہیں اور ان کا نام ٹکسالی سکہ کی طرح رواں ہے۔ ان کا ایک ایک قول اور ایک ایک عمل لائق تقلید ہے۔ ان کے مقالات اور تصانیف کا کیا کہنا، ان کی قرآنی تفسیر استناد کا درجہ رکھتی ہے اور ان کی علمی تحقیق اور مطالعہ اس پایہ کا تھا کہ علماء و محققین اور اساتذہ ان سے استفادہ کیا کرتے تھے۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ تحریر فرماتے ہیں۔

> اب وہ وقت آیا کہ مجھے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں درس قرآن اور تفسیر کی خدمت سپرد ہوئی، مولانا نے اپنی انگریزی تفسیر کی تالیف کا سلسلہ شروع فرمادیا تھا، اور اس سلسلہ میں ان کے مطالعہ کا اصل میدان اور تفسیروں میں ان کی تفسیر کا اصل امتیاز صحف سماوی اور مذاہب کا تقابلی مطالعہ اور ان شخصیتوں، مقامات اور تاریخی ادوار کی جدید جغرافیائی و تاریخی معلومات کی روشنی میں تحقیق اور قرآن مجید کے مشکل مقامات کا حل پیش کرنا تھا، جن کے بارے میں جدید علوم، مستشرقین کے اعتراضات اور جدید مطبوعات نے مختلف سوالات کھڑے کردیے ہیں، میں اپنے درس میں سورۂ بقرہ میں ہاروت ماروت کے قصہ "وما کفر سلیمان ولکن الشیاطین کفروا" کی آیت پر پہونچا تو مجھے ضرورت محسوس ہوئی کہ مولانا کی تحقیقات ومطالعہ سے استفادہ کروں، غالباً سبق روک کر میں پہلی مرتبہ دریاباد اس مقصد سے گیا اور

☆ مہتمم مدرسہ دینیہ غازی پور، و رکن اساسی آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت۔

وہاں سے بہت سے سوالات کا جواب اور بہت سا قیمتی مواد لے کر آیا۔ یہ اتفاق غالباً کئی بار پیش آیا۔ (پرانے چراغ جلد دوم صفحہ ۱۴۹ تا ۱۵۰)

غیر رسمی وغیر اصطلاحی عالم:

مولانا نے کسی عربی مدرسہ میں باضابطہ تحصیل علم نہیں کیا تھا، وہ فی الاصل انگریزی تعلیم یافتہ تھے، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھا تھا، فلسفہ ونفسیات کے فاضل تھے، ادیب وانشاء پرداز تھے، الحاد کی وادیوں میں بھی بھٹکتے پھرے تھے مگر یکسر بدعقیدگی اور بے دینی کے باوجود معاشرتی تعلقات مسلمانوں ہی سے رہے، اعزہ سے اجنبیت نہیں محسوس کی اور ملت مسلمہ کے دائرہ سے باہر نہیں رہے، خود فرماتے ہیں۔

> اپنے طالب علمی میں ایک دور خاص الحاد کا بھی رہا ہے اواخر ۲۸ء سے شروع ہو کر کئی سال تک طالب علمی کیننگ کالج لکھنؤ کی تھی۔ انٹرمیڈیٹ میں آ کر چند مہینوں کے اندر ہی انگریزی کتابوں سے یہ بے دینی پیدا ہوگئی تھی اور عقلیت (ریشنلزم) نے پورے ارتداد کا روپ بھر لیا تھا۔ رسالت، آخرت، توحید کا کوئی ایک بھی بنیادی عقیدہ جب سلامت نہیں رہنے پایا تھا تو پھر اعمال (نماز وروزہ وغیرہ) کا کیا ذکر، فخر ومباہات اپنی اس آزاد خیالی (Free thinking) پر تھی اور الحاد میں نشانی اپنی علم دوستی وفلسفیت کی تھی۔ یہاں کہنے کی بات یہ ہے کہ اس یکسر بدعقیدگی اور بے دینی کے باوجود معاشرتی تعلقات مسلمانوں ہی سے رہے۔ دیندار باپ اور تہجد گذار ماں کی اولاد بدستور بنا رہا، بھائی بہن کسی عزیز سے بھی اجنبیت محسوس نہ کی اور اپنے کو مسلم ملت کے دائرہ سے ایک دن باہر نہ سمجھا، لکھنا پڑھنا، کھانا پینا، پہننا اوڑھنا سب مسلمانوں ہی کا سا رہا (صدق جدید ۲۷ راگست ۱۹۶۵ء)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ان کی ان الفاظ میں تعریف کرتے ہیں:

> وہ چونکہ رسمی واصطلاحی طور سے کسی مدرسہ کے عالم ومدرس نہ تھے، بلکہ اعلیٰ انگریزی تعلیم یافتہ، صاحب طرز ادیب وانشاء پرداز، فلسفہ ونفسیات کے فاضل اور مغرب اور اہل مغرب سے مذہب کا مذاق اڑانے والوں سے زیادہ واقف تھے اس لئے ان کی تحریروں کو ''ملائے مذہبی'' کا طعنہ دے کر یا ''شعر من بمدرسہ کے برد'' ؟ کا فقرہ

چست کرکے نالانہیں جاسکتا تھا (پرانے چراغ جلد دوم صفحہ ۱۶۵)

مولانا کہلانے سے قبل:

اس عنوان سے نشر گاہ کراچی سے مولانا کی ایک تقریر ۱۵ اپریل ۱۹۵۵ء کو نشر ہوئی تھی جس میں مولانا نے فرمایا تھا:

> اپنی آنکھ جس ماحول میں کھلی وہ اچھا خاصہ مذہبی تھا، گھرانہ کھاتا پیتا ساتھ ہی دیندار، یہ قصہ انھارہویں صدی آخر کا ہے یا پوری گنتی سننا چاہتے ہوں تو ۱۸۹۲ء کا، عادتیں اپنی بھی قدرتاً مذہبی قسم کی پڑگئیں، نماز روزہ کی پابندی، قرآن مجید کی تلاوت، دینی کتابوں کا مطالعہ وغیرہ اور یہ سب بطور خشک معمول کے نہیں بلکہ عقائد میں پختگی اور جوش بھی ساتھ ساتھ، اپنے ساتھیوں کو تبلیغ بھی۔ ہائی اسکول پاس کرکے داخلہ کالج میں ہوا۔ اب مستقل رہنا لکھنؤ میں شروع ہوا جہاں کتابوں کی کمی نہ تھی۔ جو کتاب بھی سامنے پڑگئی بس اسے کتاب کے کیڑے کی طرح چاٹ گیا۔ کوئی بتانے والا نہ تھا کہ کتاب ہے کس نوعیت اور کس پائے کی۔ اتفاق کی بات کہ شروع ہی میں سابقہ جس کتاب سے پڑا وہ ایک سخت ملحد قسم کے انگریز ڈاکٹر کی کتاب (Elements of Social Science) تھی۔ ظالم نے پیرایہ بیان تمام تر علمی یا بقول خود سائنٹی فک اختیار کیا تھا۔ جوں جوں مطالعہ آگے بڑھا طبیعت اثر قبول کرتی گئی، یہاں تک کہ چند سو صفحہ کی کتاب جب ختم کی ہے تو اندر ہی اندر چپکے ہی چپکے قلب میں ایمان کی نورانیت کی جگہ الحاد کی ظلمانیت جگہ لے چکی تھی۔ (مولانا جعفر تھانیسری (جو انڈمان میں نظر بند تھے) نے اپنی کتاب ''کالا پانی'' میں لکھا ہے کہ میں انڈمان میں جب نظر بند تھا تو میں نے اتنی انگریزی پڑھ لی تھی اور لکھنے کی مہارت حاصل کرلی تھی کہ عدالتی عرضیاں لکھ لیا کرتا تھا مگر انگریزی کتابوں کے پڑھنے کا یہ اثر ہوا کہ نوافل تو دور رہیں فرائض میں بھی کوتاہی ہونے لگی۔ خدا بھلا کرے مولانا دریابادی کا انہوں نے اپنا تجربہ بیان کرکے مولانا جعفر تھانیسری کی بات کی تصدیق کردی اور یہ بھی بدبختی ثابت ہوگیا کہ جن علماء نے ابتدائی زمانے میں انگریزی لٹریچر سے مسلمانوں کو دور رہنے کی تلقین کی تھی وہ بے جا نہ تھی)

مولانا آگے لکھتے ہیں:۔۔۔۔۔

ایک لائبریری میں ایک کتاب اور نظر پڑی جس میں دنیا کے مشاہیر کے ادب پارے درج تھے اور اس سلسلہ میں قرآن مجید کے اقتباسات بھی۔ اسی کتاب میں پورے صفحہ پر تصویر نعوذ باللہ عرب مصنف قرآن کی یعنی ہمارے حضور اکرم ﷺ کی درج تھی اور یہ نہ پوچھئے کہ وہ کس درجہ زہر میں بجھی ہوئی تھی۔ صاف ایک جلاد قسم لیکن کمر میں ایک طرف پیش قبض، دوسری طرف تلوار اور اس سے بڑھ کر شانے پر ترکش اور کمان! تیوروں پر بل پڑے ہوئے اور چہرے سے تمام تر خشونت ٹپکتی ہوئی۔ قدرتاً صاحب تصویر کی شخصیت سے متعلق انتہائی بدعقیدگی پیدا ہو کر رہی۔ اناللہ۔

جب بی اے میں پہنچا تو فلسفہ اور نفسیات کی کتابوں کے پڑھنے کا ہوکا تھا۔ ایک نامور ڈاکٹر کی دو ضخیم کتابیں پڑھ ڈالیں۔ ان میں بدبخت نے یہ کمال کیا تھا کہ مرض صرع (Ellepey) کا بیان کرتے کرتے ایک دم سے (بیان) اس میں یہ لے آیا کہ انبیاء کی بعض مشہور ترین اور عظیم ترین ہستیاں بھی اس قسم کے دوسرے مرض میں مبتلا رہی ہیں چنانچہ نزول وحی کے وقت کے آثار وعلامات کا شمار آثار مرض میں کر ڈالا۔

اب فرمائیں کہ ایک سادہ دل مسلم نوجوان کے دل و دماغ پر پیہم حملے جب اس قسم کے ہوں تو وہ بیچارہ اپنے ایمان کو کب تک سلامت رکھ سکتا تھا۔

مولانا آگے لکھتے ہیں کہ یہ نشہ ایک دو دن نہیں متواتر آٹھ دس سال جمار ہا لیکن اللہ کا فضل اتنا رہا کہ اس ساری مدت میں تعلق وعقیدت حضرت اکبرالہ آبادی سے بھی قائم رہا اور وہ کمال حکمت سے دین کی تبلیغ کرتے رہے اور مادیت وفرنگیت سے مرعوبیت دماغ سے ہٹاتے گئے۔ دوسری رہنما ہستی مولانا محمد علی جوہر کی ہوئی پھر توجہ بدھ مذہب، ہندو فلسفہ کی طرف مڑ گئی، مسز بیسنٹ، آربند وگھوش، ڈاکٹر بھگوان داس، مہاراجہ تلک اور ایڈمنڈ ہوتر، چھ مہینہ کے مسلسل مطالعہ روحانیت نے مادیت اور الحاد کا طلسم توڑ کر رکھ دیا۔ عین اسی زمانے میں علامہ شبلی کی سیرۃ النبی شائع ہوئی اس نے پیغمبر اعظم ؐ کی عظمت و برتری کا پوری طرح قائل کر دیا۔ (سیرۃ النبی کی اثر پذیری کی ایک روشن مثال اور واضح دلیل ہمارے شہر غازی پور کی ایک معزز اور ذی علم شخصیت شاہ ابوالفیض صاحب مرحوم کی تھی جو الحاد وتشکیک کے دور سے گذر رہے تھے کہ قاضی محمود عالم صاحب مرحوم ہادی طریق بن کر سامنے آگئے۔ انہوں نے سیرۃ النبی ﷺ کی جلدیں چپکے سے

لاکر رکھ دیں، اس کے مطالعہ نے کایا پلٹ دی پھر حضرت مولانا علی میاںؒ سے تعلق قائم ہوا جنہوں نے اپنی تصانیف مطالعہ کے لئے دیں اور شیخ زکریاؒ سے بیعت کرا دیا۔) اس کے بعد رسائی مولانا روم کی مثنوی تک ہوگئی، دل ابھی مثنوی کے فرے لے ہی رہا تھا کہ مولوی محمد علی لاہوری کی انگریزی تفسیر میری نظر کے سامنے آگئی اور جو بھی کسر از سر نو مسلمان ہونے میں باقی رہ گئی تھی پوری ہوگئی۔

الحاد سے اسلام تک:

خود مولانا کی زبان سے یہ روداد سنئے:

> مثنوی کے شاید چند ہی صفحے پڑھے ہوں گے کہ نظر آنے لگا کہ اب میں اپنے ارادے سے کتاب نہیں پڑھ رہا ہوں بلکہ کتاب خود مجھے اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ کشش کا یہ عالم تھا کہ کہاں کا کھانا پینا اور کہاں کا سونا بس کمرہ بند کر کے اسی کتاب کو یکلخت پڑھتے جائیے اور چیخ چیخ کر روتے جائیے۔
>
> حاشیے اس کے لاجواب تھے، خصوصاً وہ حاشیے جو مرشدنا قبلۂ عالم کے نام سے منسوب تھے اور بعد کو معلوم ہوا کہ اس اشارے کے مشارٌ الیہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ تھے۔ دو لفظوں میں شعر کا پورا مغز نکال کر رکھ دیتے تھے۔

اب مولانا پوری طرح اسلام کی طرف لوٹ چکے تھے پھر بھی طبیعت رسمی تصوف اور خانقاہی شخصیت کی وادیوں میں ٹھوکریں کھا رہی تھی۔ درگاہوں پر حاضری اور عرسوں میں شرکت کا زور تھا۔ اجمیر اور دیوہ کی درگاہوں پر حاضری دی۔ دو تین سال یہ رنگ رہا پھر مجدد سرہندیؒ کے مطالعہ کی توفیق ہوئی۔ مکتوبات نے دل و دماغ کو بدلا اور ذہنی سکون اور انشراح خاطر پیدا کر دیا اور بجائے اِدھر اُدھر بھٹکنے کے اور ہاتھ پیر مارنے کے اب اتباع شریعت کی صراط مستقیم مل گئی اور منزل مقصود معین ہوگئی کہ وہ صرف رضائے الٰہی ہے اور اس مقصد کے حصول کا راستہ اور ذریعہ صرف اتباع احکام مصطفوی ہے۔

علوم دینیہ کا حصول:

مولانا خود فرماتے ہیں:

> اب مطالعہ خالص دینی کتابوں کا شروع ہوا۔ تفسیر، حدیث اور فقہ کی ورق گردانی شوق

وسرگرمی سے شروع کردی۔ شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کے اجزاء تفسیر قرآن، شاہ ولی اللہ دہلوی کا فارسی ترجمہ، شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے حواشی تفسیری، مولوی محمد علی لاہوری کی بیان القرآن، بیضاوی، کشاف وغیرہ براہ راست مطالعہ کرنا شروع کردی۔

بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، مؤطا، مشکوٰۃ وغیرہ حدیث کے جتنے مستند مجموعے مل سکے ان کا معقول اور اپنے کام کا حصہ اردو ترجموں کی مدد سے پڑھ ڈالا۔

فطری ادیب:

مولانا دریابادی ایک فطری ادیب تھے اور بیک وقت اردو، عربی اور انگریزی تینوں زبانوں پر قدرت رکھتے تھے۔ اس کا ثبوت ان کی اردو تصانیف اور اردو اور انگریزی کی تفاسیر ہیں۔ اردو ادب کے تو وہ امام ہی تھے۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ تحریر فرماتے ہیں:

> ایک فطری ادیب اور صاحب قلم کی پہچان یہ ہے کہ موضوع کیسا ہی سادہ، سنجیدہ اور خشک و پر تقدس ہو، وہ اپنے علم کی جولانی، خیال کی رعنائی اور طرز ادا کی دلآویزی کو روک نہیں سکتا اور اس کے لئے اپنے ادبی ذوق اور اسلوب تحریر سے عاری و خالی ہو جانا ناممکن ہوتا ہے۔ خلافت وندوہ کے خطبات کا ثقہ و متین ماحول ہو یا فلسفۂ اجتماع یا فلسفۂ جذبات کی سنگلاخ اور پرخار وادی یا تفسیر و تصوف کا پرعظمت اور نازک میدان ہر ہر قدم پر ہوشیار اور نگاہ روبرو کی آواز اور بڑے ادیبوں کے کان میں:
>
> قدم سنبھال کے رکھیو یہ تیرا باغ نہیں
>
> کی صدا آتی ہے۔ اس کا قلم گل کاری اور گلفشانی سے باز نہیں رہتا۔ مولانا دریابادی کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی کوئی تحریر ادب وزبان کی چاشنی سے خالی نہیں اور کہیں ان کا اسلوب تحریر جو ان کی شخصیت بن گیا ہے، ان کا ساتھ نہیں چھوڑتا، حد یہ ہے کہ ان کی کتاب "ہسٹری آف یورپین مارلس" کے ترجمہ "تاریخ اخلاق یورپ" (جو اپنے موضوع، اپنے فنی اصطلاحات اردو کی تنگ دامانی اور ترجمہ کی مشکلات کی وجہ سے نہایت مشکل کام تھا) میں بھی وہ پورے طور پر کامیاب ہوئے ہیں اور پوری کتاب میں کہیں ثقالت وخشکی اور ترجمہ پن نظر نہیں آتا۔ (پرانے چراغ جلد دوم صفحہ ۱۴۷تا۱۴۸)

اپنے طرز کے بانی اور خاتم:

مولانا کی علمیت یا مولانا کے ادب پر کچھ کہنا آفتاب کو چراغ دکھانا ہے، ان کے اسلوب تحریر اور ادبی خصوصیت پر روشنی ڈالنا ہما شما کا کام نہیں ہے، ان کے مقام اور ان کے کام پر کلام کرنے کا حق اسی کو ہے جو ان کا ہم پلہ ہو۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ فرماتے ہیں:

''وہ (مولانا دریابادی) اپنے طرز کے بانی اور خاتم ہیں۔''

واقعہ بھی یہی ہے کہ ان کے طرز تحریر کا تتبع کوئی نہ کر سکا۔ طنز نگاری میں بھی ان کا کوئی جواب نہیں۔ طنز نگار بہت ہوتے ہیں مگر مولانا دریابادی جیسا انوکھا طنز نگار نہیں دیکھا گیا۔

منفرد نقاد:

اس میں شک نہیں کہ مولانا اردو کے صاحب طرز نقاد بھی تھے۔ وہ ایک ایک لفظ کی تحقیق کرتے تھے اور جب تک انہیں اطمینان نہیں ہو جاتا تھا جستجو جاری رکھتے تھے۔ زبان و بیان کی معمولی سی غلطی پر بھی خوب گرفت کرتے تھے اور نقد کرتے وقت کسی کی رو رعایت نہیں کرتے تھے۔

ان کا اخبار ''صدق جدید'' اچھا خاصہ ''نقد نامہ'' تھا جس میں ادیبوں، شاعروں، صحافیوں، لیڈروں سب کی خبر لی جاتی تھی۔ چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی ان کی نگاہ سے اوجھل نہیں ہوتی تھی۔ اپنے مخصوص انداز میں وہ فقرے چست کرتے تھے اور بڑے بڑوں کو چت کر دیا کرتے تھے۔

ذکاوت حس:

بقول حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ مولانا کی ذکاوت حس اتنی تیز تھی کہ کسی شاعر کے کلام یا کسی ادیب کے مضمون میں مذہب و شریعت کی توہین یا طنز و استہزاء کا کوئی جملہ دیکھ لیتے تو فوراً اس کا نوٹس لیتے اور اس پر تنبیہ فرماتے، مولانا کی مغفرت و مقبولیت کے لئے شاید یہ ہی دینی حمیت کافی ہو جائے جو ہزار عبادت و تسبیح سے زیادہ خدا کے یہاں وزن رکھتی ہے۔

تحریک خلافت اور تحریک آزادی میں شرکت:

ملکی سیاسیات اور تحریک آزادی کے سلسلہ میں مولانا کا کیا رجحان تھا اور انہوں نے اس میں کس طور سے حصہ لیا، اس کے بارے میں خود مولانا کی زبان سے سنئے، مولانا فرماتے ہیں:

جب سے کامریڈ نکلنا شروع ہوگیا تو میں اس کا حرف حرف پڑھنے لگا، ترکی سیاست اور عالم اسلام کی سیاست سے دلچسپی پیدا ہونے لگی پھر جب ۱۹۱۷ء میں مسز اینی بیسنٹ نظر بند ہوئیں تو ان کی ذات سے عقیدت کی بناء پر دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ ہوم رول اور کانگریس کو اچھا سمجھنے لگا پھر گاندھی جی کی تحریک ترک موالات اور اس کا علم بردار علمی حد تک بن گیا چنانچہ ماڈرن ریویو (کلکتہ) میں ''ستیہ گرہ اور اسلام'' پر لکھا اور پھر جب علی برادران گرفتار ہوکر کراچی کے مقدمہ میں سزایاب ہو گئے تب سے تو تحریک خلافت کا بے داموں کا غلام بن گیا۔ مرکزی خلافت کمیٹی اور پھر اس کی ورکنگ کمیٹی کا ممبر بھی تھا، اودھ خلافت کمیٹی کا صدر کئی سال تک رہا، ۱۹۲۷ء میں لکھنؤ میں خلافت کانفرنس کا جو اجلاس ہوا، اس کی مجلس استقبالیہ کا صدر تھا اور جو ایڈریس اس میں پڑھا لوگوں نے اس کی بڑی ہمت افزائی کی۔ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں سے ہمدردی رہی مگر دور دور کی اور جب سے محمد علی کا انتقال ہوگیا، سیاست سے بالکل قطع تعلق کرلیا، گاندھی جی کی دور اندیشی، تدبر اور اخلاص سب کا مداح زندگی بھر رہا اور ان کے بے وقت اور بے دردانہ موت ملک کے لئے ہی نہیں مسلمانوں کے لئے بھی ایک سانحہ ہے۔ (ماہنامہ آج کل دہلی جولائی ۱۹۷۰ء)

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ ـــ چند باتیں، چند یادیں

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید☆

لگ بھگ (۳۲) سال قبل کی بات ہے لیکن محسوس ہو رہا ہے جیسے کل کی بات ہے۔ کل کی نہیں بلکہ آج کی اور ابھی کی۔ ۱۸؍جولائی ۱۹۷۳ء ہے۔ میں یونیورسٹی میں اپنے کمرہ میں بیٹھا ہوں۔ ڈاکیہ ڈاک دے جاتا ہے۔ میں سب سے پہلے ایک پوسٹ کارڈ پڑھنے لگتا ہوں:

عزیزم۔ وعلیکم السلام!

دریاباد ریلوے اسٹیشن، لکھنؤ۔ مغل سرائے لائین پر ہے۔ لکھنؤ سے (۴۲) میل دور۔ پسنجر ٹرینیں دو گھنٹے کا وقت لیتی ہیں اور اکسپریس ٹرینیں ڈیڑھ گھنٹے سے بھی کم کا۔ دہرہ اکسپریس تقریباً پونے گیارہ بجے پہنچا دیتا ہے اور واپسی میں دہلی پانچ بجے سے کچھ قبل مل جاتا ہے۔ جمعہ کا دن اگر اتفاق سے ہوا تو حکیم عبدالقوی (منیجر "صدق") کا ساتھ لکھنؤ سے رہ سکتا ہے۔ اسٹیشن سے مکان دو میل دور کے فاصلہ پر اور پورے اکّے کا کرایہ دو روپے اب ہو گیا ہے۔ فی سواری اس سے کہیں کم:

ایک امکانی صورت یہ بھی ہے کہ میں ۴؍اگست کو صبح لکھنؤ آجاؤں تو عزیز کو دریاباد تک زحمت نہ کرنا پڑے۔ والسلام

دعاگو

عبدالماجد

ماجد صاحب سے ملاقات کا شرف حاصل کرنے کا ارمان نہ جانے کب سے تھا۔ یقیناً طالب علمی کے زمانے سے۔ لیکن یہ ارمان دل ہی دل میں رہا۔ شرمندۂ تکمیل نہ ہوا۔ ہاں شگفتہ وشاداب ضرور رہا۔ مولانا کبھی کبھار حیدرآباد تشریف لاتے لیکن ان سے نیاز حاصل کرنے کی کوئی

☆ سابق صدر شعبۂ اردو تروپتی یونیورسٹی آندھراپردیش۔

سبیل نہ نکلی۔ یاد پڑتا ہے مولانا ان دنوں بھی ایک مرتبہ حیدرآباد تشریف لائے تھے (حیدرآباد میں غالباً یہ اُن کی آخری بار تشریف آوری تھی) جب میں رہنمائے دکن میں کام کرتا تھا۔ مولانا ''رہنمائے دکن'' کے دفتر بھی آئے تھے۔ اس وقت میں دفتر میں تھا نہیں۔ نیاز حاصل کرنے کی سعادت سے محروم رہا — اور پھر دن گزرتے رہے، گزرتے رہے —

''رشید احمد صدیقی: شخصیت اور فن'' کے موضوع پر ریسرچ کے دوران جب اس کا علم ہوا کہ رشید صاحب سے ماجد صاحب کے گہرے دوستانہ مراسم ہیں تو میں نے ماجد صاحب کو خط لکھا اور خاص طور پر درخواست کی کہ وہ رشید صاحب کے مکاتیب یا ان کے نقول سے سرفراز کریں۔ رشید صاحب کو کسی نہ کسی وجہ سے اپنے خطوط کی اشاعت پسند نہ تھی۔ جس طرح اور بہت سے اصحاب نے مجھ کو لکھا۔ اندیشہ یہی تھا کہ ماجد صاحب بھی رشید صاحب کا حوالہ دیتے ہوئے خطوط عنایت نہیں فرمائیں گے لیکن میری مسرت اور حیرت کی انتہا نہ رہی کہ جلد ہی ماجد صاحب کا مکتوب اور پھر چند روز بعد ماجد صاحب کے رشید صاحب کے مکاتیب بذریعہ رجسٹری وصول ہوئے۔

ادیبوں کی زندگی عموماً بے پروائی کا شکار ہوتی ہے۔ کئی اصحاب نے رشید صاحب کے خطوط کے سلسلے میں لکھا تھا کہ وہ خطوط دینے پر آمادہ تو ہیں لیکن پتہ نہیں خطوط کہاں بکھرے ہوئے ہیں، اِدھر اُدھر — اُن کی تلاش ممکن نہیں۔ نتیجہ معلوم! لہٰذا معذرت — ماجد صاحب ہمارے دور کے بزرگ ترین ہی نہیں بلکہ صف اول کے معروف ترین اور مصروف ترین شخصیات میں سے تھے۔ مذہبی، ادبی، صحافتی ہر شعبہ میں ان کی خدمات گراں بہا، وزن و وقار کی حامل اور نا قابلِ فراموش ہیں۔ ہر کوئی ان کی بے پناہ مصروفیات کا اندازہ کر سکتا ہے۔ بایں پس منظر میرے لئے یہ چیز باعث استعجاب رہی کہ ماجد صاحب نے سارے مکاتیب کو یکجا اور تاریخی ترتیب کے ساتھ رکھا تھا۔ اس کے بعد مدت تک ماجد صاحب سے بہت کم خط و کتابت رہی لیکن ہمیشہ کی طرح ان کی ہر تحریر سب سے پہلے پڑھنے کی سعی کرتا۔ ذوق و شوق کے ساتھ! علاوہ ازیں ''صدق جدید'' کا مطالعہ بھی ایک طرح معمولات میں داخل ہو گیا۔

اپنی پہلی کتاب ''رشید احمد صدیقی'' کی اشاعت کے بعد میں نے اس کا ایک نسخہ آں محترم کی خدمت میں روانہ کرتے ہوئے ''صدق جدید'' میں تبصرہ کی مؤدبانہ درخواست کی۔ ماجد صاحب نے شرفِ قبولیت بخشا۔ میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ماجد صاحب کے اس تبصرہ کا میری

ادبی زندگی پر گہرا اثر پڑا ہے۔ میری ادبی صلاحیتیں جتنی بھی جلا پائی ہیں۔ مجھے مطالعہ اور تحریر وتصنیف کا جو بھی ذوق اور حوصلہ ملا ہے اس کی تحریک میں ماجد صاحب کی ادبی شخصیت اور ان کے مذکورہ تبصرہ کا قابلِ لحاظ حصہ ہے۔ بہت زیادہ!

ماجد صاحب اردو دنیا میں چراغ راہ بھی رہے ہوں۔ اب تو وہ چراغ منزل تھے۔ مینارۂ نور! انہوں نے اپنے طور پر ادب کی مہتم بالشان خدمات انجام دیں۔ اور اسی کے ساتھ انہوں نے نہ جانے کتنوں کو روشنی دکھائی۔ کتنوں کی رہبری کی، کتنوں کو منزل تک رسائی میں اعانت کی۔ کتنوں کی حوصلہ افزائی کی۔ کتنوں کے ذوق کو صیقل کیا۔ کتنوں کی ادبی سلاحیتوں کو نکھارا — ماجد صاحب کی ذات استعداد آفریں تھی۔ وہ ایک شجر سایہ دار تھے۔ نہ جانے آج اردو کے صفِ اول کے کتنے ممتاز ادیب، نقاد اور انشا پرداز ہیں جن کا قلم ماجد صاحب کی حوصلہ افزائی کا مرہونِ منت ہے اور اب ماجد صاحب کے غم میں خوں چکاں اور سوگوار بھی۔

اب بھی ماجد صاحب سے خط وکتابت شاذ ہی ہوتی۔ ۱۹۷۳ء کی بات ہے میں نے دلی اور علی گڑھ وغیرہ جانے کا ارادہ کیا۔ طے کیا کہ دریاباد ضرور جاؤں گا اور ماجد صاحب سے نیاز حاصل کروں گا۔ مکتوب روانہ کیا۔ ماجد صاحب نے بخوشی اپنے ہاں آنے کی دعوت دی۔ لکھنؤ سے دریاباد جانا اور دریاباد ریلوے اسٹیشن سے ماجد صاحب کے در دولت تک راستہ ڈیڑھ دو میل کا ہے۔ کچا، بے ہنگم اور ناہموار (پتہ نہیں اب کیسا ہو، اس وقت تو ضرور تھا) سواری جو ملتی ہے وہ بھی کچھ ایسی ہی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ماجد صاحب نے اپنے مکتوب میں ایک امکانی صورت کا بیان کیا کہ وہ ۲۸ اگست کو لکھنؤ آجائیں گے اور مجھے دریاباد تک ''زحمت'' نہ کرنی پڑے گی۔ اس مکتوب سے میرے نزدیک ماجد صاحب کی شخصیت اور بلند اور منور ہوگئی — ہم میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو گھر پر آنے والوں سے بھی سلیقہ سے نہیں ملتے اور ایک ماجد صاحب تھے کہ (۸۰) سال کی عمر کے مرحلہ میں اتنی منزلت اور مرتبت کے حاصل ہونے کے باوصف ایک معمولی طالب علم کے لئے (۴۲) میل کا فاصلہ طے کر کے تشریف لانے پر آمادہ تھے۔ میرا سر احترام سے جھک گیا — یہ بات میرے لئے کسی طرح قابل قبول نہیں تھی کہ میں دریاباد پہنچ کر ان کے دولت کدہ پر حاضری دینے کی بجائے وہ میرے لئے دریاباد سے لکھنؤ آنے کی زحمت برداشت کریں میں نے فوراً خط لکھا کہ آپ یوں مجھے شرمندہ نہ کریں۔ یہ امر میرے لئے باعثِ سعادت اور وجہ افتخار ہوگا کہ میں

دریاباد پہنچوں اور آپ کی قیامگاہ پر حاضری دوں — آپ میرے لئے لکھنؤ تشریف لائیں، جی نہیں ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ میں ملتجی ہوں۔ ظاہر ہے میں ایسا نہیں کرسکتا تھا کہ ماجد صاحب کو زحمت دیتا۔

اگست ۱۹۷۳ء کی دو تاریخ تھی۔ میں حیدرآباد سے لکھنؤ پہنچ گیا۔ دو ایک روز لکھنؤ میں گزارے اور یکشنبہ ۵ راگست کو ماجد صاحب کے مکتوب کی روشنی میں دہرہ اکسپریس سے دریاباد پہنچ گیا۔

دریاباد اتر پردیش کے ضلع بارہ بنکی کا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ ریلوے اسٹیشن بھی چھوٹا موٹا۔ نہ ریل پیل، نہ گڑبڑ نہ ہنگامہ آرائی نہ شور پکار۔ جو کسی ریلوے اسٹیشن کا نام لیتے ہی تصور میں ابھر آتے ہیں۔ لیا دیا سا ماحول۔ ہر طرف سکون و عافیت سی۔ جیسے ماجد صاحب کی شخصیت یہیں سے اپنا پتہ دے رہی ہو۔ ٹرین آنے پر اُترنے والے بھی دو چار اور سوار ہونے والے بھی اتنے ہی۔ اسٹیشن سے باہر چند قدیم وضع کے تانگے۔ جن کے چلانے والے سواریوں کی تلاش میں خود پلیٹ فارم پر موجود! ابھی میں ریل سے اُتر کر خود کو ٹھیک ہی کر پایا تھا کہ ایک تانگے والے نے مجھ سے صاف و شستہ لہجہ میں دریافت کیا" کہاں جایئے گا" میں نے ماجد صاحب کا نام لیا۔ "مولانا کے ہاں چلئے گا" وہی دھلی دھلائی زبان۔ مولانا کے لئے عقیدت و احترام سے بھرپور لہجہ! میں نے دریافت کیا "تمہیں مولانا کا مکان معلوم ہے"؟ تانگے والے نے کچھ ایسی عجیب نظروں سے مجھے دیکھا جیسے میں نے اس سے پوچھ لیا ہو، جانتے ہو سورج کدھر سے نکلتا ہے۔ قدرے توقف کے بعد اُس نے کہا۔" واہ مولانا کو یہاں کون نہیں جانتا" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا لیکن اس کا چہرہ کہہ رہا تھا۔ جناب! دریاباد سے مولانا نہیں، مولانا سے دریاباد معروف ہے۔ یہاں کا ہر فرد بلا تخصیص رنگ و نسل، مذہب و ملت یہاں کا ہر گوشہ ہر چپہ، مولانا کی شخصیت اور ان کے کارناموں کو اپنے لئے باعثِ افتخار متصور کرتا ہے — اب میں اُس سے کرایہ کی بات کیا کرتا۔ تانگے والے نے میرا چھوٹا سا اٹاچی اٹھایا اور اسٹیشن سے باہر لا کر اپنے تانگے میں رکھ دیا۔ میرا ایسے تانگے میں بیٹھنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ بیٹھتے ہوئے تھوڑی سی دقت اور بے چینی ہوئی۔ گذشتہ رات غالباً بارش بھی ہوئی تھی، کچی سڑک، کیچڑ سے لت پت۔ راستے پر بیل گاڑیوں کے پہیوں کے نشان، جا بجا کھڈ، تانگا ہچکولے کھاتا زیر و زبر ہوتا رواں ہوا لیکن جوں ہی خیال آیا کہ اب

مولانا سے ملاقات ہوگی احساس ہی نہ رہا کہ میں کس سواری میں بیٹھا ہوں اور کیسے راستوں سے سابقہ ہے جیسے کچھ دیر بعد مولانا سے ملاقات اور گفت وشنید کے خوشگوار لمحات سواری اور راستے کی ان بے ترتیبیوں پر سایہ فگن ہو چکے ہوں۔ سڑک دونوں طرف گھنے اور سایہ دار درخت، شور مچاتے پرندے، چھوٹے چھوٹے مکانات، مکانات کے سامنے کام کرتی عورتیں، کھیلتے ہوئے بچے، گائیں ـــــ مجھے کچھ دیر کے لئے پریم چند اور حیات اللہ انصاری کے افسانوں اور ناولوں میں پیش کردہ، اتر پردیش کے قصبات کی فضا یاد آ گئی۔ میں ان چیزوں کو دیکھتا اور ان سے بے خبر بھی کھویا کھویا سا تھا۔ کچھ دیر میں قصبہ کا بازار آ گیا اور ایک دو موڑ چل کر تانگا رک گیا۔ ''یہی ہے صاحب، مولانا کا مکان'' ـــــ تانگے والے کی آواز تھی ـــــ قدیم وضع کی حویلیوں جیسی پختہ شاندار عمارت، باوقار ـــــ وسیع احاطہ، کشادہ برآمدہ، اونچی اونچی محرابیں، دروازوں اور محرابوں کے اوپر دیواروں پر قرآنی آیات رقم، عمارت کے ہر گوشہ سے تقدس ٹپکتا۔ چہار سو ایک دل آسائی کی کیفیت! برآمدہ میں تھوڑا بہت فرنیچر، آئینہ داری کرتا ہوا کہ صاحب خانہ کے استعمال میں کم آتا ہے۔ درونِ خانہ جانے کے لئے خاصے بلند دروازے، روایتی چلمنیں پڑی ہوئیں۔ چلمنوں پر کپڑا لگا۔ میں نے ماجد صاحب کو اپنے آنے کی اطلاع کرائی اور برآمدے میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ چند لمحے ہوئے ہوں گے، چلمن کو جنبش ہوئی اور ماجد صاحب برآمد ہوئے۔ دراز قد، چوڑا چکلا سینہ، سرخ وسپید رنگ، کسی قدر خمیدہ مگر بھرا بھرا جسم، کتابی چہرہ، ستواں ناک، عبادت وریاضت سے پُرنور، دراز اور بھرپور داڑھی، روشن آنکھیں، ہر بُن مو سے شادانی ٹپکتی، سفید کرتا سفید پاجامہ ـــــ میں نے اپنے تصور میں ماجد صاحب کی جو شبیہ بنائی تھی، زیادہ فرق نہ نکلا۔ گویا علم وادب میرے سامنے مجسم ہوں۔ میں یہ سطور لکھ رہا ہوں۔ لگتا ہے ماجد صاحب اب بھی میرے سامنے موجود ہیں۔ جس زاویہ سے بھی دیکھئے، عظمت، بزرگی اور برگزیدگی کا پیکر۔ دھیرے دھیرے قدم بڑھاتے ہوئے وہ میری طرف بڑھ رہے ہیں۔ میں ایستادہ ہو جاتا ہوں۔ وہ مجھ سے غائبانہ متعارف اور میری آمد کا علم رکھتے تھے۔ بایں وجہ اس خصوص میں رسمی باتوں کی ضرورت پیش نہ آئی۔ لکھنؤ کب آئے؟ سفر کیسا رہا؟ جیسے دو ایک جملوں کے بعد باتوں کا سلسلہ چل نکلا۔

ماجد صاحب سے میرا موضوع گفتگو متعین نہیں تھا۔ ہاں چاہتا ضرور تھا کہ جی بھر کے گفتگو ہو، ہر موضوع پر ـــــ حیدرآباد کا تذکرہ ناگزیر تھا۔ اس وجہ سے نہیں کہ مجھ کو حیدرآباد سے نسبت

حاصل ہے بلکہ اس باعث بھی کہ ماجد صاحب کو کم کم ہی سہی حیدرآباد سے نسبت رہی ہے۔ علاوہ ازیں اردو کا ذکر ہو اور حیدرآباد کا نام نہ آئے، ایسا ممکن بھی تو نہیں۔ ماجد صاحب نے قیام حیدرآباد کے اپنے زمانے کو خوشگوار انداز میں یاد کرتے ہوئے بتایا کہ وہ سررشتہ تالیف وترجمہ میں لگ بھگ ایک سال رہے۔ نامپلی اسٹیشن روڈ پر مالگزاری کے دفتر اور مسز سروجنی نائیڈو کے گھر ''گولڈن تھرش ہولڈ'' (موجودہ دفاتر یونیورسٹی آف حیدرآباد) کے قریب کہیں وہ رہتے تھے۔ ماجد صاحب نے مسز نائیڈو کی بے حد ستائش کی۔ مسز نائیڈو کے ذکر کے ساتھ یوپی کے گورنروں کی بات چلی۔ ماجد صاحب کہنے لگے حیدرآباد نے دو اچھے گورنر دیئے ہیں۔ مسز نائیڈو اور اکبر علی خاں صاحب (میری اس ملاقات کے موقع پر اکبر علی خاں صاحب ہی یو۔ پی کے گورنر تھے)۔ اکبر علی خاں صاحب کی سادگی، ان کے شفاف شخصی کردار اور بحیثیت گورنر ان کے رویہ کے ماجد صاحب رطب اللسان رہے دوران گفتگو اکبر علی خاں صاحب کا جب بھی نام آیا ماجد صاحب نے محبت اور شیفتگی کے ساتھ ان کا ذکر کیا۔

ماجد صاحب ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ فلسفہ، ادب، مذہب اور صحافت، ہر شعبہ میں ان کی خدمات اتنی زیادہ ہیں کہ وہی ان کے نام اور کام کو ہمیشہ زندہ رکھنے کے لئے کافی۔ اور پھر اردو کے حق کے لئے لڑائی میں انہوں نے ایک مجاہد کا کردار ادا کیا— ماجد صاحب نے اگر ایک طرف ادب میں فلسفہ کا رس گھولا اور فلسفہ میں ادبیت پیدا کی تو صحافت میں ادبی وقار پیدا کرتے ہوئے اس کو اعتبار بخشا۔ ماجد صاحب کی ابتدائی تصانیف پر فلسفہ کا رنگ گہرا ہے۔ ایسی تصانیف میں ''فلسفہ اجتماع'' مبادی فلسفہ، فلسفہ جذبات اور'' مکالمات برکلے'' خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔ مولانا کی ادبی خدمات کا دائرہ بغایت وسیع ہے۔ ''اکبر نامہ'' لسان العصر اکبر الٰہ آبادی پر ایک بنیادی کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ ''انشائے ماجد (دو حصوں میں) مقالات ماجد، حکیم الامت، محمد علی کی ذاتی ڈائری، مشاہیر کے خطوط اور ''سفر حجاز'' ایسی تصنیفات وتالیفات ہیں جن کی روشنی میں ماجد صاحب کو اردو کا جانسن قرار دیا جاسکتا ہے۔ میرے استفسار پر ماجد صاحب نے اپنی تصنیف ''معاصرین'' کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ اس کی نوعیت مولوی عبدالحق کی کتاب ''چند ہم عصر'' کی سی ہے جس میں اپنے دور کے (۱۲) بڑوں (۱۰) چھوٹوں اور باقی برابر والوں کا حال احوال ہے۔ ''صدق جدید'' میں ''معاصرین'' کے بعض مضامین شائع ہو چکے ہیں جن سے اس کتاب کے وزن ووقار کا اندازہ ہوتا ہے۔— جوش ملیح آبادی کی مشہور زمانہ لیکن متنازعہ فیہ

سرگزشت ''یادوں کی برات'' کے بارے میں ماجد صاحب کے خیالات سے واقف تھا اور اس سے بھی کہ ماجد صاحب نے ''یادوں کی برات'' پر دیگر جرائد میں شائع شدہ تبصروں کو ''صدق جدید'' میں جگہ دی تھی۔ ان سب تبصروں میں جوش کی اس کتاب کی شدید مذمت تھی۔ میں نے ''یادوں کی برات'' کا نام ہی لیا تھا کہ ماجد صاحب کے قلم کی طرح ان کی زبان دونوک چلنے لگی (تکلف برطرف) اس کتاب کی مذمت کرتے اور اپنے لہجہ میں ممکنہ کراہیت پیدا کرتے ہوئے وہ کہتے گئے۔ لکھی ہی کیسے گئی ایسی کتاب۔ جوش نے شاعری میں اتنا مبالغہ نہیں کیا جتنا نثر میں۔ لڑکوں کی شوخیاں اور شرارتیں ہوتی ہیں مگر اس ظالم (جوش) نے تو انتہا کردی اور پھر اس نے ندامت کے ساتھ نہیں، فخر کے ساتھ لکھا ہے— میں خاموش ماجد صاحب کے اس زبانی تنقید و تبصرہ کی سماعت کرتا رہا۔ آخر میں انہوں نے گویا مقطع پڑھا۔ پڑھنے کے قابل کتاب نہیں۔ اتنا غصہ آتا ہے اس کتاب پر۔

ماجد صاحب نے ادھر برسوں سے خالص ادبی موضوعات پر لکھنا کم کردیا تھا۔ لیکن ''صدقِ جدید'' کے تبصروں سے بخوبی واضح ہوتا تھا کہ آخر وقت تک ان کا شعر و ادب کا مطالعہ گہرائی کا حامل رہا۔ اردو میں تحقیقی کاموں کی رفتار بڑھ جانے کے باوجود ان کا یہ احساس رہا کہ ذاتی تحقیق میں مولوی عبدالحق کا درجہ بڑھا ہوا ہے۔ بایں ہمہ ان کے اس خیال سے کون اتفاق نہیں کرے گا کہ اردو میں ایک ایسی لغت کی ضرورت ہے جو عصر حاضر کے تقاضوں کی تکمیل کرے۔ ماجد صاحب ملک کی بیشتر ریاستوں میں اردو کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں پر بے حد ملول رہے۔ اردو کے حقوق کی لڑائی میں ان کو ایک مجاہد کی حیثیت حاصل تھی۔ وہ اردو کے سلسلے میں کسی انجمن، کسی تحریک سے وابستہ نہ رہے ہوں لیکن اپنی ذات سے وہ بجائے خود ایک انجمن اور ایک تحریک تھے۔ انہیں کسی انجمن، کسی تحریک کی کیا ضرورت تھی؟ ''صدق جدید'' کے ذریعہ انہوں نے اردو تحریک کے سلسلہ میں ایک موثر اور معتبر کردار ادا کیا۔ ماجد صاحب کے نقطۂ نظر سے بعض لوگوں کو اتفاق نہ ہوسکتا ہو لیکن اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ ماجد صاحب نے ''صدقِ جدید'' کے ''شذرات'' کے ذریعہ اردو کے مسائل پر مخلصانہ اور جرأت مندانہ بلکہ مجاہدانہ اظہار خیال کیا۔ نہ شخصیات کی دنیاوی عز و جاہ کی پروا کی اور ایوان حکومت کو خاطر میں لایا اور نہ سیاست کے سرد و گرم اور سیاستدانوں کے مزاج کو درخور اعتنا متصور کیا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے نظریات سے شدید اختلاف کرنے والے بھی ان کے خیالات کا احترام کرتے اور ان کے خلوص کو شک وشبہ سے

بالاتر قرار دیتے — اور پھر اردو کے مسائل ہی کیا۔ ملک کے کس مسئلہ پر ماجد صاحب نے آئین جواں مرداں سے دستبرداری اختیار کی، رؤباہی نہ ان کو آتا تھی نہ آئی۔ وہ افراد کو نہیں، مسائل، موضوعات اور کردار کو زیر بحث لائے۔ ستائش کی تمنا اور صلہ کی پروا کے بغیر انہوں نے وہی کہا جس کو حق تصور کیا۔ اس خصوص میں انہوں نے اوروں ہی کو نہیں اپنے احباب اپنے عزیزوں کو بھی معاف نہیں کیا۔

ماجد صاحب سے مذہبی مسائل پر بھی گفت وشنید ہوئی بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ''گفت'' نہیں صرف ''شنید'' ہوئی میں مولانا سے مذہبی موضوعات پر کیا گفتگو کرتا۔ وہ کہتے رہے اور میں سنتا رہا اور اپنے دامنِ علم کو اور گراں اور گراں کرتا رہا تفسیر ماجدی کے تعلق سے کچھ کہنے سے قبل ایک بات کہتا چلوں۔ ہمارے پاس کلام پاک کی تفاسیر میں زیادہ تر خوش عقیدگی سے کام لیا گیا ہے اور یہی خوش عقیدگی حد سے متجاوز ہوکر کئی الجھنوں کا باعث بنی ہے۔ عربی زبان سے عموماً واقفیت، بحیثیت مذہبیت اور مولویت کا ہونا مفسر کے لئے کافی سمجھا گیا ہے۔ کلام پاک، حیاتِ انسانی کے کسی مسئلہ اور زندگی وزمانے کے کسی معاملہ اور موضوع سے بے تعلق اور بیگانہ نہیں۔ مفسر کے لئے عربی زبان سے واقفیت، بحیثیت مذہبیت اور مولویت کا ہونا تو ضروری ہے لیکن اس کے علاوہ بھی کچھ ہونا چاہئے۔ مفسر کو زندگی اور زمانے کے تمام موضوعات کا مطالعہ کرنا چاہئے عصری زندگی پر تو اس کی نگاہ ضروری ہے۔ اور قدیم وجدید علوم سے بھی وہ بیگانہ نہیں رہ سکتا۔ ان زاویوں سے دیکھا جائے تو مفسر کی حیثیت سے مولانا کا پایہ بہت بلند ہوجاتا ہے۔ عربی اور قدیم علوم پر مولانا کو غیر معمولی دسترس حاصل تھی۔ مولانا نے بائبل کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا۔ انگریزی زبان پر ان کو انگریزوں کی سی قدرت حاصل تھی۔ انہوں نے نہ صرف انگریزی کے کلاسیکی ادب کا خاصا مطالعہ کیا تھا بلکہ انگریزی کی کوئی اچھی کتاب یا جریدہ ایسا نہ تھا جو مولانا کے مطالعہ میں نہ آتا۔ بالخصوص کسی بھی مذہب پر ہو، انگریزی کی کوئی کتاب مولانا کی نظر سے شاید ہی چھوٹی ہو، مستشرقین اور ان کے کاموں سے وہ کماحقہٗ واقف تھے۔ فلسفہ ان کا اپنا موضوع رہ چکا تھا۔ عصری زندگی سے وہ کبھی دور ہی نہیں رہے۔ قومی بھی اور بین قومی بھی۔ ملک کے اہم انگریزی روزناموں اور ہفت روزہ جرائد کا مطالعہ وہ پابندی سے کرنے والوں میں سے تھے۔ ان کے علاوہ ان کی اپنی ایک رائے بھی ہوتی تھی۔ وہ مذہبی ضرور تھے اور کٹر مذہبی لیکن نرے مولوی اور ابلہ مسجد نہیں بلکہ دانائے راز! مذہب کو زندگی کی ایک اہم حقیقت سمجھنے والے، ایک مردِ مومن بھی! انہوں نے تفسیر

میں جن نکات کو پیش نظر رکھا ہے بہت کم مفسر ہوں گے جنہوں نے ان نکات پر اوراس طرح غور کیا ہو۔ اس نکتہ کو واضح کرتے ہوئے کہ مفسرین کی تاریخ وجغرافیہ سے عدم واقفیت کئی غلط فہمیوں کا سبب ہے، ماجد صاحب نے کہا کہ سب یہی سمجھتے ہیں کہ فرعون دریائے نیل میں غرق ہوا حالانکہ گہرے مطالعہ اور فکر وشعور کی کارفرمائی سے یہ امر واضح ہوگا کہ فرعون کو دریائے نیل کی سمت آنا ہی نہیں تھا بلکہ وہ غرق ہوا ہوگا بحیرہ روم میں نہر سوئز کے قریب کہیں ـــــــ

ماجد صاحب کی گھریلو زندگی بھی قابل رشک رہی ہوگی۔ اپنی اہلیہ کی وفات پر انہوں نے ''صدق جدید'' میں جو شذرات لکھے وہ ان کی قلبی کیفیات کی ترجمانی کرتے ہیں کہ یہ سانحہ ان کے لئے کتنا غیر معمولی اور نہ سہارے جانے والا تھا۔ اس ملاقات کے موقع پر بھی انہوں نے بے حد ملول انداز میں کہا کہ ''اپنی پسند سے ہم نے شادی کی تھی، قریبی عزیزوں میں۔''

سوا گیارہ ہوئے ہوں گے میں ماجد صاحب کے یہاں آیا تھا۔ اس دوران ماجد صاحب دو، ایک مرتبہ تھوڑی دیر کے لئے اندر تشریف لے گئے ہوں گے۔ ظہرانہ کا انہوں نے بے حد پُر تکلف انتظام کیا تھا۔ وہ خود شریک نہیں ہوئے، یہ کہتے ہوئے کہ وہ دوپہر میں بے حد کم کھاتے ہیں اور پھر ایسی مرغن غذاؤں کا تو سوال ہی نہیں۔

ظہر کی اذان ہو چکی تھی، ماجد صاحب اندر تشریف لے گئے۔ کسی نے بتایا ظہر کی نماز کے لئے وہ مسجد میں نہیں جاتے۔ مسجد ان کے دولت کدہ سے چند ہی قدم کے فاصلہ پر ہے۔ وہی مسجد جس کا ''صدق جدید'' میں وہ بارہا ذکر کر چکے ہیں۔ میں ظہر کی نماز ادا کرنے کے لئے اسی مسجد میں چلا گیا۔ یہیں مسجد کے قریب قبرستان میں ماجد صاحب کی اہلیہ، ان کے والدین اور ان کے کئی عزیز واقارب کے قبور ہیں (آج ماجد صاحب بھی یہیں آرام فرما ہوں گے۔ میرے چشم تصور میں ان کی آخری آرام گاہ اُبھر آتی ہے)۔ اب چار بجنے والے تھے۔ مجھے پانچ سے کچھ قبل کی ٹرین سے لکھنؤ واپس ہونا تھا۔ اتنے میں چائے مع لوازمات کے آگئی۔ ماجد صاحب بھی چائے میں شریک رہے۔ انہوں نے اصرار سے کھلایا۔ ٹرین کا وقت ہو رہا تھا لیکن ماجد صاحب سے باتیں کرتے ہوئے طبیعت سیر نہیں ہوتی تھی۔ ایک طرح افسوس بھی ہو رہا تھا کہ آج چار اس قدر جلد کیوں بج گئے۔ کہیں میری گھڑی خراب تو نہیں ہوگئی میں تو چاہتا تھا کہ آج وقت کی رفتار کچھ تھم سی جائے، کچھ رک سی جائے، میں ماجد صاحب سے محو گفتگو رہوں۔ وہ کہتے جائیں، کہتے

جائیں، میں سنتا رہوں، سنتا رہوں، چند گھنٹوں کی گفتگو سے جو ماحول بن چکا تھا اس کی خوشبو اور روشنی سے اپنے افکار واحساسات کو مہکاتا اور اجالتا رہوں۔ وہ شفقتوں اور محبتوں کے پھول برساتے رہیں، میں چنتا رہوں، جہاں تک حصول علم کی بات ہے میں نے اپنا دامن بے حد وسیع، بے حد وسیع پایا ہے، پھر بھی مجھے تنگیٔ داماں کی شکایت ہو جائے، کاش ایسا ہوتا، کاش!— ابھی میں خیالات کے انہی تانوں بانوں میں الجھا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں وہی تانگا آگیا جو مجھے یہاں لایا تھا۔ میں نے بے حد عقیدت اور احترام سے اجازت چاہی۔ ماجد صاحب نے لطف وعنایت کے ساتھ مجھے اجازت دی۔ کچھ یوں محسوس ہوا ان چار پانچ گھنٹوں میں بہت کچھ بدل چکا ہوں، مجھ میں بہت کچھ اضافہ ہو چکا ہے۔ میری شخصیت فزوں ہو چکی ہے۔ مجھے اپنے آپ پر رشک آرہا تھا۔ میری حالت کچھ ایسی تھی جیسے کوئی سیدھا سادا شخص عطر کی دکان میں آئے، کچھ دیر رہے اور واپس ہوتے ہوئے اپنے ہمراہ خوشبوؤں کا کارواں لیتا جائے۔ میں بھی علم وادب کا خزینہ لئے ماجد صاحب کی دعاؤں کی رفاقت میں واپس ہوا۔ پھر وہی راستہ، اور دیہات کا وہی ماحول رہا۔ اسٹیشن پہنچا ہی تھا کہ ٹرین آگئی۔ میں لکھنؤ کے لئے روانہ ہوا۔

اب ماجد صاحب سے خط وکتابت نسبتاً زیادہ رہی۔ وہ از راہ شفقت میرے ہر خط کا بے حد چاؤ اور بے حد نوازش سے جواب مرحمت فرماتے۔ علی گڑھ اور دہلی میں اس سفر کے دوران مجھ کو رشید صاحب کے کئی مکاتیب دستیاب ہوئے۔ دلی میں بعض احباب کا مشورہ رہا کہ ان مکاتیب کو شائع کر دینا چاہئے۔ میں نے اپنی کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں ''پیش لفظ'' جیسی چیزوں کا کم ہی اہتمام کیا ہے۔ نہ جانے اس وقت یہ بات کیوں دل میں آئی اور بار بار آتی رہی کہ ''مکاتیب رشید'' کا ''پیش لفظ'' ماجد صاحب کے قلم سے ہو۔ خیال آیا، دریاباد میں یہ بات ذہن میں آتی تو بالمشافہ عرض کرتا — خیر — میں نے دلی ہی سے ماجد صاحب کو مکتوب روانہ کیا۔ جلد ہی ان کا جواب آگیا ''مقدمہ لکھنے سے معذرت خواہ ہوں۔'' میں چاہتا تھا۔ ''مکاتیب رشید'' کا پیش لفظ یا دیباچہ، ماجد صاحب ہی تحریر فرمائیں یہ میری عین خواہش تھی۔ مولانا کی جو شفقت اور محبت مجھ کو حاصل تھی، اس کی روشنی میں، میں نے ایک اور مرتبہ التماس کیا۔ مولانا رد نہ کر سکے اور اپنی کرم فرمائیوں میں ایک اور اضافہ انہوں نے ''مکاتیب رشید'' کے لئے اپنے مختصر سے ''پیش لفظ'' سے سرفراز فرمایا۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ مولانا ''مکاتیب رشید'' کی اشاعت سے قبل یوں داعیٔ اجل کو لبیک کہیں گے۔ میں تو کچھ یہی سمجھ رہا تھا کہ اپنی ہر کتاب کی طرح یہ کتاب بھی

مولانا کی خدمت میں ارسال کروں گا۔ وہ لطف وکرم سے پذیرائی کریں گے۔ ''صدق جدید'' میں تبصرہ شائع فرمائیں گے اور مجھے لکھنے لکھانے کا مزید حوصلہ ملے گا۔ میں ایک نئی امنگ سے اور آگے بڑھوں گا۔ مولانا کی یہ تحریر ''اس ''پیش لفظ'' کا مسودہ ان سطور کے لکھتے وقت میرے سامنے ہے، ایک سوالیہ نشان کی طرح! جیسے پوچھ رہا ہو، کہاں ہے میرا خالق؟ میرا خالق! میں گم صم ہوں، کیا کہوں کچھ بن نہیں پڑتا۔ ارادہ تھا، اب بھی شمالی ہند جانا ہوتو پھر دریاباد جاؤں گا۔ مولانا کی خدمت میں حاضری دینے — ان کی علالت کی خبریں بھی تو آ رہی ہیں لیکن قدرت کو جانے کیا منظور تھا۔ نئے سال کا سورج گہن آلود نکلا۔ جو نہ ہونا تھا، ہوا۔ مگر وہی ہوا جو ہونا تھا۔ موت برحق ہے اس سے کس کو رستگاری ہے۔ ماجد صاحب نے مسکراتے ہوئے، خوش دلی کے ساتھ فرشتۂ موت کا استقبال کیا ہوگا۔ جان، جاں آفریں کے سپرد کی ہوگی۔ اقبالؔ نے تو ایسے ہی کسی مردِ درویش کے لئے جس کو حق نے اندازِ خسروانہ سے نوازا تھا۔ کہا ہے:

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے

ماجد صاحب مفسرِ قرآن بھی تھے۔

ماجد صاحب پر فالج کے حملہ کی اطلاع آئی، ماتھا ٹھنکا، ''صدق جدید'' میں وہ اپنی علالت کے بارے میں خود ہی لکھتے۔ کسی اشاعت میں بہتری کی اطلاع پڑھ کر سکون ہوتا اور ابتری کی اطلاع پڑھ کر تشویش وتردد! ران کی ہڈی ٹوٹ جانے کی اطلاع ملی۔ ایک اور صدمہ ہوا۔ اس کے بعد تو کیفیت مایوس کن ہی ملتی رہی۔ اور پھر ——

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی صحافت میں طنز و مزاح کی نشتریت

ڈاکٹر سید عبدالباری☆

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی صحافتی زندگی کا آخری اور مہتم بالشان دور ۱۹۵۰ء میں صدق جدید کے اجرا سے شروع ہوتا ہے اور ان کی وفات سے کچھ قبل یعنی ۱۹۷۶ء تک محیط ہے۔ یہ ہمارے ملک کی تاریخ کا بڑا نازک دور تھا جب کہ آزادی کا سورج طلوع ہونے کے بعد جمہوریت و سیکولرزم کی اساس پر ایک نظام حکومت کے قیام کے بعد صدہا ایسے مسائل پیدا ہوئے جن کا جنگ آزادی کے دوران تصور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ لوگ آزادی و مساوات سے بہرہ مند تو ہوئے لیکن بدقسمتی سے دلوں کی دنیا تنگ و تاریک اور ذہن و دماغ کے دائرے محدود سے محدود تر ہوتے گئے۔ وہ لوگ جو غیر ملکی سامراج سے برسر جنگ تھے جب اقتدار ہاتھوں میں آیا تو عدل و انصاف کے تقاضوں کو پامال کرنے لگے۔ ملک کی تہذیبی و لسانی رنگارنگی بہت سے لوگوں کو ناگوار خاطر ہوگئی اور کچھ لوگ جمہوریت کی آڑ میں فاشزم کا خواب دیکھنے لگے اور لسانی و تہذیبی جارحیت کی راہ پر چل پڑے۔ انہیں اطمینان تھا کہ جمہوریت میں ہر فیصلہ اکثریت کے ذریعہ ہوتا ہے اور وہ آسانی سے اکثریت کے مذہبی جذبات کو بھڑکا کر اقلیت کا اسے حریف بنا سکتے ہیں۔ اس صورت حال میں ستم بالائے ستم یہ تھا کہ ملک میں ترسیل عامہ کے ذرائع نے بھی ایک جارح اکثریت کی حمایت کرنے اور کمزور و پس ماندہ و مظلوم طبقات کو ہر معاملہ میں ملزم و قصوروار ٹھہرانے کی روش اختیار کرلی۔ اس طرح کے عناصر کی حمایت اور اعانت کے لئے اقلیتوں اور مسلمانوں کے درمیان سے ایسے لوگ منظر عام پر آگئے جو برسرعام اقلیت کو اپنے مذہب و تہذیب کو پامال کرنے اور اکثریت کے اندر مکمل طور پر ضم ہوجانے کا مشورہ دینے لگے۔ مسلمانوں کے لئے اپنے بچوں کو

☆ مدیر ماہنامہ ملی اتحاد، ذاکر نگر نئی دہلی۔

اردو زبان کی تعلیم دلانا مشکل ہوگیا۔ ان کے تعلیمی اداروں پر یلغار شروع ہوگئی۔ فسادات کا ہولناک سلسلہ شروع ہوا۔ پرسنل لا پر تیر اندازی ہونے لگی۔ اور تمام سرکاری اداروں میں ان کی بھرتی تقریباً بند ہوگئی۔ ان حالات میں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اپنی زبان، اپنی ملت اور اپنے ملک کو فساد و اختلاف اور زوال و انتشار سے بچانے کے لئے سامنے آئے۔ خوش قسمتی سے وہ ایک قلندر صفت اور درویش منش انسان تھے۔ صدق جدید اپنے وجود و بقا کے لئے حکومت کی امداد و استعانت کا قطعاً محتاج نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ مولانا اس روایت کے امین اور اس تہذیب کے قطب مینار تھے جو حق و صداقت کے لئے زنجیر و سلاسل کا خیر مقدم کرنے کا سبق دیتی ہے۔ چنانچہ مکمل بے خوفی، مکمل لاتعلقی، مروت و مداہنت کی ہر طرح کی بندشوں سے آزاد اور ہر طرح کے اندیشوں سے بے نیاز ہوکر انہوں نے فرقہ واریت کے عفریتوں، عدل و انصاف کے دشمنوں اور تہذیب و اقدار کے قاتلوں پر اپنی فکر و تخلیق کی ترکش سے اپنے شذرات کے تیر برسانے شروع کردیئے اور اس دور کی صحافت کی تاریخ لکھنے والا یہ دیکھ کر محوِ حیرت ہوجاتا ہے کہ جو کام سیکڑوں و ہزاروں افراد کے اسٹاف پر مشتمل اخبارات اور ادارے ۲۵ رسال کے عرصے میں نہ کرسکے اسے اس نیک سرشت بوڑھے انسان اور اسباب و وسائل سے محروم قلمی مجاہد نے انجام دیا اور اس ولولے سے کہ ایک کمزور، شکستہ حال ملت نے اپنے اکھڑتے ہوئے قدم اس سرزمین پر جمانے شروع کئے، اپنی تہذیبی و اخلاقی حیثیت کو برقرار رکھنے اور اپنی اقدار کی بازیافت کا ولولہ اس کے اندر پیدا ہوا۔ نئی نئی تحریکیں اور ادارے وجود میں آئے۔ کشمکش باہم ختم ہوئی۔ ملک و قوم کے مسائل سے دلچسپی لینے اور اس کا مقدر تبدیل کرنے کے لئے جدوجہد کرنے والے جرأتمند رہنما پیدا ہوئے۔ اسلامی فکر و نظر کی بھرپور ترجمانی علم و ادب اور فکر و تحقیق کے جملہ شعبوں میں کرنے والے اہل نظر اور اہل قلم منظر عام پر آئے۔

مولانا نے آزادی کے بعد جب اپنی صحافتی زندگی کے آخری اور اہم ترین دور میں قلم ہاتھ میں لیا تو ان کے سامنے سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ ایک ملت کی تہذیبی شناخت کو برقرار رکھنے کی کیا تدابیر اختیار کی جائیں اور ان کے اندر ارتداد و انحراف کا خطرناک میلان پیدا کرنے والوں کا کس طرح مقابلہ کیا جائے اور خود اعتمادی اور یقین کی دولت سے ان کو کس طرح بہرہ مند بنایا جائے۔ اس وقت ایک بااثر طبقہ تجدد پسندوں کا ایسا موجود تھا جس کے پہلو میں مسلمانوں کی الگ مذہبی و تہذیبی شناخت کانٹے کی طرح چبھ رہی تھی۔ ان لوگوں نے اپنی تحریروں سے یہ تاثر پیدا

کرنے کی کوشش کی کہ نئی زندگی نئے حالات اور نئے انقلاب کے تقاضوں کو سمجھنے سے مسلمان قاصر ہیں۔اور خود اپنی اور ملک کی ترقی میں اپنی گہری مذہبیت کی وجہ سے روڑہ بن رہے ہیں۔ان حضرات نے اس کو سیکولرزم کے تقاضوں کی خلاف ورزی قرار دیا اور ہر موقع پر مسلمانوں کو عدم رواداری غیر سیکولر اور تنگ نظر گردانا شروع کیا۔عین اسی زمانہ میں حکومت وقت نے سیکولر اور جمہوریت کے نام پر کچھ ایسے گل کھلانے شروع کر دیئے کہ اس سے مسلمانوں کے اندران دونوں الفاظ سے برہمی پیدا ہونے لگی۔اکثریت کی تہذیب وعقائد کو قومی دھارا قرار دیا جانے لگا اوران کی ثقافت اور مذہبی رسوم کو قومی ثقافت اور تہذیب کے ہم معنی سمجھا جانے لگا۔ان حالات میں سیکولرزم سے کچھ زیادہ حسن ظن مسلمانوں کو نہیں رہا۔ڈاکٹر عابد حسین نے اپنی تصنیف ''ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں'' میں بجا طور پر اس صورت حال کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔سیکولر انداز نظر یہ سیکولرزم کے بارے میں عام طور پر ہمارے ملک کے لوگوں کو اور خصوصاً مسلمانوں کو بڑی غلط فہمی ہے۔وہ اس سے ایسا انداز فکر مراد لیتے ہیں جو سرے سے مذہب کا اور اس کی اعلیٰ قدر وقیمت کا منکر ہو۔یہ سچ ہے کہ ہندوستان کے طریق حکمرانی میں سیکولرزم ایک رہنما اصول بن کر اپنے مغربی پس منظر سے بالکل مختلف روپ میں سامنے آیا۔لیکن بدقسمتی سے ہندوستان میں یہ تہذیبی جارحیت کا ترجمان بن گیا۔چنانچہ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے اس سیاسی اصطلاح اور اس کے عملی مظاہر اور اس کے تجدد پسند وانحراف دوست حامیوں کی خوب خبر لی اور اسے اپنی قلمی کاوشوں کا ایک مرکزی عنوان قرار دیا ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کے موقف کی بڑی متوازن اور مؤثر ترجمانی بھی کرتے رہے۔ذیل میں ہم ان کے شذرات کے چند اقتباسات کی مدد سے ان کے موقف کو نمایاں کریں گے۔

سیکولرزم اہنسا اور رواداری کا ذکر کرتے ہوئے ۷ر جنوری ۱۹۶۶ء کے شذرے میں مولانا رقم طراز ہیں:

''تحریک خلافت وترک موالات میں ملت نے اسے ایک بڑی حد تک برت کر بھی دکھایا۔مسلمانوں نے اہنسا کو بطور دین (Creed) ایک دن کے لئے بھی نہیں تسلیم کیا تھا جیسے آج بھی وہ سیکولر اسٹیٹ کو بطور آئیڈیل یا مثالی حکومت کے تسلیم نہیں کرتے لیکن حالات وماحول کے اقتضا سے جس طرح انہوں نے اہنسا کو بطور آئین (Policy) کے اس وقت تسلیم کر لیا تھا قول سے بھی

اور عمل سے بھی ٹھیک اسی طرح ملک کے موجودہ حالات میں وہ سیکولرزم ہی کو بہتر اور قابل قبول حل سمجھتے تھے۔"

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ سیکولرزم کو ہندوستان کے لئے جو مختلف مذاہب اور تہذیبوں کا گہوارہ ہے ایک نعمت تصور کرتے ہیں لیکن انہیں چھاگلا جیسے افراد کے سیکولرزم سے سخت نفرت ہے ۱۰ردسمبر ۶۵ء کے صدق جدید کے شذرے میں رقم طراز ہیں "علی گڑھ، بنارس دونوں یونیورسٹیوں کے نام سے لفظ مسلم اور لفظ ہندو فوراً اڑ جانے چاہئیں اس لئے کہ ان سے فرقہ واریت کی بو آتی ہے جو سیکولرزم کی فضا میں ناقابل برداشت ہے۔ یہ فرمایا سیکولرزم کے ایک شارح اور انوکھے علمبردار وزیر تعلیم شری چھاگلا نے"۔ اس کے بعد مولانا رائے دیتے ہیں کہ ان ناموں کی مذہبیت اگر کوئی جرم ہے تو پھر تمام کالجوں، اداروں ہوٹلوں سرایوں مسافر خانوں دکانوں کے نام جو کسی فرقہ یا مذہب کی جانب منسوب ہوں سب کے نام توپ سے اڑا دینے کے قابل ہیں۔ اسی طرح سیاسی وغیر سیاسی پارٹیوں واخباروں کے نام بھی بدلیں حتیٰ کہ افراد واشخاص کے ناموں کو بھی سیکولر بنایا جانا چاہئے اس سے نوبت کروڑہا کروڑ ناموں کے بدلنے کی کیوں نہ ہو اس طرح لفظ ہندو مسلم کو اپنی چڑھ بنالینا چاہئے۔ اور سیکولرزم کو سیکولرزم کے خبط کے مرتبہ تک پہنچادیا جائے اس کے بعد مولانا کلمہ آخر تحریر کرتے ہیں۔ "یہ معروضے چاہے جتنا مضحکہ خیز نظر آئیں بہرحال لازمی اور منطقی نتیجے سیکولرزم کی چھاگلائی تعبیر وتفسیر کے ہیں ورنہ اگر سیکولرزم کے سیدھے سادے اور بے تکلف معنی بے تعصبی رواداری غیر جانب داری کے لئے جائیں تو سیکولرزم مختلف مذہبوں کی مخلوط آبادی میں لعنت نہیں نعمت ہے۔

اس سے قبل ۱۲رجولائی ۵۷ء کے ایک شذرے میں مولانا نے یک طرفہ سیکولرزم کے عنوان سے اس افسوسناک طرز عمل کا ذکر کیا تھا جو ملک کی فرقہ پرست جماعتوں اور خود کانگریس کے نام نہاد سیکولر رہنماؤں نے مسلمانوں کے سلسلہ میں اختیار کر رکھا تھا۔ مسلمانوں کے بہت سے تعلیمی اداروں کا نام بدلنے اور اسلام اور مسلم کی شناخت مٹانے اور اس کے بالمقابل ہندو یونیورسٹی اور سناتن دھرم کالجوں وغیرہ کے ناموں میں کسی طرح کی ترمیم وتنسیخ کی کوئی ضرورت نہ محسوس کرنے پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے مولانا رقمطراز ہیں خوب ہے یہ فرقہ واریت جس کی زد میں آکر ہمیشہ ایک ہی فرقہ پر پڑی اور وہی بدبخت اقلیت اس داغ کو اپنی پیشانی سے مسل مسل کر اور رگڑ رگڑ کر

دھوتی چھتر اتی اور منافی ہے۔''

یکم مارچ ۵۷ء کے شذرے میں ''سیکولرزم کی راجدھانی میں'' کے عنوان سے اہل سیاست اور سیکولرزم کے ساتھ سنگین مذاق کو نمایاں کرنے والے ایک واقعہ پر روشنی ڈالتے ہیں۔ واقعہ یوم جمہوریہ کے موقع پر راشٹرپتی بھون کی تقریبات اور رسوم کا ہے جہاں بجلی کے ایک قمقے میں سے پھوٹتی کرن میں لکشمی کی مورت نظر آتی تھی۔ اس کے علاوہ دیگر واقعات بھی خالص ہندوانہ عقائد سے متعلق پیش آئے۔ مولانا ان کے تذکرہ کے بعد تبصرہ کرتے ہیں۔ ''یہ کہنا شاید مبالغہ سے خالی ہو کہ جس زور شور کے ساتھ اس دیس میں سیکولرزم کا طبل پیٹا جا رہا ہے۔ عملی ظہور اس کا جس صورت میں ہو رہا ہے اس کے لحاظ سے بھی بس یہ اپنی نظیر آپ ہے۔'' اسی شمارہ میں 'سیکولر دیس میں، کے عنوان سے مرحوم اسلامیہ کالج کلکتہ (جواب سنٹرل کالج ہے) میں سرسوتی پوجا کی تقریب دھوم دھام سے منائے جانے کی تفصیلات درج ہیں۔ اس طرح مولانا آزادی کے بعد نئے حکمرانوں کے کھوکھلے اعلانات اور دعاوی کا پول کھولتے ہیں اور قول وعمل میں تضاد کو واشگاف کرتے ہیں اس سلسلہ میں سیکولرزم ان کے لئے موضوع خاص ہے جو کہ فریب کا پردہ بار بار چاک کرنے میں معاون ہوتا ہے۔

سیکولرزم کا ڈھنڈورا پیٹنے اور مسلمانوں کی مذہبیت پر طنز کرنے اور ان کی مذہبی جماعتوں کو نشانہ بنانے والوں کا بھی مولانا ڈٹ کر تعاقب کرتے ہیں۔ اس طرح کی تحریروں میں مولانا کی غیرت ایمانی اپنے شباب پر نظر آتی ہے اور ان کے لب ولہجہ میں ابوالکلام کا خروش نظر آتا ہے۔ ۱۴ر جنوری ۶۶ء کے ایک شذرے میں ''صحرا کی زبان اور ہے گلشن کی زبان اور'' کے عنوان سے ایک معاصر کے مسلمانوں پر طنز وتنقید اور اس کے اس مشورہ کا ذکر کرتے ہیں کہ اکثریت کی رضا جوئی اور موجودہ فضا سے ہم آہنگی کو مسلمان اپنا مقصد زندگی بنالیں گے پھر یہ تبصرہ ملاحظہ ہو:۔

''بے شک موقعہ شناسوں اور آخرت سے منہ موڑ کر دنیا ہی کو سب کچھ سمجھ لینے والے مصلحت شناسوں کی صدائیں ہر دور میں ایسی ہی ہوتی ہیں اور انہیں میں وقت کے بڑے بڑے فیضی اور ابوالفضل بھی پیدا ہوتے رہے ہیں۔ لیکن ان فرزانوں کی صفوں سے الگ دیوانوں کی بھی جماعت ہمیشہ موجود رہی ہے اور ہمیشہ کی طرح اب بھی ہے۔ اس کی دعوت یہی رہی ہے کہ۔ ''اسلام جس طرح کسی بھی دور میں اور کسی بھی ماحول کے درمیان رہنمائی سے قاصر نہیں رہا ہے

آج بھی قاصر نہیں ہے۔ ہماری ایک آئیڈیالوجی ہے جسے ہم نہ کسی کی مروت میں چھوڑ سکتے ہیں کسی کے دباؤ میں آ کر جب آئیڈیالوجی زد پر آجائے گی تو جہاد وقتال کی آیتیں پڑھتے ہوئے ہم بے تحاشا اپنی جانیں قربان کر دیں گے۔ جمہوریت ہو یا آمریت ہم کسی بھی گڑھی ہوئی اصطلاح کے گرویدہ نہیں اور سیکولرزم ہو یا دنیا کا کوئی بھی نظام حکومت ہم مثالی حکومت صرف خلافت یا حکومت الٰہی کو سمجھتے ہیں۔ باقی وقتی حالات کے ماتحت ہم سیکولرزم کو بھی دل و جان سے ماننے کو تیار ہیں بشرطیکہ اس کے معنی صرف بے تعصبی یا غیر جانب داری کے لئے جائیں نہ یہ کہ یہ مذہب بیزاری یا لفظ مسلم سے چڑھنے کے مترادف ہو۔''

اس صدی کی چھٹی وساتویں دہائی میں جس شدت کے ساتھ سیکولرزم کے نام پر مسلمانوں کو اپنی مذہبی شدت پسندی کو ترک کرنے لبرل بننے اور مذہب کو اجتماعی زندگی کے معاملات میں دخیل بنانے کا رجحان خیر باد کہنے کا کچھ لوگ مشورہ دیتے تھے، حکمراں جماعت بھی ہندو فرقہ واریت اور ردعمل کا ہوا کھڑا کر کے مسلمانوں کو خوفزدہ کرنے اور زیادہ سے زیادہ سیکولر بننے کا مشورہ دیتی تھی اور یہ مشورہ کبھی کبھی دھمکی کا لہجہ اختیار کر لیتا تھا۔ مولانا عبدالماجد نے اس صورت حال کا بڑی عالی ہمتی اور حوصلہ مندی سے مقابلہ کیا اور اپنے شذرات میں بار بار اس ذہنیت کو نشانہ تنقید بنایا۔ ۲۸؍جنوری ۱۹۶۶ء کے صدق جدید میں بعنوان ''ہندو راج کا ہوا'' یہ خبر نقل کرتے ہیں۔ ''کہا گیا ہے کہ مسلمانوں کے لئے سیکولرزم بہت ضروری ہے کیوں کہ ہندوستان کی ساخت کو دیکھتے ہوئے یہاں سیکولرزم کو ہٹا کر جو چیز آسکتی ہے وہ گول والکر کا ہندو راج ہے۔'' مولانا کا تبصرہ ملاحظہ ہو: ''ہندو راج اگر حقیقتاً ہے گرو گولوالکر کے ٹائپ کے راج کے ساتھ جب تو بے شک یہ برائے نام سیکولرزم بھی اس سے بہتر ہی ہوگی لیکن سوال اگر مطلق صورت میں ہے تو معاصر موصوف سن لے کہ یہ کاغذ پر لکھی ہوئی سیکولرزم ہر حال میں ہندو حکومت سے بہتر نہیں ہوسکتی۔ مسلمان سو فیصدی تو قائل اسی حکومت کے ہیں جسے خلافت کہا جائے گا لیکن جب یہ معیاری مثال حکومت نایاب ہے تو معیار انتخاب مسلمان کے پاس اس حکومت کا صرف عادلانہ ہونا ہوگا نہ کہ اس کا کسی چلتے ہوئے نام کی طرف منسوب ہونا۔ سوشلسٹ ڈیماکریٹ، ری پبلک، شاہی، نیم شاہی ساری ہی اصطلاحیں اس کے لئے کھلونوں سے زیادہ نہیں۔ وہ تسلیم صرف اسی حکومت کو کرے گا جو عملاً عادل ہوا اور عادل جس طرح کوئی بھی غیر مسلم ہوسکتا ہے ایک ہندو راج بھی ہوسکتا ہے۔ عادل ہندو راجہ ہرگز عادل مجوسی حکمراں سے کم تر نہ ہوگا اور مسلمانوں نے ایک

عادل مجوسی تاجدار نوشیرواں کو اپنے ادب میں ضرب المثل بنالیا ہے۔"

مولانا اپنی اس تحریر میں برصغیر کے ایک اور عظیم مفکر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے ہم زبان نظر آتے ہیں جنہوں نے آزادی کے وقت ہندوستان کی اکثریت سے درخواست کی تھی کہ "خدارا دنیا کی بگڑی ہوئی قوموں سے وہ نہ لیجئے جن کی وجہ سے وہ خود بھی خراب ہو رہی ہیں اور دنیا کو خراب کر رہی ہیں۔ ویدوں پرانوں اور شاستروں اور گرنتھوں کو دیکھئے۔ قرآن میں آئی ہدایت آپ کو ملے تو ہم کہیں گے کہ آپ ہندوستان کی ریاست کا نظام اس پر قائم کیجئے اور ہم سے وہی برتاؤ کیجئے جو آپ کا دین ہمارے لئے تجویز کرتا ہے۔ ہم اس نظام کی مزاحمت نہ کریں گے اسے ہم کام کرنے کا موقع دیں گے لیکن اگر آپ اپنے یہاں کوئی ایسا مفصل ہدایت نامہ نہ پائیں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ خدا نے آپ کے یہاں بھیجا نہیں تھا بلکہ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ اپنی طویل تاریخ کے انقلابات میں اسے یا اس کے ایک بڑے حصے کو آپ کھو بیٹھے ہیں۔"

مولانا نے آزادی کے بعد ملک میں جمہوریت اور سیکولرزم کی تصویر بگاڑنے والے اصل مجرموں کی خوب خوب خبر اپنے شذرات میں لی ہے۔ جن چند اشخاص کا خاص طور پر انہوں نے پیچھا کیا ان میں لکھنؤ کے ایک مشہور و معروف روزنامہ کے مدیر شہیر، مسٹر ایم سی چھاگلا گول والکر اور علی یاور جنگ وغیرہ ہیں۔ مسٹر ایم سی چھاگلا اس صدی کی ساتویں دہائی میں مسلمانوں کے لئے بے حد دل آزار اور جانکاہ شخصیت بن کر ابھرے اور طرح طرح کے مصائب میں مسلمانوں کو مبتلا کر کے اور حکومت وقت و اکثریت سے داد و تحسین کا پشتارہ لے کر اس دنیا میں آگ کے شعلوں سے ہم آغوش ہو گئے اور آج بھول کر ان حضرات کا کوئی نام لینے والا نہیں۔ ان کی سرپرستی میں جب کہ علی یاور جنگ مسلم یونیورسٹی سے اسلام کا ہر نقش مٹانے پر کمربستہ تھے ۲۷ نومبر ۱۹۶۵ء کو اکزیکیوٹیو کونسل نے یہ فیصلہ کیا کہ اب یونیورسٹی میں اسلامی دینیات کے بجائے ہندوستان کے مختلف مذہبوں کلچروں اور تہذیبوں کے تقابلی مطالعہ کے ذریعہ مشرقی اور اسلامی تعلیمات طلبہ کو دی جائیں۔ اس خبر پر مولانا کا تیکھا چست اور بے لاگ تبصرہ ملاحظہ کیجئے اور ان کے بے لاگ واضح اور بے کم و کاست تصور اسلام سے روشناس ہوئیے اور جس وادی میں بڑوں بڑوں کے قدم لڑکھڑا گئے ہیں وہاں مولانا کی ثابت قدمی ملاحظہ کیجئے۔

"چلئے دینیات اسلامی کا شعبہ علی گڑھ سے رخصت ہوا اور سلب اسلامیات کی توپ کا پہلا

گویا مولانا اکبرالہ آبادی کے شعبہ پر پڑا۔ سفارش یہ ہوئی کہ اسلامیات کے ساتھ ہی نہیں بلکہ اس کے بجائے یعنی اسے ہٹا کر شعبہ تقابل ادیان قائم کیا جائے اور مسلم زادوں کے دماغ میں یہ عقیدہ ٹھونسا جائے کہ اسلام نام دین برحق کا نہیں تاریخ ادیان کا نہیں بلکہ اسلام نام ایک مذہب کا ہے جو دنیا کے بہت سے چلے ہوئے مذہبوں میں سے ایک مذہب ہے اور اسلامی تہذیب بھی ایسی ہے جیسے دنیا میں بہت سی تہذیبیں ہر ہر ملک کی الگ الگ رائج ہیں یا رہ چکی ہیں شری چھاگلا کے دین دھرم سے غرض نہیں یہ حساب تو یوم الحساب کے لئے اٹھار کھئے سوال صرف نواب علی یاور جنگ اور ان کے مسلمان رفیقوں سے ہے کہ کیا انہوں نے اب یہی عقیدہ جینے کے لئے اور اسی پر حشر میں اٹھنے کے لئے طے کرلیا ہے۔ تاؤ کس نے ڈبوئی خضر نے۔"

اس خبر کے دوسرے جز پر مولانا لکھتے ہیں۔" یہ محسوس کیا گیا کہ اس ترمیم سے یونیورسٹی کا سیکولر کردار واضح ہو جائے گا، اور اس کے خلاف فرقہ واریت کے پروپیگنڈے کو شکست ہو جائے گی۔ گویا یونیورسٹی نے تسلیم کرلیا کہ چھاگلا کی تعزیرات ہند کے بہ موجب اسلامیات اور ایمانیات کی تعلیم بجائے خود ایک جرم ہے جب تک کہ اس کی تلافی اس میں غیر اسلامی عنصروں کو شامل کر کے نہ کی جائے۔"

مولانا نے مسٹر ایم سی چھاگلا کے ساتھ ہی ساتھ ان کے ہم خیال صحافیوں کو بھی نہیں بخشا۔ جیسا کہ ذکر آچکا ہے لکھنؤ کے ایک مشہور سیکولر روزنامہ کے مدیر شہیر کی قوم پرست لن ترانیوں اور ملت کی دل آزاریوں پر ان کی بھی اچھی خبر لی۔ ۷رجنوری ۶۹ء کے صدق جدید میں "مسلمان پھر مجرموں کے کٹہرے میں" کے عنوان سے ایک معلوم ومعروف روزنامہ کے ایک زناٹے دار مقالے کا یہ اقتباس نقل کرتے ہیں۔" سب طرح کی بحثیں ملیں گی اور سوال نہیں اٹھایا جائے گا تو یہ کہ ہندوستان کے اندر اس کے حالات چاہے اچھے ہوں یا برے باعزت زندگی بسر کرنے کے لئے مسلمانوں کو کیا راستہ اختیار کرنا چاہئے حالانکہ یہی سوال اصل سوال ہے اور سارا زور اس سوال پر دینا چاہئے۔" مولانا کا تبصرہ ملاحظہ ہو:" حالانکہ مسلم صحافت ۱۸ رسال سے اس کے سوا اور کر کیا رہی ہے بجز اس اصل اور بنیادی سوال کے اور کس سوال کو مرکز توجہ بنائے ہوئے ہے۔ اس ایک سوال کے سوا اور موضوع گفتگو اس بدنصیب اقلیت کے پاس اور ہے ہی کیا۔ گھروں کے اندر بھی اور گھروں کے باہر بھی اور سب جتنے سوال ہیں سب اسی ایک بنیادی سوال کی شاخیں ہیں۔

مسلمان اونچی ملازمتیں کیسے حاصل کریں۔ اپنی ملی درسگاہوں کے تحفظ کی کیا تدبیر اختیار کریں، اپنی تہذیب وثقافت کا بچاؤ کیسے کریں، اپنا ملی وجود دوسروں میں ضم وتحلیل ہوجانے سے کیوں کر روکیں۔ اس طرح کے بیسوں سوال اگر اسی بنیادی سوال کی شاخیں نہیں ہیں تو اور کیا ہے۔ کیا پھر بھاکڑا ننگل ڈیم کی منقبت سرائی میں صفحے کے صفحے رنگ دیئے جاتے۔ کیا پنج سالہ منصوبہ بندیوں کے لئے قصیدہ خوانی کا حق ادا کر دیا جاتا۔"

اس طرح کی گرفت اور تعاقب میں مولانا کبھی کبھی اپنی ملت کے زخموں کے احساس کی وجہ سے اور زمانہ پرستوں کی سنگ دلی کے سبب تلخ وترش لہجہ اختیار کر لیتے ہیں لیکن کبھی کبھی اکبرالہ آبادی والی لطیف معنی خیز ظرافت کی چاندنی ان کی تحریروں میں چھٹکی نظر آتی ہے اور ایسے ہی مواقع پر مولانا کا مخصوص اسلوب اپنے پورے شباب پر نظر آتا ہے اور ان کا ردعمل قطعاً غیر متوقع اور حیرت انگیز طور پر غیر جذباتی ہوتا ہے۔ ۲۸ رجنوری ۶۶ء کے صدق میں گول والکر کی خبر اچھی طرح لیتے ہیں اور ان کی پٹنہ کی ایک تقریر کو الجمعیۃ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ "مسلمان عرب سے بھارت آئے اور ہماری عورتوں سے بدکاری کی اور اس سے جو اولاد پیدا ہوئی وہی مسلمان کہلائے۔ یہ مسلمان کہیں باہر کے نہیں بلکہ یہیں کی استریوں کی کوکھ سے پیدا ہوئے ہیں" مولانا کا ردعمل ملاحظہ ہو۔ "العظمۃ للہ! غصہ اور جوش تعصب اتنے چڑھے ہوئے پارے کا درجہ کون ساتھرمامیٹر بتا سکتا ہے جن پرانی شریف ہندو خاتونوں کو یوں بے دھڑک اور بے جھجک بدکاری کا مرتکب بنادیا ہے وہ آخر رشتے میں آج کل کے لوگوں کی کیا تھیں یہی نانیاں دادیاں یا کچھ اور ان کو یوں گروجی نے کیا کہہ ڈالا؟

غصہ میں کچھ رہا نہ انہیں تن بدن کا ہوش

کروڑوں مسلمانوں کو بدذات ٹھہرانے کی دھن میں گروجی کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ شدید غصہ کے طوفان وہیجان میں انسان اپنے کو کوس تو لیتا ہے لیکن اپنے کو ماں کی گالی نہیں دے بیٹھتا اس عالم میں بھی آپ نے کسی کو سنا ہے؟ کسی مسلمان کی زبان سے شریف ہندو خاتونوں سے متعلق کوئی آدھا لفظ بھی نکل گیا ہوتا تو اس پر سب سے اول سرزنش کرنے والا خود صدق ہی ہوتا لیکن یہ منہ بھر کر گالی گروجی کی زبان سے نکلی ہے۔ کس کی مجال ہے جو ان کی زبان پکڑ سکے؟"

اس طرح دہلی کے ایک سیکولر مسلم اخبار نویس کا ایک شذرہ نقل کرتے ہیں جس نے دھمکی

دی تھی۔''جس نے اب تک نہ سمجھا ہے سمجھ لے کہ ہندوستان کا بیڑا صرف کانگریس ہی پار لگا سکتی ہے۔ ورنہ وہ لوگ جو ہندوستان کے در پردہ دشمن ہیں اور پاکستان کے ایجنٹ ہیں وہ بیڑا کیا پار لگائیں گے۔ پہلے اپنی خیر تو منائیں ان سبھوں کی الگ الگ ناپ کی قبریں تیار ہیں وہ دن بڑا بھیانک ہوگا ڈرو اس دن سے جب ہندوستان کو جلال آجائے گا اور وہ اپنے غداروں کو نیست ونابود کرنے پر تل جائے گا۔''مولانا کا اس چنگیزی دھمکی پر یہ ردعمل ملاحظہ ہو۔''مذہبی موقع کے لئے جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو۔ ہندوستان کو تو جلال جب آئے گا آئے گا۔ ہندوستان کے در پردہ دشمن مسلمان تو آپ ہی کے قہر وجلال کو دیکھ کر کانپ گئے اور اپنا وقت آخر سمجھ کر توبہ واستغفار میں لگ گئے کہ دیکھئے قبریں تو الگ الگ ناپ کی تیار ہیں اب جان نکلنے اور دفن ہونے کی گھڑی کس وقت آجائے۔ اللہ اکبر اس بھیانک دن کی وحشت ودہشت، ایسے جلالت مآب جو قلم سے کام پورے ایٹم بم کا لے سکیں یقیناً اس کے مستحق ہیں کہ سرکار اپنے کسی خصوصی تمغے سے نوازے یا کسی مخصوص خطاب سے سرفراز فرمائے۔ سیکولرزم نے اور کچھ نہ سہی ایک نئی سج دھج کا اور سفاک طبع گورکن تو ملک میں پیدا کر ہی دیا ہے جو صدا لگا رہا ہے کہ اتنی قبریں تیار ہیں۔''مولانا نے ملک کی اعلیٰ ترین شخصیتوں کو بھی ان کی لغزشوں اور ان کے قول وعمل کے تضاد پر معاف نہیں کیا ڈاکٹر راجندر پرشاد کی غیر سیکولر اور خالص ہندوانہ تقریبات میں شرکت پر وہ بار بار گرفت کرتے ہیں۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد کی اس تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے جو انہوں نے کروکشیتر سنسکرت یونیورسٹی کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے کی تھی اور سنسکرت زبان کی تعریف وتوصیف میں بڑی طویل تقریر کی تھی اور اس کے گن گائے تھے مولانا رقمطراز ہیں''بیشک حیرت کی کوئی بات بھی نہیں۔ یہ صدر محترم وہی بزرگ تو ہیں جن کی بارگاہ عالی میں اردو کی درخواست ۲۲ لاکھ دستخطوں کے ساتھ ساڑھے تین سال سے پڑی ہوئی ہے کہ خدا کے لئے مجھے لکھنؤ وآگرہ کی سرزمین پر بطور ایک ضمنی وثانوی زبان کے زندہ رہنے کی اجازت مرحمت ہو جائے اور وہ اجازت آج تک مرحمت نہ ہونا تھی نہ ہوئی۔ اس کم سخنی کی تلافی کیا اب اتنی درازنفسی سے بھی نہ فرمائی جائے۔''

اس طرح پنڈت نہرو کی مزاج پرسی ۲۲ رفروری ۵۷ء کے اخبار کے شذرے میں ان کی اس تقریر کے سلسلہ میں کرتے ہیں جو موصوف نے اردو کی حمایت اور اس کی حفاظت وترقی کے لئے پرزور اپیل کی خاطر کی تھی۔ لکھتے ہیں''پنڈت جی اردو کی حمایت سے ایسی دل خوش کن لیکن بے نتیجہ تقریریں اتنی بار کر چکے ہیں کہ اس تازہ تقریر سے دل میں قطعاً کوئی امنگ نہیں پیدا ہوتی۔''

اس طرح اسی عہد میں یوپی کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر سمپورنا نند جی کی اردو دشمنی کی پالیسی پر سخت تنقید کرتے ہیں۔ مولانا کے تیرونشتر کا ہدف ممتاز اشخاص اور وہ بھی ذمہ دار عہدوں پر فائز اشخاص جو اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برا نہیں ہو رہے ہیں، ہوتے ہیں۔ اس معاملہ میں ان کی جرأت اظہار قابل داد ہے۔ ظالم حکمراں کے روبرو کلمۂ حق کہنے کا یارا انہیں کو ہے حتیٰ کہ اس وقت بھی ان کی زبان بند نہیں ہوتی جب ان کے عربی زبان پر عبور کی وجہ سے ایک خاص سند فضیلت اور وظیفے کا ان کو مستحق قرار دیا جاتا ہے۔ حکومت ہند کی جانب سے یہ سند اعزاز ملنے پر ان کا انکسار ملاحظہ ہو۔ ایسے ہی مواقع پر ہمیں ان کی دلربا شخصیت کے کچھ انوکھے پہلو دیکھنے کو ملتے ہیں خود اپنے او پر ہنس لینا اور کبر وانانیت کے ساغر کو چور چور کر دینا کوئی آسان کام نہیں غالب کی طرح مولانا بھی یہ وسعت ظرف رکھتے ہیں کہ خود اپنا محاسبہ کر سکیں اور اپنے او پر قہقہے لگا سکیں۔ ۲ ر ستمبر ۶۶ ء کا شذرہ ملاحظہ ہو۔ ''اب کی سال قرعہ انتخاب ایک ایسے نااہل کے نام پر پڑا ہے جسے فضیلت کا درجۂ اعلیٰ تو کیا درجہ ادنیٰ بھی نصیب نہیں۔ لیکن دنیا میں اپنی اور ساری راحتیں آسائشیں نعمتیں اور عزتیں کب استحقاق کی بنا پر ملی ہیں جو ایک اس اعزاز کے لئے نااہلی کا سوال چھیڑا جائے۔ جہل وکم علمی کی ستاری و پردہ پوشی کی جہاں بے شمار مثالیں زندگی میں مل چکی ہیں وہاں ایک کا اضافہ اور سہی...... تہنیت ناموں کا انبار دیکھ معاً خیال تعزیت ناموں کے انبار کی طرف گیا۔ آج کا دن غفلتوں کا ہے وہ دن حساب کا ہوگا۔ یہ پھلجھڑی ہے خواب ہے، وہ حقیقت ہوگا۔ عبرت زدگان کار بہ آمرزدگان نیست۔''

غرض مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے شوخ بے باک تیز وطرار مگر ہوش مند و حکیمانہ قلم سے ان کے اخبار میں مسلسل شذرات کا ترشح ہوتا رہا اور اپنے عہد کے اہم مسائل پر اور اہم شخصیات پر وہ نہایت ظریفانہ اور طنزیہ لب ولہجہ میں اظہار خیال کرتے رہے۔ ان کی یہ تحریریں انہیں اردو کے ایک ممتاز صحافی اور طنز نگار کا رتبہ عطا کرتی ہیں جنہیں کبھی فراموش نہ کیا جا سکے گا۔

''بحر المحبت ''اور''فیہ مافیہ'' کی تہذیب وترتیب

ڈاکٹر ضیاءالحق چودھری ☆

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ (۱۸۹۲-۱۹۷۷ء) قدرت کی طرف سے ایک غیر معمولی ذہن لے کر اس دنیا میں آئے۔ اُن کی ذہانت اور طباعی کا اظہار کم عمری میں ہی ہونے لگا تھا۔ ابتدائی تعلیم عربی کی ناظرۂ قرآن سے، فارسی کی گلستاں بوستاں وسکندر نامہ سے اور اردو کی کتب مولوی اسماعیل میرٹھی سے ہوئی۔ اُسی دوران امام غزالی کی ''کیمیائے سعادت'' بھی پڑھی اور اُس کے پہلو بہ پہلو ''یوسف وزلیخا'' بھی پڑھنا پڑھی جو ملا جامی کی طرف منسوب ہے۔ اُس کے بعد سیتاپور سے ۱۹۰۸ء میں ہائی اسکول پاس کیا جہاں عربی کو بہ حیثیت مضمون چنا اور ایف۔ اے۔ و۔ بی۔ اے کینگ کالج لکھنؤ سے ۱۹۱۰ء و ۱۹۱۲ء میں پاس کئے اور ان میں بھی عربی کا ساتھ رہا۔ انگریزی، منطق، فلسفہ اور نفسیات کے مضامین سے بھی خاص شغف پیدا ہو گیا اور جلد ان میں کمال حاصل ہو گیا۔ ۹-۱۹۰۸ء میں ان کے دو اوّلین مضامین ''محمود غزنوی'' اور ''غذائے انسانی'' سہ روزہ ''وکیل'' (امرتسر) میں شائع ہوئے جن کو بعد میں وکیل بک ایجنسی نے رسالوں کی شکل میں بھی شائع کر دیا۔ یہ مضامین بڑے مدلل تھے اور کسی پختہ کار ادیب کے معلوم ہوتے تھے۔ ایسا سمجھ کر بک ایجنسی نے ان کے نام کے ساتھ ''مولانا'' بھی جوڑ دیا جو شائد عطیۂ الٰہی تھا طالب علم عبدالماجد کو اس کا پتہ اس وقت چلا جب ایجنسی نے رسالے ان کو بھیجے۔ ان کے ایمان وایقان کی دنیا میں کئی بار تبدیلیاں ہوئیں۔ بچپن اور شروع جوانی میں وہ خالص مذہبی رہے۔ ۱۹۱۰ء کے بعد ان کے عقائد اس وقت تشکیک والحاد کا شکار ہو گئے جب وہ عقلیت (ریشنلزم) اور لاادریت (ایگناسٹزم) کی گردش میں پھنس گئے۔ اور مسٹر عبدالماجد کہے جانے لگے۔ اس بھنور سے باہر نکالنے میں تصوف، ویدانت اور تھیوسوفی نے معاونت کی۔ جن شخصیات کے وہ مرہونِ منت رہے ان میں حاجی وارث علی شاہؒ، اکبرالہ آبادی، مولانا محمد علی جوہر، رشی بھگوان داس اور مسز اینی

☆ استاد کرسچن کالج لکھنؤ۔

بیسنٹ شامل ہیں۔ ۱۹۲۰ء کے آتے آتے وہ ازسرنو مسلمان ہو چکے تھے۔ مسٹر سے مولانا تک واپسی کا سفر پورا ہو چکا تھا۔ مذہب اور ادب دونوں ان کی زندگی میں شانہ بہ شانہ چل رہے تھے اور ان سے متعلق شہ پارے ان کے قلم سے برابر نکل رہے تھے۔

مولانا دریابادیؒ کی ذات بابرکات سے راقم کو ایک عرصہ سے عقیدت رہی ہے اور ان کے خاندان سے گہرے روابط بھی رہے ہیں جس نے ان کی متعدد تحریروں کو پڑھنے کے مواقع بھی فراہم کئے ہیں۔ میرا ایک مختصر سوانحی مضمون بعنوان ''مولانا عبدالماجد دریابادیؒ: ایک نامور نیم علیگ'' رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' (علی گڑھ، فروری ۲۰۰۱ء) میں شائع ہو چکا ہے۔ شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ (نئی دہلی) کے زیر اہتمام اس سیمینار کے کنوینر جناب عطاء الرحمٰن قاسمی صاحب نے جب مولانا دریابادیؒ جیسی ہمہ جہت شخصیت پر مجھ جیسے کم مایہ شخص کو مقالہ تحریر کرنے کی دعوت دی تو میں شش و پنج میں پڑ گیا کہ اس بارگراں کو اُٹھانے کا متحمل میں کیسے ہو سکوں گا۔ جس عبقری کی شخصیت میں علامہ شبلی نعمانی، مولانا محمد علی جوہر، اکبرالہ آبادی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا حسین احمد مدنی دیوبندی اور علامہ سید سلیمان ندوی جیسے بلند پایہ علمی وادبی شخصیتوں کا نچوڑ آ گیا ہو اس پر کچھ خاص تحریر کرنا تو بڑی استعداد کا متقاضی ہے جو راقم میں نہیں۔ قاسمی صاحب کے الفاظ میں: ''علم و فضل کے اعتبار سے وہ بڑی امتیازی پوزیشن کے مالک تھے۔ اس کا اندازہ ان کی تصانیف سے کیا جا سکتا ہے۔ جو متعدد فنون و علوم پر مشتمل ہیں، مثلاً سیرت، قرآنیات، سوانح نگاری، سفرنامے، فلسفہ، نفسیات، تصوف، اخلاق اور اردو ادب اور شاعری۔'' ان تمام اصناف نیز ترجمہ و صحافت میں اس نابغۂ روزگار شخصیت نے ایک کثیر سرمایہ اپنی یادگار چھوڑا ہے جس کو سمیٹنے کے لئے دفاتر درکار ہیں اور اس سیمینار میں موقر حضرات اپنے گرانقدر مقالے پیش کر کے اس کا کچھ حق ادا کریں گے۔

راقم نے یہاں ان کی اوائلِ عمری کے دو کارناموں کا ایک مختصر جائزہ پیش کرنے کی ادنیٰ کوشش کی ہے۔ یہ دو کارنامے ان کی بعد کی علمی و ادبی زندگی کے کارہائے نمایاں کی تابندگی میں ماند پڑ گئے مگر ان کی اہمیت و اولیت مسلّم الثبوت ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔

مولانا دریابادیؒ کے پاس کتب کا ایک نادر ذخیرہ تھا جس میں شیخ غلام ہمدانی مصحفی (۱۱۶۴ھ/۱۷۵۰ء — ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۴ء) کی مثنوی ''بحرالمحبت'' کا نایاب نسخہ بھی تھا۔ جناب

عبدالماجد بی۔اے نے ۱۹۲۲ء میں اس کی تہذیب وترتیب کی جو اُسی سال "سلسلۂ آصفیہ" کے تحت مطبع معارف اعظم گڑھ میں چھپی۔ تحقیق وترتیب کے اُصول کے مطابق انہوں نے پہلے اس مثنوی کو اکتوبر ۱۹۲۱ء کے سہ ماہی رسالہ "اردو" میں شائع کرادیا تھا تا کہ اگر کوئی دوسرا نسخہ بھی کہیں ہو تو پتہ چل جائے جس سے مقابلہ کر کے اس کی صحت کا اطمینان کرلیا جائے مگر کوئی دوسرا نسخہ دستیاب نہ ہوسکا اور اس نسخے کو ۱۹۲۲ء میں طبع کرایا گیا۔ اس نسخے کی کتابت ۱۲۴۱ھ میں طاہر الزماں نامی کاتب نے کی تھی۔ اس طباعت کے بعد ۱۹۲۴ء میں اس مثنوی کا ایک دوسرا نسخہ ملا جو شاکر حسین صاحب نکہت سہسوانی کی ملک تھا اور سید محفوظ علی بدایونی صاحب کی وساطت سے ان کو ملا تھا۔ اس نسخے کی کتابت ۱۲۲۵ھ میں مہر علی بیگ نامی کاتب کے ذریعے ہوئی تھی۔ نسخۂ اول (دریابادی) کا آغاز اس طرح ہے: "مثنوی میاں مصحفی سلمہ کہ بر طبق مضمون مثنوی دریائے عشق کہ از میر تقی مرحوم است گفتہ اند"۔ نسخۂ دوم (سہسوانی) کے عنوان پر کتاب کے محض نام کے بجائے یہ الفاظ درج ہیں: "مثنوی بحرالمحبت مصحفی بہ جواب دریائے عشق میر تقی" خاتمہ پر یہ عبارت تحریر ہے: "مثنوی در جواب دریائے عشق میر محمد تقی صاحب سلمہ من کلام میاں مصحفی صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ"۔ نسخۂ دوم میں "میر محمد تقی صاحب سلمہ" سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۲۵ھ میں مصحفی نے میر تقی میر کی زندگی میں ہی یہ مثنوی کہہ ڈالی تھی۔ میر تقی میر کا عرصۂ حیات ۱۱۳۵ھ/ ۱۷۲۲ء — ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء پر محیط ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصحفی نے میر کی مثنوی کے جواب میں جس سال مثنوی کہی اُسی سال میر کا انتقال ہوا۔ طبع اول (۱۹۲۲ء، صفحات ۷۹) الہٰ آباد یونیورسٹی، بمبئی یونیورسٹی، محکمۂ تعلیمات یوپی، اور دوسرے تعلیمی اداروں کے نصاب میں داخل تھی جس سے اس تہذیب وترتیب کی اہمیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ طبع دوم میں مولانا دریابادیؒ نے ایک فرہنگ کا اضافہ بھی کردیا تھا جس سے اس کی افادیت بڑھ گئی تھی۔ طبع دوم (۱۹۲۷ء، صفحات ۸۶) جو راقم کے پیش نظر ہے اس کے ورق بیرونی پر حسب ذیل عبارت ہے: "سلسلۂ آصفیہ، مثنوی بحرالمحبت مؤلفہ شیخ مصحفی بہ تصحیح وتحشیہ واضافۂ مقدمہ وتبصرہ وفرہنگ از عبدالماجد بی۔اے طبع ثانی باہتمام مسعود علی ندوی، مطبع معارف اعظم گڑھ میں چھپی ۱۳۴۶ھ"۔ "دیباچۂ طبع دوم" کے تحت تحریر ہے: "آج سے پانچ سال ہوئے جب مصحفی کی بحرالمحبت میری تہذیب وترتیب کے بعد شائع ہوئی تھی۔" پھر "تذکرۂ مصحفی" کے تحت شاعر کے حالات حیات اختصار کے ساتھ درج کئے گئے ہیں۔ مصحفی کی ولادت امروہہ (ضلع مرادآباد) میں ہوئی تھی۔

نوعمری میں دلی آگئے۔ یہیں تعلیم حاصل کی، شعر گوئی کی اور مصحفی تخلص اختیار کیا۔ مولد و وطن دہلی نہ تھا مگر دہلی وطنِ ثانی بنا جس پر فخر کرتے تھے۔ کہا ہے:

دہلی کہے ہیں جس کو زمانہ میں مصحفی
میں رہنے والا ہوں اُسی اُجڑے دیار کا

''سراپائے سخن'' مؤلفہ سید محسن علی محسن لکھنوی (۱۲۷۷ھ) میں ہے کہ مصحفی میاں امانی کے شاگرد تھے۔ دہلی سلطنت کے زوال کے باعث پریشانی اُٹھائی اور نواب آصف الدولہ (دورِ حکومت ۱۷۷۵ تا ۱۷۹۷ء) کے لکھنؤ کی طرف مراجعت کی جدھر میر، سودا، میر حسن اور انشاء پہلے ہی ہجرت کر چکے تھے۔ بعدۂ یہاں مرزا سلیمان شکوہ پسر شاہ عالم ثانی و برادر اکبر شاہ ثانی بھی آئے تھے اور محفلِ شعر و سخن گرم کی تھی جن کی سرکار میں مصحفی بھی حاضر ہوئے۔ ایک شعر میں اِدھر اشارہ ہے۔

تختِ طاؤس پہ جب ہوئے سلیماں کا جلوس
مورچھل ہاتھ میں میں بالِ ہما کا لے لوں

رفتہ رفتہ دربارِ شاہی میں بھی رسائی ہوگئی۔ شاعری کے استاد گردانے گئے۔ تلامذہ بہ کثرت ہوئے۔ انشاء سے سالہا سال معرکہ آرائی ہوئی۔ مرزا سلیمان شکوہ ابتداءً مصحفی سے اصلاح لیتے اور ان کی سرپرستی کرتے تھے۔ بعدۂ انشاء نے یہ مقام حاصل کرلیا اور مرزا سلیمان شکوہ علانیہ انشاء کا ساتھ دینے لگے۔ ایک بار مصحفی کے دو وفادار شاگردوں (میاں نورالاسلام منتظر اور مرزا حیدر علی گرم) کے انشاء مخالف سوانگ کو مرزا سلیمان شکوہ نے کوتوالی سے رکوادیا جس سے مصحفی دل گرفتہ ہوگئے اور ترکِ سکونتِ لکھنؤ کا قصد کرلیا۔ ایک غزل کے مطلع و مقطع میں کہا ہے۔

جاتا ہوں تیرے در سے کہ توقیر نہیں یاں
کچھ اس کے سوا اب میری تدبیر نہیں یاں
اے مصحفی بے لطف ہے اس شہر میں رہنا
سچ ہے کہ کچھ انسان کی توقیر نہیں یاں

لیکن لکھنؤ کی خاک مقدر میں تھی۔ یہیں انتقال ہوا اور یہیں آسودۂ خاک ہوئے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے "آب حیات" میں اس باب پر آب حیات چھڑک دیا ہے۔

مصحفی بڑے زود گو شاعر و نثر نگار تھے۔ اردو غزلیات کے ۸ ردیوان، ۱ ردیوان قصائد، ۳ ردیوان فارسی، ۱ رعربی کا مختصر دیوان، شعرائے اردو فارسی کے ۳ رتذکرے، ایک خودنوشت، چھوٹی بڑی چند مثنویاں اور مختلف موضوعات پر چھوٹے چھوٹے ۲، ۳، رسالے اپنی یادگار چھوڑے۔

مصحفی کو اس کا احساس تھا کہ وہ ایک قادرالکلام شاعر ہیں۔ خود کہا ہے۔

اور بھی کہہ کر سنا دیوے تو اچھی سی غزل
تازہ معنی کا تو آخر مصحفی خلاق ہے

☆☆☆

کچھ میں جرأت نہیں، ہوں مصحفی سحر بیاں
میر ومیرزا سے لڑانے یہ غزل جاؤں گا

☆☆☆

خامُش ہیں ارسطو وفلاطوں مرے آگے
دعویٰ نہیں کرتا کوئی موزوں مرے آگے
باندھے ہوئے ہاتھوں کو بہ امید اجابت
رہتے ہیں کھڑے سینکڑوں مضمون مرے آگے
سب خوشہ رُبا ہیں مرے خرمن کے جہاں میں
کیا شعر پڑھے گا کوئی موزوں مرے آگے
استاد ہوں میں مصحفی حکمت کے بھی فن میں
ہے کودکِ نودرس فلاطوں مرے آگے

متصوفانہ کلام بھی خوب ہے۔ایک غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

مخلوق ہوں یا خالقِ مخلوق نما ہوں
معلوم نہیں مجھ کو کہ میں کون ہوں کیا ہوں
ہوں شاہد تنزیہہ کے رُخسار کا پردہ
یا خود ہی میں شاہد ہوں کہ پردہ میں چھپا ہوں
ہستی کو مری ہستیِ عالم نہ سمجھنا
ہوں ہست تو پر ہستیِ عالم سے جدا ہوں
یہ کیا ہے کہ مجھ پر مرا عقدہ نہیں کھلتا
ہرچند کہ خود عقدہ وخود عقدہ کشا ہوں
اے مصحفی شانیں ہیں مری جلوہ گری میں
ہر رنگ میں میں مظہر آثارِ خدا ہوں

وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے اسرار سے متعلق ایسے فکر انگیز اشعار بہت کم اردو شعراء کے یہاں ملیں گے۔

''دریائے عشق'' اور ''بحرالمحبت'' کے موضوعات و کرداروں میں بہت مماثلت ہے۔ایک نقشِ اول ہے تو دوسرا نقشِ ثانی۔مرتب کے الفاظ میں: ''دونوں کا پلاٹ ایک ہے، طرزِ بیان ایک ہے، وزن ایک ہے اور چونکہ زمانہ تالیف ایک ہے اس لئے زبان بھی قدرۃً ایک ہے۔یہاں تک کہ کہیں کہیں الفاظ بھی متحد ہو گئے ہیں۔'' مصحفی نے میر کے تقدس کو تسلیم کیا ہے۔کہتے ہیں ؎

گرچہ ہے کلکِ میرؔ نادر کار
تو بھی ندرت کو اپنی کر اظہار
جن مقاموں میں رنگ کم ہے بھرا
دے ذرا اور بھی تو حسن ملا

سطح کاغذ پہ کھینچ وہ تصویر
جس سے حیراں رہیں صغیر وکبیر
شق القمر جتاوے تو
معجزہ اپنا تک دکھادے تو

''دریائے عشق'' اور ''بحرالمحبت'' دونوں کا نفس مضمون یکساں ہے جس کو کوزے میں بند کرنے کی ایک ادنیٰ کوشش مندرجہ ذیل الفاظ میں کی جارہی ہے:

ایک جوانِ رعنا اور عشق کے دلدادہ کی آنکھیں ایک نازنین گل رُخسار سے، جو ایک غرفہ (جھروکا) میں نمودار ہوتی ہے، چار ہوجاتی ہیں اور دونوں ایک دوسرے کے عشق میں گرفتار ہوجاتے ہیں۔ نازنین تو پھر مستور ہوگئی لیکن جوان اس کے عشق میں دیوانہ ہوگیا۔ دوسری طرف نازنین بھی رفتہ رفتہ اُس جوان کی محبت میں ڈوبتی گئی۔ جب نازنین کے متعلقین کو اس کا پتہ چلا تو وہ اس جوان کے دشمن ہوگئے اور کوشش کرنے لگے کہ یہ داستانِ عشق آگے نہ بڑھے۔ ایک دایہ کے ساتھ نازنین کو دریا پار اپنے عزیزوں کے پاس بھیجنے کا ارادہ کرلیا اور ایک محافہ (ڈولی) میں سوار کرادیا۔ عاشق صادق کو پتہ چلا تو وہ بھی ڈولی کے پیچھے دریا کے کنارے پہونچا۔ نازنین، دایہ اور محافہ دار (کہار) ایک کشتی پر سوار ہوئے تو عاشق بھی اُس پر سوار ہوگیا۔ اب اس مکار دایہ نے عاشق کا کام تمام کرنے کا ایک طریقہ سوچا۔ اس نے نازنین کی کفش (جوتی) دریا میں پھینکی اور عاشق سے کہا کہ اس کو نکال لاؤ۔ جوان جوشِ عشق میں دریا میں کود اگر موجوں کی طغیانی اس کو بھی کفش کے ساتھ تہِ آب لے گئی اور دونوں پھر سطحِ آب پر نہ اُبھرے۔ دایہ اس نازنین کو دریا پار لے گئی اور اس کا غم دور کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ کچھ عرصہ بعد یہ سمجھ کر کہ اب شعلۂ عشق سرد پڑگیا ہے اس نازنین کو اس کے گھر کی طرف واپس لے چلی مگر یہ نہ جانتی تھی کہ باطناً وہ نازنین اپنے عاشق کے فراق میں گھل رہی تھی۔ بیچ دریا میں اس نے ظاہراً دایہ سے کہا کہ اب جب کہ وہ جوان اپنی جان سے ہاتھ دھوچکا ہے مجھے یہ تو بتا کہ وہ کہاں ڈوبا تھا۔ دایہ نے جیسے ہی اس جگہ کی نشاندہی کی، نازنین فوراً اسی جگہ کود گئی اور تہِ آب چلی گئی۔ دام دار (جالیے) بلائے گئے اور دام ندی میں ڈالے گئے تو دونوں کے جسدِ خاکی ''باہم متصل'' دریا سے برآمد ہوئے۔ عشق صادق نے دونوں کو حیات میں نہ سہی مگر ممات میں تو باہم کرہی دکھایا اور عشق ومحبت کی ہی فتح ہوئی۔

''بحرالمحبت'' کے چند آخری اشعار یہ ہیں ۔

مصحفی بس زباں درازی بس
آفریں ہے مقامِ ضبطِ نفس
مجھ سے یہ مثنوی ہوئی جو تمام
رکھا بحرالمحبت اس کا نام
قصہ ہے ایک اور دوناے
جیسے اک شخص کے ہوں دوجامے
میر صاحب نے پہلے نظم کیا
میں نے بعد ان کے ریز وپرز کیا

دونوں مثنویوں کے موازنہ سے پتہ چلتا ہے کہ ''دریائے عشق'' میں ۲۶۵ اشعار ہیں جب کہ ''بحرالمحبت'' میں ۳۵۹۔ میر کے مقابلے میں مصحفی نے مضمون کو زیادہ شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا ہے اور اس طرح نقش اول کے مقابلے میں نقشِ ثانی زیادہ اثر انگیز ہے۔

مضمون کو مختصر کرتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ مولانا دریابادیؒ نے ''بحرالمحبت'' کو تہذیب وترتیب سے مزین کرکے اور ناظرین کے سامنے پیش کرکے اردو شاعری کے مطبوعہ خزانہ میں گراں بہا اضافہ کیا جس کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کا بحیثیت مرتب دوسرا کارنامہ مولانا جلال الدین رومی کے ملفوظات ''فیہ مافیہ'' کی ترتیب ہے جو ۱۹۲۸ء میں پہلی بار طبع ہوکر منظر عام پر آئے۔ اس طباعت کے سرورق پہ تحریر ہے: ''سلسلۂ آصفیہ'' فیہ مافیہ یعنی ملفوظات مولٰنائے جلال الدین رومیؒ، بہ اضافۂ مقدمہ وحواشی وتذکرہ وتبصرہ، مرتبۂ عبدالماجد، باہتمام مولوی مسعود علی ندوی در مطبع معارف اعظم گڈھ طبع گردید'' فہرست عنوانات کے تحت مندرجہ ذیل تحریر ہے: (۱) دیباچہ (۱۔۷)۔ (۲) تذکرۂ صاحبِ ملفوظات (۹۔۳۱)۔ (۳) تبصرہ بر ملفوظات (۳۲۔۴۲)۔ (۴) فیہ مافیہ (۱۔۲۴۲)۔

دیباچۂ مرتب (مرقومۂ ۱۹۲۸ء) کے تحت مولانا دریابادی نے لکھا ہے کہ اس کتاب کی ترتیب تمام تر احسانِ خداوندی ہے اور اس میں ان کی کاوش کو دخل نہیں۔ وہ ۸؍ سال پہلے رام پور کے سرکاری کتب خانہ میں مختلف کتابیں الٹ پلٹ رہے تھے کہ اسی الٹ پلٹ میں اتفاقاً ان کی نظر فارسی کی ایک بوسیدہ و کرم خوردہ کتاب پر پڑی جس کا عنوان فیہ مافیہ تھا۔ پہلے تو انہیں یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ یہ وہی نایاب کتاب ہے جو مولانا جلال الدین رومی سے منسوب ہے مگر اس کے مطالعہ سے یہ وہی کتاب ثابت ہوئی اور مولانا کی خوشی اور پھر شکر خداوندی اس وقت بے پایاں تھے۔ مولانا رومی کی مثنوی کا شمار دنیا کی چند بہت اہم شعری تصانیف میں ہوتا ہے۔ ان سے متعلق تذکروں میں اس کتاب فیہ مافیہ کا ذکر ضمناً ملتا ہے مگر اب تک اس کا کوئی نسخہ اہل علم حضرات کے سامنے بہ شان و کمال ظاہر نہیں ہوا تھا۔ فریدون سپہ سالار نے، جنہوں نے ایک مدت مولانا رومی کی خدمت میں گزاری تھی، اپنے ''رسالۂ سپہ سالار'' میں جو مولانا کے حالات میں ''قدیم ترین ہے'' صرف ایک مقام پر ضمناً فیہ مافیہ کا ذکر کیا ہے اور مولانا شبلی نعمانی نے بھی ''سوانح مولانا روم'' میں مختصراً لکھا ہے کہ فیہ مافیہ ان خطوط کا مجموعہ ہے جو مولانا نے معین الدین پروانہ کے نام لکھے اور یہ نایاب ہے۔ مشہور انگریز مستشرق پروفیسر نکلسن نے بھی انگریزی میں ''انتخاب دیوان شمس تبریز'' کے مقدمہ میں ایسا ہی لکھا تھا۔ یہ محض فضل الٰہی تھا کہ جو مخطوطہ مشرق و مغرب کے زبردست فاضلوں کی نظروں سے مخفی رہا تھا اس پر ان کی نظر بلا جستجو و کاوش پڑ گئی۔ انہوں نے کتب خانہ سے اس کی نقل ۱۹۲۲ء میں حاصل کر لی۔ اس کے بعد ۱۹۲۳ء کے آغاز میں وہ حیدرآباد گئے اور وہاں کتب خانوں کی چھان بین کی تو بعنایت کارساز مطلق وہاں دو مزید مخطوطے نظر کے سامنے آگئے۔ ایک تو ''کتب خانۂ آصفیہ'' کا نسخہ نسبتاً صحیح تر پایا گیا۔ اسی اثنا میں مولانا دریابادی اور کیمبرج کے مشہور مستشرق پروفیسر آر۔ اے۔ نکلسن، جو مولانا رومی کے کلام کے شیدائی تھے، کے بیچ اس رسالہ کے باب میں مراسلت شروع ہو چکی تھی۔ مولانا نے ان کی خدمت میں ''نسخۂ آصفیہ'' کی نقل بھی بھیج دی تھی جس کا انہوں نے مطالعہ کیا اور جولائی ۱۹۲۳ء میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی صد سالہ سالگرہ کے موقع پر اس رسالہ پر مبنی ایک مقالہ بھی پیش کیا۔ ساتھ ہی انہوں نے قسطنطنیہ میں اپنے شناساؤں کے ذریعہ اس رسالہ کی کھوج بھی شروع کرائی۔ مزید الطاف رب العزت کے صدقے پروفیسر موصوف اور ان کے دوستوں کی کوششیں بار آور ہوئیں اور ۱۹۲۴ء میں قسطنطنیہ سے ایک بہت خوشخط اور صحیح نقل مولانا کو دستیاب ہو گئی جس کو ان تینوں ہندوستانی نسخوں کے ساتھ

رکھ کر مولانا نے فیہ مافیہ کی ترتیب کا بیش بہا کام شروع کیا جس کی تفصیل مولانا نے دیباچہ میں رقم کی ہے اور ان تمام علماء وفضلاء کا تہِ دل سے شکریہ ادا کیا ہے جن کی معاونت سے یہ اہم کام پایۂ تکمیل کو پہونچا۔

اس کے بعد مولانا دریابادیؒ نے تذکرۂ صاحب ملفوظات کے تحت مولانا جلال الدین رومیؒ کے حالات وسوانح تحریر کئے ہیں جن کے دو اصل ماخذ ''رسالۂ سپہ سالارؒ'' (از فریدون سپہ سالار) اور ''مناقب العارفین'' (از شمس الدین افلاکی) فارسی میں ہیں۔ فریدون سپہ سالار مولانا رومی کے حاضر باش تھے اور شمس الدین افلاکی صرف دو واسطوں سے ان کے سلسلہ میں شامل ہوتے ہیں اسی لئے یہی دونوں تذکرے مولانا رومی کے قریب ترین ہیں۔ دوسرے فارسی تذکرے اور اس کے بعد اردو تذکرے بھی ہیں۔ اردو میں مولانا شبلی کی ''سوانح مولانا روم'' معروف ہے۔ صاحب ملفوظات کا نام محمد، لقب جلال الدین اور تخلص رومی تھا۔ بلادِ روم سے تعلق کی بنا پر بھی آپ رومی کہلائے۔ عرف عام میں بحیثیت مولوی رومی، ملائے رومی، مولوی معنوی، ومولانا روم مشہور ہوئے۔ آپ کی ولادت ۶/ربیع الاول ۶۰۴ھ مطابق ۲۸/دسمبر ۱۲۰۷ء بمقام بلخ ہوئی اور ۶۸ سال قمری یا ۶۶ سال شمسی کی عمر پا کر ۵/جمادی الثانی ۶۷۲ھ مطابق ۱۶/دسمبر ۱۲۷۳ء کو بمقام قونیہ وفات پائی۔ آپ کا سلسلۂ نسب ۹/واسطوں سے حضرت ابوبکر صدیقؓ تک پہونچتا ہے اور نانہالی سلسلہ حضرت سلطان ابراہیم ادھمؒ سے ملتا ہے۔ آپ کے والد ماجد سلطان بہاء الدین ولدؒ بہت بڑے عالم، زاہد و درویش تھے۔ مذکور ہے کہ بلخ کے متعدد عالموں نے ایک رات ایک ساتھ یہ خواب دیکھا کہ حضور مقبولؐ نے آپ کو اپنی نورانی محفل میں سلطان العلماء کا لقب عطا کیا ہے۔ فرمانروائے بلخ محمد خوارزم شاہ آپ کا عزیز بھی تھا اور معتقد بھی۔ مگر امام فخر الدین رازی کے زیر اثر آپ سے بدظن رہنے لگا جس وجہ سے آپ نے ۶۰۷ھ میں اہل وعیال اور شاگردوں ومریدوں کی جماعت کے ساتھ ترک وطن کیا اور نیشاپور، بغداد، مکہ معظمہ، دمشق وغیرہ کی سیاحت اور حج سے فراغت کے بعد یہ قافلہ قونیہ پہونچا جہاں سلجوقی خاندان کے تاجدار علاء الدین کیقباد کی حکومت تھی۔ اس نے شیخ کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور عزت واحترام کے ساتھ درس وتدریس کی خدمت سپرد کی۔ اثنائے مسافرت نیشاپور میں شیخ فرید الدین عطار سلطان العلماء سے ملنے آئے اور طفل رومی پر نظر پڑی تو جوہر کو پہچان لیا، اپنی کتاب اسرار نامہ عنایت کی اور فرمایا کہ عنقریب یہ لڑکا دل جلوں کے گروہ میں آگ لگا کر رہے گا اور یہ ارشاد حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوا۔ اس سفر کے دوران

۶۲۳ھ میں مولوی روی کا عقد لالائے سمر قند کی صاحبزادی جوہر خاتون سے ہوا جن سے تین پسر بہاء الدین محمد سلطان ولد، علاء الدین محمد اور مظفر الدین تولد ہوئے۔ ان اہلیہ کی وفات کے بعد عقد ثانی کرا خاتون قونوی سے ہوا جن سے ایک دختر ملکہ خاتون تولد ہوئیں۔

مولانا نے علوم ظاہری کی ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی۔ اس کے بعد سید برہان الدین محقق ترمذی سے کسب فیض کیا جو آپ کے والد کے شاگرد بھی تھے۔ آپ مشہور علمی مراکز حلب، دمشق وغیرہ بھی گئے جہاں کے مشہور اساتذہ سے علوم وفنون کی تحصیل کی اور زمانہ طالب علمی میں ہی جملہ علوم نقلیہ وعقلیہ میں کمال حاصل کرلیا۔ ۶۲۸ھ میں اپنے والد کی وفات کے بعد بادشاہ اور معززانِ شہر کے اصرار پر مسند درس وافتاء پر فائز ہوئے اور ایک عالم کو سیراب کرنے لگے لیکن علم ظاہری کی یہ فراوانی سوز باطن کی تسکین کا سامان فراہم نہیں کرسکتی تھی۔ آپ کے والد ایک عارف کامل تھے اور ان کی صحبت میں آپ نے عرفان وسلوک کی ابتدائی منزلیں طے کی تھیں۔ ان کے انتقال کے بعد اور ان کے حسب خواہش آپ نے ان کے شاگرد وخلیفہ سید برہان الدین محقق ترمذی کے دست پر بیعت کی اور وہی آپ کے باضابطہ پیر ہوئے۔ آپ نے ۹ رسال تک ان کی تربیت میں تصوف کے اعلیٰ مقامات تک رسائی حاصل کی۔ ۶۳۷ھ میں محقق ترمذی کی وفات ہوئی۔ ۶۴۲ھ میں آپ کو شیخ زمانہ حضرت شمس تبریز کی صحبت نصیب ہوئی جس نے مولانا کی زندگی میں انقلاب برپا کردیا۔ دونوں کی ہستی ایک دوسرے میں گم ہوگئی اور عرفان الٰہی کے جویا نے مسندِ درس وافتاء کو خیرباد کہہ دیا اور سماع، سرمستی وسرشاری آپ کی کیفیات بن گئیں۔ یہ صحبت صرف ڈھائی برس رہی مگر اس نے تصوف اور فارسی کی صوفیانہ شاعری کو ایک خزانہ عطا کردیا۔ مولانا کے عزیزوں اور شاگردوں کو یہ صحبت کھلنے لگی جس کو دیکھ کر حضرت شمس تبریز ایک روز اچانک کہیں چلے گئے۔ مولانا رومی بیقرار رہنے لگے۔ کچھ عرصہ بعد آپ کو دمشق سے ان کی خبر ملی۔ آپ نے اپنے فرزند اکبر سلطان ولد کو بھیجا جو حضرت شمس کو ساتھ لے کر قونیہ آئے مگر حاسدوں نے پھر زور پکڑا۔ اب کے حضرت شمس ایسے گئے کہ پھر واپس نہ آئے اور مولانا رومی اپنے کعبۂ مقصود کے فراق میں گھلتے رہے اور اس حد تک تقریباً ۵۰ ہزار اشعار پر مبنی ایک ''دیوان'' کے خالق ہوئے جس کو حضرت شمس تبریز کے نام سے منسوب کردیا۔ یہ ''دیوانِ شمس تبریز'' یا ''کلیات شمس تبریز'' کے عنوان سے مشہور ومعروف ہے۔ غزلیات کے مقطع میں آپ شمس تبریزی، شمس تبریز یا شمس ڈال کر اپنے روحانی رفیق کی یاد کو تازہ کرتے رہے۔ رباعیات بھی

کلیات میں شامل ہیں۔ بقول مولانا دریابادی ''کلام کا بیشتر حصہ غلبۂ سکر ومستی کے زمانہ کا کہا ہوا ہے اس لئے علماء ظاہر کو اپنے مسلمات سے مطابقت دینے میں قدرۃً دشواری پیش آتی ہے۔''
مولانا رومی وحضرت شمس کے درمیان من وتو کا امتیاز ختم ہو چکا تھا اور یہ سرِّ روحانی بآسانی سمجھ میں آنے والا نہیں۔ مثلاً:

شمس تبریز طلوع بکن از مشرق جاں
کہ چو خورشید تو جانے وجہاں جملہ بدن

مندرجہ ذیل شعر کے اسرار ورموز کی تشریح کوئی عارف باللہ ہی کرسکتا ہے جو عامیوں کے ادراک سے پرے ہے۔

پیر من ومرید من دردِ من ودوائے من
فاش بگویم ایں سخن شمس من وخدائے من

یہاں حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی اور ان کے محبوب مرید حضرت امیر خسرو کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور ذہن میں طوطیِ ہند حضرت امیر خسرو کا یہ شعر ابھرتا ہے۔

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

حضرت شمس کے فراق میں مولانا روم کی حالت زبوں ہوگئی۔ ایک دن مولانا اپنے پیر بھائی شیخ صلاح الدین زرکوب کی دکان کے پاس سے گزرے جو اس وقت چاندی کے ورق کوٹ رہے تھے۔ ہتھوڑے کی آواز نے مولانا روم پر سماع کا سا اثر کیا اور کیف وسرمستی میں وہ حضرت زرکوب سے لپٹ گئے اور دیر تک اپنے ایک شعر کی تکرار کرتے رہے۔

یکے گنجے پدید آمد ازیں دوکانِ زر کوبی
زہے صورت، زہے معنی، زہے خوبی، زہے خوبی

اس کے بعد مولانا روم کی حالت کچھ بہتر ہوئی اور اپنے پیر بھائی کے ساتھ بھی وہی روحانی راز ونیاز قائم ہو گئے جو حضرت شمس تبریز کے ساتھ تھے۔ فرماتے ہیں۔

لطفہائے را کے باماشہ صلاح الدین کند
خضر جاں گرباز بیند دم بدم تحسین کند

مولانا کے عزیز وشاگرد پھر چراغ پا ہوئے مگر معاملہ زیادہ آگے نہ بڑھا۔تقریباً ۱۰ سال یہ رفاقت قائم رہی۔۶۶۲ھ میں حضرت زرکوب کا وصال ہوگیا۔مولانا روم اپنے نالۂ ہجر میں ان کے لئے کہتے ہیں۔

اے زہجرانت زمین وآسمان بگریستہ
درمیانِ خود نشستہ عقل وجاں بگریستہ

حضرت زرکوب کے انتقال کے بعد مولانا کے روحانی رفیق ان کے مرید خاص حضرت حسام الدین چلپی ہوئے اور انہیں کی تحریک پر مولانا ''مثنوی'' کی تصنیف کی طرف مائل ہوئے جس نے مولانا کے ساتھ حسام الدین چلپی کو بھی زندۂ جاوید بنادیا۔وصال سے پہلے مولانا نے ان کو اپنا خلیفہ بھی منتخب کیا۔مثنوی کے ۶ر دفاتر میں ان کا ذکر انتہائی تعلق خاطر کے ساتھ کیا۔دفتر ۴ر میں حکایت مرد تشنہ کے تحت فرماتے ہیں۔

ہمچناں مقصودِ من زیں مثنوی
اے ضیاء الحق حسام الدین توئی
مثنوی اندر اُصول وابتدا
جملہ بہر تست وبرتست انتہا

واقعتاً مثنوی جس میں تقریباً ۲۷ر ہزار اشعار ہیں اور جو مولانا کی زندگی کے اواخر سالوں کا کلام ہے،معارف الٰہی کا ایک گنجینہ ہے اور یہ حرف بہ حرف صحیح ہے کہ۔

مثنوی مولوی معنوی
ہست قرآں در زبانِ پہلوی

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مولانا رومی جیسے صاحب کیف وحال بزرگ بہت کم ہوئے ہیں۔

حضرت حسام الدین چلپی کی وفات کے بعد مولانا کے فرزند سعید و شاگرد رشید حضرت بہاء الدین سلطان ولد مسند خلافت پر متمکن ہوئے۔ اور یہ خود بڑے متقی و صاحب دل بزرگ ہوئے ہیں۔ مولانا دریابادی کے مطابق حضرت سلطان ولد نے کوئی مثنوی بھی لکھی تھی جس کے اشعار مختلف تذکروں میں کثرت سے منقول ہوئے ہیں۔ مولانا دریابادی نے حاشیۂ ذیلی میں یہ بھی لکھا ہے کہ "ان کی دو مثنویاں، مطبوعہ نہیں، قلمی، میری نظر سے گزری ہیں۔ ایک حیدر آباد کے کتب خانۂ آصفیہ میں اور ایک قصبہ سندیلہ (اودھ) میں۔ ایک مثنوی بالکل مولاناؒ کی مثنوی کا تکملہ معلوم ہوتی ہے۔" تذکروں میں ہے کہ تمام استغراقی وسماعی کیفیت ومحویت کے باوجود مولانا روم سے شرعی احکامات کی پیروی میں لغزش نہ ہوتی تھی اور اوقات مقررہ پر وہ صلوٰۃ وصوم کے پابند تھے اور اتباع شریعت کے بغیر طریقت وحقیقت کا تصور ان کے ہاں نہ تھا۔

مشہور زمانہ شعری "دیوان" اور "مثنوی" کے بعد نثری ملفوظات "فیہ مافیہ" کے بارہ میں مولانا دریابادیؒ لکھتے ہیں: "دنیا اب تک اس رسالہ کے صرف نام سے واقف تھی۔ آج مولاناؒ کے وصال کے چھ سو ہتر سال (قمری) کے بعد محض کریم مطلق کے فضل وکرم سے پہلی بار یہ رسالہ منظر عام پر آرہا ہے اور اس کی طبع واشاعت کا سامان ہورہا ہے۔ اس پر اجمالی تبصرہ صفحات آئندہ کا موضوع ہے۔"

"تبصرۂ فیہ مافیہ" کے تحت یہاں مولانا دریابادی کے ابتدائی الفاظ کا اعادہ مناسب ہوگا جو از خود موضوع کو روشن کردیتا ہے: "مولانا کی مشہورترین یادگار ان کی ضخیم "مثنوی" اور اس سے اتر کر، ان کا ضخیم تر "دیوان" ہے۔ یہ ان کی کوئی مستقل تصنیف نہیں بلکہ آپ کے متفرق ملفوظات کا مجموعہ ہے جو اثنائے مجالس میں آپ کی زبان مبارک سے صادر ہوتے رہتے تھے اور جو آپ کے صاحبزادہ سلطان بہاء الدین ولدؒ کے قلمبند ومرتب کئے ہوئے ہیں۔ جیسا کہ دیباچہ کے شروع ہی میں تصریح موجود ہے ملفوظات کے اصلی مخاطب مرید باختصاص معین الدین پروانہؒ ہیں جو وزیر سلطنت بھی تھے۔ عموماً انہیں سے تخاطب ہے، بیشتر انہیں کے سوالات کے جوابات ہیں لیکن کہیں کہیں دوسرے مریدوں اور سائلوں کی جانب بھی روئے سخن ہے۔ چنانچہ خود سلطان بہاء الدین ولدؒ کے نام کی تصریح ایک سے زائد مقام پر ہے۔

ملفوظات کے خیالات ومطالب مثنوی کے خیالات ومطالب ہیں۔ انداز بیان مثنوی کا انداز بیان ہے۔ زبان مثنوی کی زبان ہے۔ اس لئے ملفوظات کے صحیح ومستند ہونے میں بھی شبہ کی وجہ نہیں۔ فرق جو کچھ ہے وہ اجمال اور تفصیل اور نثر وشاعری کا ہے۔ فیہ مافیہ مختصر ہے اس لئے قدرۃً

مطالب میں اجمال ہے، مثنوی کی سی تکرار و تفصیل، شرح و بسط اس میں نہیں۔ علیٰ ہذا جو جوش و خروش، جو کیف و مستی، جو درد و گداز مثنوی کے ایک ایک شعر میں ہے اس کا مقابلہ ملفوظات کے سارے اوراق مل کر بھی نہیں کر سکتے۔ ان دو باتوں سے اگر قطع نظر کر لی جائے تو اور ہر حیثیت سے فیہ مافیہ اور مثنوی دونوں ایک ہی پھول کی پنکھڑیاں، ایک ہی گلشن کی بہاریں، ایک ہی نور کی تجلیاں ہیں۔

تذکروں میں ہے کہ مولانا درویش کامل بننے سے پیشتر علوم ظاہری و شرعی میں بھی کمال حاصل کر چکے تھے۔ مثنوی میں جس حسن و خوبی کے ساتھ آیات و احادیث کو تصرف میں لایا گیا ہے اور جس سادہ و عام فہم طریقہ سے نازک، دشوار و دقیق مسائل کو حل کر دیا گیا ہے وہ بجائے خود اس دعویٰ کے دلائل ہیں۔ مزید شہادت فیہ مافیہ کے اوراق میں بہ کثرت ملتی ہے۔ آیات قرآنی اور احادیث نبوی سے قدم قدم پر استشہاد ہے اور علوم عقلی سے بھی بیگانگی کہیں سے ظاہر نہیں ہونے پاتی۔ اس سے اگر ایک طرف مولانا کی وسعت نظر، تنوع کمالات اور جامعیت ظاہر و باطن کی تائید نکلتی ہے تو دوسری طرف اس حقیقت پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ مولانا کے زمانہ تک اہل باطن کا طریقہ اہل ظاہر سے، اہل دل کا اہل علم سے اور درویشوں کا کتاب و سنت سے مخالف بلکہ مختلف بھی نہ تھا۔ آگے لکھا ہے: ''متقدمین صوفیہ کے تذکرے بہ کثرت آئے ہیں اور بعض مقامات پر ان کے اقوال و احوال کی دلچسپ شرح و توجیہ بھی فرمائی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ دلچسپ تشریح منصور کے مشہور کلمۂ اناالحق کی ہے۔'' مولانا رومی کے فارسی الفاظ یہ ہیں'' ......آخر ایں اناالحق گفتن منصور ہم از یں معنی است مردم پندارند کہ دعویٰ بزرگست اناالحق عظیم تواضعست۔ زیرا آنکہ می گوید کہ من عبد خدایم دو ہستی اثبات می کند یکی خود را و یکی خدا را اما آنکہ اناالحق می گوید خود را عدم کرد بباد داد و می گوید کہ اناالحق یعنی من نیستم، ہمہ اوست، جز خدا را ہستی نیست، من بکلی عدم محضم و ہیچم تواضع در ینجا بیشتر است اینست کہ مردم فہم نمی کنند'' (ص:۴۹) ان الفاظ کا مفہوم مولانا دریابادیؒ کے الفاظ میں یہ ہے:''......اناالحق کو لوگوں نے انانیت و خود بینی پر کیسے محمول کر لیا۔ یہ تو انتہائی فروتنی تھی۔ اس کا قائل تو اپنی خودی و ہستی کی قطعی نفی کر رہا ہے اور کہتا ہے کہ میں تو حق میں شامل ہو گیا ہوں۔ میں خود تو کچھ رہ ہی نہیں گیا ہوں۔ انانیت اگر نکلتی ہے تو اناالعبد سے نکلتی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ہستی معبود کے علاوہ عبد خود اپنی ہستی کا بھی اثبات و ادعا کر رہا ہے۔'' مگر عوام الناس کی نافہمی اتنی بڑھی کہ منصور کے تہ تیغ کئے جانے کے محضر نامہ پر سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ کو بھی مجبوراً دستخط کرنا پڑے۔

مرتب کیا ہوا نسخہ ملفوظات فیہ مافیہ ۶۹ رفصول پر مشتمل ہے۔ملفوظات کا اختتام عربی زبان میں تحریر کلمات پر ہوا ہے۔ جو مولانا رومی کے علمی وعملی تصوف کی روح کو بخوبی واضح کر دیتا ہے:
"......ومن كلامه اوصيكم بتقوى الله في السرو العلانيه وبقلة الطعام وقلة المنام وقلة الكلام وهجرة من المعاصي والآثام وترك الشهوات على الدوام واحتمال الجفاء من جميع الانام والمواظبة على الصيام ودوام القيام وترك المجالسة بالسفهاء الليام من العوام ومصاحبة الصالحين والكرام، اخواني اخواني احفظوا من هذه الوصية لاتكونوا في قيد دولة وفضيلة ولكن كونوا في قيدان يفتح الله قلوبكم." (ترجمہ: اللہ سے تقویٰ اختیار کرو، باطناً وظاہراً، کم کھاؤ، کم سوؤ، کم بولو، گناہوں سے بچو، خواہشات نفس کو مغلوب کرو، خلق اللہ کا جور وجفاء برداشت کرو، دن میں روزہ اور شب میں نماز کی عادت دائمی رکھو، بدوں کی صحبت سے الگ رہو اور صالحین کی صحبت اختیار کرو، میرے بھائیو میرے بھائیو! میری اس وصیت کی حفاظت کرو، حکومت اور منصب کی آرزو میں نہ رہو، اور اس کی تمنا کرو کہ اللہ تمہارے دلوں کو کھول دے)۔

مولانا دریابادیؒ نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ: "یہ عجیب توارد ہے کہ جس طرح ایک مشہور بزرگ (حضرت مولاناؒ) کے ملفوظات کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوتا ہے اسی طرح ایک دوسرے مشہور بزرگ (حضرت نظام الدین اولیاؒ محبوب الٰہی) کے ملفوظات کی تقریباً ابتداہی میں یہ الفاظ ملتے ہیں: "كمال مرد در چهار چیز پیدا می شود قلة الطعام وقلة الكلام وقلة الصحبة الانام وقلة المنام (فوائد الفواد، مرتبہ خواجہ حسن علا سنجری، ص:۴، مطبوعہ نولکشور)۔"

فیہ مافیہ کے فارسی متن کے ذیلی حواشی میں مولانا دریابادیؒ نے جابجا وضاحتیں کی ہیں مگر ملفوظات کا مکمل اردو ترجمہ ہی اردو داں طبقے کو اس کے صحیح عرفان سے ہم کنار کر سکتا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی زندگی خود رفتہ رفتہ ان ہی خطوط پر ڈھلتی چلی گئی جس کے نتیجہ میں عالم اسلام کی مشہور ہستی امام المتأخرین شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی سرزمین پر آج ہم ان سے معنون ادارہ کے زیر اہتمام مولانا دریابادیؒ جیسی مختلف الجہات شخصیت کے علمی وادبی کارناموں کی یاد تازہ کرنے اور ان سے مستفید ہونے کے لئے یکجا ہوئے ہیں جس کی ہمیں ضرورت بھی ہے اور یہ وقت کا تقاضہ بھی ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اور تحریک خلافت

ڈاکٹر محمد سلیم قدوائی ☆

مفسر قرآن، صاحب طرز ادیب، بلند پایہ صحافی اور عہد ساز مدیر مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اگر چہ سیاست کے مرد میدان نہیں تھے لیکن یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ وہ سیاست سے یکسر لاتعلق رہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کی بھرپور زندگی کا ایک دور جو کہ مختصر تھا ایسا بھی گزرا ہے جب انہوں نے عملی سیاست میں سرگرم حصہ لیا۔ اسی کا ذکر انہوں نے عملی سیاست "آپ بیتی" کے ۳۳ ویں باب میں سیاسی زندگی کے عنوان سے کسی قدر تفصیل سے کیا ہے۔ اس کے علاوہ محمد علی ذاتی ڈائری کی دو جلدوں میں بھی مصنف کی سیاسی سرگرمیوں کی جھلکیاں جابجا نظر آتی ہیں۔ اس مختصر مقالہ میں اس پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ کون سے محرکات اور عوامل تھے جنہوں نے مولانا کو سیاست میں حصہ لینے پر مجبور کیا اور وہ کون سی شخصیات تھیں جنہوں نے ان کو متاثر کیا یعنی وہ کون سی تحریکات تھیں جن میں انہوں نے دلچسپی لی؟ اس مقالہ میں ان تمام سوالات کے جوابات ڈھونڈنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مولانا دریابادیؒ ایک غیر معمولی حساس انسان تھے۔ انہوں نے جس دور میں ہوش سنبھالا وہ ایک نہایت ہنگامی اور پر آشوب دور تھا۔ یہ وہ دور تھا جب انسان استبداد اور استعماریت، جاگیرداری اور غلامی کی تاریکی سے نکل کر آزادی، انصاف، مساوات اور خودگری کی روش میں داخل ہونے والا تھا۔ پرانے معتقدات اور اقدار زندگی کی جگہ جدید خیالات و افکار وجود میں آرہے تھے۔ نئی نئی سیاسی جماعتیں اور تحریکیں جنم لے رہی تھیں۔ ان میں انڈین نیشنل کانگریس، مسلم لیگ اور تحریک خلافت خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ سیاست کے افق پر نئے نئے لیڈر ابھر کر سامنے آرہے تھے۔ ان میں مہاتما گاندھی، علی برادران، حکیم اجمل خاں، سی آر داس، پنڈت موتی لال نہرو، ڈاکٹر انصاری، مولانا آزاد وغیرہ قابل ذکر ہیں ایسے حالات اور ماحول میں

☆ استاذ امریکن اسٹڈیز جے این یو، نئی دہلی۔

مولانا دریابادیؒ جیسے دانشور جن کی قدیم وجدید دونوں علوم پر گہری نظر تھی اپنے دور کے مختلف سماجی اور سیاسی مسائل اور تحریکات سے کس طرح خود کو مکمل طور پر علیحدہ رکھ سکتے تھے۔ چونکہ فطری طور پر ان کا مزاج سیاسی نہیں تھا اس لئے انہوں نے سیاست کے بارہ میں نہایت محتاط رویہ اختیار کیا اور جہاں تک ممکن ہو سکا خود کو اس سے دور رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن وقت اور حالات کے تقاضوں سے مجبور ہو کر وہ رفتہ رفتہ سیاست کی طرف مائل ہونے لگے یہ تبدیلی کب اور کیسے رونما ہوئی؟ اس کا جواب خود مولانا نے اپنی سوانح میں یوں دیا ہے:

> "جب اپنے ہوش کی آنکھیں کھلیں تو مسلمانوں کی مسلم پالیسی سرکار انگریزی کی تائید اور وفاداری کی پائی۔ میٹرک پاس کرنے (جون ۱۹۰۸ء) تک اپنا بھی یہی رنگ ماحول کی تقلید میں رہا۔ کالج میں آنے اور لکھنؤ میں قیام کے بعد جب "آزادی" کی ہوا لگی تو اپنے خیالات بھی بدلنے اور کانگریس کی طرف مائل ہونے لگے۔ دسمبر ۱۹۱۶ء میں کانگریس کا سالانہ اجلاس لکھنؤ میں خوب دھوم دھام سے ہوا، اس میں شریک ہوا مگر محض تماشائی کی حیثیت سے۔ صرف جلسہ کی سیر اور بہار دیکھنے۔"

ایک حساس انسان ہونے کی حیثیت سے مولانا اپنے گرد وپیش کی دنیا سے نہ تو بے خبر رہ سکتے تھے۔ اور نہ مختلف واقعات اور حادثات کو نظر انداز کر سکتے تھے۔ ۱۹۱۷ء میں جب برطانوی حکومت نے مسز اینی بیسنٹ کو گرفتار کیا تو اس پر اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے مولانا نے اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے:

> ۱۹۱۷ء میں جب حکومت نے مسز اینی بیسنٹ جیسی آفاقی شخصیت رکھنے والی کو تحریک ہوم رول کے سلسلہ میں میں گرفتار ونظر بند کر دیا تو اس دھاکہ سے سارا ملک دہل گیا اور مجھ پر بھی ایک جوش کا عالم طاری ہو گیا۔"

اسی طرح سے جب تحریک ترک موالات کے سلسلہ میں مولانا کے محبوب لیڈر مولانا محمد علیؒ کو گرفتار کیا گیا تو مولانا کے جیل جانے کی خبر سنتے ہی انہوں نے پلنگ پر لیٹنا چھوڑ دیا کہ مولانا کو جیل میں کیا پلنگ ملتا ہوگا۔

تحریک خلافت اور ترک موالات کا جب زور بندھا اور ہر روز ہر جگہ جلسے ہونے لگے اور

جلوس نکلنے لگے تو مولانا بھی ان جلسوں، جلوسوں میں شریک ہونے لگے لیکن اس سے زیادہ نہیں۔ ان کی حقیقت محض دور کے تماشائی کی سی تھی جیسا کہ ذاتی ڈائری جلد اول کے اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے:

''عملی سیاست سے میں علی العموم کنارہ کش ہی رہا ہوں۔ ۱۹۲۴ء کے آخر تک میں کسی سیاسی کمیٹی کا ممبر نہ تھا۔ محض ایک تماشائی کی حیثیت رکھتا تھا۔''

اسی دور کی سیاسی شخصیات میں مولانا سب سے زیادہ مولانا محمد علی جوہرؔ کی شخصیت سے متاثر ہوئے۔ ان کو محمد علی کے فہم و اخلاص دونوں پر سو فیصدی اعتماد تھا۔ محمد علی سے عقیدت اور محبت کا اظہار مولانا کی تحریروں میں جا بجا ملتا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو ذاتی ڈائری جلد اول سے:

''فروری ۱۹۲۱ء کا اخیر تھا جب لکھنؤ میں صوبہ خلافت کا جلسہ رفاہِ عام کے احاطہ میں دھوم دھام سے منعقد ہوا۔ خلافت کا معمولی سے معمولی جلسہ بھی اس وقت انتہائی گرم جوشی کے ساتھ ہوتا تھا اور پھر اس کی صدارت کے لئے تو محمد علی آرہے تھے۔ اس نام کی کشش نے اور چار چاند لگا دیئے۔ یہ عین وہ زمانہ تھا کہ میں لکھنؤ کے ہمہ وقتی ہنگاموں سے اکتا کر اور تنگ آکر لکھنؤ سے ۴۰، ۴۲ میل دور اپنے آبائی وطن قصبہ دریاباد ضلع بارہ بنکی کو منتقل ہو آیا تھا۔ لیکن محمد علی کا نام سن کر کیسے نہ آتا۔ بہ قول شخصے سر کے بل آیا۔''

ایک دوسرا اقتباس آپ بیتی سے ملاحظہ ہو:

''مولانا محمد علی کو زندگی بھر اپنا سیاسی پیشوا سمجھتا رہا۔ ان کے فہم و اخلاص دونوں پر سو فیصدی اعتماد تھا۔ ان کے بعد سے کوئی لیڈر اس پایہ کا نہ ملا۔''

ذاتی ڈائری جلد دوم میں مولانا رقم طراز ہیں:

''محمد علی ضابطہ سے تو مرشد نہ تھے لیکن ان کی رضا جوئی اپنے کو ایسی ہی مقصود و مطلوب رہتی جیسے مریدوں کو اپنے مرشدوں سے رہتی ہے۔''

غرض کہ مولانا محمد علی کے اصرار پر وہ اس دور کی عظیم الشان خلافت تحریک میں باقاعدہ طور پر شامل ہو گئے اور ان کے توسط سے عملی سیاست میں سرگرم حصہ لیا۔

''۱۹۲۵ء میں محمد علی ہی کی رفاقت اور کشش کھینچ کر اس حلقہ کے اندر لائی۔ شرکت کی

تبلیغ زبانی گفتگوؤں میں بارہا کرتے رہے تھے۔ اکتوبر ۱۹۲۵ء میں مرکزی خلافت کمیٹی کا ممبر منتخب ہوا۔ خلافت کمیٹی کا عروج اس وقت تک ختم ہو چکا تھا، اس پر بھی مرکز کی ممبری بڑے اعزاز کی چیز تھی۔ نومبر ۱۹۲۵ء میں لکھنؤ کے کارکنان خلافت خصوصاً چودھری خلیق الزماں نے یک بیک صوبہ اودھ کی خلافت کمیٹی کی صدارت کا بار سر پر رکھ دیا۔"

نامناسب نہ ہوگا اگر مختصر الفاظ میں مسئلہ خلافت پر بھی روشنی ڈال دی جائے۔ تحریک خلافت کی بنیاد مسئلہ خلافت و مقامات مقدسہ کے بارہ میں ان وعدوں اور معاہدوں کے ایفا و تکمیل کا مطالبہ تھی جو پہلی جنگ عظیم کے دوران برطانوی حکومت نے مسلمانان عالم اور خاص طور پر ہندوستانی مسلمانوں سے کئے تھے۔ سلطنت ترکی جنگ عظیم اول میں برطانیہ کی حریف تھی۔ اس کا حکمراں خلیفۃ المسلمین مانا جاتا تھا اور اس کے زیر اقتدار جزیرۃ العرب بھی تھا۔ جس میں مسلمانوں کے مقامات مقدسہ واقع ہیں۔ قوی اندیشہ تھا کہ ترکی کی شکست کے نتیجہ میں خلیفۃ المسلمین کی سیاسی حیثیت کے ساتھ ساتھ اس کی روحانی حیثیت بھی خطرہ میں پڑ جائے گی اور اس کے اقتدار سے مقامات نکل جائیں گے۔ برطانوی حکومت نے مسلمانان ہند کی اسی فکرمندی کو پوری طرح محسوس کرتے ہوئے جنگ کے بارہ میں اپنی پالیسی کا ہندوستان میں وائسرائے ہند کے ذریعہ برطانیہ میں وزیر اعظم کی پارلیمنٹ میں تقریر کے ذریعہ صاف اور واضح الفاظ میں اعلان کیا کہ جنگ مذہبی نہیں ہے اور اس کے دائرہ سے مقامات مقدسہ کو دور رکھا جائے گا۔ نیز خلیفہ کی مذہبی حیثیت کو مجروح نہ ہونے دیا جائے گا۔ ۱۹۱۸ء میں برطانیہ کی فتح اور ترکی کی شکست کے بعد برطانیہ کے تیور بدل گئے اور مسلمانان ہند سے کئے گئے وعدوں سے مکر جانے کے قرائن وشواہد یکے بعد دیگرے نظر آنے لگے۔ چنانچہ ۱۹۱۹ء میں اسی شہر لکھنؤ میں خلافت کمیٹی کی بنیاد پڑی۔ اس وقت علی برادران بیتول جیل میں نظر بند تھے لیکن جب سے باہر نکلے خلافت کمیٹی پر ایسا چھاگئے کہ لوگ اس کے بانیوں کو بھول ہی گئے اور زبانوں پر صرف محمد علی، شوکت علی کے نام رہ گئے۔ یہ خلافت کمیٹی کے مرادف اور خلافت کمیٹی ان کے مرادف۔ خود تحریک خلافت ہی کیا تھی؟ ایک دوسرا نام علی برادران کا یا عام فہم و عام پسند لفظوں میں محمد علی شوکت علی کا۔

تحریک خلافت کا یہ پہلو خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ اس سے ہمارے ملک میں آزادی

کامل کی بنیاد پڑی اور ہندو مسلم اتحاد کا بیج بویا گیا۔ پہلی مرتبہ ہندوستان برطانیہ کی رعایا ہونے پر فخر کرنے کی ذلت سے نکلا اور ہر باشندۂ ملک نے خودداری اور خوداعتمادی کی فضا میں اپنے کو ہندوستانی کہنے پر شرم نہ کرنا دریافت کیا۔ قاضی عدیل عباسی مرحوم کے الفاظ میں:

''تحریک خلافت ایک مشعل تھی جس نے ہندوستان کے ضمیر کو روشن کیا اور اسی اجالے میں اس نے اپنے آپ کو دیکھ لیا اور پالیا۔ جو نظارہ ہندو مسلم اتحاد کا اس تحریک کے زمانہ میں دیکھنے میں آیا وہ اپنی مثال آپ تھا۔ تحریک آزادی نے عوام کے دل و دماغ پر قبضہ کرلیا تھا۔ اب ہر طرف ایک ہی جذبہ تھا کہ انگریز کو ہندوستان سے نکال باہر کیا جائے۔''

اب آیئے ذرا اس بات کا جائزہ لیا جائے کہ مولانا دریابادیؒ پر جن کا مزاج مطلق سیاسی نہ تھا ایک بڑی سیاسی جماعت میں باقاعدہ طور پر شامل ہوکر اور اس میں اہم اور ذمہ دار عہدے پر فائز ہونے کے بعد کیا گزری اور انہوں نے کیسا محسوس کیا۔

خلافت کمیٹی کا صدر دفتر بمبئی میں تھا لیکن جلسوں کے لئے سہولت کے خیال سے کوئی مرکزی ہی مقام اختیار کیا جاتا تھا۔ تقریباً ہر جلسہ میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ اس پر قومی اور اسلامی ہند کے عظیم الشان ادارہ کی کارفرمائیوں کو اندر سے دیکھنے کا موقع ملا۔

ایک دوسری جگہ تحریر کرتے ہیں:

''میں اکتوبر ۱۹۲۵ء میں نیا نیا مرکزی کمیٹی کا ممبر بنا تھا۔ کچھ تو تازہ تازہ جوش و شوق اور کچھ محمد علی کی ذاتی کشش۔ ہر بار ساڑھے تین سو میل کے فاصلہ سے دوڑ کر دریاباد سے دہلی آتا۔''

ہر جماعت و ادارہ کو مختلف نشیب و فراز سے گزرنا پڑتا ہے۔ مولانا دریابادیؒ جب خلافت کمیٹی میں باضابطہ طور پر داخل ہوئے تو یہ زوال پذیر ہوچکی تھی۔ تحریک خلافت کا زور ۱۹۲۲ء میں ہی گھٹ گیا تھا اور ۱۹۲۵ء میں تو تحریک نیم مردہ ہوچکی تھی۔ محمد علی ذاتی ڈائری حصہ اول میں مولانا رقم طراز ہیں:

''یہ نیاز مند، بے عمل و پست ہمت اس کے دور عروج میں تو اس سے چھٹکا چھٹکا پھرا۔ اب محمد علی کی مروت اور تعمیل ارشاد میں مجبوراً اس میں شرکت کرنا پڑی اور کچھ عملی حصہ

لینا پڑا۔ یار لوگوں نے کوئی ذمہ داری کا عہدہ بھی سرمنڈھ دیا۔ اس کی تفصیلات تو اب یاد نہیں۔ اتنا یاد ہے کہ اس نئی اور اہم ذمہ داری کے سر آپڑتے پر جولائی ۱۹۲۵ء کے مہینہ میں محمد علی کو لکھا: "اپنی قسمت کو کیا کہئے کہ یہ فرض اپنے حصہ میں آیا تو اب جب کہ فضا بالکل ٹھنڈی ہو چکی ہے اور کوئی ولولۂ عمل کہیں باقی ہی نہیں رہا۔" محمد علی نے جواب میں لکھا: "کام کا وقت تو یہی ہے۔ اس وقت تو ایک سیلاب تھا اور سب ہی اس میں بہے چلے جا رہے تھے۔ اب کام کرنا عزیمت کا ثبوت ہے۔"

سیاست میں اختلافات اور آویزش ناگزیر ہوتی ہے۔ مولانا دریابادیؒ کو بھی اس کا سامنا کرنا پڑا۔ ذاتی ڈائری حصہ اول میں مولانا تحریر کرتے ہیں:

> "مولوی ظفر الملک بھی ان ہی لوگوں میں تھے جو حمایت ابن سعود میں غلو رکھتے تھے اور ہماری خلافت کمیٹی کے خاص رکن تھے۔ ان سے آویزش ناگزیر سی ہو گئی اور پھر سچ (صدق کا پرانا نام) کے مہتمم اور عقل کل بھی وہی تھے۔ مجھ سا عافیت پسند بھلا جھگڑوں بکھیڑوں کا کہاں عادی۔ جی میں یہی آیا کہ سچ کی ایڈیٹری اور خلافت کمیٹی کی صدارت دونوں ہی سے استعفا داخل کر دیا جائے۔ اکتوبر ۱۹۲۶ء کے آخری ہفتہ میں مولانا کو خط لکھا کہ ان دونوں باتوں کی اجازت مرحمت ہو۔ ہمدرد کے اسٹاف کے ایک صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا خط موصول ہوا۔ اس میں یہ الفاظ تھے۔
>
> خلافت کمیٹی کے استعفے پر بہت ناراض ہوئے۔ فرماتے ہیں کہ یہ وقت نہیں کہ آپ اس طرح علیحدہ ہو جائیں۔ مخلصین کو دل شکنی اور حوصلہ فرسا تجربات ہوتے ہی رہتے ہیں تو پھر کیا ان سے گھبرا کر کام چھوڑ دیا جائے۔"

اب ذرا خلافت کمیٹی کے اس اجلاس کے بارہ میں بھی کچھ بات کر لی جائے جو اسی شہر لکھنؤ میں ۱۹۲۷ء میں ہوا اور جس کے صدر استقبالیہ مولانا دریابادیؒ تھے۔ اب وہ زمانہ آ گیا تھا کہ نہ کہیں خلافت کانفرنس ہوتی تھی اور نہ کہیں خلافت کے ممبر ہی باقی رہ گئے تھے۔ بہرحال آخر ۱۹۲۶ء میں مرکز خلافت کمیٹی نے طے کیا کہ خلافت کانفرنس کا اجلاس ایک بار پھر ہو اور اب کی اس کے ضمیمہ کے طور پر مؤتمر عالم اسلامی کا اجلاس بھی رکھا جائے۔ مقام اجلاس کے لئے قرعۂ انتخاب لکھنؤ کے نام پر پڑا اور تاریخیں اخیر فروری کی قرار پائیں۔ اس وقت خلافت کمیٹی کی حیثیت عوام

کی نظروں میں کیا رہ گئی تھی اس کا ذکر خود مولانا نے نہایت دل چسپ انداز میں ذاتی ڈائری میں اس طرح کیا ہے:

''شہر میں اشتہار تقسیم کرنے کے لئے ہمارے والینٹروں کی وہ ٹولی جب اکوں پر اور پیدل باجہ بجاتی ہوئی نکلی تو مجھے وزیر گنج کی ایک بوڑھی کا فقرہ نہیں بھولتا۔ سڑک پر یہ مختصر جلوس دیکھ پکار کر بولی ''اے لو خلافت پھر نکلی۔'' عوام کے دل سے اس کا تصور مٹ چکا تھا۔ اب جو نام سنا تو جیسے بھولا ہوا خواب یک بیک پھر یاد پڑ گیا۔''

چونکہ مولانا اودھ خلافت کمیٹی کے منتخب صدر تھے اس لئے لکھنؤ میں ہونے والی اس کانفرنس کی استقبالیہ کمیٹی کا صدر بھی مولانا کو بنایا گیا۔ اس بارہ میں مولانا لکھتے ہیں:

''وہی پہلی صدارت میرے مذاق طبیعت کے کیا موافق تھی۔ یہ دوسری تو سراسر عملی اور انتظامی قسم کی خدمت تھی۔ ہر وقت کی دوڑ دھوپ کی طالب اور سب سے بڑھ کر چندہ وصول کرنے کی مہم۔ اس پر اپنے تجربے قلم بند کرنے بیٹھوں تو خود ایک مستقل مقالہ تیار ہو جائے۔ بہر حال میں نے یہ ساری ذمہ داریاں اپنے مذاق کے خلاف جو قبول کیں تو اس کی تہ میں زیادہ تر دخل اسی جذبہ کو تھا کہ محمد علی کی خوشی اسی میں ہے۔ محمد علی ضابطہ سے مرشد نہ تھے لیکن ان کی رضا جوئی اپنے کو ایسی ہی مقصود و مطلوب رہی جیسے مریدوں کو اپنے مرشد کی ہوتی ہے۔ خیر کام تو سارے کے سارے دوسرے لوگ انجام دیتے رہے لیکن نیک نامی ضابطہ کی صدارت کی بنا پر خواہ مخواہ اپنے حصہ میں آ گئی۔ مولانا شوکت علی چندہ وصول کرنے کی گویا مشین تھے اور اس فن میں لاثانی۔ بڑے لوگوں کے ہاں جہاں جہاں گئے یہ خاکسار بھی ''تابع مہمل'' کی طرح ساتھ ساتھ لگا رہا۔ فطرت بشری کے تجربے خوب خوب حاصل ہوتے رہے۔''

اس حقیقت کے باوجود کہ تحریک خلافت کا دم واپسیں تھا لیکن کانفرنس نہایت کامیاب رہی۔ اس کے جلسے دو ڈھائی دن زور شور سے رہے۔ اس جلسہ میں کچھ ہنود حضرات بھی مولانا دریابادیؒ کی دعوت پر شریک ہوئے۔ مثال کے طور پر پنڈت کشن پرشاد کول ممبر سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی اور ایڈیٹر ہندوستان۔

مولانا نے اس موقع پر جو خطبۂ صدارت ۲۶ رفروری ۱۹۲۷ء کو لکھنؤ کے ۱۴ویں اجلاس آل

انڈیا خلافت کمیٹی کانفرنس میں پڑھا اس سے ایک اجمالی نقشہ اس وقت کی سیاسیات کا اس وقت کے مسائل کا نظر کے سامنے آجاتا ہے۔ اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا کی سیاست حاضرہ پر گہری نظر تھی۔ نہ صرف ملکی سیاست بلکہ سیاسیات عالم اسلامی سے بھی۔ خطبہ کے پڑھتے وقت اور اس کے خاتمہ پر لوگوں نے دل کھول کر داد دی۔ لیکن مولانا کے لئے سب سے بڑی اور قیمتی داد یہ تھی کہ ان کے محبوب لیڈر مولانا محمد علی نے ایڈریس کے خاتمہ پر معاً ایک کر گلے لگایا اور پیشانی پر بوسہ دے دے کر داد کے الفاظ بڑے فیاضانہ الفاظ میں صرف کر ڈالے۔

غرض کہ مولانا محمد علی کے شدید اصرار پر مولانا دریابادی تحریک خلافت کے پلیٹ فارم سے عملی سیاست کی خار دار وادی میں داخل ہوئے اور کچھ برسوں تک اس میں سرگرم عمل رہے اور اس مختصر مدت میں انہوں نے اپنی ہمہ گیر شخصیت کے نقوش اس شعبہ میں بھی ثبت کئے جو آج تاریخ کا حصہ ہیں۔ ان کی سیاسی تربیت اور سیاسیات سے واقفیت میں مولانا محمد علی کا اہم حصہ رہا اور اس کا اعتراف مولانا نے متعدد بار اپنی تحریروں میں کیا ہے مثال کے طور پر ایک اقتباس ذاتی ڈائری جلد اول سے ملاحظہ ہو:

> ''سیاسی تربیت اور واقفیت محمد علی کے ساتھ رہ کر چند روز میں جتنی حاصل ہو جاتی تھی وہ بجائے خود ایک نعمت تھی اور واقفیت صرف سیاسیات ہندی سے نہیں بلکہ سیاسیات عالم سے بھی خصوصاً سیاسیات عالم اسلامی سے۔''

خلافت کمیٹی کے علاوہ اس وقت جو دوسری بڑی سیاسی جماعتیں مثلاً انڈین نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ میدان میں تھیں ان سے مولانا دریابادی کا تعلق نہ ہونے کے برابر رہا۔ خود مولانا کے الفاظ میں:

> ''سیاسی مجلسوں میں اس ڈائری نویس کو زیادہ دلچسپی کبھی نہیں رہی۔ خلافت کمیٹی کی صورت ایک استثناء کی تھی۔ مسلم لیگ کا نہ کبھی ممبر رہا۔ نہ کسی جلسہ میں تماشائی کی حیثیت سے بھی شریک ہوا۔'' (حصہ اول: ص: ۲۹۸)

اپنی آپ بیتی میں مولانا نے لکھا ہے:

> ''ان کے (محمد علی کے) بعد سے کوئی لیڈر اس پایہ کا نہ ملا اور اسی لئے بعد کی کسی تحریک مسلم لیگ وغیرہ میں عملاً نہ شریک ہوا۔''

ایک جگہ اور لکھتے ہیں:

''پاکستان کے قیام کا میں اصولاً حامی تھا کہ اس سے مسلمانوں کو ایک ہوم لینڈ ہاتھ آیا جاتا ہے۔ لیکن تحریک جس رخ پر چلی اور جو جو مرحلے پیش آتے رہے ان سے میرا کوئی تعلق کبھی نہیں رہا اور تقسیم ملک کا انجام مسلمانانِ ہند کے لئے اتنا دردناک اور الم انگیز ہوگا۔ اس صورت حال کا تو کوئی اندازہ ہی نہیں تھا۔''

مولانا دریابادیؒ اور علامہ شبلیؒ

حافظ عمیر الصدیق دریابادی ☆

علامہ شبلی کے اوصاف وکمالات میں ایک بڑی خوبی مردم شناسی بلکہ جوہر شناسی بھی ہے ان کے تلامذہ اور فیض یافتگان کے نام ہی علامہ کی نگاہ جوہر شناس کی قدر وقیمت کے لئے کافی ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادی بھی شبلی کے اس نظام شمسی کے ایک اہم کوکب وسیارے کی حیثیت کے حامل ہیں، مولانا دریابادی، مفسر قرآن مجید، سوانح نگار، انشا پرداز، ادیب وصحافی کی حیثیت سے محتاج تعارف نہیں، وہ صاحب طرز تھے اور ایک منفرد اسلوب کی وجہ سے اردو زبان وادب میں ان کا بلند پایہ مقام ہمیشہ کے لئے متعین ہو چکا ہے، اپنی شخصیت کی تعمیر وتشکیل میں انہوں نے جن ہستیوں کا ذکر احسان وتشکر کے جذبے کے ساتھ کیا ہے، ان میں سرفہرست علامہ شبلی کی ذات گرامی ہے، انہوں نے اپنی آپ بیتی میں قدرے تفصیل سے اور دوسرے مضامین میں بار بار علامہ شبلی کی یادوں کو جس طرح بیان کیا ہے اس کی تفصیل بڑی دلچسپ ہے، علامہ شبلی کے ان کے نام اکیس خطوط بھی مکاتیب شبلی میں شامل ہیں جن سے ان دونوں اکابر کے تعلقات کی نوعیت واضح ہوتی ہے۔

مولانا دریابادی کا سال پیدائش ۱۸۹۲ء ہے یعنی ان کی ہوش کی آنکھیں اس عالم میں کھلیں جب علامہ شبلی کی شہرت کا آفتاب نصف نہار پر تھا۔ ۱۹۰۶ء میں مولانا کی عمر ۱۴ سال کی تھی اس وقت انہوں نے پہلی بار رسالہ الندوہ کی زیارت کی اور ساتھ ہی صاحب الندوہ علامہ شبلی کی بھی، پہلی نظر سے ہی انہوں نے دل وجان سے شبلی کا کلمہ پڑھا اور علامہ کا علم وفضل اسلوب، زبان اور طرز بیان سب ان کے دماغ پر چھا گئے اور بقول مولانا کہنا چاہئے کہ علمی وقلمی زندگی کا دور اسی وقت شروع ہو گیا۔ ۱۹۰۸ء میں ان کا پہلا مضمون وکیل امرتسر میں محمود غزنوی کی حمایت میں شائع

☆ رفیق دارالمصنفین، اعظم گڑھ، یوپی۔

ہوا۔ جس کے متعلق انہوں نے لکھا کہ یہ علامہ شبلی کے رنگ اوران ہی کے تتبع میں تھا، لیکن ۱۹۰۱ء میں جب مولانا دریابادی کی تعلیمی زندگی اسکول سے کالج میں بدلی تو عقائد وخیالات میں بھی انقلاب آیا، ایمان واسلام کی جگہ مغربی فلاسفہ کے زیر اثر تشکیک وارتیاب بلکہ الحاد تک کا دور شروع ہوا، اس دور میں شبلی پر اعتقاد بھی زد میں آیا اور انہوں نے اس کا اظہار اس طرح کیا کہ الکلام پر ایک طویل تنقید سپرد قلم کی، لیکن شبلی کا رنگ اس طرح چھاچکا تھا کہ اس تنقید کا انداز شبلی ہی کا تھا، یہ انداز کیا تھا مولانا کے الفاظ میں بجائے مناظرانہ ومجادلانہ کے بس علمی وادبی، اسی لئے اس مضمون کی شہرت بھی خوب رہی، کتاب پر تنقید لیکن صاحب کتاب کی تعریف وتحسین کی اس کشمکش میں یہ واقعہ بھی دلچسپ ہے کہ ۱۹۱۲ء میں انہوں نے بکلیے پر اردو میں ایک کتاب لکھی، اس کا مسودہ خود بڑی محنت سے خوش خط لکھا اور سرورق پر اسے علامہ شبلی کے نام علمی وتصنیفی محسن کے جملے سے معنون کیا، یہ مسودہ سالہا سال تک محفوظ رہا لیکن جب ان کے افکار کامد، جزر پر آیا تو یہ مسودہ بھی اس کی نذر ہوگیا، مولانا نے خود ہی دین داری کے جوش میں اسے چاک کر ڈالا، بعد میں ان کو اس کا افسوس بھی ہوا۔ دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ الکلام پر سخت تنقید کے بعد علامہ شبلی کے رویہ اور معاملے میں فرق نہیں آیا، علامہ شبلی کی دوررس نگاہ نے شاید یہ دیکھ لیا تھا کہ یہ جوہر قابل ایک دن کامل بن کر ہی رہے گا۔ چنانچہ عین الحاد ودہریت کے اس زمانہ شباب میں یعنی ۱۹۱۲ء میں علامہ نے سیرۃ النبیؐ کے کام کے سلسلے میں انگریزی معلومات کے لئے اپنے اسٹاف میں لے لیا، ایک معقول معاوضہ دیا، اور حیرت تو یہ ہے کہ بعض انگریزی کتابوں کے نام بھی علامہ نے ہی بتائے، مولانا دریابادی نے مولانا کے اس عمل کے متعلق لکھا کہ یہ احسان عمر بھر بھولنے والا نہیں شہرت تو خود خریدار اور قدرداں دینے لگتی ہے، یہ قدر تو اس وقت ہوتی ہے جب مصنف نوآموز وگمنام ہوتا ہے۔ مولانا نے لکھا ہے کہ علامہ کا یہ احساس تو تھا لیکن علامہ کا فیض صحبت بجائے خود ایک نعمت تھا۔

۱۹۱۲ء ہی میں علامہ شبلی کے پہلے خط کا پتہ چلتا ہے جو انہوں نے بمبئی سے مولانا دریابادی کے نام لکھا اور یہ سلسلہ علامہ کے انتقال سے چند ماہ قبل تک جاری رہا، لکھنؤ میں قیام کی وجہ سے اکیس خطوط میں زیادہ تر دستی رقعے بھی ہیں، پہلے خط میں محبی کے لفظ سے تخاطب ہے لیکن ایک سال بعد ہی جناب من اور جناب ماجد زاد لطفہ اور پھر مکرمی جیسے الفاظ کا بھی اضافہ ہوگیا، ان خطوط میں علامہ شبلی کے افکار ومعانی کا ایک جہان آباد ہے طرز شبلی کا سحر بھی کم نہیں، ایک خط میں لکھا کہ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ خوش خط ہیں لیکن میری ضعف بصارت متدعی ہے کہ ذرا

جلی لکھئے، کبھی یہ نکتہ سمجھاتے ہیں کہ مارگولیوتھ کا پایہ عربی زبان سے بہت بلند ہے، وہ اس مکار کا خوشہ چین نہیں، اس کی وسعت نظر بے انتہا ہے گرچہ اسی کے ساتھ سخت بددیانت اور غلط نتائج نکالنے والا ہے، میور کے ماخذ بالکل ضعیف و ناقابل اسناد ہیں، اسی طرح کبھی مولانا کی ہمت افزائی اس طرح کی کہ دوسری قسط بھی ترجمے کی پہنچی، ترجمے کی خوبی مستغنی عن الوصف ہے، آپ صرف مترجم ہی نہیں بلکہ مصنف بھی ہیں اس لئے آپ کے سوا کوئی اور شخص مشکل سے میرے ارادوں اور خواہشوں کے موافق کام کر سکے گا، لیکن حکیمانہ ہمت افزائی کے ساتھ اس تنبیہ کا کیا جواب، کہ ترجمے میں آنحضرت ﷺ کے متعلق واحد کی ضمیر نہ استعمال کیجئے، بلکہ جمع کی شبلی کے ضمیر کی پاکی اور آنحضرت ﷺ سے ان کے بے پناہ عقیدت کے اظہار کے لئے سیرۃ النبی نہ بھی ہوتی تو یہ جملہ ہی کافی تھا، اس خط سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اب علامہ شبلی کے دربار تقرب میں مولانا دریابادی کا مقام اور بڑھ گیا تھا، اب تکلف کے پردے اٹھ رہے تھے، عزیزانہ انداز غالب تھا لکھا کہ میں اپنے مستقل قیام گاہ کا فیصلہ ابھی نہ کر سکا، ممکن ہے کہ پیری اور ضعف کی بدہمتی مجھ کو وطن کی پابندی اور یہ شہر خود روم و شہریار خود باشم پر آمادہ کرے، وہاں مکان ہے، رعایا ہے، احباب ہیں، عزیز ہیں غرض ایثار کے سوا سب کچھ ہے اسی طرح ۱۹۱۴ میں ایک دستی خط میں لکھا کہ اب تو آپ کے احسانات فوق الحد ہوتے جاتے ہیں سیرۃ النبی کے اس کام میں مولانا دریابادی کی معاونت بعض لوگوں کے لئے بہانہ بنی کہ ریاست بھوپال میں شکایت کی جائے اور سیرۃ کی تالیف کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کی جائیں، اس وقت مولانا دریابادی تو خیر ملحد تھے ہی ان سے تعلق کی سزا علامہ شبلی کو اس طرح ملی کہ مولویوں نے چار پانچ کفر کے فتوے بھوپال بھجوا دیئے۔ اس پر ایک سطر میں علامہ نے مولانا دریابادی کو بمبئی سے لکھا کہ یہ ہے ہمارا خلوص، خیر زمانہ گو حقیقت شناس نہیں ہے تاہم سچ ہمیشہ نقاب میں نہیں رہے گا۔ بمبئی سے ایک خط اور بھی ہے یہ اسی سال کا ہے جس کے آخر میں علامہ شبلی اس دنیا سے رخصت ہوئے، ندوے کے معاملات میں چند باتیں لکھ کر فرماتے ہیں کہ رہا نصاب تعلیم تو اسے زمانہ خود درست کر لے گا، ندوہ دیوبند نہیں بن سکتا اور خود دیوبند کب تک دیوبند رہ سکتا ہے، اس طرح ۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۴ء تک علامہ شبلی سے استفادہ کی مدت کل آٹھ سال کی ہے، لیکن اس مختصر مدت نے مولانا دریابادی کے ایمان و عقیدہ بلکہ ان کی آئندہ کامیاب ترین مذہبی و علمی وادی کو اس طرح راہ مستقیم پر لا دیا کہ عمر بھر مولانا دریابادی اس احسان کا اعتراف کرتے رہے، انہوں نے بار بار لکھا کہ لکھنے لکھانے کا فن کسی سے اور کبھی بھی

نہیں سیکھا، حقیقی معنوں میں بالکل بے استاد اہوں، نہ کسی کی شاگردی اختیار کی نہ کسی سے اصلاح لی، پھر بھی اگر کسی کے لئے لفظ استاد صاحب اطلاق کرسکتا ہوں تو وہ بلاشک وشبہ مولانا شبلی تھے، ان کا ممنون احسان دل کی گہرائیوں سے ہوں لکھنا لکھایا جو کچھ بھی آیا ان کی نقالی میں آیا، برسوں ان کا چربہ اتارتا رہا ہوں، ان کے فقرے کے فقرے ترکیبوں کی ترکیبیں نوک زبان تھیں، لکھتے ہیں کہ اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، حسن ترتیب صفائے بیان ان کا حصہ تھیں، اب بھی میرا مشورہ مبتدیوں کے لئے یہی ہے کہ ہر علمی سنجیدہ مضمون نگاری اگر سلیس انداز میں سیکھنا ہے تو مولانا ہی کی کتابوں سے سیکھئے، مضمون نگاری ہی کیا سخن فہمی اور سخن سنجی کے لئے بھی وہ بس علامہ شبلی کو ہی معیار کامل سمجھتے ہیں، لکھتے ہیں مولانا کے اور کمالات جو تھے، وہ تو تھے ہی، میری نظر میں ان کا شاید سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ وہ شعر کے مصراعلیٰ درجہ کے تھے، میں یہ کیا کرتا کہ جو شعر ادھر ادھر سے کان میں پڑ جاتا اسے کسی طرح مولانا کو ضرور سنا دیتا انہوں نے اگر پسند فرمالیا تو بس مجھے بڑی سند ہاتھ آجاتی اور اگر انہوں نے داد نہ دی تو وہ شعر میری نظر سے بھی گر جاتا، غرض مولانا نے جس طرح نثر نویسی میں مولانا کے مقالوں اور کتابوں سے جی بھر کر استفادہ کیا اسی طرح سخن فہمی میں بقول ان کے تھوڑی بہت جو تمیز حاصل ہوئی وہ مصنف شعرالعجم اور موازنہ انیس ودبیر کی حاشیہ نشینی سے ہی حاصل ہوئی، مولانا نے ایک بات اور لکھی کہ علامہ کی عادت کبھی اس موضوع پر طویل گفتگو کی نہ تھی، کوئی شعر پڑھ کر بس اس کی مختصر تشریح کردیتے اور یہی بالکل کافی ہوجاتا، سارا مغز ان چند لفظوں کے اندر آجاتا۔

شبلی فہمی کے لئے مولانا دریابادی کے ان اعترافات کی اہمیت علامہ شبلی کے کسی سوانح نگار سے کم نہیں خاص طور سے ان کے اس مضمون کا ذکر ضروری ہے جو انہوں نے دارالمصنفین کی گولڈن جوبلی کے موقع پر شبلی، انسان، مصنف، مصنف گر کے عنوان سے لکھا، یہ مضمون تو اس لائق ہے کہ شبلی کی یاد کے ہر موقع پر اس کی بازخوانی کی جائے، شبلی کی شخصیت اور ان کے مرتبہ ومنزلت پر اس مضمون کا ہر جملہ بس پڑھنے کے لائق ہے، کبھی لکھتے ہیں کہ ہوش کی آنکھیں کھلی ہی تھیں کہ کانوں میں نام مولانا شبلی کا عظمت وتوقیر کی راہ سے پڑنے لگا، اکثر حالی کے ساتھ عطف ہوکر اور کبھی ان سے ہٹ کر بلکہ کبھی کٹ کر بھی، کبھی لکھتے ہیں کہ مولانا، دینی غیرت مندی کے پتلے تھے، خود عبادات میں چاہے ڈھیلے ہوں، بعض عقائد کی تاویل میں بھی چاہے عقل پرستوں کی صف میں جا ملے ہوں لیکن جہاں تک دین کی حمیت وغیرت کا سوال ہے ان کے قدم کسی بڑے

سے بڑے منقولی بزرگ سے پیچھے نہ ہوں، مولانا کا سب سے بڑا وصف ان کا مشغلہ علم تھا، فن تصنیف میں ان کو یکتائی حاصل تھی، مولانا لکھتے ہیں قلم پر یہ قدرت وہ بھی ایسی ہمہ گیر، اس جامعیت کے ساتھ کمتر ہی کسی مصنف کے نصیب میں آتی ہے، پڑھنے والے گویا موم کی گڑیا ہیں کہ لکھنے والے نے جب اور جدھر چاہا ان کی ناک موڑ دی اور انہیں پتہ بھی نہ چلنے پایا۔

کبھی لکھتے ہیں شبلی علمی مضمون ادا کرنے کی حیثیت سے اپنی بس آپ نظیر ہیں، اب ان کے زمانے کو بھی اتنا عرصہ گزرا، اتنے دنوں میں زبان کہاں پہنچ گئی، محاورے بدل گئے، ترکیبیں نئی نئی چل پڑیں لیکن شبلی کے طرز اسلوب پر اوس اب تک نہیں پڑنے پائی، لیکن جو بات سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ ہے علامہ شبلی کی مذہبیت، مولانا دریابادی نے لکھا کہ یہی مذہبیت ان کی تصنیفی زندگی پر چھائی ہوتی تھی وہ کچھ بھی لکھیں، متکلم سب سے پہلے اور کچھ بعد کو تھے، اور اس کے ساتھ شرافت اور متانت یہ دو وصف تو جیسے شبلی اپنے قلم کو ساتھ لئے پیدا ہوئے تھے، ہزاروں صفحے ان کی تحریروں کے پڑھ جایئے اور ان میں تحریریں ہر دور کی اور ہر موضوع پر، نہ کہیں کوئی لفظ مبتذل ملے گا اور نہ کہیں کوئی ایسا محاورہ یا ترکیب جس کا بولنا ثقہ زبانوں پر بار ہو، جس کا سننا شریفوں کے لئے باعث عار ہو۔

شبلی و ماجد کی یہ داستان دراز ہوتی جائے گی، اس وقت بس اتنا ہی ــــ

مولانا دریابادیؒ—ایک ہمہ جہت مجاہد بالقلم

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن رازؔ☆

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کا شمار بیسویں صدی عیسوی کے اہم ادیبوں، عالموں اور دانشوروں میں ہوتا ہے۔ وہ ایک صاحب علم وقلم فنکار تھے، صحافت ان کا اوڑھنا بچھونا تھا اور علم وتقویٰ سے بھی ان کا بھرپور رشتہ تھا۔ وہ ایک صاحب طرز انشاء پرداز اور صائب الرائے عالم دین تھے۔ ان کی علمی زندگی میں فلسفہ، تحقیق، ادب، مذہب، سیاست، صحافت اور تصوف وغیرہ سب ملے جلے اور گھلے ملے تھے۔ وہ آپ بیتی میں ایک جگہ رقم طراز ہیں: ''بالکل ابتدائی دور کو اگر نظر انداز کردیا جائے اور عمر کے اٹھارہویں سال سے اگر حساب رکھا جائے تو میری تصنیفی عمر اب ۵۶، ۵۷ سال کی ہوتی ہے۔ اخباری کتابی سارے مسودات تحریر کی کوئی میزان لگائے تو نوبت ہزارہا مضامین سے کچھ اوپر کی یقیناً آجائے گی۔ آگے لکھتے ہیں: حقیقی معنی میں بالکل بے استادا ہوں۔ نہ کسی کی شاگردی اختیار کی۔ نہ کسی سے اصلاح لی۔ لیکن دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ زندگی کے مختلف دوروں میں متاثر بہتوں کی تحریروں سے رہا ہوں اور شعوری ولاشعوری تقلید خدا معلوم کتنوں کے قلم کی ہے۔ بالکل بچپن میں یہ اثر مولوی احسان اللہ عباسی چریا کوٹی ثم گورکھپوری صاحب الاسلام وتاریخ اسلام وغیرہ تک محدود رہا پھر نمبر مولوی ثناء اللہ امرتسری، مولوی حکیم نورالدین احمدی اور مولوی نذیر احمد دہلوی کا آیا۔ اس کے بعد دور خواجہ غلام الثقلین، ظفر علی خاں اور مولوی عباداللہ عمادی کا رہا۔ اور محض ادب وزبان کی حیثیت سے قائل محمد حسین آزاد، ابوالکلام آزاد، سجاد حسین (اودھ پنچ)، راشد الخیری، ریاض خیرآبادی، عبدالحلیم شررؔ، رتن ناتھ سرشار، محمد علی، سید محفوظ علی اور خواجہ حسن نظامی کا رہا ہوں۔ خیر یہ تو سب میرے بڑوں میں ہوئے۔ برابر والوں میں اثر کچھ نہ کچھ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا

☆ رکن تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند (دوحہ قطر)۔

مودودی، مولانا عبدالباری ندوی۔ اور جہاں تک ادب وانشاء کا تعلق ہے قاضی عبدالغفار اور سید ہاشمی فرید آبادی کا (اثر) قبول کیا ہے۔ بلکہ چھوٹوں میں بھی رشید احمد صدیقی کا۔ اس وقت یہی نام خیال میں آرہے ہیں ان کے علاوہ بھی کچھ اور ضرور ہوں گے...... رہی انگریزی...... اپنی طالب علمی بھر شغف مل اور اسپنسر اور اس کے بعد بکسلے کی تحریروں کا رہا۔ انہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھتا اور قدرتاً نقل انہیں کے انداز بیان کی کرتا رہا۔ آخر میں رنگ ولیم جیمس (امریکی) کا چڑھ گیا تھا۔ اس دور کے خاتمہ پر اپنے لوگوں میں سب سے زیادہ گرویدگی ایڈیٹر کامریڈ (محمد علی) کی تحریروں سے ہوئی اور پھر ایڈیٹر ینگ انڈیا (گاندھی جی) کے انداز عبارت سے۔ آخر میں جب انگریزی ترجمۂ قرآن کی باری آئی تو سب سے زیادہ جاذب نظر مار ماڈیوک پکتھال کی زبان نظر آئی۔'' (آپ بیتی، ص: ۳۰۶، ۳۰۹)

ایک دوسرے عنوان کے تحت مولاناؒ نے مذکورہ شخصیتوں کے ساتھ اپنے کچھ دیگر موثرین محسنین اور کرم فرماؤں کے نام بھی گنوائے ہیں ان میں سرسید احمد خان، الگزینڈر بن (BIN) حضرت اکبرالہٰ آبادی، ڈاکٹر بھگوان داس، مسزانی بیسنٹ، ٹیگور، تلک اور آربندو گھوش، مولوی عبدالاحد کسمنڈوی، مولوی عابد حسین فتح پوری، مولانا حسین احمد مدنی، حضرت اقبال، اور مولوی حاجی محمد شفیع بجنوری، بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق، افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق کرنولی، مولوی سید امین الحسن بسمل موہانی، نواب سالار جنگ حیدرآبادی، نواب علی یاور جنگ حیدرآبادی اور مہاراجہ محمودآباد سرعلی محمد خان، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صدر جمہوریہ ہند، ڈاکٹر میر ولی الدین حیدرآبادی، ڈاکٹر محمد حمیداللہ حیدرآبادی ثم فرنساوی، مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا اویس نگرامی ندوی، مولانا محمد طیب صاحب (دیوبند) اور مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا دریابادیؒ مزید فرماتے ہیں:

''تصنیفی زندگی میں اگر میں کسی کو استاد کہہ سکتا ہوں تو وہ علامہ شبلی نعمانی ہیں اور ایک ان کے خالہ زاد بھائی مولانا حمیدالدین فراہی جو کہ علم وفن کے دریا اور تقویٰ وحسنِ عمل کے پیکر، عربی ادب کے فاضل متبحر اور قرآنیات کے نکتہ شناس اس باب کے آخر میں مولانا لکھتے ہیں کہ: دو شخصیتوں نے میری زندگی کا رخ ہی موڑ دیا اگر ان کا فیض صحبت نہ نصیب ہوتا تو خدا معلوم کہاں کہاں اب تک بھٹکتا پھرتا۔ پہلا نام تو ہندوستان کے مشہور لیڈر مولانا محمد علی کا ہے۔ اور دوسری ان سے بھی اہم تر اور میرے لئے مفید تر حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی شخصیت تھی۔ ان سے مراسلت کے بعد جب نوبت دید وزیارت کی آئی تو کتنے ہی کمالات ظاہری وباطنی کھل کر رہے۔

علم وتفقہ،تصوف وشریعت کے جامع ،حسن عمل کے ایک زندہ پیکر اور ارشاد واصلاح کے فن کے تو بادشاہ۔ وقت کے دوسرے مشائخ کو ان سے کوئی نسبت ہی نہ تھی۔

تو بہار عالم دیگری
زکجا بہ ایں چمن آمدی

محمد علی اگر میرے محبوب تھے تو اشرف علی میرے مقتدا ومطاع ۔محبت کے مرکز اگر وہ تھے تو عقلیت کے مرجع یہ —''

مولانا نے جن اخباروں اور رسالوں میں مضامین لکھے ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں اودھ اخبار، ریاض الاخبار، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، البشیر (اٹاوہ) وکیل (امرتسر) الناظر (لکھنؤ) ایڈوکیٹ (انگریزی سہ روزہ) ادیب (الہ آباد) العصر (لکھنؤ) زمانہ (کانپور) نوائے کیمبرج (کیمبرج) کانفرنس گزٹ (علی گڑھ)۔ ۱۹۲۴ء سے مولانا نے ہفتہ وار ''سچ'' نکالا، پھر اس سے اختلاف ہونے پر صدق اور پھر اسے ''صدق جدید'' کے نام سے ۱۹۵۰ء سے نکالا جو غالباً اب تک چل رہا ہے۔ جیسا کہ عام طور پر مشہور ومعلوم ہے کہ مولانا پر ایک دور الحاد و بے دینی کا بھی گزرا ہے، جس سے نکلنے میں انہیں تقریباً دس سال کا عرصہ لگا اس دوران انہوں نے گوتم بدھ اور سری کرشن کی تعلیمات کا بھی مطالعہ کیا اور ٹیگور اور آربندو گھوش کی تحریریں بھی پڑھیں جن سے مادیت، لاادریت اور تشکیک کی سر بفلک عمارت دھڑام سے زمین پر آرہی اور بقول مولانا: ''دل پھر اس عقیدہ پر آگیا کہ مادیت کے علاوہ اور اس سے کہیں ماوراء و مافوق ایک دوسرا عالم روحانیت کا بھی ہے۔'' اسی دور میں مولانا شبلی کی سیرۃ النبی ﷺ کی پہلی جلد پریس سے باہر آئی جس سے ان کے سامنے رسول اکرم ﷺ کی صحیح تصویر آئی مولانا رومی کی مثنوی کے علاوہ اس دوران مولانا نے تصوف کی دیگر فارسی کتب پڑھیں، فریدالدین عطار کی منطق الطیر، جامی کی نفحات الانس اور مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات، مکتوبات سے انہیں شریعت کا واضح راستہ ملا اور پھر حضرت تھانویؒ کے فیض صحبت سے آپ نے تفسیر ماجدی مرتب کی اس طرح مولانا بہ یک وقت مؤرخ، مفسر، محدث، متکلم، متصوف اور ادیب و ناقد وصحافی ودانشور قرار پائے۔

مولانا دریابادیؒ کا اصل کارنامہ:

مولانا مرحوم کے ہمہ جہت مطالعہ اور تحقیق وتخلیق کے دائرۂ کار کا آپ حضرات کو علم ہے مگر

ان کا منفرد نمائندہ کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے انشائے لطیف کی حامل تحریروں کے ذریعہ صحافت کی راہ سے دین وایمان کی خدمت و وکالت انجام دی۔ اکبرالہٰ آبادی واقبال نے شعر وسخن کے ذریعہ اور مولانا دریابادیؒ نے صحافت وانشاء کے ذریعہ۔ اس راہ میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خاں اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی بھی ان کے ہمقدم وہمرکاب ہیں مگر مولانا دریابادیؒ کی دلچسپ اور تیکھے طنز ومزاح کی حامل تحریر عوام وخواص دونوں سے خطاب کرتی ہے گویا بقول میر:

شعر میرے نہیں گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

اردو میں سہل ممتنع نثر نگاری کی مثالیں بہت کم ہیں جن میں مولانا دریابادیؒ کی تحریریں سرفہرست ہیں۔ انشائے لطیف کی حامل تحریر علامہ نیاز فتحپوری کی بھی تھی مگر ان کا قبلہ درست نہیں وہ زیادہ تر کعبہ کی مخالفت، یا منحرف سمت میں رہا جب کہ مولانا دریابادیؒ کی تحریریں از دل خیزد بردل ریزد کی سچی مصداق ہیں۔ انہوں نے اپنے اخباروں کے نام سچ اور صدق یونہی تجویز نہیں کئے بلکہ یہی ان کا اصل جوہر تھا اسی لئے میں نے انہیں مجاہد قلم کار کہا ہے۔ اس دور میں سچائی سے متصف ہونا سب سے بڑا اجہاد ہے۔ جس طرح لطیف ظرافت کو غالب نے شاعری میں برتا اسی طرح مولانا دریابادیؒ نے اسے صحافت وانشاء میں متعارف کرایا۔ یہ تیکھا طنز ومزاح دودھاری ہوتا ہے۔ دل ودماغ کو گدگداتا بھی ہے اور جھنجھوڑتا بھی ہے۔ یہ خصوصیت مولانا کی ادبی وصحافتی تحریروں میں کم وبیش پچانوے فیصد کی نسبت سے نظر آتی ہے۔ مولانا کے طرز تحریر میں غالب جیسا تیکھا طنز اور ظرافت ہی نہیں بلکہ ان کا خطابی طرز وانداز بھی نمایاں ہے۔ اور کچھ بعید نہیں کہ یہ خاصیت کسی حد تک کسی طور پر مستعار بھی ہو۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے قرآن کی تفسیر وترجمہ مرتب کیا اور مولانا دریابادیؒ نے اس سے مستفیض ہو کر لطیف تر انداز میں اس کا خلاصہ پیش کیا جس میں مستشرقین سے ماخوذ بعض چیزوں کا اضافہ بھی کیا یہاں تک کہ ان کی تفسیر عوام وخواص دونوں کے لئے بہ اختصار وبہ آسانی اہم تفسیری معلومات کا سرچشمہ بن گئی۔

یہاں ایک نکتہ اور قابل توجہ ہے مولانا دریابادیؒ نے علی گڑھ یونیورسٹی کے ایم۔ اے (فلسفہ) میں داخلہ لیا مگر بعض وجوہ سے اس کو پورا نہیں کر سکے اور پھر بغیر ایم۔ اے کے ہی رہے۔

یہ سوچ کر کہ آئندہ کے علمی وادبی کام اس کی تلافی کردیں گے۔ راقم کا خیال ہے کہ اگر مولانا ایم۔ اے مکمل کر لیتے تو شاید اتنی تندہی سے آئندہ اتنے سب کام انجام نہ دے پاتے کیونکہ ڈگریاں لے کر کوئی منصب پالینے کے بعد عموماً تخلیقی عمل کمزور پڑ جاتا ہے۔ اسی طرح مرزا غالبؔ (راقم کی رائے میں) اگر دہلی کالج کی نوکری قبول کر لیتے تو اس کے بعد اتنے عظیم تخلیقی کارنامے شاید انجام نہ دے پاتے خصوصاً خطوط نگاری کے معاملہ میں تو یہ بات یقینی طور پر کہی جاسکتی ہے۔ ایسے موقع پر اقبال کا یہ خیال صحیح ہے۔

گر گیا سرمست مجھ کو ٹوٹ کر میرا سبو

یا

جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

بہر حال مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کا نام نامی اردو ادب وصحافت اور صالح فکری ودینی لٹریچر میں ایک تابندہ ستارے کی طرح ہمیشہ روشن رہے گا اور وہ اپنی گوناگوں خدمات وتحقیقات کے حوالہ سے ہمیشہ یاد کئے جاتے رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کے نقش قدم پر چلنے والے بہت سے اہل علم واہل قلم عالم فکر وفن واصلاح کو عطا فرمائے۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

عبدالماجد دریابادیؒ: بطور جغرافیہ نویس

مولانا مزمل حسین قاسمی☆

جغرافیہ بذات خود ایک ایسا مضمون ہے جس نے ہر زمانے میں علماء اور دانشوروں کو اپنی طرف راغب کیا ہے۔ قدیم وجدید علوم کے سنگم مولانا عبدالماجد دریابادیؒ سے بھلا یہ مضمون اچھوتا کیسے رہتا۔ مولانا نے اپنی تفسیر اور سیاحت ناموں میں اس مضمون سے بھرپور استفادہ کیا ہے اور جابجا جغرافیائی معلومات اور زمینی منظر کشی کی انوکھی تصویر پیش کی ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔ روئے زمین پر رونما ہونے والے واقعات اور ان میں تبدیلی کا مطالعہ کرنا جغرافیہ کا موضوع رہا ہے۔ یہ واقعات طبعی وفطری بھی ہو سکتے ہیں اور انسانی عمل کا نتیجہ بھی۔ سطح زمین پر اور قشر ارض میں پیدا ہونے والی تبدیلی اور ان کی وجہ سے انسانی اعمال پر پڑنے والے اثرات کا جائزہ پیش کرنا ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں ہے۔ یوں تو جغرافیائی اعمال واثرات کا تذکرہ پرانے سیاحوں سے لے کر جدید علوم کے ماہرین کی اکثر تصنیفات میں ملتا ہے لیکن اسے ایک مضمون کی حیثیت سے سمجھنا، اس کی باریکیوں کو پرکھنا اور تمام عوامل کی ہمہ گیر اثرات کا تجزیہ کرنا خصوصاً انسانی فکر ونظر پر اس کے پڑنے والے اثرات کا جائزہ لینا مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کو صف اول کے جغرافیہ نویسیوں میں کھڑا کر دیتا ہے۔ مولانا نے اپنی تفسیر ''تفسیر ماجدی جلد دوم'' کے افتتاحیہ نمبر ۲ میں تفسیر نگار کے لئے علوم عصری سے بہرہ مند ہونے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ''قرآن اگرچہ صراحۃً کہیں بھی دعوت دنیا کے چلے ہوئے علوم وفنون کی طرف توجہ نہیں دیتا۔ لیکن ساتھ ہی مطالبات ایسے کرتا ہے کہ کہیں یہ قاعدہ اشارۃ النص اور کہیں یہ قاعدہ اقتضاء النص کہ دوسرے علوم وفنون کی تحصیل کچھ ناگزیر سی ہو جاتی ہے..... قل سیروا فی الارض، اولم یسیروا فی الارض۔ ان پر عمل در آمد بغیر جغرافیہ کے میدان میں قدم رکھے کیوں کر ممکن ہے۔ ان فی خلق السمٰوات والارض واختلاف اللیل والنهار لأیات لاولی الالباب۔

☆ استاذ ٹیچر ٹریننگ کالج جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی۔

کے ذیل میں مفسر کی نظر علوم طبعی وفلکیاتی میں جتنی گہری ہوگی اس کو حکمت وصنعت تکوینی کے کیسے کیسے دلائل وشواہد ملتے جائیں گے۔ دریا اور پہاڑ، شجر وحجر، جمادات ونباتات اور حیوانات کی پیدائش کے جہاں جہاں تذکرے آئے ہیں ان کی تعیین وتحقیق نے کتنے ہی سائنسی علوم کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ یتفکرون، یفقھون اور یعلمون وغیرہ کی تاکید وتفصیل سے اگر منطق اور استدلالات فکری کی طرف رہنمائی مقصود نہیں تو اور کیا ہے؟[۱]"

مولانا نے جغرافیہ کو ایک جامد وفاصل مضمون کی حیثیت سے نہیں دیکھا ہے، بلکہ ایک محرک، زندگی سے بھرپور اور زندگی کے تمام شعبوں سے متعلق ایک جامع اور کمّی (Synthesis) مضمون کی حیثیت سے پہچانا ہے جس کی وکالت موجودہ دور کے جغرافیہ داں بھی کرتے ہیں۔ خاص کر علاقائی جغرافیہ کی تشریح میں مولانا نے اپنی کتاب جغرافیہ قرآن یا ارض القرآن میں جہاں پہاڑ، دریا، آبشار، جنگلات، ریگستان وغیرہ فطری مناظر کی تصویر کشی کی ہے وہیں وہاں کے باشندوں کی طرز زندگی اور ان کے مذہب وتمدن کا بھی خاصہ ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ...... نہ صرف قبیلہ قریش بلکہ سارے حجاز کے طور طریقوں کو پیش نظر ہونا چاہئے، ان کے رسم ورواج، عقائد واوہام، ان کے معتقدات ومزعومات، ان کے شعر وخطابت، سب سے واقفیت ہونی چاہئے۔ قریبی ملکوں سے ان کے تعلقات کی کیا نوعیت تھی، عورتوں کا ان کے یہاں سیاسی، مذہبی، معاشی ومعاشرتی مرتبہ کیا تھا۔ دولت کے کیا کیا مصرف رائج تھے۔ آقا وغلام، زردار ونادار کے درمیان تعلقات کی نوعیت کیا تھی۔ مفلس، یتیم اور مسافر کس برتاؤ کے مستحق سمجھے جاتے تھے۔ قانونی، اخلاقی ومعاشی آداب کس سطح اور کس معیار کے تھے۔ سیاسی وعمرانی رشتے ایک طرف عراق وایران، دوسری طرف شام ومصر کے ساتھ کس قسم کے تھے[۲]۔......ان باتوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ علاقائی جغرافیہ کے علاقائی عوامل وتعامل کو اس وقت بھی اپنی تحریروں میں اچھی طرح برت رہے تھے جب کہ جغرافیہ داں علاقائی تعامل جیسے نظریات کی واضح تعریف بھی نہیں کر پائے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ مولانا نے "جغرافیۂ قرآن یا ارض القرآن" کی ترتیب وتصنیف ۱۹۵۵ء میں الگ کتاب کی شکل میں کی۔

مقامات قرآن سے متعلق کتابوں میں سید سلیمان ندوی کی "ارض القرآن"، انتظام اللہ شہابی کی "جغرافیۂ قرآن" اور مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی "جغرافیۂ قرآن یا ارض القرآن" کا

ایک اجمالی تقابلی مطالعہ پاکستانی ادیب ڈاکٹر تحسین فراقی کی کتاب ''عبدالماجد دریابادیؒ احوال وآثار'' کے پانچویں باب میں افکار ماجد کے تحت کیا گیا ہے۔ان کے مطابق ان تینوں کتابوں میں قرآنی مقامات کی ترتیب کی حیثیت سے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے زیادہ موزوں (methodological) ہے۔ جہاں تک سید سلیمان ندوی کی ارض القرآن کی بات ہے تو اس کا دامن بہت وسیع ہے اس میں قرآنی مقامات کے تذکرے کے ساتھ ساتھ ان خطوں میں بسنے والی قوموں کے سلسلے میں تفصیلی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ ان کی تاریخی اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ ان کے عقائد ورسوم کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر تحسین فراقی نے اس کتاب کے موضوع کو جغرافیۂ قرآن کی جگہ اعلام القرآن زیادہ موزوں قرار دیا ہے[۳]۔ لیکن مذکورہ بالا تذکرے سے اہل بصیرت سمجھ سکتے ہیں کہ جغرافیہ کے موضوع میں یہ تمام باتیں بھی شامل کی جاتی ہیں۔ جہاں تک انتظام اللہ شہابی کی کتاب جغرافیۂ قرآن کا تعلق ہے تو یہ مفید معلومات سے پر ہے لیکن اس میں موضوع کے اعتبار سے مقامات کی ترتیب کا خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ اس میں مقامات کی ترتیب نہ تو سورۃ کے لحاظ سے ہے نہ ہی حروف تہجی کے اعتبار سے۔ اس میں ان مقامات کا تذکرہ بھی ملتا ہے جو قرآن میں موجود نہیں ہیں جیسے نینوا، حطیم، غارثور، غارحرا، بعلبک، چاہ زمزم وغیرہ۔ اس لئے اسے پڑھنے کے بعد قاری شبہ میں مبتلا ہوسکتا ہے کہ یہ مقامات بھی قرآنی ہیں یا ان کا تذکرہ قرآن میں موجود ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی کتاب جغرافیۂ قرآن یا ارض القرآن اپنے موضوع کے اعتبار سے منفرد ہے۔ اس کتاب میں مقامات کی ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے دی گئی ہے۔ مولانا نے پہلے تو قرآن کے ان سورتوں کی نشاندہی کی ہے جہاں ان مقامات کا تذکرہ ہے۔ پھر ان مقامات کی تعیین میں طول البلد اور عرض البلد کا مختصراً ذکر کیا گیا ہے اور آخر میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان کا جدید نام کیا ہے مثلاً مدین کے مقام کی تعیین کے ساتھ ساتھ مدین والوں کی زندگی کے بارے میں بھی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ مولانا لکھتے ہیں: ''مدین والے خانہ بدوش تھے اور خانہ بدوش قوموں کی جغرافیائی مقامیت معلوم کرنا دشوار ہی ہوتی ہے۔ تاہم جہاں تک قدیم نوشتوں سے اتا پتہ چلتا ہے شہر مدین کا محل وقوع غالباً بحراحمر کی داہنی جانب شمال مشرق میں تھا۔ جزیرہ نمائے سینا سے جنوب ومشرق میں ارض البلد شمالاً جنوباً ۲۷ درجہ ۲۹ دقیقہ اور ۲۷ درجہ ۲۹ دقیقہ کے درمیان واقع ہے۔ اس مقام کا دوسرا نام آج کل مغاییر شعیب ہے[۴]۔'' جب کہ سید

سلیمان ندوی نے مدین کی پوری تفصیل ۱۹ ارصفحات میں پیش کی ہے۔ان کے مطابق ''یہ ملک طوالاً خلیج عقبہ کے سواحل پر دہانہ خلیج سے ساحل بحر احمر وارض ثمود و حجاز تک جہاں ثمود و جرہم اور عرب اسماعیل آباد تھے، واقع تھا(۵)۔'' ماجد صاحب نے سید سلیمان ندوی کی کتاب ارض القرآن سے کافی استفادہ کیا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انگریزی کتابوں سے بھی کافی مواد اخذ کیا ہے۔

عہد عتیق کی مملکت کی تعیین میں ماجد صاحب نے بائبل اور اسرائیلی روایات سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ مثلاً ملک سبا کی تعیین میں لکھتے ہیں کہ سبا وہی ہے جہاں آج یمن، حضر موت اور عسیر کے علاقے واقع ہیں جو اپنے زمانہ میں ایک بڑا متمدن، متمول اور زرخیز ملک تھا۔ اس کی ملکہ بلقیس کی دولت اور عمارت کے قصے افسانوی حد تک مشہور ہیں۔ اسرائیلی روایتوں میں یہاں تک آیا ہے کہ اس ملک کی مٹی سونے سے زیادہ قیمتی تھی اور یہاں جو گرد اڑتی تھی وہ چاندی کی ہوتی تھی(۶)۔

کہیں کہیں مولانا سے سہو بھی ہو گیا ہے جیسا کہ ڈاکٹر تحسین فراقی کا کہنا ہے کہ ''مقامات کے صحیح تعین کے سلسلے میں ماجد سے کہیں کہیں سہو بھی ہوا ہے۔ مثلاً تفسیر ماجدی میں انہوں نے ایلہ اور عقبہ کو ایک مقام قرار دیا ہے جب کہ دونوں شہر آس پاس ہیں مگر دونوں ایک نہیں (۷)۔''

اس سلسلے میں مولانا کی تحریر میں ایلہ ادرم کے قدیم علاقہ میں، بحر احمر کے مشرقی خلیج میں لب ساحل آباد تھا۔ فلسطین کے جنوب میں اور شمالی عرب کے عین سرحد پر موجود نقشہ میں اس کا نام عقبہ اور یہ خلیج عقبہ کی مشہور بندرگاہ ہے۔ اس سہو کی وجہ شاید برٹن کی کتاب Gold Mines of Madyen میں پورٹ سٹی کی تفصیل ہے(۸)۔

علاقائی جغرافیہ سے متعلق تفصیلی معلومات ماجد صاحب کے سفرناموں میں ملتی ہیں مثلاً مولانا نے اپنے سفرنامہ سفر حجاز میں جہاں سواد مکہ و مدینہ، جوار عرب اور مقامات مقدسہ کی منظر کشی کی ہے وہیں ان کے جغرافیائی محل وقوع کا بھی تعارف کرایا ہے۔ ان سے متعلقہ تاریخی واقعات، ان سے وابستہ تہذیبی روایات، عقائد اور خود اپنے احساسات کو نہایت ہی دلگداز انداز میں پیش کیا ہے۔ جنۃ المعلیٰ اور جنۃ البقیع کے محل وقوع بتاتے ہوئے اگر وہ ایک طرف قبر پرستی اور قبہ آرائی کی مذمت کرتے ہیں تو دوسری طرف شاہ ابن سعود کی قبر شکنی اور مزارات مبارکہ کو توڑنے اور کھنڈروں میں تبدیل کرنے پر پُرزور احتجاج بھی کیا ہے۔ روضۂ رسول کا جغرافیہ بتاتے وقت وہ اپنی اٹوٹ

محبت کا نمونہ پیش کرتے ہوئے زیارت روضۂ رسول کے آداب بھی بیان کرتے ہیں تو کچھ حجاج کے بدعات پر افسوس بھی کرتے ہیں (۹)۔

ڈھائی ہفتے پاکستان میں یا مبارک سفر میں نہ صرف کراچی ولاہور جیسے مقامات اور ان میں تبدیلی کا تذکرہ کرتے ہیں بلکہ ماضی کے مشاہدات سے حال کا موازنہ اس طرح کرتے ہیں کہ بدلتے سماج کا پورا کلچر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ پاکستان کے ادیبوں، صحافیوں اور سیاستدانوں سے ملاقات میں ان کے رہن سہن اور انداز فکر کی جھلکیاں صاف پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر تحسین فراقی کے الفاظ میں سفر حجاز اور سفر پاکستان میں بنیادی فرق یہ ہے کہ سفر حجاز میں شدید قلبی تاثرات کے ساتھ ساتھ سطح ارض کی تصویر کشی خاصی ہے، جب کہ سفر پاکستان میں مناظر ومقامات کی تصویر کشی سے زیادہ افراد اور ان کی مختصر انداز فکر کی ترجمانی ہے (۱۰)۔

سیاحت ماجدی یا گیارہ سفر میں آٹھ مقامات کی زیارت کا تذکرہ ملتا ہے۔ مولانا نے ان مقامات کے محل وقوع اور پہونچنے کے راستوں اور ذرائع کا تذکرہ بھی مختصراً کیا ہے۔ لیکن مختلف مقامات پر بسنے والے افراد سے ملاقاتوں کے بعد اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ ان حضرات کے کارناموں، مذہبی ودینی طرز احساس اور اسلامی ہندوستان کے کربناک یادوں سے تقسیم کے بعد موجودہ ہندوستان میں مسلم نشاۃ ثانیہ کا تصور کرتے ہیں۔ ڈاکٹر تحسین فراقی کے الفاظ میں انہیں جدید ہندوستان میں اسلام اور اردو، مسلمان اور مسلم کلچر کا وجود خطرے میں دکھائی دیتا ہے۔ وہ ہندو تعصب اور فسطائی ذہنیت کی مذمت کرنے میں کسی رورعایت سے کام نہیں لیتے۔ اپنی ریاست اترپردیش کے مقابلہ میں حیدرآباد اور مدراس ان کے لئے زیادہ پرکشش اس لئے تھے کہ وہاں مسلم اقلیت ہندو اکثریت سے خائف نہیں ہے (۱۱)۔

مولانا نے علاقائی عصبیت پر بھی جم کر حملہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ٹھیٹھ مذہبی عقائد کا تعلق اور علاقائی عصبیت اغلب طور پر غالب رہتی ہے لیکن یہ تہذیبی شرافت ایک ایسی چیز ہے جو اس دنیا میں بندوں کا دل بندوں سے جوڑے رکھتی ہے اور جب اس تہذیب کا جنازہ اٹھتا ہے تو ماتم داروں میں سب سے آگے شرافت ہی ہوتی ہے۔ خواہ وہ کلکتہ ہو یا لاہور (۱۲)۔

حوالہ جات

۱۔ تفسیر ماجدی جلد اول صفحہ ۴۔

۲۔ ایضاً صفحہ ۶، ۷۔

۳۔ ڈاکٹر تحسین فراقی: عبدالماجد دریابادیؒ احوال و آثار صفحہ: ۶۲۵، ۶۲۶۔

۴۔ عبدالماجد دریابادیؒ: جغرافیۂ قرآن صفحہ ۴۷۔

۵۔ سید سلیمان ندوی: ارض القرآن صفحہ ۴۔

۶۔ عبدالماجد دریابادیؒ: جغرافیۂ قرآن صفحہ ۶۸۔

۷۔ ڈاکٹر تحسین فراقی: عبدالماجد دریابادیؒ احوال و آثار صفحہ ۶۲۸۔

۸۔ برٹن: گولڈ مائنز آف مدین باب ۸۸، صفحہ ۴۷۔

۹۔ ڈاکٹر تحسین فراقی: عبدالماجد دریابادیؒ احوال و آثار صفحہ ۶۲۸۔

۱۰۔ ڈاکٹر تحسین فراقی: عبدالماجد دریابادیؒ احوال و آثار صفحہ ۴۴۹۔

۱۱۔ عبدالماجد دریابادی: سیاحت ماجدی صفحہ ۹۸۔

۱۲۔ عبدالماجد دریابادیؒ: سیاحت ماجدی صفحہ ۹۸۔

سچی باتیں ـــــ ایک تجزیاتی مطالعہ

پروفیسر محمد شافع قدوائی ☆

اردو میں کالم نویسی اب تک ایک باقاعدہ اور مستقل صنف کے طور پر رائج نہیں ہو سکی ہے۔ اردو میں کالم سے مراد عام طور پر حالات حاضرہ پر شگفتہ انداز میں تبصرہ ہوتا ہے۔ کالم کا بالواسطہ تعلق طنز و مزاح سے سمجھا جاتا ہے۔ اور ہلکے پھلکے تاثرات کا ذریعۂ اظہار گردانا جاتا ہے۔ اردو صحافت کی تاریخ کے مطالعہ سے منکشف ہوتا ہے کہ ''اودھ پنچ'' نے حالات حاضرہ پر طنز و مزاح کے پیرائے میں تبصرے شائع کر کے کالم نگاری کی راہ ہموار کردی تھی اور پھر مولانا ابوالکلام آزاد نے ۱۹۱۲ء میں الہلال میں ''افکار و حوادث'' کے عنوان سے مزاحیہ کالم لکھ کر کالم نگاری کا رشتہ طنز و مزاح سے مستحکم کر دیا۔ مولانا ظفر علی خاں نے مولانا آزاد کا اتباع کرتے ہوئے ۱۹۱۷ء میں ''ستارۂ صبح'' کے نام سے فکاہیہ کالم لکھا۔ اس کے بعد حسن نظامی اور مولانا محمد علی جوہر نے بھی فکاہیہ کالم لکھے۔ مولانا آزاد، مولانا ظفر علی خاں اور حسن نظامی کے فکاہیہ، طنزیہ اور مزاحیہ کالموں کی مقبولیت کے باعث اردو کالم نگاروں نے سنجیدہ مسائل اور فکری موضوعات پر توجہ مرکوز کرنے کے بجائے طنز و مزاح کو اپنا مقصود جانا اور سیاسی موضوعات پر شگفتہ انداز میں رائے زنی کرتے رہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ جنہوں نے صرف بارہ سال کی عمر میں یعنی ۱۹۰۴ء میں اودھ اخبار میں ایک مذہبی عنوان پر مضمون لکھ کر اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ فکری مباحث اور مذہبی داخلاقی موضوعات کی طرف متوجہ ہوئے اور انہوں نے اپنے کالم ''سچی باتیں'' کی اساس ان موضوعات پر رکھی۔ مولانا دریابادیؒ نے ۱۹۲۵ء میں ایک ہفتہ وار سچ نکالا جس کے صفحۂ اول پر ان کا اداریہ نما کالم ''سچی باتیں'' شائع ہوتا تھا۔ ہر چند کہ مولانا نے اس کالم میں مقبول عام روش کے مطابق سیاسی موضوعات پر طنزیہ پیرائے میں اظہار خیال بھی کیا مگر انہوں نے ''سچی باتوں'' کو بنیادی طور پر معاشرتی اصلاح اور اخلاق کی درستی کے لئے وقف کر دیا تھا۔ ''سچی باتیں'' مولانا کے

☆ شعبۂ صحافت مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

مخصوص نصب العین یعنی اخلاقی قدروں کی باز آفرینی اور مذہب کی سربلندی اور احیا کے جذبہ کی آئینہ دار ہوتی تھیں۔ نصف صدی کو محیط، مولانا کی صحافتی زندگی کا بنیادی موضوع روحانی اور اخلاقی اقدار ہیں۔ ان کی تقریباً تمام تحریریں اسی ایک نقطہ کی تشریح و توضیح کرتی ہیں۔ ادبی موضوعات ہوں یا روزمرہ کے واقعات۔ مولانا دریابادیؒ ہر واقعہ سے عبرت اور سبق آموزی کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور نکال لیتے تھے اور اپنے کالم میں اسی پہلو کی معنویت کو آشکارا کرتے تھے۔ اس لحاظ سے مولانا کی تمام تحریریں اسالیب بیان کے تنوع اور موضوعات کی رنگارنگی کے باوجود اپنی غایت کی سطح پر باہم متحد اور مربوط ہیں۔ انہوں نے ''سچی باتوں'' کے حوالے سے کائناتی مظاہر میں مستور ایک مرکزی حقیقت کی تلاش کو اپنی فکر کا مرکز بنایا تھا۔ مولانا نے سچ کے بعد صدق اور پھر صدق جدید نکالا۔ ان پرچوں میں بھی ان کی تحریروں کا مرکزی حوالہ وہی رہا۔ مولانا کا کالم ''سچی باتیں'' برصغیر کے ادبی اور صحافتی حلقوں میں بے حد مقبول تھا اور بہت سے روزنامے، ہفت روزہ اور دیگر جرائد اسے اہتمام کے ساتھ شائع کرتے تھے۔ مولانا نے سچی باتوں کے ذریعہ لوگوں کو دعوت فکر دی اور اعلیٰ روحانی، مذہبی اور اخلاقی اقدار کو جو رفتہ رفتہ قصہ پارینہ بنتی جا رہی تھیں، روزمرہ کی زندگی کا لازمی جزو بنانے کی سعی کی۔ ''سچی باتوں'' کے جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب، اخلاق، روزمرہ کے سماجی مسائل، فحاشی، بے راہ روی اور تعلیمی نظام کے مسائل پر مولانا نے تفصیلی اظہار خیال کیا۔ مولانا دریابادیؒ کو فنا اور عبرت کے موضوع سے خاص مناسبت تھی اور وہ بعض خبروں، واقعات، حکایات اور قصوں کے حوالے سے دنیا کی ناپائیداری اس کے نقش کو اور گہرا کرتے اور یہ باور کراتے ہیں کہ یہ حیات چند روزہ، وقتی اور لمحاتی ہے اور اسے آنے والی زندگی کا ایک پڑاؤ سمجھنا چاہئے۔ اس سلسلے کی چند مثالیں ملاحظہ کریں:

> ''(۱) ہندوؤں کی مشہور و قدیم مذہبی کتاب مہابھارت کے شروع ہی میں راجہ یدھشٹر کی زبان سے ایک سوال کے جواب میں یہ قول درج ہے کہ ''دنیا کے عجائبات میں جو عجوبہ سب سے بڑا بڑھا ہوا ہے وہ یہ ہے کہ انسان اپنے چوطرفہ لوگوں کو مرتے دیکھا رہتا ہے لیکن اپنے لئے سمجھتا ہی نہیں کہ میں بھی مرنے کی چیز ہوں۔''
>
> بات کتنی سچی حکیمانہ اور دانش مندانہ ہے۔ اپنی موت کی طرف سے غفلت ایک حد تک تو امر طبعی ہے۔ حب حیات اگر انسان پر غالب نہ ہوتو یہ کارخانہ عالم آباد ہی کیونکر رہے اس آبادی کا دار و مدار ہی اس غفلت بے حسی اور انجام فراموشی پر ہے۔

(۲) شہر کے کسی کباڑیے کی دکان پر آپ کا گذر ہوا ہو گا ضرور دۃً نہ سہی تفریحاً یا سر رہ گذر پڑ جانے کی حیثیت سے۔ نخاس لکھنؤ کا سارا بازار ہی گویا ایک عظیم الشان کباڑ گھر کا نام ہے۔ پھر آپ ایسی جگہ میں کیا پاتے ہیں، ایک عظیم الشان ڈھیر، ایک انبار عظیم بے کار بے مصرف ردی اور نا قابل استعمال چیزوں کا، ٹوٹے ہوئے گلاس کی چمنیاں، چٹخی ہوئی چائے دانیاں، ٹوٹی پھوٹی کرسیاں، دیمک کھائے ہوئے کوچ وصوفے، بدقلمی لوٹے، زنگ کھائے ہوئے برتن، پھٹے ہوئے پاجامہ، نچے ہوئے کوٹ، بوسیدہ گھڑیاں، بے مرمت سائیکلیں، پرزہ ٹوٹے ہوئے بدرنگ موٹر، غرض ساری دنیا کا ملبہ یا کوڑا کرکٹ جمع مگر یہ کوڑے کرکٹ کا انبار ہے یا کیا، سب کی سب ایسی چیزیں جو ابھی کل تک آپ کو کس قدر عزیز تھیں۔ وہی سامان جسے آپ نے کس شوق سے، کس تلاش ومحنت سے، کتنا روپیہ خرچ کر کر کے جمع کیا تھا وہی ساز وسامان جس کے پیچھے آپ دیوانہ ہوئے جا رہے تھے۔ گیا دنیا کی بڑی سے بڑی چکیلی چیزوں کی حیثیت کل اتنی ہی ہے۔ دنیا کی بڑی سے بڑی رغبت بھی کچھ دن کے بعد، کچھ وقت گذر جانے کے بعد کہنہ فرسودہ ہو کر آخر بے رغبتی میں تبدیل ہو کر رہتی ہے۔"

فنا اور عبرتناکی کے بے شمار واقعات سچ، صدق اور صدق جدید کے صفحات پر بکھرے پڑے ہوئے ہیں۔ مولانا کا خیال تھا کہ عہد حاضر کے تمام مسائل خواہ وہ معاشرتی لوٹ کھسوٹ کی شکل میں ظاہر ہوں یا اخلاقی کمزوریوں کے روپ میں یا طلبہ کی شورش کی صورت میں، اصلاً آخرت فراموشی کا نتیجہ ہیں۔ مغرب سے درآمد شدہ تعلیمی نظام اور معاشرتی اقدار نے لوگوں کو اس طرف سے بالکل بے پروا کر دیا ہے۔ روحانی اور اخلاقی اقدار پر عدم اطمینان معاشرتی بگاڑ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ مولانا دریابادیؒ اخلاقیات کو قدیم ادبی سرمائے کا امتیازی وصف قرار دیتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> "(۱) طلسمات گل بکاؤلی (صحیح نام مذہب عشق ہے) ایک لچری کتاب قصہ کہانی اور دل بہلاوے کی ہے اور افسانہ عشق سراپا فسق کا ہے۔ لیکن اگر کبھی اتفاق سے نظر پڑ جائے تو دیکھئے گا کہ خرافات کے انبار میں پند وموعظت کے کیسے کیسے گوہر نایاب چھپے ہوئے اور پتے جھلک رہے ہیں۔ اور فسانہ آزاد جو ایک غیر مسلم کے قلم سے چار ضخیم جلدوں میں ہے، بیگماتی زبان میں محض ہنسنے ہنسانے کے لئے لکھا گیا ہے اور جو

آج سے قبل کے نوابی لکھنؤ کی ہو بہو و من وعن تصویر ہے وہ بھی شروع سے آخر تک محض گدگدیوں سے بھرپور نہیں بلکہ کہیں کہیں چٹکیاں بھی رکھتی ہے اور کہیں کہیں سسکیاں بھی۔ دونوں کے بھی ۲۵ رسال کے بعد امراؤ جان ادا چھپ کر سامنے آئی وہ کہنے کو ایک نستعلیق خواندہ بیسوا کی آپ بیتی ہے جو خباثت کی ترغیب وتشویق سے یکسر خالی اور آرٹ کے حق میں فخر و پندار کا نہیں، حسرت و ندامت کا جذبہ پیدا کرنے والی یہاں تک کہ جب آپ کتاب بند کریں گے تو عجب نہیں کہ حاسہ شرافت کو ایک نئی جلا اشراقیت سے جگمگاتے ہوئے پائیں۔

گو کہ صدق بقول مدیر ایک دعوتی صحیفہ تھا مگر ''سچی باتوں'' میں مذہبی اور اخلاقی موضوعات کے علاوہ روزمرہ کے مسائل مثلاً رشوت خوری، طلبہ کی شورش، شراب نوشی اور جوے کے مضر اثرات پر بھی اظہار خیال کیا جاتا تھا۔ مولانا دریابادیؒ نے اپنے کالم میں روزمرہ کے واقعات کی عکاسی کبھی تو تمثیلی پیرائے میں کی اور کبھی اسے مختصر سے قصہ کے طور پر پیش کیا مگر ان کا بنیادی مقصد واقعہ کی تہہ میں کارفرما رجحانات کو نشان زد کرنا تھا۔ مثلاً:

> ''(۱) کراچی کی خبر ہے کہ مغربی پاکستان کے محکمہ انسداد رشوت ستانی نے جن سرکاری افسران کے خلاف رشوت ستانی کی تحقیقات شروع کی ہے ان کی تعداد ایک ہزار سے بھی اوپر ہے۔ ان ملزموں میں جو اونچے گزیٹیڈ عہدے دار شامل ہیں، ٹاؤن آفیسر، سپرینٹنڈنگ انجینئر، سول سرجن، ڈپٹی کمشنر، سشن جج وغیرہ ان کی تعداد ۱۰۷ ہے۔ اور یہ اعداد بھی تو صرف ان کے ہیں جن کا پتہ کسی نہ کسی طرح سے خفیہ پولیس کو مل گیا اور جن کو گرفت میں لانے کے لئے قانونی ثبوت کسی درجہ میں مل گیا ہے۔ پاکستان اور اسی طرح ہندوستان بھی، دونوں اپنی جگہ ٹھنڈے دل اور پوری سنجیدگی سے سوچیں کہ اتنی بڑی تعداد اور رشوت خوروں کی خصوصاً اعلیٰ افسروں کی صف، کبھی انگریزوں کے دور میں بھی رہی ہے۔ کیا اپنی حکومت اور آزادی مل جانے کے معنی یہی ہوئے کہ ہر طرح کی اخلاقی پابندیوں سے اپنے کو مستثنیٰ سمجھ لیا جائے اور اپنے ہی بھائیوں کو لوٹنے کے لئے اپنے کو ہر طرح تیار کرلیا جائے۔
>
> (۲) اسٹیٹسمین میں شائع ہوا ہے کہ طالب علموں کے لئے رعایتی شرح ٹکٹ کا جو طریقہ ریلوے نے اختیار کیا تھا وہ اب اس کے لئے وبال جان بنتا جارہا ہے۔ طلبہ

سے زیادہ فرضی طلبہ کی درخواستیں ہر سال سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں پرنسپلوں کی تصدیق کے ساتھ وصول ہوتی رہتی ہیں۔ اور بعد کو کھلتا ہے کہ فلاں اور فلاں درخواستیں طالب علموں کی نہیں دوسروں کی تھیں۔ چنانچہ حال میں پوری بارات کی بارات اسی طلبہ والے رعایتی ٹکٹ پر سفر کرتے ہوئے پکڑی گئی اور ریلوے کو اچھا خاصہ نقصان اس دھو کے دھڑی سے اٹھانا پڑ رہا ہے۔ لیکن یہ نقصان اسی ایک شق تک کیا محدود ہے۔ بے شمار بے ٹکٹ سفر کرنیوالے، خواہ مخواہ زنجیر گھسیٹ کر ریل کو رکواتے والے، ڈبوں سے گدے اٹھالے جانے والے، انہیں کاٹ دینے والے، شیشے اور آئینے توڑ ڈالنے والے، پنکھے اور روشنی کے بٹن اور گھنڈیاں چرا کر لے جانے والے وغیرہ وغیرہ یہ حضرات کچھ کم ہیں۔ اور یہ ساری مثالیں تو زندگی کے صرف ایک شعبہ اور سرکار کے ایک محکمہ سے متعلق معلوم ہوئیں۔ ڈاک خانہ، تار گھر، پولیس، جیل، اسپتال، اسکول، کالج، کچہریاں ابھی خدا معلوم کتنے سرکاری محکمے ہیں اور نیم سرکاری شعبے زندگی کے، ان کے بھی علاوہ۔ گویا جان و مال کے کل نقصانات کا اندازہ اگر کرنا ہے تو ان اعداد کو ضرب دہائیوں سے نہیں بلکہ سیکڑوں سے دینا ہوگی۔

یہ سب نتیجے کاہے کے ہیں۔ یہ ہر جہت اور ہمہ وقتی دھوکا دھڑی، چھین جھپٹ، لوٹ کھسوٹ نتیجہ اس تعلیم اور اس نظام تمدن کا ہے۔"

مولانا کی گہری مذہبیت نے انہیں امن اور آشتی کا جویا اور بے تعصبی اور حق گوئی کا پیامبر بنا دیا تھا۔ مولانا کے مسلک میں ادعائیت بمنزلہ گمراہی تھی اور وہ ہمیشہ جادہ اعتدال اختیار کرتے۔ مولانا نے اپنے عہد کے مسائل سے روگردانی نہیں کی۔ اور دوقومی نظریے اور تقسیم کے مسئلہ پر بھی متعدد مرتبہ اظہار خیال کیا۔ ان کے نزدیک مسلمان ہونے اور ہندوستانی ہونے میں کوئی تضاد یا تناقض نہیں وہ وطن سے غداری کو مسلمان کے حق میں گالی سمجھتے تھے مثلاً:

"(۱) ملک کے مسلم وفاداروں بلکہ جاں نثاروں کی فہرست کوئی مختصری مختصر بھی تیار کی جائے تو اس میں ایک نام ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کا ضرور ہوگا۔ ہندو ووٹ کی اکثریت نے انہیں ملک کا بڑے سے بڑا اعزاز دلوایا اور کرسی صدارت تک پہنچایا۔ جن سنگھ تک ان کے حق میں کلمۂ خیر سے باز نہ رہ سکی۔ ان کی وفاداری کی قسم کھانے میں کسی سے پیچھے نہ رہی۔ اچھا تو اس معلوم و معروف حقیقت کو اپنے ذہن میں تازہ

کر لیجیے کہ ان کے ایک بھائی حقیقی اور عزیز بھائی پاکستانی تھے اور بڑے اونچے پاکستانی مرکزی حکومت میں وزیر تک رہے اور عین اس وقت کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں۔ یہ تضاد و تناقض کیا۔ یہ مشرق کے ساتھ مغرب کا جھمگھٹا کیسا یہ آدھی رات کو سورج کا طلوع کیسا؟

اچھا نہ کھیجے، حیرت میں نہ ذرا پڑیے، مثال انوکھی نہیں نرالی نہیں۔ آج ہندوستان میں لاکھوں بلکہ شاید کروڑوں ڈاکٹر ذاکر موجود ہیں ایک طرف اپنے ملک و وطن کے سو فی صدی وفادار اور دوسری طرف پاکستان کے ساتھ خصوصیت و یگانگت کے رشتوں میں جڑے ہوئے۔ بیوی یہاں تو میاں وہاں، باپ ادھر تو بیٹا اُدھر، ایک بھائی ہندوستان کا رعایا تو دوسرا بھائی پاکستان کا نمک خوار۔

بارہا عرض کیا جا چکا اور آج ایک بار پھر عرض ہے کہ اسلام کی برادری مقامی نہیں آفاقی ہے، وطنی نہیں، نسلی نہیں عالمی ہے۔ ہندی مسلمان دینی روحانی ملی بھائی ہے افغانی مسلمان کا، جاوی مسلمان کا، مصری مسلمان کا، ترکی مسلمان کا، بخاری مسلمان کا اسپینی مسلمان کا عزیزانہ بلکہ برادرانہ جذبات رکھنے والا اخلاص و وفاداری سے معمور لیکن دوسری طرف اپنے ہی دین و مذہب کے حکم کی تعمیل میں وطنی، قانونی، آئینی و جغرافیائی تقاضوں کو یاد رکھنے والا، پاس عہد و وفا پر ایمان رکھنے والا، غداری سے دور اور سازش و چالبازی سے نفور۔ غداری دوسروں کے حق میں محض ایک سیاسی جرم ہے اور مسلمان کے حق میں ایک مذہبی گالی۔

سچی باتوں کے علاوہ مولانا دریابادیؒ نے اپنے شذروں (Editorial Notes) میں بھی دو قومی نظریہ کے مضمرات پر روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً:

"مسلمان جہاں کہیں بھی رہتا ہے اس ملک کا ہر ایک جزو بن کر رہتا ہے اس کے آئین کا احترام کرتا ہے اس کے قانون کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ اس ملک کی بدخواہی میں شریک نہیں ہوتا وہاں کے رسم و رواج کی، عرف عام کی پیروی کرتا ہے اور اس لحاظ سے اس ملک کا جزو اسی طرح ہوتا ہے جس طرح کوئی غیر مسلم ہوسکتا ہے۔ چین کا مسلمان یقیناً چینی اور امریکا کا مسلمان یقیناً امریکی ہے جس طرح دوسرے چینی اور امریکی ہوتے ہیں۔ لیکن فرق یہ ہے کہ دوسرے لوگ محض چینی یا

امریکی ہوں گے۔ مسلمان اس کے برعکس اپنے ملی تشخص کو کسی حال میں فنا نہ ہونے دے گا وہ محض چینی یا امریکی نہیں بلکہ چینی مسلمان اور امریکی مسلمان بن کر رہے گا۔ اس کا دین، اس کی تہذیب، اس کی معاشرت، اس کی سیاست ہر شعبۂ زندگی میں دخیل ہے۔ اس لئے مسلمان اپنے وطنیت کے تقاضوں کے ساتھ اپنے دینی ملی فرائض کا بھی پورا لحاظ رکھے گا اور یوں کہنا چاہئے کہ مسلمان قائل صرف دوقومی نظریہ کا نہیں بلکہ صد قومی نظریہ کا رہتا ہے۔"

مولانا کے گہرے تاریخی شعور اور وسعت مطالعہ نے "سچی باتوں" کی انفرادیت اور مقبولیت کے نقش کو اور بھی گہرا کر دیا تھا۔ مولانا دریابادیؒ تاریخی حقائق سے عبرت اور سبق کا درس لینے کی تلقین کرتے تھے جیسا کہ عرض کیا جا چکا کہ مولانا کی گہری مذہبیت نے انہیں مذہبی تعصب سے پاک کر دیا تھا لہٰذا اگر برادران وطن میں انہیں اچھائی کا کوئی پہلو نظر آتا تو سچی باتوں میں اس کا برملا ذکر کرتے اور اس سے سبق لینے کا درس دیتے مثلاً:

"ڈاکٹر کاٹجو موجودہ وزیر اعلیٰ مدھیہ پردیش، معلوم ہے کہ ایک زمانے میں الٰہ آباد ہائی کورٹ کے ایک کامیاب ترین ایڈوکیٹ بھی رہ چکے ہیں۔ ایک اپنے تازہ مضمون (مندرجہ لیڈر) میں اپنی پچھلی زندگی کے ذکر میں لکھتے ہیں:

"جب میں سہارن پور اس مقدمہ کی پیشی پر پہنچا تو دیکھتا کیا ہوں کہ فریق ثانی کی طرف سے بحث کرنے والے میرے عزیز ترین دوست تھے لیکن پیشہ کی زندگی میں برابر میرے مخالف ہی۔ ہم دونوں عدالتوں میں ایک دوسرے سے زور آزمائی ہی کرتے نظر آتے تھے۔ نہ صرف ہائی کورٹ میں بلکہ کم و بیش ہر صوبہ میں ایسا قابل، فاضل اپنے فن میں کامل کم ہی میرے دیکھنے میں آیا ہے۔"

ہے کوئی درس ان ٹھیٹھ دنیاداروں سے ہمارے دینداروں کے لئے ہمارے عالموں فاضلوں سے بھی ممکن ہے کہ کسی دوسرے عالم فاضل کا، جن سے کسی بھی مسئلہ میں اختلاف ہوا ہو، ذکر محبت کے ساتھ یا تعظیم و احترام کے لہجے میں کریں اور اگر کہیں وہ بدنصیب کسی دوسرے فرقہ یا مسلک کا ہے جب تو خیر کچھ پوچھئے ہی نہیں۔"

مولانا دریابادیؒ سچی باتوں میں اکابرین کے اقوال اور حکایتیں کثرت سے لکھتے اور ان کا

بنیادی مقصد جذبۂ ہم آہنگی کو فروغ دینا ہوتا تھا۔ لکھنؤ کے شیعہ سنی مناقشہ سے ان کو سخت ذہنی اذیت اور کوفت رہتی تھی اور وہ علمائے سلف کے طور وطریقوں اور اعمال وافعال کا ذکر کر کے ان دونوں فرقوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی کوشش کرتے تھے۔ مثلاً:

> ''قاضی نور اللہ شوستری کو جو مرتبہ ومنزلت شیعی دنیا میں حاصل ہے اس سے کون ناواقف ہے، حد یہ ہے کہ شہید ثالث مانے جاتے ہیں، یعنی گویا حضرت حسن وحضرت حسین کے بعد انہیں کا مرتبہ ہے اور آگرہ میں ان کا مزار شاید شیعان ہند کا سب سے بڑا مرکز اور مرجع ہے۔ ساتھ ہی اہل سنت میں ملا عبدالقادر بدایونی جو مرتبہ وحیثیت رکھتے ہیں اس سے بھی تعلیم یافتہ طبقہ میں کون ناواقف ہے۔ دور اکبری کے مشہور مورخ ہونے کے ساتھ ہی اپنے دینی علو، تقشف اور تصلب کے لئے شہرت پائے ہوئے۔ غرض ایک کٹر اپنے عقیدے میں تو دوسرا متشدد اپنے مذہب میں۔ ملا صاحب کی مشہور کتاب منتخب التواریخ تین جلدوں میں ہے جس کی تیسری جلد اکبر کے زمانے کے اکابر ومشاہیر پر ہے اس میں ملا صاحب کے قلم سے قاضی صاحب کے لئے جو نکلا ہو کم ہی ہے۔ سب وشتم، لعن وطعن سب ہی کچھ ہوگا۔ لیکن دیکھئے سارے قیاس واندازے کے برخلاف واقعۃً ملا صاحب کے قلم سے کیا نکلتا ہے۔
> ترجمہ: قاضی نور اللہ شوستری اگر چہ مذہب شیعی رکھتے ہیں لیکن عدل وانصاف، نیک نفسی، حیاداری، پاکبازی کی صفات سے متصف ہیں اور ان میں شریفوں کی خوبیاں جمع ہیں۔ علم وحلم، تیز فہمی، طباعی صفائی قلب وذکاوت کے لئے مشہور ہیں۔ ان کی اچھی اچھی کتابیں ہیں۔ اور اس طرح کی سطریں دور تک لکھتے چلے گئے ہیں۔ کوئی شیعہ دوست اس سے زیادہ اور کیا لکھے گا ایک دوسرے کو نواصب اور روافض کے لقب سے نوازنے والے اور خشونت وتند مزاجی میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے والے اپنے مباحثہ ومناظرہ کو دینی تحقیق کا درجہ دینے والے کیا اس سے کوئی سبق حاصل نہیں کر سکتے۔''

مولانا کا کالم ''سچی باتیں'' ایک مرکزی موضوع کا تابع ہونے کے باوجود مواد کے تنوع اور اسلوب بیان کی دل کشی اور ادبی چاشنی کے باعث برصغیر کے علمی حلقوں میں بڑی دلچسپی سے پڑھا جاتا تھا۔ مولانا دریابادیؒ نے اپنے کالم میں صرف مذہبی موضوعات کی تعبیر وتشریح نہیں بلکہ اکثر

حکایتوں کے توسط سے کسی مقتدر شخصیت کے تعارف کا فریضہ بھی انجام دیا۔انہوں نے بزرگان دین کی خشکی اور مزاج کی درشتی سے متعلق مشہور عام غلط فہمی کا ازالہ بھی کیا نیز اپنے کالموں میں بعض ایسے حقائق اور واقعات کا بھی ذکر کیا جن سے متعلقہ شخص کے شخصی خصائص اور زیادہ نمایاں ہو گئے۔مولانا دریابادیؒ اپنے مرشد حضرت تھانوی کی شخصیت کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''ملک کے ایک مشہور ترین شیخ طریقت اور نامور ترین عالم شریعت کا لطیفہ اپنے مخلص اور مشہور دنداں ساز ڈاکٹر سے

''آپ کو تو سب دانت ہی دکھاتے ہیں۔''

وہ ڈاکٹر بھی آخر خادم کس مخدوم کے تھے، لطائف حکمت و معرفت کے ساتھ شوخی و برجستگی کا درس بھی انہیں سے پائے ہوئے جواب میں عرض کرتے ہیں

''مگر حضرت تو سب کو آنکھیں دکھاتے ہیں۔''

یہ لطیفہ گوئی غالب کے معیار کی ہے یا نہیں۔ان لطیفہ گو بزرگ عالم العلماء شیخ المشائخ کا نام آپ سنیں گے؟ بغیر بتائے کسی کا ذہن بھی نہ جائے گا۔حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہ! جی ہاں مولانا ہی۔عام تخیل بزرگان دین کا جودلوں میں بیٹھا ہوا ہے اس کے لحاظ سے تو ایسا فقرہ کبھی کسی عالم دین یا شیخ طریقت کی زبان سے ادا ہو ہی نہیں سکتا۔ان کو تو زاہد خشک ہونا چاہئے تبسم اور شوخی کی ہوا بھی اسے نہ لگنا چاہئے اور پھر مولانا تھانوی جو اپنی خشکی وخشونت کے لئے مخالفین معاندین کے پروپیگنڈے سے نہیں زیادہ تر اپنے دوستوں اور مہربانوں کے ہاتھوں اور زیادہ بدنام ہوئے۔

مولانا ایک صاحب طرز ادیب تھے اور ان کے مخصوص ادبی اسلوب کی سچی باتوں پر گہری چھاپ نظر آتی تھی۔اسلوب سے قطع نظر مولانا نے موضوع کی سطح پر بھی ادبی مباحث سے اپنی توجہ مرکوز کی اور اپنے مشہور کالم میں بعض ادبی مسائل پر تفصیلی اظہار خیال کیا۔اردو شاعری پر عام طور پر اعتراض کیا جاتا ہے۔یہ تمام تر بدیسی ہے اور اس میں ہندوستانی عناصر بہت کم ہیں۔مولانا سچی باتوں میں اس نقطۂ نظر کا محاسبہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بت، بت کدہ، دیر، صنم، خانہ، کفر، کافر، زنار، قشقہ، برہمن یہ سب الفاظ آپ نے اپنی شاعری میں، اردو فارسی شاعری میں کثرت اور بڑی کثرت سے پڑھے ہیں یا نہیں۔ ان کا استعمال محل مدح میں ہوتا ہے یا محل ذم میں، دینی و مذہبی اعتبار سے ان لفظوں کو آپ کی نظر میں جتنا مکروہ و مبغوض ہونا چاہئے ظاہر ہے لیکن سوال یہاں مذہبیات سے نہیں ادبیات سے متعلق ہے۔ شعر غزل میں آپ نے ان چیزوں کو اونچی سے اونچی جگہ دے رکھی ہے یا نہیں۔ شاعر صاحب ذاتی حیثیت سے لاکھ پختہ مسلمان ہوں، متقی ہوں، عابد و زاہد ہوں، لیکن شعر کے کوچے میں جب قدم رکھیں گے تو عزت و رفعت، احترام و عقیدت کے لباس پہنا پہنا کر ان لفظوں سے اپنی محفل آراستہ کریں گے یا نہیں؟ امیر خسرو دہلوی سے لے کر امیر مینائی لکھنوی تک کون اس سے بچا ہے کس نے تخیل کی دنیا میں پائے صنم پر سجدے نہیں کئے۔ کس نے بتوں کی پوجا نہیں کی ہے، کس نے اذان دینے کے بجائے ناقوس نہیں بجایا۔ اور کہا یہ جارہا ہے کہ اردو شاعری تمام تر مسلمانوں کی شاعری ہے ہندو تصورات کو ہندو تخیلات کو کبھی اس میں منہ نہیں لگایا گیا ہے۔

مسی، کاجل، پان، کڑے، انگیا، مہندی، برسات، ساون، کوئل، پپیہا، ان سب کو ترکیبوں میں لا لا ان سے مضمون پر مضمون پیدا کرنا اردو شاعری کا جزو شروع سے بنا چلا آرہا ہے یا نہیں۔ یہ چیزیں کیا مسلمان عرب سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ یہ سارے تخیلات اس ملک کی پیداوار ہیں یا نہیں۔ حد یہ ہے کہ مرثیہ کی شاعری اور نعتیہ شاعری، جو تمام تر مذہبی شاعری کی قسمیں ہیں وہ تک ہندوانہ اور ہندیانہ تشبیہوں اور ترکیبوں سے خالی نہیں۔''

سچی باتوں کے موضوعات کے اس مختصر سے جائزے سے واضح ہوجاتا ہے کہ مولانا دریابادیؒ نے اردو میں کالم کا تعلق طنز و مزاح کے ساتھ ساتھ فکری مباحث سے بھی قائم کیا۔ مولانا دریابادیؒ نے مذہبی، اخلاقی اور روحانی موضوعات کے علاوہ روز مرہ کے مسائل مثلاً رشوت خوری، شراب نوشی، قمار بازی، ہڑتال، بدنظمی، گرانی اور طلبہ کی بدامنی پر بھی اظہار خیال کیا نیز ادبی موضوعات اور سماجی مسائل کی عکاسی بھی کی۔ مزید برآں رواداری، امن، صلح اور آشتی کا درس بھی دیا۔ اردو کے کسی دوسرے کالم نگار کے یہاں موضوعاتی تنوع کا اس قدر احساس نہیں ہوتا۔

مذکورہ موضوعاتی تجزیے سے قطع نظر اگر سچی باتوں کے اسلوب کا تجزیہ کیا جائے تو منکشف ہوگا کہ مولانا دریابادیؒ کے کالم کا مزاج مختلف اسالیب کے امتزاج سے مرتب ہوتا ہے۔ مولانا دریابادیؒ کے اسلوب کا مابہ الامتیاز عنصر طنز (Irony) ہے جو اکثر صورتوں میں طنز کی زہرناکی کے بجائے قاری کو المیاتی احساس سے دوچار کراتا ہے۔ مولانا نے سچی باتوں میں طنز، استہزا، تمسخر، مایوسی، حسرت، تاسف اور غصہ کے اسالیب آزمائے۔ مولانا کا اسلوب بنیادی طور پر خطیبانہ ہے جو پیہم سوالات کی آویزش سے متشکل ہوتا ہے۔ انہوں نے تحریر کو زیادہ موثر بنانے اور قاری کو قائل کرنے کے لئے ایک خطیبانہ حربے Rhetori Cal Questions سے خاصا استفادہ کیا اور اپنے کالم میں دیکھئے، ملاحظہ کریں، سنئے، سبق لیجئے، سنتے ہیں آپ، جی ہاں، ہے کوئی وغیرہ پر مشتمل خطابیہ جملے لکھ کر اپنی تحریر میں گفتگو کی سی برجستگی پیدا کر دی تھی۔ مولانا کے اسلوبی خصائص میں طنز اور استفہامیہ لہجہ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

مولانا دریابادیؒ صحافت میں متانت و سنجیدگی کے حد درجہ قائل تھے اور وہ سنسنی خیزی کے ہمیشہ مخالف رہے۔ وہ صحافیوں کی غیر ذمہ دارانہ روش اور خبر لکھنے میں تصدیق کا لحاظ کئے بغیر عجلت سے بہت نالاں رہتے تھے۔

مولانا نے طنز، تمسخر اور استہزا کے ساتھ غم، غصہ اور خوف کے اسالیب بھی آزمائے اور رعایت لفظی، تلمیح، استعارہ، کنایہ، ضلع جگت اور اشعار نیز مصرعوں کے برمحل استعمال سے اپنے اسلوب کی انفرادیت کا تعین کیا ہے۔

مولانا دریابادیؒ کے کالم کا اہم ترین وصف ادبی اور علمی اسلوب بیان ہے۔ مولانا نے اپنی تخلیقی فطانت اور علمیت کے وسیلۂ اظہار کے طور پر ایک صحافتی صنف کالم کو اختیار کیا اور مواد اور اسلوب دونوں سطحوں پر اس صنف کے منظرنامے کو وسیع کیا۔ مولانا دریابادیؒ نے ادبی جمود اور تعطل کے دور میں ''کالم'' کو مکالمہ کا بنیادی ذریعہ بنایا اور اسی کی وساطت سے معاشرتی اصلاح کا فریضہ انجام دینے کی کوشش کی۔ مولانا کے کالم ''سچی باتیں'' کا حوالہ موضوعاتی تنوع اور اسلوب بیان کی ندرت کے باعث اردو کالم نویسی کی روایت میں ناگزیر رہے گا۔

مضامین عبدالماجد دریابادیؒ: نقد وتبصرے کا مرقع

ڈاکٹر علیم اشرف خاں☆

کوئی بھی مبصر یا ناقد جب تک اپنی شناخت قائم نہیں کر پاتا اس وقت تک اس کی نگارشات پر بالعموم رائے زنی کی روایت کا اطلاق کمتر ہوتا ہے۔ مگر اس میں رایزن کے لئے ایک آسانی یہ پوشیدہ ہوتی ہے کہ وہ جیسا چاہے تبصرہ اور آزادانہ رائے زنی کردے۔ اس کے برعکس اگر نقد وتبصرہ کرنے والا اپنی نگارشات سے علمی وادبی مقام اور دانشوری کی سند کا حامل ہو اور دیگر کوئی اس پر مزید تبصرہ ونقد کرنے کی غرض سے اس کی نگارشات پر زبردستی کرتے ہوئے کوئی رائے دے تو یہ کام بعد کے ادیب یا دانشور کے لئے چنداں سہل نہیں ہے میری مشکل یہ ہے کہ آج جس شخصیت کے علمی وادبی مرتبے کے تعین کے لئے ہم سب یہاں جمع ہیں وہ کوئی عام مبصر، ناقد، ادیب یا نثر نگار نہیں بلکہ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کو بجا طور پر عبقری شخصیت ہی کہنا چاہئے کیونکہ ان کی ذاتِ گرامی میں اضداد صفات کا مجمع تھا اسی لئے مختلف میدانوں میں ان کی بے پایاں جلوہ گری دکھائی دیتی ہے۔

راقم نے ادنیٰ کوشش اس بات کی کی ہے کہ ''مضامین عبدالماجد دریابادیؒ'' جسے غلام دستگیر رشید صاحب نے مرتب کر کے ادارہ اشاعت اردو، حیدرآباد (دکن) سے مارچ ۱۹۴۳ء میں شائع کیا ہے اور اس مجموعہ مضامین میں مولانا کے ۲۷ مضمون کل ۲۵۵ صفحات پر محیط ہیں ان مضامین میں موجود مولانا کے نقد وتبصروں کا ایک مختصر جائزہ لیا جائے مزید ان کی تنقید وتبصرے کا علمی وادبی معیار جانچا جائے جس سے ان کی تحریری سحر بیانی اور جادو قلمی کا اندازہ ہو سکے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے مضامین میں نقد وتبصرہ سے متعلق کچھ کہنے سے قبل ان کے گرد وپیش ان کی پیدائش، ان کی طالب علمی، ان کے دور کے سماج اور بالخصوص ان کی مختلف

☆ سینئر لکچرار شعبۂ فارسی دلی یونیورسٹی۔

الجہات شخصیت سے متعلق چند ضروری معلومات کا ایک سرسری جائزہ لینا اس مردحق کے "صدق وسچ" کو معنوی نذرانۂ عقیدت ہوگا۔

مولانا عبدالماجد ۱۸۹۲ء میں متولد ہوئے تھے ابتدائی تعلیم کے بعد لکھنؤ کے کیننگ کالج میں اعلیٰ تعلیم کے لئے داخلہ لیا تو وہاں دوران بی اے انہوں نے نفسیات، فلسفہ اور منطق کو اپنا اوڑھنا اور بچھونا بنالیا۔ بعد میں آپ نے "سچ اور صدق" نام سے دو معرکۃ الآرا صحافتی کارنامے کئے۔ سچ (ہفت روزہ تھا اور ابتدا میں الناظر کے ایڈیٹر ظفر الملک اور مولانا دونوں نے اسے جنوری ۱۹۲۵ء میں جاری کیا تھا) مگر اگست ۱۹۲۵ء سے مولانا سچ کے ایڈیٹر اور ظفر الملک اس کے منیجر ہوگئے۔ سچ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۳ء تک باقاعدہ نکلا اور دسمبر ۱۹۳۳ء میں مولانا سے ظفر الملک صاحب کی شکایت کے باعث بند ہوگیا۔ آپ کے مضامین جو کم وبیش ایک ہی موضوع سے متعلق تھے وہ انتخابات میں "مردوں کی مسیحائی" اور "محمد علی" عنوانات سے شائع ہو چکے ہیں ابتدا سے آخر عمر تک مولانا نے زندگی کے کئی ادوار کا مشاہدہ کیا۔ ابتدائی دور میں معاملہ سمجھنے پر محیط تھا عین شباب میں تشکیک کا عنصر مع الحاد غالب آیا اور آخر عمر کے ۳۵ یا ۴۰ سال صرف قرآنیات کی تفسیر، توضیح اور تبلیغ میں صرف کئے۔ بلاشک یہ کہا جاسکتا ہے کہ اپنی عمر کے ہر دور کو مولانا نے اس کی تمام تر اسراف اور انتہا تک جیا اور مختلف ومتضاد شخصیت کے ذاتی تجربات کا مثبت ومفید سود قارئین تک منعکس کیا جس میں ان کی کثیر الجہات فکر اور مختلف النوع شخصیت کے عوامل کا بھرپور عکس دکھائی دیتا ہے۔ ان کی شخصیت سازی میں بیک وقت مختلف عناصر کارفرما تھے ان کے بارے میں کچھ دانشوروں کی یہ رائے بالکل درست ہے کہ: "عشق نبرد پیشہ کی طرح ادب، فلسفہ، نفسیات، انتقاد، سوانح، سیرت، تفسیر اور ترجمے کے لئے بھی کسی مرد مبارز طلب کی ضرورت تھی اور ماجد ایک ایسے ہی فرد فرید تھے۔ بہرحال دنیا کا کوئی خورشید ہمیشگی ودوام کی صفات کا متحمل نہیں اس لئے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ بھی ۹۴ سال کی عمر میں ۶ رجنوری ۱۹۷۷ء کو پنجشنبہ کو ساڑھے چار بجے صبح میں خاتون منزل (لکھنؤ) سے رب حقیقی سے جاملے اور دریاباد میں مکان سے متصل مدفون ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی گرانقدر ادبی اور علمی خدمات کا سبھی حلقوں میں اعتراف کیا گیا ہے آپ کو ۱۹۶۵ء میں راشٹر پتی کا سرٹیفکیٹ آف آنرز یوم آزادی پر ایک شال اور مان پتر کے ساتھ عطا ہوا۔ حکومت اتر پردیش کی طرف سے آپ کو ۵ ہزار روپے کے انعام سے نوازا گیا۔

مارچ ۱۹۷۶ء میں علی گڈھ مسلم یونیورسٹی ڈی لٹ کی اعزازی سند عطا کی۔ آپ کی وفات پر مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند، بزم اردو محمد علی اکیڈمی مدینہ وغیرہ نے تعزیتی قرارداد یں پاس کیں مزید متعدد اردو وانگریزی اخبارات نے آپ کی وفات کو علمی وادبی دنیا کے لئے زیاں قرار دیا۔

آپ کی وفات پر ڈاکٹر مغیث الدین فریدی صاحب نے قطعہ تاریخ یوں رقم کیا۔

تاریخ رحلتِ بے ہنگام (یعنی ۱۹۷۷ء)

محبِ اسلام حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

عالم دین مفسر قرآن	مردِ حق محرم رموز حیات
اپنے خالق سے جاملا آخر	چھوڑ کر یہ جہان مکروہات
بے کم وبیش ہے یہی تاریخ	پاک دل، پاک ذات، پاک صفات
۱۳۹۷ہجری قمری = ۳۷۸-۱۷۷۵	۳۷۸

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے تنقید میں ایک ایسے اسکول کی تقلید کی ہے جسے ہم مشرقی تنقید کہتے ہیں کیونکہ ان کی تنقید میں تشریح بھی ہے تفسیر بھی نیز تجزیہ بھی ہے اور محاکمہ بھی۔ اردو میں باقاعدہ تنقید کا آغاز بالعموم مولانا الطاف حسین حالی کے نام ہے۔ مولانا دریابادیؒ سے قبل اردو تنقید کے جس عبوری دور امداد اثر کا نام لیا جاتا ہے ان کے بعد ناقدین کی ایک فہرست میں مہدی افادی، مولانا وحید الدین سلیم، مولوی عبدالحق، شرر، چکبست، عبدالرحمٰن بجنوری، عبدالسلام ندوی، احسن مارہروی، سر عبدالقادر، محی الدین زور، جعفر علی خاں اثر، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام قابل ذکر ہیں، جن میں سے مہدی افادی، وحید الدین سلیم، مولوی عبدالحق، سر عبدالقادر، عبدالرحمٰن بجنوری، احسن مارہروی عبدالسلام ندوی ان کے پیشرو ہیں۔

مولانا دریابادیؒ کے تنقیدی مضامین میں جمالیات، تاثرات، نفسیات، اخلاقیات اور فلسفے کے عنصر دکھائی دیتے ہیں آپ کی تنقید میں کچھ ممتاز اوصاف ملتے ہیں جیسے سادگی، سلاست، شگفتگی اور جدت ادا، نیز وہ تنقید میں پیچیدہ، تجزیاتی یا تحلیلی اسلوب کو بھی پسند نہیں کرتے۔ آپ کے تنقیدی مضامین کے لئے راقم نے ''مضامین عبدالماجد دریابادیؒ'' کو انتخاب کیا ہے جس میں

۲۷ مضامین ہیں مگر اس میں سے اصل اور خالص تنقیدی مضامین کی تعداد آٹھ ہے۔

(۱) مثنوی (۲) جاوید نامہ (۳) ضرب کلیم (۴) پس چہ باید کرد اے اقوام شرق (۵) جھوٹ میں سچ (۶) ایک بزمِ مشاعرہ کی غیر شاعرانہ صدارت (۷) غالب کا فلسفہ اور (۸) جوہر اور ان کی شاعری۔

مولانا عبدالماجد ایک دور میں ریشنلسٹ (Rationalist) رہے اور تقریباً ۸ سال تک الحاد وتشکیک سے بھی دوچار رہے۔ نیز اسی زمانے میں مولانا نے عقائدوایمان کے مسائل کو عقلی معیار پر پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ مولانا نے تنقید کے لئے ایک راہ نکالی جس کا انکشاف انہوں نے نہایت دیانتداری سے ''الناظر'' میں یکم اپریل ۱۹۱۱ء کے ص ۱۹ پر یوں کیا ہے:

''ناقدین پر ایک عام الزام ہے کہ ان کی نگاہ ہمیشہ عیوب ونقائص پر پڑتی ہے اور وہ مصنف کی صرف غلطیوں اور فروگذاشتوں کو پبلک میں ظاہر کردینا اپنا فرض خیال کرتے ہیں اور سچ یہ ہے کہ یہ الزام بے بنیاد ہے ملک میں جن تحریروں کو تنقید کہا جاتا ہے وہ عموماً دوطرح کی ہوتی ہیں۔ اگر تنقید نگار مصنف کا ہم خیال یا دوست ہے تو سرے سے مداحی کے گلدستے پیش کرنا شروع کردیتا ہے اور اگر اس کے معائب کے متعلق کوئی لفظ زبان سے نکالتا بھی ہے تو اس قدر ضعیف اور دھیمی آواز میں کہ مدح سرائی کے ہنگامہ خیز غلغلہ میں یہ صدا کسی کے کان تک نہ پہنچے۔ برعکس اس کے اگر ناقد کو کسی وجہ سے مصنف سے مخالفت ہے تو تصنیف زیر تنقید ہر قسم کے اعتراضات کا ہدف بن جاتی ہے۔ اس کی جزوی فروگذاشتوں کو نہایت اہمیت دی جاتی ہے اور قدم قدم پر اس کی مخالفت کی جاتی ہے لیکن یہ دونوں طریقے سخت معیوب وناپسندیدہ ہیں اور ایسی تحریروں کو تنقید کے نام پر یاد کرنا واقعیت پر ظلم کرنا ہے۔ ایک نقاد کو در حقیقت افراط وتفریط سے علیحدہ ہو کر کامل دیانت داری اور راستبازی کے ساتھ بجائے خود ہر ایک مسئلہ پر غور کرنا چاہئے اور اس کا فرض ہے کہ جس آزادی کے ساتھ وہ ادنیٰ سے ادنیٰ نقائص کی پردہ دری کرتا ہے اسی فیاضی کے ساتھ خفیف سی خفیف خوبیوں کا بھی اعتراف کرے۔''

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے کبھی فن تنقید پر کوئی کتاب تو نہیں لکھی ہے مگر ان کے تنقیدی مضامین کو پڑھ کر ہی مولانا کی انتقادی روح اور اس کے اثرات کا اندازہ ہوپاتا ہے مثلاً مضامین عبدالماجد میں ''جوہر اور ان کی شاعری'' عنوان سے تنقیدی مضمون میں آپ رقم طراز ہیں:

''تکلف اور تصنع سے محمد علی کی زندگی کا ہر شعبہ پاک تھا وہی رنگ یہاں بھی ہے شعر کہتے ہیں، یہ معلوم ہوتا ہے بے تکلف باتیں کرتے چلے جاتے ہیں نہ کسی قسم کی تیاری نہ کوئی اہتمام، کیسی نظر ثانی اور کہاں کا غور وفکر، نہ اصلاح نہ ترمیم بس جو دل میں آ گیا جھٹ کہہ گزرے یہی حال نثر کا ہے، یہی حال نظم کا''۔ (ص:۲۳۷)

اسی مضمون میں آگے لکھتے ہیں: ''زبان پر آئی ہوئی ''واہ'' کا غلغلہ بس یہیں محفل کے فرش تک، دل کی نکلی ہوئی آہ کی رسائی مالکِ عرش تک! رومی و حافظ اور سعدی آج تک کیوں زندہ ہیں؟ اس لئے کہ کلام فصیح و بلیغ ہوتا تھا؟ یا اس لئے کہ خوش مزہ کلام کے اندر کوئی روح بھی ہوتی تھی؟ فارسی زبان بدل گئی، الفاظ متروک ہوگئے، محاورات تبدیل ہوگئے، ترکیبیں نئی ہوگئیں، لیکن حی و قیوم کا نام جپنے والے صدیوں کے بعد بھی جوں کے توں! خود بھی زندہ اور دوسروں کو زندگی بخشنے والے بھی! جوہر نے بھی اپنے کو اسی نہ مٹنے والے زندہ کے نام کے پیچھے مٹا دیا تھا، عجب کیا ہے کہ کچھ زندگی ان کے نصیب میں بھی آجائے۔'' (مضامین عبدالماجد دریابادیؒ، جوہر اور ان کی شاعری ص:۲۴۱و۲۴۲)

عبدالماجد دریابادیؒ کی تنقید کا خاصہ اور تحریر کی انفرادیت ان کے ایجاز میں پنہاں ہے مثال کے لئے ''ضرب کلیم'' کے لئے مولانا کا جملہ نہایت وقیع ناقدانہ نظر کا غماز ہے وہ لکھتے ہیں:

''ضرب کلیم کا وصف امتیازی، حکیمانہ ژرف نگاہی ہے'' یہ چھوٹا جملہ مستقل پیراگرافوں پر بھی بھاری ہے جو ایک اچھے ناقد کا وصف امتیازی ہی ہے۔ (ضرب کلیم، مضامین عبدالماجد دریابادیؒ ص:۶۱)

اسی مضمون کا ایک اور حوالہ دیکھیں جو مولانا کی عمیق اقبالیاتی نظر کا راز افشا کرتا ہے:

''گھر کا بھید، گھر کے بھیدی سے بڑھ کر کس کی زبان سے ادا ہو سکتے ہیں۔ بت کدۂ آزر پر تیشۂ ابراہیمی سے بڑھ کر کس کی ضرب پڑ سکتی ہے۔ طلسم افرنگ کو توڑنے کے لئے افسوں خواں اقبال سے بڑھ کر کون ملے گا۔ اسی طلسم کدہ کا پروردہ، اسی میکدہ کا سرشار۔

مدتے محو تگ و دو بودہ ام — راز دانِ دانش تو بودہ ام

باغبانان امتحانم کردہ اند — محرمِ این گلستانم کردہ اند

مدتے بالالہ رویاں ساختم　　عشق بامرغولہ مویاں باختم

کوئی صفحہ کہیں سے کھول لیجئے۔ ایک ہی چمن کی گل کاریاں نظر آئیں گی، قوت اگر بے دینوں کے ہاتھ میں ہے تو دنیا کو نمونہ جہنم بنا دینے کے لئے کافی ہے۔ وہی قوت اگر حق پرستوں کے ہاتھ میں ہے تو جنت کی رہبر۔'' (ضرب کلیم، مضامین عبدالماجد دریابادیؒ ص:۶۱و۶۲)

اسی مضمون میں فلسفے پر تنقید کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں: ''جس لفظی طلسم بندی کا نام یونان نے کبھی اور یورپ نے آج بھی فلسفہ رکھا ہے، کہتے ہیں کہ وہ نوجوانوں کے دلوں میں مذہب کی بنیادیں ہلا ڈالتا ہے اس کی حقیقت کوئی اس کے دل سے پوچھے جو خود ان گلیوں کی خاک چھانے پڑا ہو۔ شاعر آج نہ سہی چند سال اُدھر تو آخر جوان تھا اور انہیں ڈگریوں اور امتحانوں اور پروفیسروں کی بھول بھلیاں میں ٹھوکریں کھا چکا ہے:

معلوم ہے مجھ کو ترے احوال کہ میں بھی　　مدت ہوئی گزرا تھا اسی راہ گذر سے

الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا　　غواص کو مطلب ہے صدف سے نہ گہر سے

یا مردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار　　جو فلسفہ لکھا نہ گیا خونِ جگر سے!

(ضرب کلیم، مضامین عبدالماجد دریابادیؒ، ص:۶۲و۶۳)

یہ حقیقت ہے کہ ہمارے بزرگوں اور محدثین نے غالباً اس سمت میں پہلے سے پیش قدمی کرلی تھی جس کے باعث خود دہلی میں ہمیشہ علم منقول کو علم معقول پر سبقت دی گئی ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ ایک اور انتقادی مضمون ''پس چہ باید کرد اے اقوام شرق'' ان کے تجزیاتی اور تخیلی فکر و انتقاد کا بھرپور منظر نامہ ہے۔ اسی مضمون کے دو اقتباسات مولانا کی انشاپردازی، تاثیر، زور بیان، وجدانی و تاثراتی بیچ کاری کے نمونے ہیں وہ فرماتے ہیں:

''دوسروں کا فقر رہبانیت اور جوگ ہے، مومن کا فقر تو عین بادشاہی و حکمرانی ہے۔''

(ص:۶۶)

یا پھر لکھتے ہیں: ''تہذیب فرنگ کی مصوری اقبال خدا جانے کتنی بار کر چکے ہیں لیکن ہر نیا نقش اپنی دلآویزی میں پچھلے نقوش سے کچھ بڑھ کر ہی رہتا ہے۔'' (ص:۶۷)

مولانا عبدالماجد صاحب"خود ڈرامے کے شوقین تھے وہ ڈراما نگار تھے اور تاثیر کلام میں اس کے جادو کے قائل تھے۔ اسی مذکور مضمون کے اختتام میں رقمطراز ہیں:

''اقتباسات بہت ہوگئے، جبر کر کے قلم روکنا پڑتا ہے، ورنہ اگر طبیعت پر چھوڑ دیا جائے تو شاید ساری کتاب ہی اول سے آخر تک نقل ہوکر رہے۔'' (ص:٦٧)

ظاہر ہے یہ عبارت صرف ایک ناقد و مصر ہی لکھ سکتا ہے جو دریا کو کوزے میں سمونے کے فن سے بخوبی آشنا ہو اور مولانا اس فن کے عملی غواص۔ بہرحال یہ تو چند مثالیں مشتے نمونہ از خروارے کی طرح آپ حضرات کی خدمت میں مولانا کے انتقادی مضامین کے حوالوں سے ہوئیں اور اس میں مزید ڈاکٹر تحسین فراقی صاحب کے تبصرے اور رائے پر مولانا کی انتقادی حیثیت کے تعین کا سلسلہ ختم کرتا ہوں:

''ماجد نے تنقید میں محض تاثرات سے کام نہیں لیا وہ تاریخی و تہذیبی پس منظر اجاگر کرتے ہیں مختصر تقابل کرتے ہیں، ادب و فن کے دوام کی شرائط متعین کرتے ہیں، تدریجی ارتقا کا بھی کسی قدر کھوج لگاتے ہیں لیکن ان کا اسلوب رُک رُک کر سوچنے کا موقع کم دیتا ہے۔ قاری ان کے منھ زور اسلوب کے دھارے میں بہہ جاتا ہے۔ یہی اس اسلوب کی کامیابی بھی ہے اور ناکامی بھی، قوت بھی ہے اور کمزوری بھی بہرحال ماجد کی جتنی تنقید بھی ہے ان کی اپنی ہے وہ ہمارے احساس کمتری میں مبتلا بعض نقادوں کی طرح مغربی اقوال کی منڈی نہیں لگاتے۔ ان کا انداز تنقید، بہرحال مشرقی ہے اور مشرقیات کی عظمت کا علمبردار''۔ (عبدالماجد دریابادیؒ احوال و آثار، ڈاکٹر تحسین فراقی، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور ١٩٩٣ء، ص:٣١٩)

مضامین عبدالماجد میں تبصرہ:

مولانا عبدالماجد کے یہاں تنقید و تبصرے کا زمانہ کم و بیش ایک ہی ہے، انہوں نے ١٩١٠ء/١١ء میں ''الناظر'' میں متعدد مضامین و تبصرے لکھے تھے اسی طرح ١٩١٦ء میں معارف کے اجراء سے مولانا نے اس مجلے میں بھی تبصرے شائع کیے مگر بالعموم یہ تبصرے فرضی ناموں سے لکھے جاتے تھے۔ مگر مولانا نے ماڈرن ریویو، کلکتہ میں ١٩١٨ء سے ١٩٢٨ء تک تقریباً دس سال تک انگریزی میں مختصر تبصرے لکھے تھے۔

مولانا تبصروں میں شعر وادب کا صالح تصور، ادب کے لئے شرافت لازمی جزو، فصاحت وبلاغت ایجاز، سلاست اور شگفتگی کے قائل ہیں۔ بصیرت افروز مسائل کی وہ داد دیتے ہیں۔ عموماً راستبازی اور صاف گوئی وتوازن برقرار رکھتے ہیں۔ شدت سے مشرقیت کے قائل ہیں۔ ان کے بعض تبصرے نہایت طنزیہ اور کٹیلے ہیں۔ ان کے تبصرے مذہبی، تاریخی، ادبی، سیاسی، علمی، فکری، سوانحی اور تنقیدی سبھی طرح کے ہیں۔ مقالات ماجد میں ان کے اٹھارہ تبصرے، بیسیوں تبصرے الناظر، معارف ماڈرن ریویو کلکتہ، ہمدرد دہلی اور سچ وصدق میں شائع ہوئے ہیں۔

تبصروں کے ضمن میں دو تبصرے کلکتہ ریویو سے انگریزی میں اور دو تبصرے اردو میں ملاحظہ ہوں: مولانا نے انگریزی تبصروں میں بالعموم اور اردو تذکروں میں بالخصوص راست بازی، حقیقت بیانی، دقت نظر اور عمیق مطالعے کے جوہر آبدار سے مبصر کے ہنر کو جلوے دکھائے ہیں زیر نظر تبصرے میں مولانا نے ریوانڈ گولڈ سٹیک (Ravend Golstake) کی کتاب "The Traditions in Islam" کے بارے میں حقیقت پر مبنی تبصرہ کرتے ہوئے کہ مصنف کا یہ خیال کہ احادیث کا کوئی تنقیدی جائزہ نہیں لیا گیا اور یہ اس ضمن میں پہلی کتاب ہے اس پر تبصرہ یوں رقم کیا ہے:

"This may be true or not, but the book is certainly a novel production: In as much as it sets to prove what nobody has ever denied." (Modern review, calcutta, september 1919, p. 313)

پھر مولانا بتاتے ہیں کہ مسلم اسماء الرجال کا حیرت انگیز انضباط خود حدیث کے معاملے میں جس قدر چھان بین کا قائل ہے اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ مسلمان حدیث کے ردوقبول میں کتنے محتاط ہیں یہ حقیقت اتنی واضح ہے کہ اس کی مزید وضاحت میں مصنف نے اپنی محنت خواہ مخواہ برباد کی ہے وہ شدید اور تند انداز میں تبصرہ کرتے ہوئے رقم کرتے ہیں:

"Infact, it is a common place canon in muslims theology that all the traditions of which the authencity is not strictly proved, or which are in contradiction either with the Quran, or reason are not taken as genuine, we sympathise with the author in his misspent labours." (Same as early/Ibid).

جوش ملیح آبادی کی ادارت میں رسالہ کلیم جب دہلی سے نکلا جو اس میں اردو ادبیات میں انقلاب کی ضرورت پر جوش صاحب کا ایک نہایت جاندار مقالہ شائع ہوا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا نے مقالات ماجد (طبع دوم) کے ص ۲۹۴ و ۲۹۵ میں لکھا تھا:

''یہ جوش و خروش، غیظ و غضب اگر محض تخلص کی مناسبت سے ہے اور یہ گرج اور چمک اور یہ ہوش رُبا تجلیات آتشین اور سب سے بڑھ کر بقول ایک صاحب کے لن ترانیاں اگر اسی کلیم کی شاعرانہ رعایت سے ہیں تو اس حسن ادا کی داد نہ دینا ظلم ہے لیکن اگر اس کے سوا کوئی اور صنعت ملحوظ رکھی گئی ہے تو اتنا رسا دماغ کہاں سے لائیں؟''۔

مذکورہ بالا تذکرے سے ماجد کے تبصرے میں وسعت علم اور تخیل ادب کے ساتھ تصور ادب نیز طنز ماجدی کا بھی پتہ چلتا ہے۔

دوسرے تبصرے میں مولانا نے عبدالرحمٰن کی ''مرآۃ الشعر'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''مرآۃ الشعر معلومات کا خزینہ ہے۔ جس میں عربی، فارسی اور اردو شاعری اور اس کے عمومی مبحث بہت تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں بقول مولانا تشبیہ، استعارہ، بحر، قافیہ، تنقید اور متعلقہ امور پر بصیرت افروز تفصیل موجود ہے لیکن اس کتاب میں ایک ہی خامی ہے کہ اس کا اسلوب منشیانہ اور بھاری بھرکم ہے۔''

ایک اعلیٰ فنکار کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ وہ پیدا ہوتا ہے بنتا نہیں گویا یہ فنکار وہبی ملکہ ہے کسبی نہیں یہ بھی حقیقت ہے کہ زبان، شخصیت اور فکر کے مثلث کا نام ہی اسلوب ہے اور مولانا کے یہاں یہ ایک منفرد اور متاثر کن شکل میں موجود ہے۔ مولانا بنیادی طور پر ایک ماہر ادیب تھے اور ایسے ادیب جن کا اپنا منفرد اور نا قابل تقلید اسلوب تھا۔

ڈاکٹر تحسین فراقی صاحب ان کی نثر اور اسلوب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بظاہر اتنے متنوع بلکہ متعارض موضوعات پر فنکارانہ چابک دستی سے دلچسپ اور دلکش تمہید باندھنا اور ان میں ڈرامے کا سارنگ بھر دینا ماجد کی کلک کرشمہ ساز کی ادنیٰ جنبش کا اعجاز ہے۔'' (احوال و آثار مولانا عبدالماجد دریابادی ص: ۴۷)

آخر میں احتشام حسین صاحب کے مضمون مولانا عبدالماجد کی تنقیدی بصیرت، مشمولہ فروغ

اردو عبدالماجد دریابادی نمبر کے صفحہ ۱۰۵ پر ان کے تبصرے سے ختم کرتا ہوں:

''مولانا کے فقروں کے ٹھاٹھ کسی بربط نواز کے تال سُر سے کم نہیں ہوتے اور ان کے لہجے کا زور اور معنویت کی اشاریت سونے پر سہاگہ کا کام کرتی ہے۔ ان کا طرزِ تخاطب اور جذبات کی لہریں نثر میں نظم کا کیف و سرور پیدا کر دیتی ہیں۔''

آپ بیتی والے ـــــ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

مولانا عبدالعلی فاروقی ☆

اسے کوئی میری کم علمی سے تعبیر کرے یا ناسمجھی قرار دے، کہ اپنی ''آپ بیتی'' لکھ کر اسے شائع کرانے کو میں ''اپنے منہ میاں مٹھو بننے'' سے زیادہ وقعت نہیں دیتا تھا ـــــ اپنے قلم سے اپنی زندگی کے بیتے لمحوں کی ''قدر و قیمت'' اجاگر کرنے کی کسی کوشش کو، یا پھر اپنے کو آئیڈیل بنا کر دوسروں کے سامنے پیش کرنے کے ''تکلف'' کو، خودستائی، یا ''اپنے منہ میاں مٹھو بننے'' کے علاوہ کیا تعبیر دی جا سکتی ہے؟

اسے حسنِ اتفاق کہوں یا سوءِ اتفاق، کہ میری نظروں سے جو ''آپ بیتیاں'' گذری تھیں، ان میں میں نے ''آپ بیتی والوں'' کو بقلم خود سجا سجایا آئیڈیل ہی پایا تھا ـــــ کئی نامی گرامی اور جانے پہچانے لوگوں کی زندگی کے کمزور پہلوؤں اور ''ناکام تجربات'' کی تفصیلات کو میں نے ان کی ''آپ بیتیوں'' میں تلاش کیا تو مجھے مایوسی ہاتھ لگی، کیونکہ ان ''آپ بیتیوں'' میں یا تو ایسے واقعاتِ زندگی کا مطلقاً ذکر ہی نہ تھا، یا پھر سرسری ذکر ملا بھی تو اس انداز میں کہ اس کی ذمہ داری دوسروں کے کاندھوں پر ڈال دی گئی اور ''غیبت وعیب جوئی سے بچنے کے خیال سے'' تفصیلات پیش کرنے سے گریز کیا گیا تھا؟

اس پس منظر میں مطالعہ کے لئے میں ''آپ بیتی'' کے بجائے ''سوانح'' کو ترجیح دینے لگا کہ کم از کم اس میں ''بہ قلم خود'' والی بات تو نہیں ہوتی! غالباً اسی احساس کا یہ نتیجہ ہے کہ اپنی ذاتی زندگی میں کل سے لے کر آج تک میں نے کسی روزنامچہ یا ڈائری لکھنے کو نہ راہ دی نہ اس کا خیال آیا ـــــ اور خیال آتا بھی کیسے کہ نصف صدی سے زائد عرصہ پر مشتمل جیسی تیسی زندگی میں چھپانے کے لئے تو اچھا خاصا سرمایہ ہے، چھاپنے کے لئے کیا ہے کہ عظمت کے سکّے چلنے کا تصور

☆ مدیر، ماہنامہ البدر، کاکوری، لکھنؤ۔

کرسکوں؟اور شاعری کی زبان میں صحیح صورت حال یہ ہے کہ۔

ذکر بہار ہے نہ یہاں چاندنی کی بات　　　　تم کیا کروگے سن کے مری زندگی کی بات

ہاں اگر مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم کی ''آپ بیتی'' کے مطالعہ کے بعد ان کے نقش قدم پر چلنے کی جرأت کرپاتا تو شاید 'ڈائری وغیرہ' بھی لکھنے لگتا ـــــ مگر اس جرأت سے محرومی کے ساتھ ساتھ ایک بات یہ بھی تھی کہ اُس وقت تک بہت دیر بھی ہوچکی تھی اور ڈائری یا روزنامچہ کو مکمل کرنے کے لئے بہت سے خاکوں میں ''فرضی رنگ'' بھرنا پڑتے؟

اس تمہید یا ''اظہار خیال'' کا مطالعہ جن لوگوں نے گوارہ کرلیا ہو، ان کے سامنے اس حقیقت کا بیان بھی ضروری ہے کہ ''آپ بیتی'' کے سلسلہ میں میرے پہلے والے خیال کو مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی ''حرف حرف سچی آپ بیتی'' نے یکسر بدل کر مجھے ایک نئے جہان سے آشنا کیا، اور میں نے جانا کہ آپ بیتی لکھنے کی 'وجہ جواز' کیا ہوتی ہے؟

اس ''آپ بیتی'' میں ''سچ'' کے مدیر کی 'صدق' بیانی کا آغاز یوں ہوتا ہے:

''عزیزوں، دوستوں، مخلصوں کی ایک ''چھوٹی سی جماعت'' کا اصرار ہے کہ ۴۷، ۵ے سال کی عمر کا ایک پیر نابالغ اپنی آپ بیتی دوسروں کو سنائے اور نادانیوں، سفاہتوں کی لمبی سرگزشت دنیا کے سامنے اپنی زبان سے دہرائے! ـــــ اللہ جانے انسان کو انسان کی پستیوں، رسوائیوں، فضیحتوں کی داستان سننے میں کیا مزہ آتا ہے! اور یہاں تو خیریت سے سادہ دل بندوں کا ایک جم غفیر اس دھوکے میں پڑا ہوا ہے کہ جلوے کسی عالم، فاضل، اہل اللہ کے ان صفحات میں دیکھنے میں آئیں گے اور موعظے کسی حکیم و عارف باللہ کے سننے میں آئیں گے! ـــــ اللہ اللہ! اس عالم آب وگل میں کسی کی صفت ستاری نے کیسے کیسے پردے عیبیوں، مجرموں، خاطیوں کے چہروں پر، اور اچھے اچھے دانش وبصیرت رکھنے والوں کی فہم ونظر پر ڈال رکھے ہیں؟''

(دیباچہ ''آپ بیتی'')

''چھوٹی سی جماعت'' کی صراحت سے شروع ہوکر اختتام کو پہنچنے والے اس ایک پیراگراف کو دیکھ کر ''صدق بیانی'' کا جو یقین پیدا ہوتا ہے، وہی اس ''آپ بیتی'' کا طرۂ امتیاز ہے ـــــ اور یہی وہ چیز ہے جس نے راقم الحروف کو کسی ''آپ بیتی'' کے لکھنے کی ضرورت

واہمیت سے آشنا کیا، کیونکہ اپنے علاوہ کوئی دوسرا سوانح نگار زندگی کے ان تاریک اور پوشیدہ گوشوں میں جھانکنے اور انہیں طشت از بام کرنے کی ہمت ہی نہیں کر سکتا، اور خود انہیں اپنے قلم سے لکھ کر رسوائیوں کے راستے عظمتوں کا سفر طے کرنے کا ہر ایک کو سلیقہ کہاں؟ اور پھر عبدالماجد دریابادیؒ والا ''کلیجہ'' بھی تو کسی کسی کو ہی ملتا ہے! ـــــ جب کہ عبدالماجد کے علاوہ ایسے ''کسی'' کا راقم الحروف کو علم نہیں ہے۔

بلاشبہ مولانا عبدالماجدؒ کی سب سے عظیم اور لائق ذکر، بلکہ لائق فخر خدمت تفسیر قرآن (انگریزی، اردو) ہے، پھر دینی خدمات کے ساتھ اردو کے ایک صاحب طرز، بلکہ ''مخترع طرز'' ادیب کی حیثیت سے ان کی اپنی ایک شناخت ہے، معمولات کی پابندی، معاملات کی صفائی، اور بات ہی بات میں ''بڑی بڑی باتیں'' کہہ جانا بھی ان کے امتیازات میں سے ہے ـــــ لیکن راقم الحروف کو تو ''آپ بیتی والے'' مولانا عبدالماجدؒ ہی نے سب سے زیادہ متاثر کیا!

آغاز کے بعد اب یہ بھی دیکھتے چلئے کہ اس ''آپ بیتی'' کا اختتام کس طرح ہوا ہے:

> ''سارا بھروسہ، سارا ناز، سارا اعتماد، بس اس ذات پر ہے جس نے اپنا نام العفو بھی بتایا ہے اور الغفور بھی، اور الغفار بھی، اور جس نے بے شمار شہادتیں بھی اس کی اپنے سچے رسول ﷺ کے ذریعہ امت تک پہونچا دی ہیں، ورنہ اپنے اصل حال کے لحاظ سے تو جی بے اختیار یہی چاہتا ہے کہ زمین پھٹے اور اس میں سما جاؤں، اور مخلوق میں سے کسی کو اپنا چہرہ نہ دکھاؤں۔ اتنے دن جیا اور نہ حقوق اللہ کی ادائی کی توفیق ہوئی اور نہ حقوق العباد کی!
>
> عزیزو، مخلصو، رفیقو، بس اللہ حافظ یغفر اللہ لنا ولکم۔ انشاء اللہ العزیز ملاقات جس میں کسی قسم کا خلل نہیں پڑے گا اب جنت ہی میں ہوگی۔'' (وصیت نامہ از آپ بیتی)

آغاز اور اختتام ہی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس منفرد و ممتاز ''آپ بیتی'' میں سچ کی کیسی کیسی کارفرمائیاں ہوں گی! ـــــ اور اب اندازہ کی ضرورت بھی کیا، کہ ''آپ بیتی'' کے متعدد ایڈیشن شائع ہو کر اہل نظر سے اپنی صدق بیانی کا لوہا منوا چکے ـــــ یہ الگ بات ہے کہ اس راہ پر چلنا آج بھی اتنا ہی دشوار ہے، جتنا کل تھا؟۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ — ایک ہمہ جہت عظیم شخصیت

مولانا جنید احمد بنارسی ☆

شروع کرتا ہوں میں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور بہت رحم کرنے والا ہے۔ کیونکہ بسم اللہ کے بغیر کوئی اہم کام مکمل نہیں ہوتا۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کل أمر ذی بال لم یبد فیه ببسم الله فهو اقطع چونکہ اس وقت ایک بڑی شخصیت کے بارے میں حرفِ چند کے اظہار کی ہمت کر رہا ہوں، جو میرے لئے باعثِ ارجمندی ہے کہ اس تقریب ماجدی میں شریک ہونا اور مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے بارے میں کچھ کہنا مجد وسعادت کی بات ہے اور اسی نسبت سے اپنی نااہلی کے باوجود اُن بڑے بڑوں کے درمیان ہوں، جن کے پاؤں کی میں دھول بھی نہیں۔ مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی کی دریادلی نے مجھے دعوت دیا اور میں ان کے اصرار پر انکار نہ کرسکا کہ ایک عبقری کے نام پر کچھ کہنے سننے کا موقع مل رہا ہے۔

میری خوش بختی تھی کہ ایک بار لکھنؤ میں مولانا عبدالماجدؒ کی زیارت کا شرف حاصل ہوا وہ گولہ گنج محلے کے ایک مشہور اور تاریخی مکان ''خاتون منزل'' میں مقیم تھے، اسی خاتون منزل میں ندوۃ العلماء کا قیام ہوا تھا اور علامہ شبلی نے ۱۹۰۵ میں اس کی بالائی منزل پر مقیم رہ کر جدید نصاب تعلیم برائے دارالعلوم ندوۃ العلماء مرتب فرمایا تھا۔ وہاں جب میں پہونچا عصر بعد کا وقت تھا بیٹھک بھری ہوئی تھی مسند پر ایک منور چہرہ والا عبقری نہایت سادگی سے فروکش تھا، مجھے احساس ہوا کہ ایک عالم وادیب ہی نہیں بلکہ ایک مرشد کے پاس لوگ جمع ہیں لوگ ادب سے آتے احترام سے سلام ومصافحہ کر کے بیٹھ جاتے، میں نے سلام ودعاء مصافحہ خیر وعافیت کے سوا کوئی بات نہ دیکھی کہ مولانا ان دنوں قدرے علیل تھے۔ مولانا کی زیارت کا شوق اس لئے تھا کہ ۱۹۵۱ء سے میں ہفتہ وار ''صدق جدید'' دیکھتا تھا چونکہ یہ پرچہ نہایت پابندی سے ہمارے یہاں آتا تھا اور میں اپنے دادا مرحوم مولانا محمد ابراہیم مفتی بنارس خطیب جامع مسجد گیان باپی کو سنایا کرتا تھا۔ اس کے

☆ ورکنگ صدر آل انڈیا مومن کانفرنس ونائب صدر آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت۔

سبب مجھے اس پرچہ سے دلچسپی ہوگئی تھی اور صدق میرے لئے تو قدیم ہوتا گیا، لیکن جب بھی دیکھا وہ "صدق جدید" ہی رہا، نام سے بھی کام سے بھی پہلے اس اخبار کا نام "سچ" تھا۔ جس کی تفصیل مولانا کے قلم سے ملاحظہ فرمائیں وہ لکھتے ہیں کہ:

"یہی زمانہ یعنی شروع جنوری ۲۵ء کا تھا جب لکھنؤ میں بعض قدیم دوستوں کی صلاح ومشورہ سے ایک اپنا مستقل ہفتہ وار نکالنے کی ٹھہری۔ نام عام فہم سچ قرار پایا۔ ایڈیٹری پر نام تین آدمیوں کے رہے۔ مولوی ظفر الملک علوی ایڈیٹر الناظر (جو سچ کے منیجر اور گویا "مالک" بھی تھے) اور عبدالرحمٰن ندوی نگرامی اور تیسرا یہ خاکسار، شروع شروع مولوی عبدالرزاق خان ندوی ملیح آبادی بھی (جو بعد کو کلکتہ جاکر کچھ سے کچھ ہو گئے) ہر مشورہ میں شریک بلکہ پیش پیش رہے۔ مولوی ظفر الملک تو چھ مہینہ کے بعد ایڈیٹر سے الگ ہو کر صرف منیجر رہ گئے، اور نگرامی مرحوم کوئی ۱۳ر مہینہ کے بعد عین جواں عمری میں رحلت فرما گئے۔ اور یہ پرچہ کی باگ تمام تر میرے ہی ہاتھ میں آگئی۔"

ہاں! آخر تک مولانا سچ کے مدیر رہے اور یہ سچ اخبار صدق ہوا پھر یہی اخبار صدق جدید ہو گیا۔ مولانا کی تحریر کی پختگی یا انداز کا اچھوتا پن الفاظ کی بندش وگرفت اور کسی بھی تحریر کا جو خصوصی رنگ تھا وہ اپنی جگہ آپ تھا۔ صدق کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کی نظر اس قدر وسیع تھی جیسے ایک ماہر صیاد، جال لے کر بیٹھا ہے کہ اب کوئی شکار اس سے بچ کر نہیں جا سکتا۔ "اور جاتا بھی نہیں تھا" چھوٹے چھوٹے جملوں اور چند حرفوں میں بڑی سے بڑی بات کا تجزیہ کر دیتے، اور فوراً نقد ونظر کی کسوٹی پر پرکھ لیتے تھے، ساتھ ہی ساتھ ظرافت کا پہلو بھی ایسا کہ جو کسی اور کے یہاں نایاب، بس انہوں نے ہفتہ وار صدق کو حق وصداقت کا آئینہ بنا کر رکھ دیا تھا۔

۱۹۵۵ء میں مولانا کی کتابیں سفر حجاز پھر محمد علی کی ذاتی ڈائری اور حکیم الامت دیکھنے اور پڑھنے کا اتفاق ہوا یہ اس وقت کی بات ہے کہ میری صلاحیت وشعور سے یہ کتابیں بالاتر تھیں لیکن شوق نے مجھ سے پڑھوا دیا تھا اس کی دل آویزی نے مجھے اس وقت کچھ اور ہی لطف دیا تھا۔ سفر حجاز میں، بحری جہاز وسمندر کا جو نقشہ ہے اور محمد علی کی ذاتی ڈائری میں ایک میٹنگ کی جو تفصیل ہے۔ جب مولانا نے مسٹر محمد علی کو پہلی بار دیکھا تھا اور اس کا جو نقشہ کھینچا ہے پڑھنے والا سمجھتا ہے کہ وہ بھی اس جگہ موجود ہے کچھ یہی کیفیت میری بھی ہوئی تھی، تحریر میں نقشہ کھینچ دینا یا تحریر کو تصویر بنا دینا مولانا کا فن تھا اور انہیں کا حق بھی۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں کہ کس طرح انہوں نے مولانا

محمد علی جوہر کا نقشہ کھینچا ہے:

''وہ قصر محمود آباد جو مہمانوں کی دعوتوں اور ضیافتوں کے لئے وقف تھا، اور جس کا ''ڈرائنگ روم'' قابوں اور پلیٹوں اور چمچوں کی جھنکار سے ہر وقت گونجتا ہی رہتا تھا۔

کمیٹی کے سامنے وقت کے بڑے بڑے اہم اور نازک مسئلے چھڑے ہوئے۔ اور ملت کے دل و دماغ کا عطر جیسے کھینچ کر یہیں آ گیا ہے۔ سرراجہ صاحب (نام، جس سے کم ہی لوگ واقف و مانوس تھے، علی محمد خان) وسیع ڈرائنگ روم کے صدر میں تشریف فرما۔ سامنے ایک بڑی لمبی میز، دورویہ کرسیوں کی قطار، میز کے ایک سمت میں ایک جوان رعنا، تندرست و توانا، کوئی ۳۳، ۳۴ سال کی عمر کا، اعلیٰ درجہ کے انگریزی سوٹ میں ملبوس بیٹھا ہوا۔ داڑھی تازی منڈی ہوئی۔ مونچھیں ذرا گھنی اور نوکیلی، ذہانت بشرہ سے ٹپکتی ہوئی، شوخی و ذکاوت چہرہ سے برستی ہوئی۔ ممبروں میں ایک سے ایک قابل و فاضل۔ اس کے بڑے اور مخدوم بھی۔ لیکن نظریں بار بار اُسی کی طرف اٹھ رہی ہیں، اور کان اُسی کی آواز پر لگے ہوئے۔ وہ بولا تو سب سننے لگے۔ وہ اٹھا تو کوئی ہنسا اور کوئی بگڑا، مگر متوجہ سب ہی ہو گئے...... یہ تھا کامریڈ کا شہرۂ آفاق ایڈیٹر محمد علی، رامپور کا باشندہ اور علی گڑھ اور آکسفورڈ کا گریجویٹ۔ جس کی جادو نگاری اور انگریزی انشاء پردازی کا سکہ اس وقت بھی دلوں پر بیٹھ چکا تھا، حالانکہ کامریڈ کو نکلے ہوئے، ابھی سال ڈیڑھ سال کا ہی عرصہ ہوا تھا۔ اور اردو روزنامہ ہمدرد کا ابھی وجود بھی نہ تھا''

محمد علی کی دوسری تصویر جو مولانا کی تحریر میں ہے ملاحظہ فرمائیں کہ...... ''دن کی میٹنگ اگر خواص کی مجلس تھی، تو شام کی یہ تقریب ایک دربار عام، اسلامی ہند کے چنے ہوئے لیڈر اور مشاہیر عوام کے درمیان ایک جگہ مجتمع، آزادی اور بے تکلفی کے ساتھ ہنس بول رہے ہیں۔ لیکن بارات کا دولہا اس وقت بھی کامریڈ کا ایڈیٹر ہے۔ سج دھج صبح سے اس وقت بالکل مختلف، بجائے ہیٹ اور انگریزی سوٹ کے، سر پر ترچھی رامپوری پگڑی، جسم پر باریک و نفیس انگرکھا، چوڑی دار تنگ موری کا پاجامہ، دلی کا جوتا...... محمد علی اپنی زندگی کے اس دور میں بھی صاحبیت میں یکسر غرق نہیں ہوئے تھے۔ معاشرت میں فی الجملہ مشرقیت و اسلامیت اس وقت بھی ملحوظ رکھتے تھے...... ملنے اور بات چیت کرنے کی ہمت تو کیا ہوتی، دل اسی سے نہال ہوا جا رہا تھا کہ اتنے قریب سے دیکھنے اور گفتگو سننے کا موقع تو مل گیا۔ کامریڈ کی سحر نگاری سے مسلمان تو مسلمان، کالج کے ہندولڑ کے بھی

متاثر تھے۔ ان کے سامنے محمد علی کا نام لے کر فخر کرنے کے لئے یہ کچھ کم تھا ع

ان کے اک جاں نثار ہم بھی ہیں!"

مولانا کا انداز بالکل اچھوتا نیا اور نا قابل تقلید رہا جس طرح مولانا آزادؔ کا اگر کسی کی تحریر کو مولانا آزاد کی تحریر کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے تو وہ مولانا عبدالماجدؔ کی تحریر ہے چاہے بعد میں خود وہ تحریر کے مقابلہ تو دل نتواں نے تو خوب کیا دونوں نادرۂ روزگار شخصیتوں کے درمیان مراسلت رہی اور Pain & Peace کے ترجمے کے لئے جو مضامین لائبریریوں کے زینت بنے ہیں وہ دیکھنے اور پڑھنے کے لائق ہیں، کاش لوگ پڑھتے اب تو المیہ یہ ہے کہ عام اردو کی کتابیں اور رسائل اور خطوط پڑھنے کے قابل ان گھروں کے بچے نہیں رہے جہاں بہترین اردو زباں تھی اور اردو کا چرچا تھا۔ جہاں کے لوگوں کی صبح اردو تھی اور شام بھی......اب ذکر مولانا آزاد کا آ گیا تو مولانا دریابادی نے مولانا آزاد کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ بھی ملاحظہ فرمالیں:

"مولانا اس وقت تک "مولانا" نہ تھے محض ابوالکلام آزاد تھے۔ ماہنامۂ خدنگ نظر، (لکھنؤ) میں ایک آدھ مضمون لکھ چکے تھے اور شاید اپنا ہفتہ وار لسان الصدق (کلکتہ) بھی کچھ دن نکال چکے تھے۔ بہر حال الندوہ میں موضوع تحریر فرید وجدی مصری کی کتاب المرأۃ المسلمۃ تھی جسے مولانا نے عربی سے اردو میں اپنا لیا تھا اور اسے جدید طبقے کے جواب میں طبی، شرعی ہر قسم کے دلائل سے یہ دکھایا تھا کہ عورت مرد کے برابر نہیں اور دونوں کے مساوات کا تمام تر دعوا غلط ہے۔ مضمون نگار کی طرف سے دل و دماغ میں عظمت پیدا کرنے کے لئے بس اسی قدر کافی تھا۔

ایک آدھ پرچے میں بلند پایہ مصری رسالوں سے ماخوذ، علمی خبریں بھی اسی قلم سے نکلیں، زور قلم اور جوش تحریر سے ایسا اندازہ ہوا کہ شخصیت بھی بڑی ہی زوردار ہوگی اور صورت کا نقشہ ذہن کے سامنے یہ جما کہ بڑے کلے ٹھلے کے ہوں گے آواز سب پر غالب رہتی ہوگی۔ کسی کو اپنے سامنے بولنے نہ دیتے ہوں گے۔

دو ڈھائی سال اور گزرے۔ میں لکھنؤ میں کالج کا طالب علم تھا کہ سردی کے موسم میں ایک روز دوپہر کے وقت دو چار ساتھیوں سمیت کسی ضرورت سے اسٹیشن جانا ہوا۔ پلیٹ فارم پر دیکھا کہ سکنڈ کلاس ویٹنگ روم سے ایک نوجوان سگریٹ پیتے برآمد ہوئے۔ گورے چٹے، خوش رو، جامہ زیب، کشیدہ قامت، چھریرے بدن کے سیاہ شیروانی اور سیاہ ایرانی ٹوپی میں ملبوس، جوان

رعنا ایسے کہ نظر ان پر خواہ مخواہ پڑے۔ پوچھ گچھ شروع ہوئی۔ کسی نے کہا کہ کوئی ایرانی پرنس (شہزادہ) معلوم ہوتا ہے۔ آخر کو کھلا کہ یہ ہی ابوالکلام آزاد ہیں۔ یہ زمانہ کوئی ۱۹۰۹ء کا ہوگا۔ مولانا عرصہ ہوا الندوہ سے سبک دوش ہو کر لکھنؤ چھوڑ چکے تھے۔ کچھ دنوں امرتسر کے معروف معزز سہ روزہ وکیل میں رہے تھے اور بھی رسالوں میں ان کا نام آنے لگا تھا۔ اصل صورت خیالی صورت سے بالکل مختلف نکلی اور کہیں زیادہ حسین و جاذب نظر۔''

یہ تھا مولانا دریابادیؒ کا قلم اور مولانا آزاد کے عہد شباب کا نقشہ۔ آپ سن کر مست نہ ہو جائیں بلکہ اب تک جنہوں نے مولانا دریابادیؒ کی تحریروں کو پڑھا نہیں ہے۔ پڑھ لیں ہاں جنہوں نے ان کو دیکھا نہیں وہ ان کی تحریروں میں ان کو دیکھ لیں۔

غرض مولانا کی کتابیں مثلاً سفر حجاز، محمد علی کی ذاتی ڈائری حکیم الامت اور سب سے بڑھ کر تفسیر ماجدی، جو ہمارے جیسے کم علم کے لئے مشکل بات تھی اس سے کما حقہ میں استفادہ نہ کر سکا۔ یہ اپنی بدقسمتی ہی کہہ سکتا ہوں مولانا وقت کے پابند، اصول پسند، غیور اپنا مقام سمجھنے والے، اور منصف مزاج تھے۔ ان کا منٹ منٹ، ضابطہ و رابطہ سے عبارت تھا، مولانا علیگ تھے، وہاں کی روایت کے مطابق سینئر جونیئر کا بھی مولانا کو خیال تھا۔ جس کا اظہار اس وقت ہوا جب ڈاکٹر ذاکر حسین صدر جمہوریہ ہند شبلی اکیڈمی کے جلسے میں خود ان سے آ کر ملے اور مولانا بیٹھے ہی رہے۔ ان کے جونیئر نے سلام و مصافحہ کر کے قدم آگے بڑھایا یہ بڑوں کی بڑی باتیں ہیں اب ایسے نمونے کہاں؟

مولانا کی ساری تحریریں آب زر سے لکھی جانے کے قابل ہیں، ان میں سے مزید دو کا حوالہ دیتا ہوں، میرے ماموں مولانا محفوظ الرحمٰن نامیؔ کے مدرسہ نورالعلوم بہرائچ میں درس نظامیہ کے ساتھ ساتھ دیال باغ کے طرز پر ہلال باغ کے نام سے جوتہ سازی کا ایک کارخانہ بھی مدرسہ میں قائم تھا، طلباء پڑھائی کے ساتھ ساتھ اس فن کو بھی سیکھتے تھے تاکہ پڑھائی کے بعد بے روزگاری کا مسئلہ نہ رہے بلکہ ایک ہنرمند ہاتھ رزق حلال کما سکے۔ چنانچہ مولانا نے معائنہ میں تحریر فرمایا:

''ایک عاصی و عاصی نے صاحب نام و نامیؔ کی معیت میں کچھ دیر کے لئے اور دل کی آنکھوں نے اتنی ہی دیر میں بہت کچھ دیکھ لیا۔ حاضری درس فقہ میں بھی ہوئی اور درس حدیث میں بھی اور

گھوم پھر کر وہاں بھی پہونچا جہاں دیکھا کہ دماغ وزبان کے بجائے دست وبازو اکل حلال کی سعی میں مشغول عمل ہیں، علوم اور صنایع ایک دوسرے کے حریف نہیں بلکہ ایک دوسرے کے حلیف وشریک ''علم'' کے متن کو ''صنعت'' کا حاشیہ اس سے بہتر کہیں کیوں ہاتھ آیا ہوگا؟ اُدھر آفتاب علم وحکمت کا جاہ وجلال، اِدھر صنعت پاپوش سازی میں کسب کمال! گستاخی نہ ہو تو عرض کروں کہ کیا خوب ؎

پاپوش میں لگائی کرن آفتاب کی''

دوسری تحریر میرے والد مولانا محمد اسحاق بناری کی کتاب کلمات اکابر پر مولانا نے تحریر فرمایا:

''اکابر کے کلمات طیبات پر کچھ لکھنے کی ہمت وہ کرے جو اصاغر میں اصغر ترین ہے ستم ظریفی میں تو یہ اپنی مثال بس آپ کی ہی ہوگی۔ اللہ اکبر''۔

اس کے بعد کئی سطروں میں مولانا نے اس کتاب پر اظہار خیال فرمایا جو کتاب میں موجود ہے۔

میرے والد اور چچا کی مولانا سے مراسلت رہی اور میرے ماموں مولانا محفوظ الرحمٰن نامی سے خصوصی تعلق تھا، جس کی بنا پر مولانا نے اپنا وقت نکالا اور عیادت کے لئے غالباً ۱۹۵۹ء میں بہرائچ تشریف لائے، اس وقت ایک خاص بات دیکھنے میں آئی کہ مولانا اسٹیشن سے گھر تک پیدل ہی جانے کو تیار تھے، جب بُعد مسافت (تقریباً ۳ میل) کا حال سنا تو سواری پر بیٹھے اور کرایہ بہ اصرار اپنی جیب سے ادا کیا، اس طرح کی مثالیں چند ہی شخصیتوں کی پیش کی جاسکتی ہیں، بایں ہمہ مولانا چھوٹی سے چھوٹی بات کا خیال فرماتے اور کسی بھی بات کو معمولی نہ سمجھتے اور ایسا کبھی نہ ہوا کہ مولانا کے یہاں سے کسی خط کا جواب نہ آیا ہو، یہ ان کی عادت تھی اس میں بڑکپن کے ساتھ اصول وضابطہ اور تعلق ورابطہ اور وضع الشیٔ فی محلہ کی مثال موجود تھی اور یہی عدل وانصاف ہے۔

مولانا کی تحریریں بے شمار اور شاندار بے غبار اور شاہکار در شاہکار ہیں مولانا کی وفات کے بعد حکیم عبدالقوی صاحب نے صدق کو باقی رکھا اور مولانا کے قدیم مضامین کو شائع کیا۔

اور کوئی ادارہ بھی ان کی یاد میں قائم کیا تھا جس کا نام میرے حافظہ میں نہیں ہے، شاید صدق فاؤنڈیشن ہی ہو بہر حال اب ضرورت ہے کہ آپ حضرات ان کے نام سے ان کے کام کو زندہ

کردیں تاکہ لوگ فیض یاب ہوسکیں۔ آپ کو جان کر یہ حیرت ہوگی مولانا عبدالماجدؒ دریابادی ندوی بھی تھے۔ اب آخر مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی تحریر پر اپنا مقالہ تمام کرتا ہوں۔ وہ یہ ہے:

''۱۹۲۹ء میں مولانا نے حج وزیارت سے فراغت حاصل کی اور وہ سفرنامہ ان کے قلم سے نکلا جو نہ صرف ان کی تحریروں بلکہ ان لاتعداد کتابوں میں جو اس موضوع پر لکھی گئی ہیں، امتیازِ خاص رکھتا ہے، جہاں تک یاد ہے، یہ مولانا کی پہلی کتاب تھی، جو میں نے بڑے شغف وانہماک کے ساتھ پوری پڑھی، پڑھتا تھا، اور مولانا کے زورِ قلم اور البیلے طرزِ تحریر پر جس میں ادب اور وارداتِ قلبی کا نہایت حسین اور دلآویز امتزاج ہے، جھوم جھوم جاتا تھا، اسی زمانہ کے قریب ندوہ کے ابنائے قدیم (اولڈ بوائز) کا جلسہ ہوا، انہوں نے مولانا کو اس جلسہ کا صدر اور حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندویؒ کو صدر استقبالیہ منتخب کیا، مولانا نے جو علامہ شبلی کے ساتھ خصوصی تعلق اور ندوہ کے مقاصد سے ہم آہنگی بلکہ ندوہ کے تخیل کی عملی تصویر ہونے کی بنا پر اعزازی ندوی تسلیم کیے گئے تھے اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے تو اپنے ایک خطبہ میں ان کو باقاعدہ فضلاء ندوہ میں شمار کرکے ان کو بطور سند پیش کیا تھا، اس موقع پر جو خطبہ پڑھا اس میں ان کے طرزِ تحریر کی ساری خوبیاں، ان کا پورا بانکپن اور اس کی پوری رنگینی موجود ہے، بے ساختہ اور بے تکلف مسجع عبارتیں اور ادبی استعارے اور تشبیہیں قلم سے نکل گئی ہیں، حافظہ کی کمزوری کے باوجود اس کا ایک ٹکڑا ابھی تک یاد ہے، بانیانِ ندوہ واساتذہ دارالعلوم اور موجودہ طالب علموں کو بیک وقت خراجِ محبت پیش کرتے ہوئے ان کی قلم سے یہ جملہ نکلا ہے۔

اللہ کی رحمت پیران مے فروش پر

اللہ کی رحمت جوانانِ مے نوش پر

مولانا کی ابتدائی زندگی سے کوئی بحث نہیں کیونکہ مولانا کا ایمان تحقیقی تھا پھر وہی عقیدہ بن گیا اور آخر تک وہ سلف صالحین کی طرح اس پر قائم رہے۔ والآخرۃ خیر وابقیٰ میں ان الفاظ کے ساتھ خراجِ عقیدت پیش کرتا ہوں، میری کیفیت یہ ہے کہ مصر کے بازار میں بضاعت مزجات لے کر خریداران یوسف کی صف میں کھڑا ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا دریابادیؒ کو جو عزت ومرتبہ اس عالم فانی میں عطا کیا تھا، اس سے بہتر اور زیادہ آخرت میں عطا کرے اور ان کے درجات کو بلند فرمائے۔ آمین

ہفتہ وار ''سچ''، لکھنؤ

ڈاکٹر شمس بدایونی ☆

اردو صحافت کی تاریخ میں اردو اخبارات کی ایک کثیر تعداد ملے گی۔ لیکن اپنی قومی وملی اور ادبی خدمات کے سبب جن اخبارات کو شہرت عام، بقائے دوام اور امتیاز خاص حاصل ہوا ان میں اودھ پنچ (لکھنؤ۔ اجراء ۱۸۷۷ء)، الہلال (کلکتہ۔ ۱۹۱۲ء) زمیندار (لاہور۔ ۱۹۱۲ء) ہمدرد (دہلی۔ ۱۹۱۳ء) اور سچ (لکھنؤ۔ ۱۹۲۵ء) کا نام لیا جاتا ہے۔ اودھ پنچ اور الہلال پر تفصیل سے لکھا گیا، ہمدرد، اور زمیندار پر بھی گاہے گاہے لکھا جاتا رہا ہے البتہ ''سچ'' اس توجہ سے محروم رہا۔ اس مضمون میں ''سچ'' کا تعارف کراتے ہوئے اس کی قومی وملی اور ادبی خدمات کا جائزہ بھی لیا جارہا ہے۔

ہفتہ وار ''سچ'' کے روح رواں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ (۱۸۹۲ء۔۱۹۷۷ء) ایک ایسی متنوع اور ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے، جس نے علمی وادبی موضوعات وآگہی کا پوری طرح احاطہ کرلیا تھا۔ ان کی ہشت پہلو شخصیت کو علم وفن کے کسی ایک دائرے میں رکھ کر نہیں دیکھا جاسکتا۔ صحافت، سیاست، اسلامیات، ادبیات مشرق ومغرب، فلسفہ اور دیگر بہت سے علوم وفنون پر انہوں نے تقریباً ۴۹ کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ وہ قدیم وجدید علوم سے نہ صرف بہرہ ور تھے بلکہ ان علوم کے ذریعہ انہوں نے علمی وادبی اسرار ومعارف کی اس طور پر بازیافت کی ہے کہ ادب فی الواقع زندگی کا سرچشمہ نظر آنے لگا۔ زندگی کے تقاضے کیا ہیں، اس کے تہذیبی عناصر کس حد تک انسانی سوچ کا موضوع بن سکتے ہیں، اس سے وہ بخوبی باخبر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی تحریروں کے ذریعہ انہوں نے ایک خاص نقطۂ نظر پیش کیا۔ جس میں اسلام کا اخلاقی نظام، ہم عصر تہذیب کا کھوکھلا پن، عملی زندگی میں انسانیت کا فقدان، اور علم وعمل میں بُعد وغیرہ شامل ہیں۔ اگر چہ ان کی حیثیت ایک صاحب طرز انشاء پرداز، صحافی، مفسر، عالم دین، مترجم، اور ماہر فلسفہ کی ہے، لیکن ان تمام حیثیتوں اور ان سے متعلق موضوعات میں جو چیز قدر مشترک کا درجہ رکھتی ہے وہ

☆ بریلی، یوپی۔

ایک ایسے صالح نظام فکر وعمل کی تبلیغ ہے جو انسان کو اس کے صحیح مقام وحیثیت کا عرفان کرادے۔ اخبار ''سچ'' اسی نقطۂ نظر کی ابلاغ وترسیل کے لئے جاری کیا گیا تھا۔ سچ کا پیغام سچائی کی تلاش (A search of Truth) اور اس کا عملی زندگی میں نفاذ ہے۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں جاری ہونے والا یہ اخبار اس دہائی کے معاشرتی واخلاقی مسائل، قومی وملی تحریکات، مذہبی اور بعض ادبی موضوعات، اصلاحی واحتسابی امور پر خاصا مواد فراہم کرتا ہے۔

سچ کا پہلا شمارہ ۲ رجنوری ۱۹۲۵ء/ ۶ جمادی الثانی ۱۳۴۳ھ کو شائع ہوا۔ یہ ہفت روزہ اخبار تھا جو ہر جمعہ کو پابندی کے ساتھ الناظر پریس لکھنؤ سے شائع ہوتا تھا۔ اس کا دفتر ۵۳ روکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ میں تھا۔ سچ کے مالک، ناشر وطابع اور مہتمم رسالہ الناظر کے مدیر اور الناظر پریس کے مالک اسحق علی علوی عرف ظفر الملک [1] (۱۸۸۴ء۔۱۹۴۲ء) تھے۔

چار اوراق پر دو کالم میں پورا اخبار لکھا جاتا تھا۔ کاغذ اخباری (News Print) استعمال کیا جاتا تھا۔ کتابت وطباعت درمیانی ہوتی تھی۔ اسحاق علی علوی کے اہتمام میں شائع ہوتا تھا۔

سچ کا پہلا شمارہ ظفر الملک کی ادارت میں شائع ہوا۔ یہ ۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا سائز 32X22 سینٹی میٹر ہے۔ رجسٹریشن نمبر A1392 ہے۔ زر سالانہ ۳ روپے ہے۔ بعد میں (۱۹۲۶ء) بیرون ہند سے ۷ شلنگ عام خریداروں سے ۳ روپے، ششماہی ایک روپیہ بارہ آنہ اور فی پرچہ ایک آنہ لیا جاتا تھا۔ (جس میں اضافہ ہوتا رہا)۔ سچ کی پیشانی پر شیخ سعدی کا یہ شعر مندرج ہوتا تھا:

راستی موجب رضائے خداست ۔۔۔ کس ندیدم کہ گم شد از رہ راست

۳ رجنوری ۱۹۳۰ء سے شعر کی جگہ یہ آیت قرآنی (الزمر: ۳۳) مع ترجمہ پہلے صفحہ پر درج کی جانے لگی۔ والذی جاء بالصدق وصدق به اولئک هم المتقون۔ (ترجمہ) اور جو سچی بات لے کر آیا اور جس نے اس کو سچ مانا تو وہی لوگ پرہیزگار ہیں۔

سچ کا اجراء واقعاتی پس منظر میں ہوا۔ ۱۲، ۱۳، ۱۴ ر ستمبر ۱۹۲۴ء کو لکھنؤ میں ہندو مسلم فساد ہوا۔ ہر دو فریق کا شدید نقصان ہوا اور فساد ختم ہو گیا لیکن دونوں طبقوں کی پریشانی بدستور قائم رہی۔ یہ چیز اقلیتی طبقہ کے لئے زیادہ تشویش کا باعث تھی۔ لہٰذا ایسے موقع پر ایک ایسے اخبار کی ضرورت

محسوس ہوئی جو مسلمانوں کی تشویش دور کر کے ان میں اعتماد بحال کرے اور یہ ہندو مسلم اتحاد کو فروغ دینے سے ہی ممکن تھا۔ ''سچ'' سے یہی کام لیا گیا۔ ظفر الملک اس کے اجرا کے متعلق لکھتے ہیں:

''گزشتہ سال جب لکھنؤ کے ہندو مسلمانوں کو کچھ بھائیوں نے لڑا دیا تو دونوں جماعتوں کے درمیان صلح کرانے کی غرض سے کچھ دنوں تک مسلسل جدو جہد کرنی پڑی اور اگر چہ جو بات میں چاہتا تھا بعض بھائیوں کی بیجاہٹ اور فضول ضد کی بدولت نہ ہوسکی، لیکن اس کوشش کے دوران میں اس امر کی شدید ضرورت محسوس ہوئی کہ ایک آزاد اور بااصول اخبار کم سے کم مسلمانوں میں صحیح خیالات کی اشاعت کے لئے جاری کیا جائے۔ سچ اسی خیال کا نتیجہ ہے۔'' (میری معذوریاں۔ سچ ۱۵ر جنوری ۱۹۲۶ء)

عبدالماجد رقم طراز ہیں:

''چند شوریدہ سروں کو ایک اصلاحی پرچہ نکالنے کی ضرورت عرصہ سے محسوس ہو رہی تھی۔ ۱۹۲۴ء کے آخری سہ ماہی میں مولوی ظفر الملک کی مستعدی سے یہ دشواری بڑی حد تک حل ہوگئی۔ ۲۱ر نومبر ۱۹۲۴ء کو دفتر ''سچ'' میں چار شخصیتوں کی ایک مختصر مجلس میں تمام ابتدائی مراتب طے پاگئے۔ اس مختصر مجلس کے اہم رکن خود مولوی عبدالرحمٰن تھے۔'' (عبدالرحمٰن کی موت۔ سچ لکھنؤ ۱۹ر مارچ ۲۶ء)

وہ چار شخصیتیں عبدالماجد (۱۸۹۲ء۔ ۱۹۷۷ء)، ظفر الملک (۱۸۸۴۔ ۱۹۳۶ء)، عبدالرحمان نگرامی (۱۸۹۹ء۔ ۱۹۲۶ء)، اور عبدالرزاق ملیح آبادی[۲] (۱۸۹۸۔ ۱۹۵۹ء) اپنے عہد کی ممتاز شخصیتیں تھیں جن کو نہ صرف ملت کے مسائل سے دلچسپی تھی بلکہ ان مسائل کو حل کرنے اور ملت کا کھویا ہوا وقار بحال کرنے کا جذبہ بھی ان میں بدرجۂ اتم موجود تھا۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اپنی آپ بیتی میں لکھتے ہیں:

''اخیر ۱۹۲۴ء تھا کہ دفتر الناظر میں ہم چار آدمی ایک ساتھ بیٹھے ہوئے۔ ایک میں دوسرے ظفر الملک علوی، تیسرے مولانا عبدالرحمٰن ندوی نگرامی اور چوتھے مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی...... رائے یہ قرار پائی کہ اپنے خصوصی، دینی، اصلاحی اور

اجتماعی اور کسی حد تک سیاسی بھی خیالات کی نشرو اشاعت کے لئے ایک مستقل ہفتہ وار ''سچ'' کے نام سے نکالا جائے، فیجر ظفر الملک صاحب علوی ہوں، اور ایڈیٹری میں بھی پرچہ پر نام انہیں کا رہے لیکن عملاً ادارت نگرامی اور دریابادی کے ہاتھ میں رہے۔'' (آپ بیتی ص: ۲۲۱ لکھنؤ سنہ ندارد)

یہ ہے ''سچ'' کے اجرا کا پس منظر ''سچ'' کا پہلا شمارہ بڑے اہتمام سے شائع ہوا۔ اس شمارے کے قلم کار صرف ظفر الملک، عبدالماجد اور عبدالرحمٰن نگرامی تھے۔ ان تینوں ارباب اساس نے ''سچ'' کے شروع کے پانچ صفحات پر خداوند قدوس سے دعا و مناجات اور ''سچ'' کی پالیسی پر اظہار خیال کیا ہے۔ ''سچ کی دعا'' عنوان سے ظفر الملک لکھتے ہیں:

''اے دونوں جہانوں کو پیدا کرنے والے! سچ تیرے حکم سے جاری ہوتا ہے اور جب تک تیری مرضی ہے جاری رہے گا۔ تو سچ کو ہمت دے کہ ہمیشہ، ہر وقت اور ہر موقع پر سچ کہے.........

سچ تیرے پیارے نبی ﷺ کی امت کو یاد دلانا چاہتا ہے کہ رسول کریم ﷺ نے زندگی کا جو عملی نمونہ پیش کیا ہے اور قرآن نے زندگی بسر کرنے کے جو طریقے بتائے وہی اور صرف وہی سچی راہ ہے اور اب بھی اس کی پیروی کرنا ہر انسان پر اور خصوصاً ہر مسلمان پر لازم ہے کہ دین و دنیا میں سچی فلاح کے نصیب ہونے کا صرف یہی ایک طریقہ ہے۔

سچ کی یہی تمنا ہے اور یہی دعا، تیرے اختیار میں ہے کہ تو اس دعا کو سنے اور اس تمنا کو پورا کرے۔ (سچ کی دعا۔ ۲ جنوری ۱۹۲۵ء)

''سچ کی مناجات'' عنوان کے تحت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اور ''التجا'' کے عنوان سے مولانا عبدالرحمٰن نگرامی کی مختصر تحریریں ہیں جن میں خدا کی بزرگی و برتری، بلندی و بالادستی کا اعتراف اور اپنی عاجزی و درماندگی لاچاری اور بے چارگی کا اقرار کرتے ہوئے خداوند قدوس کی حمد و ثنا کی ہے اور ''سچ'' کی زندگی اور اپنے عزائم کے استقامت کی دعا کی ہے۔

ان مختصر اور انشائیہ نما تحریروں کے بعد ''ہمارا کام'' عنوان کے تحت عبدالماجد نے سچ کے اجرا کے مقصد اور اس کی پالیسی پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ جس کا لب لباب یہ ہے:

(الف) سچ کا پہلا کام یہ ہوگا کہ وہ افرادِ ملت کو اسلامی زندگی کی طرف دعوت دے گا۔

(ب) مسلمانوں کی اصلاح میں کامیابی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک قوتِ نفاذ خود مسلمانوں کے ہاتھ میں نہ ہو۔ بس قوتِ نفاذ کا حصول سچ کا مقصد ثانی ہوا۔ لہٰذا اس مقصد کے تحت ملکی آزادی میں پورا حصہ لینا، آزادی ملک کے لئے پوری کوشش کرنا سچ کا ایک خاص کام ہوگا۔

(ج) سچ کا تیسرا کام یہ ہوگا کہ جہاں تک اس کے بس میں ہو اپنے وطن کے مسلموں اور غیر مسلموں کے درمیان اچھے اور خوش گوار تعلقات کو قائم رکھے اور ان کو مزید ترقی دے۔

سچ کے مقاصد سے پیدا ہونے والے بعض اندیشوں کا اظہار، مشکل کام، عنوان کے تحت مولانا عبدالرحمٰن نگرامی نے کیا ہے، اور سچ کی سچائی کی پذیرائی اور اس کو قبول کرنے کی درخواست کی ہے، لکھتے ہیں:

> ''علوم اسلامیہ کے ایک ادنیٰ طالب علم ہونے کی حیثیت سے ہماری یہ توقع بیجا نہیں کہ دینی مشغولیت رکھنے والے بزرگ اور بھائی ہمارے کام اور سچی اور مخلصانہ خدمت میں کم سے کم اتنی ہمدردی تو ضرور کریں گے کہ ہماری باتوں کو صبر اور اطمینان سے سن لیں گے اور ہمارے خیالات کی حقیقت ماضی کے حالات میں نہیں بلکہ مستقبل کے خطرات میں تلاش کریں گے۔''

''سچ کا پیام'' عنوان کے تحت ظفر الملک لکھتے ہیں:

> ''اس کاغذ کی ناؤ کے تین چلانے والے اودھ کے رہنے والے ہیں، اور اودھ کے بھائیوں پر جو کچھ گذری یا گذر رہی ہے وہ آنکھوں کے سامنے ہے۔ اودھ میں مسلمانوں کی جو پرانی بستیاں ہیں ان کے بسنے والوں کو ''سچ'' کا یہ پیام پہنچا کر سب سے پہلے اس راہ پر لگانا ہے جس سے ان کی دین و دنیا دونوں بنیں۔ اس سبب سے سچ اگر ان بستیوں کے بھائیوں کو بار بار ٹوکے اور گھرانے گھرانے کے لوگوں کو اپنا پیغام پہنچائے تو کوئی بھائی خفا نہ ہو۔''

آخری عنوان جو ''سچ'' کی نسبت سے قائم کیا گیا ہے وہ ''سچ کی راہ'' ہے۔ یہ تحریر مولانا عبدالماجد کے قلم سے ہے۔ اس میں سچائی کی اہمیت و حقیقت، سچائی کے اثرات انسانی زندگی پر کیا

ہیں خاص اسلوب میں تحریر کیے گئے ہیں۔اس شمارے کے بعد کے تین صفحات دوسرے اخباری موضوعات کے لئے وقف ہیں۔

''سچ'' کا دوسرا شمارہ ۱۳؍ جمادی الثانی ۱۳۴۳ھ/۹؍ جنوری ۱۹۲۵ء کو ٹھیک ایک ہفتہ بعد شائع ہوا۔اس شمارے سے ''سچی باتیں'' کالم شروع ہوجاتا ہے جو ہفت روزہ سچ اور عبدالماجد دونوں کی نہ صرف شہرت کا باعث بنا بلکہ اس کالم نے مذہبی اور اخلاقی احتساب کا ایک نیا انداز پیش کیا ہے۔

مابعد کے شمارے پابندیِ وقت سے شائع ہوتے رہے اور ان میں مختلف موضوعات و مسائل کے لئے جگہ پیدا کی جاتی رہی۔جنوری ۱۹۲۵ء سے جولائی ۱۹۲۵ء تک اس کے ایڈیٹر ظفر الملک ہی رہے۔لیکن اگست ۱۹۲۵ء سے اس کے ایڈیٹر عبدالماجد قرار پائے۔مولانا کی ادارت میں پہلا شمارہ ۷؍اگست ۱۹۲۵ء کو شائع ہوا۔ادارت کی اس تبدیلی کا کوئی سبب یا عذر شائع نہیں ہوا۔

لیکن پرنٹر و پبلشر کی حیثیت سے اسحاق علی علوی یعنی ظفر الملک ہی کے نام کا اندراج ہوتا رہا۔ظفر الملک،الناظر پریس کے مالک و مہتمم تھے اور رسالہ ''الناظر'' کے مدیر بھی۔سچ کی چھپائی و دفتری امور کا تعلق بھی انہیں سے تھا۔جس کا اظہار مہتمم ''سچ'' لکھ کر کیا جاتا تھا۔ترتیب و ادارتی امور تمام تر عبدالماجد اور عبدالرحمٰن نگرامی سے متعلق تھے۔مارچ ۱۹۲۶ء میں نگرامی کی وفات کے بعد جملہ ادارتی امور عبدالماجد ہی سے متعلق ہوگئے۔

عبدالماجد اپنے وطن دریاباد (ضلع بارہ بنکی) سے اسے مرتب کر کے لکھنؤ بھیج دیا کرتے تھے۔اب ''سچ'' ایک شخصی پرچہ کے طور پر ترتیب دیا جانے لگا۔

بعض مضامین و شذرات پر مصنفین کا نام نہیں ملتا۔شناخت کے لئے تحریر کے آخر میں کہیں ''م''، کہیں ''ع'' اور کہیں ''ظ'' کا اندراج ملتا ہے۔یہ تینوں حروف بالترتیب مخفف ہیں عبدالماجد، عبدالرحمٰن، ظفر الملک کے۔

۱۸؍دسمبر ۱۹۲۵ء کے شمارے کے ساتھ ''سچ'' اپنی زندگی کا پورا ایک سال مکمل کر لیتا ہے۔اس سال کے چند اہم موضوعات اور چند مستقل عنوانات مندرجہ ذیل ہیں:

سچی باتیں:

یہ عنوان ۹رجنوری ۱۹۲۵ء سے قائم کیا گیا جو منطقی استدلال، ادبی طنز اور زبان و بیان کی شگفتگی کے سبب بے پناہ مقبول ہوا۔ ڈاکٹر عبدالاحد خاں خلیل اپنے مضمون انشائے ماجد کا حسن وآہنگ میں لکھتے ہیں:

> ''ان کے ادبی، تنقیدی اور تہدیدی انشائیے جو سچی باتوں کی صورت میں ان کے ''سچ''، ''صدق'' اور ''صدق جدید'' کی ہفتہ وار اشاعتوں میں محفوظ ہیں ان کے حسن انشاء اور آہنگ فکر کے شاہد وامین ہیں۔ ان کے احساس کی شدت اور جذبات کی گہرائی ان کی تحریر میں تاثیر اور استواری پیدا کر دیتی ہے اور ان کی سچی باتیں بصیرت افروزی اور عبرت آموزی کا مرقع بن جاتی ہیں۔'' (عبدالماجد نمبر۔ نیا دور۔ لکھنؤ اپریل مئی ۱۹۷۸ء)

سچی باتوں کا سلسلہ ایک طویل عرصہ (۱۹۲۵ء تا ۱۹۷۶ء) کو محیط ہے۔ ۱۹۲۵ء میں جو ''سچی باتیں'' تحریر کی گئی ہیں ان کی تعداد چوالیس ہے۔ مضمون کے لحاظ سے ان کی تقسیم حسب ذیل ہے:

متعلق قانون ربانی، متعلق رسومات رجب، رسومات بیاہ، رسومات شب برات، رسومات شعبان، تاکید نماز، اصلاح رسومات، بلندئ اخلاق، متعلق ہدایات رمضان المبارک، اصلاح ایمان، لیلۃ القدر، اسوۂ حسنہ، اہمیت تربیت اولاد، بدعات محرم [۳] محاسبہ اعمال، اسباب تنزل، مسلمانوں کی ذمہ داری، واقعۂ کربلا، محرم اور مسئلہ خلافت، تلاش حق، پیروی اسوۂ حسنہ، اہمیت خلافت، ماہ ربیع الاول، محبت رسول اکرم ﷺ، تحفہ ربیع الاول، اتباع رسول [۴]، اتباع غوث پاکؒ، غوث پاک کی عملی زندگی، وصیت نامۂ غوث پاکؒ، بنیاد ایمان، ترک موالات، اصلاح عمل، تقلید حضرت موسیٰ علیہ السلام، رسول اکرم ﷺ اور ذکر الٰہی۔

مضمون کے لحاظ سے ان کی تقسیم اس لئے کی گئی تا کہ ایک عمومی اندازہ ہو جائے کہ سچی باتوں کے تحت کس قسم کی مذہبی اور اخلاقی باتیں پیش کی گئیں۔ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۷۶ء تک مختلف موضوعات ومسائل کو سچی باتیں عنوان سے کے تحت پیش کیا گیا ہے۔ مذہب واخلاق سے ہٹ کر، معاشرتی، اقتصادی، ادبی وسیاسی مسائل بھی ان کا موضوع رہے ہیں۔ اس کثیر تحریری سرمایہ کے مطالعہ سے مولانا کی ذہنی زرخیزی کا پتہ چلتا ہے۔

خبریں:

مولانا کی ادارت میں آجانے کے بعد ''سچ'' میں کچھ خاص قسم کی خبریں (جنھیں نہ صرف سیاسی کہا جاسکتا ہے اور نہ ادبی واخلاقی) شائع ہوتی رہیں۔ جن میں مولانا طنز کی ہلکی پھلکی چٹکیاں لیتے تھے اور ہر خبر سے عبرت یا نصیحت وہدایت کا کوئی پہلو نکال کر افراد ملت کو کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتے تھے۔ اپنی ''آپ بیتی'' میں لکھتے ہیں:

> ''واقعات حاضرہ پر اس طرز خاص سے تبصرہ کرنا کہ پہلے نفس خبر بجنسہ نقل کر دی اور پھر اس پر مختصر جچے تلے لفظوں میں کچھ لکھ لکھا دیا۔ صدق وسچ سے پہلے شاید اردو کی دنیائے صحافت کے لئے نامعلوم تھا۔'' (آپ بیتی ص:۲۶۶)

اسلام اور رواداری:

یہ مستقل عنوان ہندو مسلم اتحاد کی غرض سے قائم کیا گیا۔ مسلم سلاطین کا غیر مسلموں کے ساتھ جو برتاؤ رہا ہے اسے عام طور سے مؤرخوں نے غلط انداز میں پیش کیا ہے لہٰذا اس عنوان کے تحت تاریخ کی مستند کتابوں سے ایسے واقعات درج کئے جاتے تھے جو آنحضور ﷺ، صحابۂ کرام اور سلاطین اسلام کے غیر مسلم افراد وقوم کے ساتھ رواداری کے برتاؤ کو اجاگر کرنے والے تھے۔ اس کے مرتب مولانا ہی تھے۔

دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ (ہندوستان کے اندر اور باہر)

اس عنوان کے تحت تمام سیاسی وسماجی خبریں یک جا کی جاتی تھیں۔ خبروں کا صفحہ لکھنے والے امین احسن اصلاحی (ف ۱۹۹۷ء) تھے۔ یہ سلسلہ دوسرے شمارے ہی سے شروع ہو گیا تھا۔

محرم اور اسلام:

اس عنوان کے تحت قدیم وجدید علمائے اسلام کے فتوے شائع کئے جاتے رہے فتاویٰ کا یہ سلسلہ ۱۳/جون سے شروع ہوا۔

ہندو و مسلم اتحاد:

اس عنوان سے مولانا عبدالماجد (ف ۱۹۷۷ء) مولانا عبدالرحمٰن ندوی (ف ۱۹۲۶ء) عبدالرزاق ملیح آبادی (ف ۱۹۵۹ء) سید سلیمان ندوی (ف ۱۹۵۳ء) مولانا ابوالکلام آزاد (ف

۱۹۵۸ء) مولانا عبدالسلام ندوی (ف ۱۹۵۶ء) وغیرہ کی تحریریں شائع ہوئیں۔

فطرت کا انتقام:

ظفر الملک کا ایک مضمون نما طویل افسانہ جو مسلسل چھ (۶) اشاعتوں میں شائع ہوا۔

جامعہ ملیہ اور مسلم یونیورسٹی سے متعلق خبریں:

کتابوں پر تبصرے:

۱۹۲۵ء کی جلد میں عام طور سے اصلاحی مضامین شائع ہوئے۔ ان مضامین میں فکری مواد بھی خاصا ہے۔ اس جلد کے قلم کاروں میں نمایاں نام تو خود مولانا ہی کا ہے۔ ان کے علاوہ مولانا عبدالرحمٰن نگرامی (ف ۱۹۲۶ء) امین احسن اصلاحی (ف ۱۹۹۷ء) ظفر الملک (ف ۱۹۴۶ء) سید سلیمان ندوی (ف ۱۹۵۳ء) مولانا عبدالسلام ندوی (ف ۱۹۵۶ء) کے نام بھی اہم ہیں۔

''سچ'' نے اپنی زندگی کا ایک سال مکمل کرلیا۔ اس ایک سالہ مدت کا جائزہ تفصیل سے اس لئے لیا گیا تا کہ سچ اور مدیر سچ کے مزاج کا اندازہ ہو جائے۔

۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۳ء تک سچ اسی مزاج کے تحت شائع ہوتا رہا۔ ۹ سال کی اس مدت کا جائزہ سال بہ سال لیتے ہوئے سچ کی خدمات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

جلد نمبر ۲۔ ۱۹۲۶ء کا پہلا اور آخری شمارہ بالترتیب یکم جنوری ۲۷/دسمبر ۱۹۲۶ء کو شائع ہوا۔ اس جلد سے متعلق چند باتیں قابل ذکر ہیں:

''سچی باتیں'' کالم امسال بھی پابندی و اہتمام سے لکھا گیا۔ ۱۹۲۵ء میں سچ کے ۴۹ شمارے شائع ہوئے اور ۴۴ شماروں میں ''سچی باتیں'' لکھی گئیں۔ ۱۹۲۶ء میں سچ کے پچاس شماروں میں ۴۶ ''سچی باتیں'' تحریر کی گئیں امسال بھی سچی باتوں کے موضوعات مذہبی، واخلاقی اور نیم سیاسی رہے۔

کتابوں پر تبصروں کی اشاعت کا سلسلہ گو ۲۵ء ہی سے شروع ہو گیا تھا لیکن تبصروں کے لئے کوئی مستقل عنوان نہ تھا۔ یہ بطور خبر شائع کئے جاتے تھے۔ ۳۰/اپریل ۱۹۲۶ء سے تبصروں کے لئے ایک عنوان ''نئی کتابیں'' قائم کیا گیا۔ یہ عنوان ''سچ'' میں تادم زندگی قائم رہا۔ اس عنوان کے تحت جن کتابوں پر تبصرے شائع ہوئے ہیں، ان میں بیشتر مذہبی اور کمتر ادبی کتابیں ہیں۔ تبصرہ

نگاری کے فرائض مولانا ہی نے ساری زندگی انجام دیئے۔ زیادہ تر تبصرے تعارفی اور بعض علمی وتنقیدی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ تبصرے مختصر مگر جامع ہیں۔ عام طور سے مصنف کے ساتھ ہمدردانہ رویہ رہا ہے۔

''سچ'' ابتداء سے جمعہ کو شائع ہوتا تھا لیکن ۱۲ر جولائی ۱۹۲۶ء سے یہ دوشنبہ کو شائع ہونے لگا۔ ٹھیک ایک سال کے بعد ۲۲ر جولائی ۱۹۲۷ء کو یہ پھر سے جمعہ کو شائع ہونے لگا۔

''دنیا میں کیا ہو رہا ہے'' کالم جو ۲۵ء میں قائم کیا گیا تھا۔ امسال اس کی اشاعت عمل میں نہیں آئی۔

اس جلد کا ایک اہم مقالہ ''حکومت شوریٰ'' (عبدالماجد) ۱۸ر اکتوبر ۱۹۲۶ء کی اشاعتوں میں شامل ہوا۔ جس سے متاثر ہو کر مولانا ثناء اللہ امرتسری (ف ۱۹۴۸ء)، مولانا سید سلیمان ندوی (ف ۱۹۵۳ء)، مولانا محمد اسلم جیراجپوری (ف ۱۹۵۵ء) مولانا ابوالکلام آزاد (۱۹۵۸ء) اور خواجہ عبدالحی وغیرہ نے مضامین لکھے جو اسلام کے نظام جمہوریت پر اچھا مواد پیش کرتے ہیں۔

اس جلد کے قلم کاروں میں خاص نام مولانا مناظر احسن گیلانی (ف ۱۹۵۶ء) مولانا محمد علی (ف ۱۹۳۱ء) مولانا محمد ابوالکلام آزاد (ف ۱۹۵۸ء)، مولانا سید سلیمان ندوی (ف ۱۹۵۳ء) قاری شاہ محمد جعفری ندوی اور ابوالجلال ندوی کا ہے۔

جلد نمبر ۳ کا آغاز ۳ر جنوری اور اختتام ۲۳ر دسمبر ۱۹۲۷ء کو ہوا۔ اس جلد سے ظفر الملک کا نام ''سچ'' کے نام کے ساتھ پیشانی پر مہتمم کی حیثیت سے شائع ہونے لگا۔

''دنیا میں کیا ہو رہا ہے'' کالم کی اشاعت دوسری جلد میں کسی وجہ سے روک دی گئی تھی۔ تیسرے سال کے شماروں میں اس کی اشاعت پھر سے ہونے لگی۔

سچ نیم سیاسی ابتداء ہی سے تھا لیکن اس کی سیاست صرف مسلم طبقہ تک محدود تھی۔ مسلمانوں کی سیاسی تحریکوں کی تشہیر اور ان کے استحکام کے لئے ذہن بنانا اس کا خاص مقصد تھا۔ چنانچہ اس جلد میں ایسی سیاسی خبریں کثرت سے شائع ہوئیں، مخالف سیاسی پارٹیوں اور لیڈروں پر تبصرے بھی شائع ہوئے۔ علماء کے خطبات بھی ان صفحات کی زینت بنے جو خلافت کانفرنس، اجلاس جمعیۃ العلماء، ہندو مسلم اتحاد اور یونیورسٹی کے طلباء سے متعلق تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا محمد علی

جوہر اور مولانا انور شاہ کشمیری کے خطبات اہمیت کے حامل ہیں۔

اس جلد کے خاص قلم کار مولانا سید سلیمان ندوی (ف ۱۹۵۳ء) مولانا ابوالکلام آزاد (ف ۱۹۵۸ء) مولانا محمد علی (ف ۱۹۳۱ء) مولانا مناظر احسن گیلانی (ف ۱۹۵۶ء) مولانا ابوالجلال ندوی، مولانا مطلوب الرحمٰن، مولانا عبدالسلام ندوی (ف ۱۹۵۶ء) ڈاکٹر محمد اسلم عمر، پروفیسر ضیاء احمد بدایونی (ف ۱۹۷۳ء) وغیرہ ہیں۔

جلد نمبر ۴ کا پہلا شمارہ ۶ رجنوری اور آخری شمارہ ۲۸ ردسمبر ۱۹۲۸ء کو شائع ہوا۔ "سچ" اپنی عمر کے ساتھ ساتھ سیاست اور مسلم سیاست کا ایک زبردست آرگن بن گیا۔ اگرچہ گاندھی جی سے مدیر سچ کی عقیدت ظاہر و باہر ہے لیکن مسلمانوں کے مسائل پر جس طرح کھل کر "ہمدرد" اور سچ نے لکھا ہے شاید ہی اس عہد کے کسی دوسرے اخبار نے لکھا ہو۔ اس جلد میں دو صدارتی خطبات شائع ہوئے۔ مولانا محمد شفیع داؤدی بہار کے مشہور قومی رہنما تھے، کا خطبہ بہ سلسلہ اجلاس آل انڈیا خلافت کانفرنس اور قاضی محمد سلیمان کا خطبہ بہ سلسلہ اجلاس اہل حدیث قابل ذکر ہے۔

چند ایک مقالے بھی قابلِ توجہ ہیں:

۱۔ عربی دانی اور اسلام۔ از مولانا مناظر احسن گیلانی (۳۱ راگست ۱۹۲۸ء)

۲۔ مسئلہ سود پر ایک معاشی نظر۔ از مولانا مناظر احسن گیلانی (۱۴/۲۱/۲۸ دسمبر ۱۹۲۸ء)

۳۔ یورپ اور اسلام۔ از مولوی عبداللہ شاہ قادری (۱۰ راگست ۱۹۲۸ء تا ۱۷ رفروری ۱۹۳۳ء)

یہ مقالہ ۵۵ قسطوں میں شائع ہوا[۵] اس جلد میں "سچی باتیں"، خبریں، تبصرے، اور متفرق عنوانات پر مضامین وغیرہ "سچ" کے عام مزاج کے مطابق شائع ہوئے۔

ڈاکٹر بشارت احمد احمدی، مولوی عبداللہ شاہ قادری، مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا عبدالماجد اس جلد کے خاص قلم کار رہے۔

جلد نمبر ۵ کا پہلا اور آخری شمارہ بالترتیب ۴ رجنوری ۱۹۲۹ء۔ ۲۷ ردسمبر ۱۹۲۹ء کو شائع ہوا۔ اس جلد کے خاص مندرجات حسب ذیل ہیں:

۱۔ الشاہد والمشہود۔ مولوی عبداللہ شاہ۔ یہ طویل مقالہ اس جلد کی (۱۵ رفروری، ۱۲، ۱۹/

جولائی، ۶/۲۷/۲ دسمبر) پانچ قسطوں میں شائع ہوا۔

۲۔ یورپ اور اسلام: از عبداللہ باقی قسطیں۔

۳۔ خطبۂ صدارت: از مولانا حسین احمد مدنی (اجلاس جمعیۃ علماء صوبہ متحدہ)

نتیجۂ خطبہ ۲۰/۱۳/۶ ستمبر ۱۹۲۹ء کی اشاعتوں میں شامل ہوا۔

۴۔ ہمدرد: (مولانا محمد علی کے اخبار کے مرحوم ہونے پر تعزیتی مضمون) از عبدالماجد (۲۶/ جولائی ۱۹۲۹ء)

۵۔ سفرِ حجاز: از عبدالماجد اس جلد میں اس سفرنامہ کی ۲۲ قسطیں شائع ہوئیں۔ پہلی قسط ۱۲/ جولائی کے شمارے میں شامل ہوئی۔

۶۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ اور ملت اسلامیہ: اس عنوان کے تحت وہ بحث پیش کی گئی ہے جو جرمن مستشرق ڈاکٹر جوزف ہیل کی کتاب ''عربوں کا تمدن'' سے متعلق ہے۔

اس کتاب کا ترجمہ سید نذیر نیازی (ف ۱۹۸۱ء) نے کیا تھا جو جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی جانب سے شائع ہوا تھا۔ اس کتاب میں پیغمبر اسلام کی شان اقدس میں گستاخیاں کی گئی ہیں۔ اس بحث کا آغاز ۲۵/ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو مولانا عبدالماجد کے مضمون ''جامعہ ملیہ اسلامیہ کی جدید خدمتِ اسلام'' کی اشاعت سے ہوا۔ اس سے قبل خبروں کی سرخیوں کے تحت اس کا ذکر ۱۱/ اکتوبر ۱۹۲۹ء کی اشاعت میں کیا جا چکا تھا۔

امسال مولانا عبدالماجد حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے۔ لہٰذا سچ کی اشاعت تین ماہ کے لئے بند رہی۔ یعنی ۲۹/ مارچ کے بعد ۵/ جولائی کو دوبارہ اس کی اشاعت عمل میں آئی۔ حج سے واپسی پر مولانا نے اپنا سفرنامہ بعنوان ''سفرِ حجاز'' اسی جلد کے متعدد شماروں میں شائع کیا۔

جلد ۶ کا پہلا اور آخری شمارہ بالترتیب ۳/ جنوری ۳۰ء/ ۲۶/ دسمبر ۳۰ء کو شائع ہوا۔ اس جلد کے خاص قلم کار، مولانا عبدالسلام ندوی (ف ۱۹۵۶ء) مولانا وحید احمد، مولوی عبداللہ شاہ، قاضی محمد سلیمان، راشد الخیری (ف ۱۹۳۶ء) عینی شاہ وغیرہ ہیں۔ اس جلد میں بالاقساط شائع ہونے والے مضامین میں ''یورپ اور اسلام'' اور سفرِ حجاز اہم ہیں۔ یورپ اور اسلام مضمون کا سلسلہ جلد ۷ میں جا کر ختم ہوتا ہے۔ البتہ سفرِ حجاز کی آخری قسط اسی جلد میں ہے۔ اس سال سچ دو حادثوں

سے دوچار ہوا۔ ۲۴ رمئی ۱۹۳۰ء کو مہتمم سچ ،ظفر الملک اسحاق علی علوی قومی جلوس نکالنے کے جرم میں گرفتار کیے گئے اور چھ ماہ کے لئے جیل بھیج دیے گئے اخبار کا ڈکلیریشن ان کے نام سے تھا لہٰذا نیا ڈکلیریشن کرایا گیا اور یہ سید محمد صدیق خیرآبادی کے اہتمام میں الناظر پریس لکھنؤ سے بدستور شائع ہونے لگا۔ اس درمیان اشاعتوں میں تاخیر تو ہوئی مگر اشاعتیں موقوف نہیں ہوئیں ماہ جولائی ۱۹۳۰ء کے پہلے جمعہ (۴ رجولائی ۱۹۳۰ء) کا پرچہ زیر طبع ہی تھا کہ پریس آرڈیننس کی دفعہ ۴ ضمن (۱) کی خلاف ورزی کے تحت سچ کے ناشر اور الناظر پریس کے مہتمم سے ایک ایک ہزار نقد کی ضمانت طلب کی گئی اور اس ضمانت کے لئے صرف ۴۸ گھنٹے کی مہلت دی گئی۔ جرم کی تفصیل مطلق نہیں بتائی گئی۔ چونکہ یہ ضمانت داخل نہیں کی گئی لہٰذا اخبار بند کر دیا گیا۔ ۱۴ رنومبر ۱۹۳۰ء سے اس کا از سر نو اجرا ہوا اس طرح کامل چار مہینے کے بعد اشاعت عمل میں آئی۔ ۱۴ رنومبر تا ۲۸ رنومبر ۱۹۳۰ء تین اشاعتیں یونائیٹڈ پریس لکھنؤ میں زیر اہتمام سید فدا حسین پرنٹر چھپوا کر کاظم علی پبلشر نے دفتر اخبار سچ لکھنؤ سے جاری کیں۔ سچ ۵ دسمبر ۱۹۳۰ء سے دوبارہ الناظر پریس لکھنؤ سے باہتمام سید محمد صدیق پرنٹر، کاظم علی پبلشر شائع ہونے لگا۔ نومبر ۱۹۳۰ء میں ظفر الملک رہا کر دیے گئے۔ رہائی کے بعد ''ضروری گزارش'' کے تحت انہوں نے لکھا:

> ''خاکسار مہتمم اگر چہ اس وقت بہ ظاہر حال آزاد ہے مگر واقعتاً وعملاً جب تک ملک میں جنگ آزادی جاری ہے تب تک اسے ہر لحہ گرفتاری واسیری کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ اس سبب سے میعاد قید کی تکمیل کے بعد اس عاجز نے دفتر الناظر و سچ کو بدستور انہیں ہاتھوں میں رکھا ہے جو گذشتہ مئی سے اس ذمہ داری کو اٹھائے ہوئے تھے۔ اور توقع ہے کہ اس انتظام سے اخبار کی بروقت اشاعت اور حساب وکتاب کی باقاعدگی میں کوئی فرق نہ آنے پائے گا۔ (سچ ۱۴ رنومبر ۱۹۳۰ء)

جلد ۷ کا پہلا اور آخری شمارہ بالترتیب ۲؍۹ جنوری ۱۹۳۱ء اور ۲۵ ردسمبر ۱۹۳۱ء کو شائع ہوا۔ یہ جلد مولانا محمد علی جوہر (المتوفی ۴ رجنوری ۳۱ء) کی وفات کے بعد لکھے جانے والے مضامین سے پُر ہے۔ مولانا کی وفات پر مولانا عبدالماجد کا پہلا مضمون بعنوان ''محمد علی'' (۱۶ رجنوری) شائع ہوا۔ بعد کے شماروں میں تعزیت نامے، مراسلے، تاثراتی مضامین، اخبار کے تراشے وغیرہ شائع ہوتے رہے۔ ۶ رفروری کے شمارے میں محمد علی پر علامہ اقبال (ف ۱۹۳۸ء) کی ایک نظم شائع ہوئی جو پانچ اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ نظم اخبار انقلاب سے ماخوذ ہے اور سرورق پر جلی قلم سے

شائع ہوئی ہے ایک شعر مندرج ہے:

یک نفس جانِ نزارِ او تپید اندر فرنگ
تا مژہ برہم زنیم از ماہ وپرویں درگزشت

مولانا محمد علی جوہرؔ پر چند اہم مضامین کی فہرست حسب ذیل ہیں:

محمد علی	عبدالماجد	۱۶/جنوری ۱۹۳۱ء
محمد علی کا مقام	عبدالماجد	۲۳/جنوری ۱۹۳۱ء
سیرت محمد علی	عبدالماجد	۶/فروری ۱۹۳۱ء
زندگی کی آخری شب	(مکتوب) مولانا شوکت علی	۶/فروری ۱۹۳۱ء
محمد علی خود محمد علی کے قلم سے		۱۳/فروری ۱۹۳۱ء
محمد علی کی یاد میں	سید محفوظ علی	۲۷/فروری ۱۹۳۱ء
تعزیت نامے	حسن محمد حیات (مولانا کے پرائیویٹ سکریٹری)	۶/مارچ ۱۹۳۱ء
تعزیت نامے	مولوی ذوالفقار علی خاں (مولانا کے بڑے بھائی)	۶/مارچ ۱۹۳۱ء

محمد علی کا مرثیہ عرب ملک الشعراء کی زبان سے:

شوقی بک مصری		۲۷/مارچ ۱۹۳۱ء
محمد علی بطور علی گڑھ کے طالب علم کے	سید سجاد حیدر	۱۴/اگست ۱۹۳۱ء
محمد علی بچپن اور شباب	سید محفوظ علی	۱۸/۱۱/ستمبر ۱۹۳۱ء
مکتوبات محمد علی بہ نام عبدالماجد		۷/اگست ۱۹۳۱ء
مکتوبات محمد علی بہ نام عبدالماجد		۲/اکتوبر ۱۹۳۱ء
مکتوبات محمد علی بہ نام عبدالماجد		۱۳/نومبر ۱۹۳۱ء

محمد علی کے خطوط کی اشاعت کا یہ سلسلہ جلد ۸ (۱۹۳۲ء) میں بھی جاری رہا اور اس کی آخری قسط (قسط نمبر ۲۷) سچ کی آخری جلد (جلد ۹۔۱۹۳۳ء) کے ۱۱راگست ۱۹۳۳ء کے شمارے میں شائع ہوئی۔ یہ خطوط ان دونوں اکابر کے درمیان پرخلوص تعلقات کے مظہر ہیں۔

''فتنہ نگارو نیاز'' سے متعلق بھی اس جلد میں مواد ملتا ہے۔ نیاز فتحپوری (ف ۱۹۶۶ء) کی علمی وادبی حیثیت مسلم، کسی ناقد نے ان کے علم کو ''قاموس علم'' کہا تھا لیکن مذہب کے معاملے میں ان کا مزاج سراسر ہنگامی تھا انہوں نے الحاد بھری تحریروں سے اسلام کے عقاید، ائمہ وعلمائے دین کا مضحکہ اڑایا۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے ان تحریروں کا بروقت نوٹس لیا۔ ۲۵ رتمبر کی اشاعت میں ایک طویل مضمون ''ایک دشمن اسلام مسلمان کے اسلام اور مسلمانوں پر جگرخراش حملے'' عنوان سے قلم بند کیا اور تمام ہندوستان کے مسلمانوں کو غیرت اور توجہ دلائی۔ چنانچہ تمام اخبارات میں تحریری احتجاج شروع ہوگیا۔ سچ نے اسے ''فتنہ نگار'' کے نام سے موسوم کیا اور اس فتنہ کی زبردست پیانے پر علمی انداز میں مخالفت کی۔ سچ کے علاوہ معارف میں بھی سید سلیمان ندوی (ف ۱۹۵۳ء) اور مولانا شاہ معین الدین ندوی (ف ۱۹۸۴ء) نے اس فتنہ کے خلاف علمی احتجاج کیا۔ نیاز کے لئے کوئی راہِ فرار نہ رہ گئی۔ لہٰذا انہوں نے ایک توبہ نامہ لکھا جو ۱۳راکتوبر ۱۹۳۱ء کی اشاعت میں شامل ہوا۔ (۲)

نگار میں ''حق گو'' کے قلم سے تنقید حدیث کا جو سلسلہ بعنوان ''احادیث کا مطالعہ تنقید صحیح کی روشنی میں'' جاری تھا اس کے رد میں دو اہم مقالات اس جلد میں ملتے ہیں:

۱۔ قتل مرتد احادیث صحیحہ کی روشنی میں۔ مولوی سید رئیس احمد جعفری ۱۰، ۱۷، ۲۴ جولائی۔

۲۔ غلامی تنقید صحیح کی روشنی میں۔ مولوی سید رئیس احمد جعفری ۱۱رتمبر۔

علاوہ ازیں ایک اہم مقالہ جو اس جلد کی ۲۷ رنومبر کی اشاعت میں شامل ہوا مولوی شاہ معین الدین احمد ندوی کا ہے جو بعنوان ''اوقات نماز اور حضرت ابن عباس پر الزامات کا جواب'' شائع ہوا۔ جو جلد نمبر ۸ میں ۹ قسطوں پر منتہی ہوا۔

جلد نمبر ۸ کا پہلا اور آخری شمارہ بالترتیب یکم جنوری ۱۹۳۲ء، ۳۰ دسمبر ۱۹۳۲ء کو شائع ہوا۔ اس جلد میں بھی ''فتنہ نگارو نیاز'' پر لے دے ملتی ہے۔ ۲۷ رمئی سے عبدالماجد کی کتاب ''محمد علی کی ذاتی

ڈائری کے چند ورق'' کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا جو پورے سال جاری رہا اور جلد نمبر۹، ۲۲ر دسمبر ۱۹۳۳ء تک اس کی اٹھارہ قسطیں شائع ہوئیں۔

جلد نمبر ۹، ۱۹۳۳ء کا پہلا شمارہ ۶ جنوری اور آخری شمارہ ۲۹ دسمبر کو شائع ہوا۔ اس جلد میں ترقی پسند تحریک کے ابتدائی مرحلے میں شائع ہونے والی اور ضبط کی جانے والی کتاب ''انگارے'' (مرتبہ احمد علی، مطبوعہ ۱۹۳۲ء) کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ یہ دس افسانوں کا مجموعہ تھا جس میں پانچ افسانے سجاد ظہیر (ف ۱۹۷۳ء) کے، دو رشید جہاں (ف ۱۹۵۲ء) کے، دو احمد علی کے اور ایک محمود الظفر کا۔ یہ افسانے موضوعاتی سطح پر فرائڈ اور نظریاتی سطح پر مارکس کے اثرات کے تحت لکھے گئے۔ اس میں ایک باغیانہ رویہ سامنے آیا جس کی زد میں مذہب، تہذیب و ثقافت سبھی آ گئے۔ مولانا نے ایک شذرہ بہ عنوان ''ایک شرمناک کتاب'' (۲۴ر فروری ۱۹۳۳ء) لکھا جس میں انہوں نے لکھا:

> ''لکھنؤ کے ایک شیعہ نوجوان، اور ایک رفیقہ اور دو رفیقوں کے نام سے ایک مختصر مجموعہ چند افسانوں کا حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ زبان بازاری اور گندی، اور طرز بیان بالکل ہی عامیانہ و مبتذل، جا بجا مذہب پر بھی اسی قسم کی بازاری پھبتیاں ہیں۔ کوئی ادبی حسن تلاش کے بعد بھی نہیں ملتا۔ البتہ زبان و انشاء کی موٹی موٹی غلطیاں بکثرت۔ کتاب اس قابل بھی نہیں کہ شریفوں کے مجمع میں اس کا نام لیا جائے...... مطالبہ یہ ہے کہ کتاب مذہبی حیثیت سے نہایت دلآزار ہے اس لئے ضبط ہو جانی چاہئے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مذہبی حیثیت سے کہیں بڑھ کر کتاب اخلاقی حیثیت سے گندی اور گھناؤنی ہے۔ مذہب پر حملے تو کہیں کہیں ضمناً آ گئے ہیں۔ لیکن شرافت، تہذیب و اخلاق پر حملے تو مسلسل اول سے آخر تک ہیں اور کسی مذاق سلیم رکھنے والے کے لئے بھی خواہ اس کے عقائد کچھ بھی ہوں کتاب کا مطالعہ آسان نہیں...... کتاب کی ضبطی کا مطالبہ یقیناً صوبہ کی حکومت سے جاری رکھنا چاہئے لیکن بجائے مذہبی دلآزاری کے عریاں نگاری و فحش پروری کے تحت میں......''۔

اس سلسلے میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ مولانا کے اس شذرہ میں جو اس کتاب کے ضبط ہونے کا سبب بنا کتاب انگارے کی فحش نگاری اور زبان و بیان کے عامیانہ پر زیادہ زور دیا گیا

ہے۔ مذہب بیزاری پر نسبتاً کم۔ سرفراز (لکھنؤ) خلافت (بمبئی) معارف (اعظم گڑھ) حقیقت (لکھنؤ) حق (لکھنؤ) وغیرہ اخبارات میں اس کے خلاف سخت قلمی احتجاج ہوا۔ متعدد مقامات پر برہمی کے جلسے بھی ہوئے۔ خان بہادر حافظ ہدایت حسین (سی آئی ای بیرسٹر) ممبر کونسل صوبہ متحدہ نے صوبہ کی کونسل میں اس کی ضبطی کے متعلق سوال اٹھایا اور بالآخر کتاب تعزیرات ہند کی فحش نگاری کی دفعہ کے تحت مارچ ۱۹۳۳ء میں ضبط کر لی گئی۔

سجاد ظہیر نے (روشنائی) لکھا ہے(۷):

''انگارے اور اس کے مصنفین کے خلاف بڑا سخت پروپیگنڈہ کیا..... عبدالماجد دریابادی خم ٹھونک کر ہمارے خلاف اکھاڑے میں آ گئے ..... اور بالآخر صوبہ متحدہ کی حکومت سے اس کتاب کو ضبط کروا دیا گیا۔''

دوسرے بڑے معرکے میں مرزا عظیم بیگ چغتائی (۱۸۹۵۔۱۹۴۱) سے متعلق بحث وتمحیص کا سلسلہ ملتا ہے۔ مرزا کی تین کتابیں قرآن اور پردہ، حدیث اور پردہ، تفویض اور چند ایک مضامین جو مسلمانوں کی دل آزاری کا سبب بنے تھے ان سے متعلق سنجیدہ علمی بحث ملتی ہے جس میں عبدالماجد کے علاوہ مولانا سید سلیمان ندوی (ف ۱۹۵۳ء) اور مولانا شاہ معین الدین ندوی (ف ۱۹۷۴ء) نے بھی حصہ لیا۔ اس جلد کے چند اہم مضامین مندرجہ ذیل ہیں:

سیرت محمد علی (تعارف)	عبدالماجد	۳/فروری ۱۹۳۳ء
محمد علی	پروفیسر رشید احمد صدیقی	۱۲/مئی ۱۹۳۳ء
جاوید نامہ	عبدالماجد	۸/۱۵/ستمبر ۱۹۳۳ء
مثنوی مولانا روم	عبدالماجد	۶/۱۳/اکتوبر ۱۹۳۳ء
معجزات اور فلسفہ جدیدہ (ہکسلے کی ترجمانی)		
	عبدالماجد	۲۷/اکتوبر ۱۹۳۳ء

۱۰/نومبر ۱۹۳۳ء، ۱۵/دسمبر ۱۹۳۳ء

یہ جلد اپنے اختتام کو پہنچتے پہنچتے سچ کی اشاعت میں التوا کی خبر بھی سنا جاتی ہے۔ ۸/دسمبر کے

شمارہ میں عبدالماجد لکھتے ہیں:

''سچ کے ذریعہ بری، بھلی، ٹوٹی، پھوٹی، دینی خدمت جیسی بھی بن پڑی ہے ناظرین سچ کے سامنے ہے۔ حقیقت کے اعتبار سے دیکھئے تو کچھ بھی نہیں ہے لیکن بہر حال حسن ظن رکھنے والوں کی ایک جماعت حوصلہ افزائی کر ہی رہی ہے۔ چند روز سے مجھے ایک اہم ترین دینی ضرورت کا احساس پیدا ہوا ہے اور روز بروز اس کا خیال غالب آتا جارہا ہے۔ وہ کام ہے جس درجہ کا اہم، اسی مناسبت سے دشوار، اور مجھ جیسے بے بساط کی بساط سے تقریباً باہر ہے۔ ابھی اپنی ہمت کا اندازہ کررہا ہوں اور دعائیں کرکر کے توفیق حق چاہ رہا ہوں۔ اگر دو تین ہفتوں میں ہمت بندھ گئی اور رائے پختہ قرار پاگئی تو وہ کام ہے اتنا بڑا کہ سچ سے مجبوراً ایک طویل عرصہ کے لئے رخصت لینی پڑے گی۔ خدمت کا سچ کے بغیر تنہا انجام پانا ہی دشوار ہے چہ جائیکہ سچ کی مشغولیت کے ساتھ ساتھ۔ اس لئے اگر وہ موقع آگیا اور علم الٰہی (میں) اس کا آنا بہتر ہوا تو ناظرین سچ سے توقع ہے کہ اپنے خادم کو ایک عرصہ کے لئے اجازت مرحمت فرمادیں گے۔ ترک مالوفات سے دل کو رنج پہنچنا امر طبعی ہے۔ لیکن مسلمان کا کام یہ ہے کہ عقلی مسرت کو طبعی غم پر غالب رکھے۔ اور ابھی تو یہی دیکھنا ہے کہ اس کی نوبت آتی بھی ہے یا نہیں''

۲۹ر دسمبر کی اشاعت میں ''سچ کی اشاعت میں التواء''[۸] عنوان سے عبدالماجد لکھتے ہیں:

''(شمارہ) ۴۷ میں شک و تذبذب کے ساتھ یہ اطلاع شائع ہو چکی ہے کہ ایک اہم تر دینی خدمت کے پیش نظر سچ کی حاضری کچھ روز کے لئے ملتوی کرنی پڑے گی...... یہ جو کچھ کیا جارہا ہے محض عدم فرصت کی مجبوری سے ہو رہا ہے...... بہر حال صبر جمیل کے سوا چارہ نہیں۔ کم از کم چھ ماہ کی غیر حاضری ناگزیر ہے، جوں ہی ذرا فرصت ملی انشاء اللہ فوراً اسی خدمت کا سلسلہ پھر سے شروع ہو جائے گا۔''

اسی شمارے میں مہتمم سچ کی طرف سے اعلان شائع ہوا جس میں تحریر ہے:

''جنوری ۳۴ سے سچ کی اشاعت ملتوی رہے گی اور غالباً جولائی سے پھر شروع ہو سکے یا ممکن ہے اس مدت میں بھی کچھ کمی بیشی ہو۔ بہر حال جس وقت سچ پھر شائع

ہوگا اس وقت جملہ خریداروں کی میعاد میں اسی قدر توسیع کردی جائے گی جتنے عرصہ تک اخبار بند رہے گا۔......الخ

۲۹ردسمبر ۱۹۳۳ء کے اس آخری شمارے کے ساتھ ہی یہ اخبار بند ہوگیا۔

سچ کا سالانہ ۵۰ (پچاس) اور ہر ماہ چار شماروں کی اشاعت کا اوسط رہا۔ شاذ، ان کی تعداد کسی ماہ ۳ یا ۵ بھی ہوئی اور کبھی دو شمارے صفحات کا اضافہ کرکے یکجا بھی جاری کئے گئے۔ ۱۹۲۶، ۱۹۲۷، ۱۹۳۱، ۱۹۳۲، ۱۹۳۳، (پانچ سال) سالانہ پچاس شمارے شائع ہوئے۔ ۱۹۲۵، ۱۹۲۸، میں ہر سال ۴۹ شمارے منظر عام پر آئے صرف ۱۹۲۹ء میں ۴۷ اور ۱۹۳۰ء میں ۳۲ شمارے جاری ہوئے اس طرح نوسال کی مدت میں کل ۴۱۷ شمارے منظر عام پر آئے۔

۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۳ء تک ۹ سال کی مدت میں (جس میں کامل سات ماہ کا التواء بھی شامل ہے) سچ نے اردو صحافت پر دیرپا اثرات مرتب کئے۔ اس درمیان اگر چہ اس کے کل خریداروں کی اوسط تعداد چھ سو سے زیادہ نہیں رہی (سچ ۲۰ رجنوری ۱۹۲۸ء) ۱۹۲۸ء کے بعد بھی اگر اضافہ ہوا ہوگا تو وہ کچھ زیادہ نہیں رہا ہوگا لیکن سچ کے مضامین خصوصاً سچی باتیں اور شذرات ہم عصر اخباروں میں کثرت سے نقل کئے گئے، ان اخباروں میں روزنامہ ہفتہ وار یا ہفتہ میں دوبار شائع ہونے والے اخبارات شامل ہیں۔ ان کے نام حسب ذیل ہیں:

خلافت (بمبئی) اجمل (بمبئی) رہبر دکن (حیدرآباد) حقیقت (لکھنؤ) المبشر (بانکی پور) الجمعیۃ (دہلی) وکیل (امرتسر) صدائے مسلم (کانپور) حق (لکھنؤ) انیس (بستی) ریاست (دہلی) پیغام صلح (لاہور) درویش (دہلی) امارت (پھلواری شریف) شہاب (راولپنڈی) زمیندار (لاہور) ہمدم (لکھنؤ) مدینہ (بجنور) تنظیم (امرتسر)۔ (سچ ۲۷ردسمبر ۱۹۲۶، ۴رجنوری ۱۹۲۹ء)

ہفتہ وار انصاف (بمبئی) میں سچی باتیں اور بعض دوسری تحریریں گجراتی زبان میں ترجمہ کرکے شامل کی گئیں۔ بعض تحریریں ہندی میں بھی پیش کی گئیں۔

سچ نے ملک وقوم مسلم اداروں وتنظیموں کی کارکردگی، مسلم رہنماؤں، قلم کاروں اور ان کے شائع کردہ لٹریچر کے احتساب کا جو محاذ کھولا تھا وہ سراسر اسلامی، علمی اور اخلاقی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ۹ سالہ مدت میں کبھی کسی سے مباحثہ چھڑا ہے کبھی کسی سے مجادلہ مدیر سچ کو خود بھی اس کا احساس تھا

چنانچہ ۱۹۳۱ء میں ایک مراسلہ (سچ اور الجمعیۃ) پر نوٹ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس چھ برس کی مدت میں شاید ہی کوئی ایسا مسئلہ چھڑا ہو، جس پر سچ کے بعض کرم فرما سچ سے ناخوش نہ ہو گئے ہوں۔ کبھی حضرات فرنگی محل روٹھے، تو کبھی بزرگان دیو بند بگڑے، آج ارباب علی گڑھ ناخوش ہوئے تو کل کارکنان جامعہ بیزار، کبھی ندوہ والوں کو شکایت پیدا ہوئی تو کبھی جمعیۃ والوں کو وجہ ملال، کبھی سچ ''وہابی'' قرار پایا تو کبھی ''بدعتی'' یہاں تک کہ کبھی کبھی بعض مخصوص ومحترم ترین بزرگوں کو بھی ناخوشی پیدا ہو ہی گئی غرض:

از مذہب من گبر ومسلماں گلہ دارد

کا منظر دیکھتے دیکھتے اتنے دن گذر گئے اور اغلب یہی ہے کہ یہی صورت ہمیشہ قائم رہے گی پھر مخلوق کی رضا جوئی کی کوشش آخر کب تک؟ اور کہاں تک؟ دعا صرف یہ فرمائی جائے کہ کسی فقرہ سے کسی حرف سے وہ مالک ومولا ناخوش نہ ہو اور بس۔ (سچ ۲۷/ مارچ ۱۹۳۱ء)

دو برس بعد یعنی ۱۹۳۵ء میں یہی پرچہ مولانا کے ایک شاگرد اور عزیز عبدالروف عباسی کے اپنے اہتمام کے تحت ''صدق'' کے نام سے جاری ہوا۔ مولانا بدستور اس کے ایڈیٹر رہے۔ صدق ۱۹۴۹ء تک پابندی سے شائع ہوتا رہا۔ مگر ۱۹۵۰ء کے اوائل میں یہ کسی وجہ سے بند ہو گیا۔ دسمبر ۱۹۵۰ء میں یہی صدق 'صدق جدید' کے نام سے شائع ہوا۔ مولانا کی ادارت بدستور قائم رہی۔ حکیم عبدالقوی دریابادی (ف ۱۹۹۲ء) کے اہتمام وانتظام میں ''صدق جدید'' مولانا مرحوم کی وفات تک شائع ہوتا رہا۔ بعد ازاں یادگار کے طور پر یہ جاری رکھا گیا۔

سچ کی قوم پروری، اسلام پسندی، مغرب پر تنقید، آزادی کی حمایت وغیرہ نے اس عہد کی تاریخ پر دیرپا نقوش ثبت کئے ہیں۔ سچ کے متعلق مولانا نے اپنی ''آپ بیتی'' میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ راقم الحروف انہیں خیالات پر اس مضمون کا خاتمہ کرتا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

''سچ کو اپنی زندگی میں بڑی بڑی لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ آج اس سے جنگ ہے تو کل اس سے۔ شروع شروع توجہ اصلاح رسوم ورد بدعات پر زیادہ تھی اس لئے قدرۃً اہل بدعات بھی زیادہ ناخوش رہے اور بعض اور طبقوں کی دشمنی مول لینا پڑی۔ پھر تبرّ

۱۹۲۵ء میں شریفی سعودی آویزش سرزمین حجاز میں شروع ہوئی۔ سچ نے سعودیوں کی پہلے تو حمایت کی اور کئی مہینے بعد ان پر نکتہ چینی شروع کی۔ پہلے وہ وہابیوں کا ترجمان سمجھا گیا، اور بعد کو بدعتیوں کا پشت پناہ۔ ایک مدت تک شیعہ حضرات اسے اپنا حریف و معاند سمجھتے رہے۔ تجدد ''ترقی پسندی'' کا مقابلہ وہ ہر محاذ پر کرتا رہا اور جمود کا بھی حامی وہ کبھی نہ رہا۔ فتنہ انکار حدیث کا مقابلہ اس نے مدتوں کیا اور ۳۱ء ۳۲ء میں تو اس نے نیاز فتحپوری کے الحاد اور فتنہ نگار کے مقابلہ کے لئے مہینوں اپنے کو وقف رکھا۔ نظریات خلافت کی بھی تبلیغ وہ مدت دراز تک کرتا رہا۔ حالانکہ خود تحریک خلافت ۲۵ء ہی میں بالکل مردہ و بے جان ہو چکی تھی...... زبان شروع شروع میں ''عوامیت'' کی سطح پر قصداً لے آئی گئی تھی۔ یہاں تک کہ اس کی اردو پر لوگوں نے پھبتی ''کانگریسی اردو'' کی کس ڈالی۔ بعد کی زبان شستہ و نستعلیق اختیار کر لی گئی۔ جولائی ۳۰ء میں صوبہ سرکار نے سچ سے ضمانت طلب کی اور پرچہ کو مجبوراً کئی مہینوں کے لئے بند رکھنا پڑا۔ نومبر سے پرچہ از سر نو جاری ہوا اور جنوری ۳۱ء سے مدتوں سردار ملت مولانا محمد علی کا ماتم ہوتا رہا۔''

۳۳ء تھا کہ میں نے بڑے حیص بیص، تامل و تذبذب کے بعد قرآن مجید کے انگریزی ترجمہ و تفسیر کا کام اپنے ہاتھ میں لیا اور چند مہینوں کے تجربہ کے بعد نظر آنے لگا کہ اللہ کا کلام کسی اور کام کی شرکت کا روادار نہیں۔ خدمت ایسی ہے کہ وقت پورے کا پورا چاہتی ہے۔ چنانچہ آخر ۳۳ء میں پرچہ کے التواء کا اعلان مجبوراً کرنا پڑا۔

پرچہ کی خدمت پر اپنے قلم سے تبصرہ کر ہی کیا سکتا ہوں دین اور پھر ضمناً علم، ادب صحافت کی خدمت بری بھلی جو کچھ بھی اس ۴۰، ۴۲ سال میں بن پڑی اس کا فیصلہ خود ناظرین پرچہ کے سو پچاس نمبر پڑھنے کے بعد کر سکتے ہیں۔ البتہ اپنی طرف سے یہاں صرف اتنی گزارش کی اجازت چاہتا ہوں کہ:

۱۔ واقعات حاضرہ پر اس طرز خاص سے تبصرہ کرنا کہ پہلے نفس خبر بجنسہ نقل کر دی۔ پھر اس پر مختصر جچے تلے لفظوں میں کچھ لکھ لکھا دیا۔ صدق و سچ سے پہلے شاید اردو کی دنیائے صحافت کے لئے نامعلوم تھا۔

۲۔ صدق نے طنز و تعریض کا استعمال بے شک کثرت سے کیا ہے لیکن اپنی والی کوشش

ہمیشہ ذاتیات کا پہلو بچا کر اور صرف پبلک زندگی کے پہلوؤں کو پیش نظر رکھ کر۔

۳۔ مروّت اور شخصی تعلقات سے یہ تو نہیں کہ سرے سے اثر قبول ہی نہیں کیا گیا۔ البتہ اس تاثر کو ہمیشہ حدود کے اندر رکھا گیا اور اسے پبلک فریضہ احتساب پر غالب نہیں آنے دیا گیا۔

۴۔ ہر حق کو حق اور ہر باطل کو باطل بلا کسی پارٹی کے خیال اور بغیر کسی تعصب و تحزب کے پیش کیا اور جہاں کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوتی تو اس سے سکوت ہی اختیار کر لیا گیا۔

۵۔ اظہار رائے اور جنبشِ قلم میں یہ کس منہ سے کہوں کہ کبھی ذاتی جذبات سے متاثر نہیں ہوا ہوں۔ جہاں کہیں بھی اس قسم کی لغزشیں ہوں اللہ سے دعا ہے کہ وہ اسے معاف فرمائے اور ناظرین سے عرض ہے کہ وہ اس پر آمین کہیں۔'' (آپ بیتی۔ مکتبہ فردوس لکھنؤ) (ص: ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۵، ۲۲۶)

حواشی:

(۱) اسحاق علی علوی اور ظفر الملک ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں۔ ظفر الملک قلمی اور تاریخی نام ہے جس سے ۱۳۰۱ھ (۱۸۸۴ء) اعداد برآمد ہوتے ہیں۔ ان کی وفات فروری ۱۹۳۶ء کو ہوئی۔

(۲) سچ سے مولانا عبدالرزاق کی عملی وابستگی نظر نہیں آتی۔ البتہ ۱۹۲۹ء میں ان سے متعلق دو ایسے شذرے سچ میں لکھے گئے جن سے ان کی عالمانہ شان مجروح ہوتی ہے۔ پہلا شذرہ ۲؍اگست ۱۹۲۹ء کی اشاعت میں بہ عنوان ''ایک کامیاب ظرافت'' لکھا گیا جس کا مضمون یہ تھا کہ مولانا ملیح آبادی قومی تنزل وادبار کے اصلی جراثیم داڑھی کے بالوں اور عمامہ کے پیچ میں پوشیدہ دیکھتے ہیں۔ لہٰذا اگر امان اللہ خاں کو از سر نو افغانستان پر جلوہ گر دیکھنے کی آرزو ہے تو مسلمان عمامہ کو اتار پھینکیں اور اپنی داڑھیاں استرے کی نذر کر دیں۔

۱۱؍اکتوبر ۱۹۲۹ء کو ایک شذرہ بہ عنوان ''مولوی کش مولوی'' لکھا گیا جس میں مولانا ملیح آبادی کے ایک خط بنام مدیر ''سچ'' کے تعلق سے یہ اطلاع دی گئی کہ مولانا ملیح آبادی نے لیگ اگینسٹ ملاازم (League Against Mullaism) قائم کی ہے۔ اور اس تنظیم کے سارے کام مولانا خود انجام دیتے ہیں لیکن ایک فرضی نام ''ابوالحیات'' کے نام سے۔ سب سے دلچسپ اطلاع یہ ہے۔ مدیر سچ کے لفظوں میں:

یہ مولانا صاحب وہی ہیں جنہوں نے پچھلی ششماہی میں اپنی داڑھی منڈوانے کا اعلان عام کر کے اس حیرت کدہ عالم کے بسنے والوں کو حیران و ششدر بنا دیا تھا۔

(۳) چھ قسطوں میں۔

(۴) دو قسطوں میں۔

(۵) یہ طویل مقالہ ۵ سال مسلسل شائع ہوتا رہا۔ اس کی پہلی قسط کے آغاز میں مدیر سچ نے جو نوٹ تحریر کیا تھا وہ حسب ذیل ہے:

مضمون ذیل جو انشاء اللہ مسلسل متعدد نمبروں میں نکلے گا اپنی نوعیت میں خاص اہمیت رکھتا ہے اور ہر سنجیدہ اور ذی علم مسلمان کے لئے قابل غور ہے۔ طلسم فرنگ کے بے نقاب کرنے کی جو غائر اور گہری کوشش اس مضمون کے ذریعہ سے کی گئی ہے وہ ہر آئینہ قابل داد و مستحق شکر گزاری ہے۔

(۶) یہ توبہ نامہ میری کتاب حقائق و بصائر ص: ۱۹۱ تا ۱۹۸ (بریلی ۱۹۸۶ء) میں دیکھا جا سکتا ہے۔

(۷) افسانے کا منظر نامہ، مرزا حامد بیگ۔ (الہ آباد ۱۹۸۳ء) ص: ۴۷۔

(۸) دراصل تفسیر ماجدی کی ترتیب و تنظیم کے لئے سچ کی اشاعت کو ملتوی کرنے کا اعلان ہے۔

انگریزی تفسیر القرآن کا تاریخی پس منظر اور چند نمایاں خصوصیات

سید منصور آغا☆

بیسویں صدی میں ہندوستانی مسلمانوں کی علمی و دینی شخصیات کی اگر ایک مختصر سی فہرست بھی تیار کی جائے تو اس میں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ مولانا نے اپنے قلم سے ہندستانی قوم، ملت اسلامیہ اور دین اسلام کی جو عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں، یا یوں کہئے کہ جس علمیت اور سلیقے سے حق کی گواہی دی ہے، وہ ہمارے لئے ایک بیش بہا اثاثہ ہے۔ مولانا نے جو تصنیفات و تالیفات چھوڑی ہیں، ان میں قرآن کریم کے ان کے اردو اور انگریزی تراجم موسوم بہ 'تفسیر القرآن' کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ یہ تراجم قرآن حکیم سے ان کے گہرے شغف، عربی زبان کی نزاکتوں کے بھرپور ادراک، تاریخ اسلام پر صحیح پس منظر میں عمیق نظر کے ساتھ تاریخ عالم، عالمی مذاہب اور علمی تحریکات اور فلسفہ، نفسیات و عمرانیات جیسے موضوعات پر یوربی مفکرین کی تصنیفات پر نظر، بالفاظ دیگر اسلامی علوم اور عصری علوم میں ان کی غیر معمولی دستگاہ اور دقت نظر کا شاہکار ہیں۔

مولانا مرحوم کی مادری زبان اگر چہ اردو ہے، لیکن ایک صحافی، ایک مصنف، مفکر، مدبر اور مفسر قرآن کی حیثیت سے انہوں نے اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی کو بھی خوب سیراب کیا ہے۔ ان کو اردو اور انگریزی تحریر پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ جس کا اندازہ ان کے اس انگریزی ترجمہ قرآن سے بخوبی ہوجاتا ہے۔ اختصار کے باوجود ایسی جامعیت، وضاحت اور علمیت خال خال ہی نظر آتی ہے۔ یہ ترجمہ قرآن درحقیقت تمام موضوعات پر، خصوصاً ان

☆ روزنامہ قومی آواز، نئی دہلی۔

موضوعات پر، جن پر اہل مغرب اسلام کو ہدف تنقید بناتے ہیں، گرانقدر تحقیقی مرقع ہے۔ایک مقالے میں اس کی تمام خصوصیات کا احاطہ ممکن نہیں۔ذیل میں انگریزی ترجمہ وتفسیر قرآن کے تاریخی پس منظر پر قدرے تفصیل سے اور اس کی بعض خصوصیات پر اشارتاً روشنی ڈالنے کی ایک طالب علمانہ کوشش کی گئی ہے۔

تاریخ اشاعت:

یہ ترجمہ مع مختصر تفسیری نوٹس پہلی مرتبہ لاہور سے ۱۹۴۱ء اور ۱۹۵۷ء کے درمیان میں شائع ہوا۔اس کا اضافہ شدہ نیا ایڈیشن بعض تصحیحات کے ساتھ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ادارہ 'اکیڈمی آف اسلامک ریسرچ اینڈ پبلی کیشن' سے نہایت اہتمام کے ساتھ چار جلدوں میں شائع ہوا۔اس کی پہلی جلد پر اشاعت اول کا سال ۱۹۸۱ء درج ہے۔جلد دوم پر ۱۹۸۲ء، جلد سوم پر ۱۹۸۳ء اور جلد چہارم پر پہلے ایڈیشن کا سال طباعت ۱۹۸۵ء اور دوسرے ایڈیشن کا ۱۹۹۴ء درج ہے۔یہی ایڈیشن ہمارے سامنے ہے۔پہلی جلد میں ۶ پارے مکمل شامل ہیں، دوسری جلد ساتویں پارے سے چودہویں پارے تک، تیسری پندرہویں پارے سے ۲۲ویں پارے کی سورۃ فاطر تک اور چوتھی جلد سورۃ یٰس سے سورہ ناس تک پر مشتمل ہے۔پہلی جلد میں ۴۶۴ صفحات، دوسری میں ۵۰۸ صفحات، تیسری میں ۵۶۳ صفحات اور چوتھی جلد میں ۵۷۲ صفحات ہیں۔چاروں جلدوں کے صفحات کی کل تعداد ۲۱۰۸ ہوتی ہے۔سرورق پر کتاب کے نام کے طور پر یہ عبارت شائع ہوئی ہے:

Holy Quran: Translation and Commentry, Tafseerul Quran: Maulana Abdul Majid Daryabadi, Introduction by S Abul Hasn Ali Nadvi

ترتیب:

اگرچہ انگریزی کا ٹائپ ۸ یا ۹ پائنٹ کا استعمال کیا گیا ہے، لیکن بین السطور کشادہ ہیں اور طباعت بہت ہی صاف ہے، اس لئے مطالعہ آسان ہے۔متن قرآن اور ترجمہ کی ترتیب یوں قائم کی گئی ہے کہ قرآن پاک کے متن سے بالعموم ۶ سطریں کاٹ کر صفحے کے اوپر لگا دی گئی ہیں۔اس میں یہ لحاظ نہیں رکھا گیا ہے کہ آیت پوری ہوئی یا نہیں۔اس کے نیچے انگریزی کا ترجمہ ہر آیت کا الگ سطر سے شروع کیا گیا ہے اور ترجمہ سے پہلے آیت کے اول و آخر حروف کو بریکٹ میں درج

کردیا گیا ہے، تا کہ یہ پتہ چل جائے کہ کس آیت کا ترجمہ ہے۔ تفسیری اشارات کیلئے ترجمہ میں متعلقہ لفظ پر ایک نمبر درج کردیا گیا ہے اور ترجمہ کے نیچے فٹ نوٹ میں تفسیری اشارے درج کر دئے گئے ہیں۔ اگر اشارہ صفحہ کے درمیان میں مکمل ہوگیا تو باقی صفحہ خالی چھوڑ دیا گیا اور اگلے صفحے پر اگلی چھ سطور قرآن کی چسپاں کرکے سلسلے کو جاری رکھا گیا ہے۔

غیر ذمہ دارانہ تبدیلی:

اس ترجمہ و تفسیر کے بعض ایڈیشن دیگر ممالک میں بھی شائع ہوئے ہیں۔ میں ان تک رسائی تو حاصل نہیں کرسکا، البتہ اسلامک فاؤنڈیشن، یو۔ کے۔ نے ۲۰۰۱ء میں اس کا جو ایڈیشن شائع کیا ہے اس میں صفحات کی تعداد 1149 درج ہے۔ اور سرورق پر جو عبارت درج ہے وہ اس طرح ہے:

The Glorious Quran:

Text, translation and commentry : Abdul Majid Daryabadi,

Introduction: Sheaikh Abul Hasan Ali Nadvi,

Publisher: The Islamic Foundation

یہ بات قابل غور ہے کہ مولانا عبدالماجدؒ کا انتقال ۱۹۷۷ء میں ہوا ہے۔ اگر مرحوم نے اپنے انگریزی ترجمہ قرآن کا نام تفسیر القرآن کے بجائے گلوریس قرآن کردیا ہوتا تو ندوہ سے شائع شدہ ایڈیشن پر بھی یہی نام ہوتا۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اسلامک فاؤنڈیشن نے نام تبدیل کیسے کردیا؟ اسلامک فاؤنڈیشن کے ایڈیشن میں متن اور ترجمہ کی ترتیب بھی بدل گئی ہے۔ صفحے کو دو کالم میں تقسیم کرکے دائیں جانب ہر ایک آیت الگ الگ درج ہے، اور ہر آیت کے بالمقابل اس کا ترجمہ درج کردیا گیا ہے۔ میری رسائی اس ایڈیشن تک نہیں ہوسکی، البتہ ویب سائٹ پر اس کے ایک صفحے کے عکس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ تفسیری نوٹس حذف کردئے گئے ہیں، حالانکہ کتاب کی اصل جان اس کے نوٹس ہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو کتاب اصلاً ۲۱۰۸ صفحات پر چھپی تھی، وہ ۱۱۴۰ صفحات میں سماگئی ہے۔ اس طرح کتاب کی لاگت اور قیمت فروخت تو بیشک کم ہوگئی مگر اس کی افادیت مجروح ہوگئی ہے اور وہ مقصد ہی فوت ہوگیا جو اس عظیم الشان تفسیر کے مصنف کے پیش نظر تھا۔

یورپ میں پہچان:

استنبول کے ایک تحقیقی ادارے 'ریسرچ سنٹر آف اسلامک ہسٹری' کی شائع کردہ ایک فہرست کے مطابق 1515ء سے 1980ء تک دنیا کی 65 زبانوں میں قرآن کے 551 مکمل اور 883 جزوی تراجم شائع ہو چکے ہیں، جن میں سب سے بڑی تعداد 149 اردو تراجم کی ہے۔ اس فہرست کے مطابق انگریزی میں 1 4 1 تراجم شائع ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر اے آر قدوائی (1988) کے مطابق ان میں 34 تراجم مکمل اور باقی ادھورے ہیں۔ بعض تراجم کے مترجمین کے ناموں کا بھی پتہ نہیں چلتا۔ اس فہرست کو شائع ہوئے تقریباً بیس سال گزر چکے ہیں، مگر اس پر غالباً نظر ثانی نہیں ہوئی ہے۔ میری ذاتی لائبریری میں ایسے دو انگریزی تراجم موجود ہیں جن کا ذکر اس فہرست میں نہیں ہے اور جو بعد میں شائع ہوئے ہیں۔ ان میں ایک ترجمہ بشیر احمد محی الدین کا ہے جو 2003ء میں Quran : the Living Truth کے عنوان سے کوئٹی بکل بک سینٹر، ارناکلم، کیرالہ سے شائع ہوا ہے اور کتاب بھون دہلی سے دستیاب ہے۔ محی الدین صاحب حکومت سعودی عرب کے ایماء پر مغربی افریقی ممالک میں فریضہ دعوت وتبلیغ کیلئے مبعوث ہیں۔ (انہوں نے ایک مقامی افریقی زبان 'حوسا' میں بھی قرآن کا ترجمہ کیا ہے۔ اس کا ذکر بھی مذکورہ فہرست میں نہیں ہے۔) ایک اور انگریزی ترجمہ جو اگر چہ پورا نہیں ہوا ہے، تاہم اپنے تفسیری نوٹس کے اعتبار سے انتہائی اہم ہے، وہ ڈاکٹر عرفان احمد خان (شکاگو) کا Insight into Quran ہے جس کا پہلا ایڈیشن دہلی سے اور دوسرا لندن سے شائع ہوا ہے۔ اس کا ہندی ترجمہ بھی کیا جارہا ہے۔ یہ دونوں صاحبان بھی اصلاً ہندستانی ہیں۔ بعض تراجم ہندستان کی دیگر زبانوں میں بھی ہوئے ہیں جن کا ذکر اس فہرست میں نہیں ہے۔

مولانا عبدالماجدؒ دریابادی کے ترجمہ سے پہلے انگریزی میں قرآن کے کئی تراجم شائع ہو چکے تھے۔ ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم نے اپنے فرانسیسی ترجمہ قرآن میں یورپی زبانوں میں قرآن کے تراجم کی جو فہرست شامل کی ہے، اس کے مطابق یہ سلسلہ ۱۳ویں صدی عیسوی میں شروع ہوا ہے۔ جب کہ استنبول والی فہرست میں 1515ء اور مابعد کے تراجم کا حوالہ ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ کی فہرست تک میں رسائی حاصل نہیں کر سکا کہ ان دونوں فہرستوں میں فرق دیکھا جا سکتا۔ تاہم یہ فہرست استنبول والی فہرست سے کچھ عرصہ پہلے شائع ہوئی ہے، اور ڈاکٹر اے آر قدوائی نے

اپنے مقالے English Translations of the Holy Qura'n: An Annotated Bibliography میں ان دونوں ماخذ کا ذکر کیا ہے اور مذکورہ بالا تعداد دی ہے، اس لئے توقع ہے کہ مسٹر قدوائی نے جو فہرست شائع کی ہے وہ اس میں ان دونوں ماخذ میں مذکور تراجم کا شمار موجود ہوگا۔

بہر حال ۱۴ویں صدی اور اس کے بعد کا یہ وہ دور ہے جس میں پورے یورپ میں شدید اتھل پتھل جاری تھی۔ مذہبی جنون کا دور دورہ تھا۔ ایک طرف کیتھولکس اور پروٹسٹنٹس کے درمیان ٹکراؤ جاری تھا۔ دوسری طرف اسلامی فتوحات سے ہر شخص ڈرا ڈرا تھا اور ہر نگاہ مشرق میں اسلام کے بڑھتے ہوئے دائرہ اثر پر لگی ہوئی تھی۔ پادری مسلسل عیسائی حکمرانوں پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ وہ اسلامی اثر ورسوخ کو روکنے کیلئے اور مسلمانوں کو بعض خطوں سے بے دخل کرنے کیلئے فوجی اقدام کریں۔ جس کے نتیجہ میں صلیبی جنگوں کا طویل سلسلہ شروع ہوا۔ اگر چہ یورپی حکمرانوں کو اور اس سے زیادہ اس دور کے پادریوں کو ڈر اپنے استحصالی نظام کے ختم ہو جانے اور جاگیروں کے چھن جانے کا تھا کہ مسلمانوں کے زیرنگیں خطوں سے عوام کے ساتھ بے مثل رواداری اور انصاف کے واقعات کی جستہ جستہ اطلاعات یورپ تک بھی پہنچ رہی تھیں، حالانکہ ذرائع ابلاغ کا فقدان تھا، تاہم عوام میں اس نئے نظام رحمت سے دلچسپی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہ گئی تھی۔ مسیحی مفکروں کو فکر لاحق تھی کہ قدیم نظام کلیسا خطرہ میں ہے، چنانچہ اس خطرے کا تدارک کرنے کیلئے جنگ کا سہارا ڈھونڈا گیا اور جنگوں کی آگ کو بھڑکانے کیلئے انسانی ایندھن کی فراہمی کی غرض سے عیسائیت کے تحفظ اور فلسطین، شام اور عراق جیسے خطوں میں عیسائیوں کا اقتدار بحال کرنے کے نام پر مذہبی جذبات کو خوب مشتعل کیا گیا۔

چونکہ معاملہ محض اقتدار کا نہیں تھا بلکہ جستہ جستہ جو اسلامی تعلیمات یورپ میں پہنچ رہی تھیں ان کا سد باب بھی مقصود تھا، چنانچہ ایک طرف جہاں تلواریں تیز کی گئیں، تیز رفتار گھوڑے فراہم کئے گئے، جنگ و جدال کا سامان مہیا کیا گیا، وہیں قلم کے تیر بھی چلائے گئے۔ ضرورت اس بات کی سمجھی گئی کہ اسلامی تعلیمات کو مسخ کر کے پیش کیا جائے تا کہ ان کی طرف جو لوگ کشاں کشاں کھنچے چلے جاتے ہیں ان کے ذہنوں کو مکدر کیا جا سکے۔ اسی سلسلہ کی دو اہم کڑیاں تھیں سیرت نبوی کو مسخ کر کے پیش کرنا اور قرآنی تعلیمات کو نعوذ باللہ حضرت محمد ﷺ کی تصنیف قرار دینا۔

چنانچہ دونوں محاذوں پر مستشرقین کی ایک بڑی فوج جھوٹ و افترا پھیلانے، حق کو چھپانے اور اپنے گھڑے ہوئے جھوٹ کو سچ باور کرانے پر کمربستہ ہوگئی۔ گویا یہ ایک طرح سے علمی محاذ پر جنگ کا آغاز تھا جو آج بھی جاری ہے۔ افسوس کہ جہاں مسلمان یورپ کے مقابلے میں اقتدار کی جنگ میں پسپا ہوتے چلے گئے وہیں علمی محاذ پر بھی حق اپنے پاس ہونے کے باوجود مغرب کی شاطرانہ چالوں کا مقابلہ کرنے میں شکست و ہزیمت سے دوچار ہوتے چلے گئے۔ بہرحال یہ ایک دوسرا موضوع ہے جس کا یہاں ضمناً ذکر آگیا۔

مستشرقین کے تراجم:

یہ تھی وہ فضا جس میں ایک فرانسیسی مستشرق 'سلی یور ڈو ریر' (Sleaur Du Ryer) نے قرآن کا ایک مسخ شدہ ترجمہ شائع کیا۔ یہ ترجمہ سترہویں صدی کے اوائل میں شائع ہوا۔ 1649ء میں ایک انگریز مستشرق الیگزینڈر روس Alexander Ross نے اس فرانسیسی ترجمہ کا چربہ انگریزی میں شائع کیا اور اس کا نام فرانسیسی مترجم کی پیروی میں 'القرآن آف محمدؐ' یعنی 'محمدؐ کا قرآن' رکھا۔ اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے تاہم آخری ایڈیشن 1856ء میں شائع ہوا۔ یہ ترجمہ بقول اے آر قدوائی 'قرآن کے بارے میں مستشرق مشنریوں کے انداز فکر کا نہایت بھونڈا نمونہ ہے'۔ اور مسلم ورلڈ (جلد ۵۔۱۹۱۵ء) میں ایس ایم زویمر S.M.Zwemer نے لکھا ہے: روس عربی سے قطعاً ناواقف تھا۔ وہ فرانسیسی کا بھی ماہر نہیں تھا، چنانچہ اس کا ترجمہ اغلاط کا بدترین نمونہ ہے۔

لندن سے 1734ء میں ایک اور مستشرق جی سیل G. Sale کا ترجمہ :The Koran Commonly called Alkoran of Mohammad شائع ہوا جس کے کم از کم **123** ایڈیشن **1975**ء تک شائع ہو چکے تھے۔ وہ عیسائی قارئین کے نام اپنے افتتاحیہ میں لکھتا ہے:

For how criminal so ever Mohammed may have been in imposing a fake religion on mankind, the praises due to his real virtues ought not to be denied ''انسانیت پر ایک جعلی مذہب مسلط کرنے کا (نعوذ باللہ) محمدؐ کا جرم کتنا بھی شدید کیوں نہ ہو، بہرحال ان کی کچھ ذاتی خوبیوں کی بنیاد پر ان کی ستائش

سے انکار کرنے کی ضرورت نہیں۔" میرے خیال میں اس ایک جملے سے مترجم کی ذہنیت عیاں ہو جاتی ہے اور یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس نے ترجمے میں تحریف کے کیسے کیسے گل کھلائے ہوں گے؟ اس شخص نے دعویٰ کیا ہے کہ قرآن کے مختلف نسخوں میں فرق پایا جاتا۔ اس نے بعض آیات کا ترجمہ بھی نہیں کیا ہے۔ مثلاً آل عمران کی آیت ۹۸ کو بالکل ہی چھوڑ دیا ہے جس میں اہل کتاب سے خطاب ہے اور اللہ فرماتا ہے:" کہو اے اہل کتاب! تم اللہ کی باتیں ماننے سے انکار کیوں کرتے ہو؟ تم جو کچھ کرتے ہو، اللہ اس سے خوب واقف ہے۔" مترجم نے ہر جگہ 'یایھا الناس' کا ترجمہ 'اے مکہ کے رہنے والو' کیا ہے اس طرح یہ ترجمہ بھی بدنیتی پر محمول تحریفات کا شاہکار ہے۔

اس کے بعد 1861ء میں روڈویل کا ترجمہ منظر عام پر آیا جس کے کم از کم 32 ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس مترجم نے سورتوں کی ترتیب ہی الٹ دی ہے اور قرآن کو حضرت محمد ﷺ کی تصنیف قرار دیتے ہوئے، عیسائی، یہودی اور زرتشت مشنریوں کو اسلام کے خلاف پروپگنڈے کے بہت سے گر بھی سکھائے ہیں۔

1880ء میں کیمبرج کے اسکالر پامیر کا ترجمہ میکس ملر نے شائع کیا۔ اس میں بھی ترجمہ کی کم از کم ستر تحریفات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ پامیر نے متعدد آیتوں کو ترجمے میں شامل ہی نہیں کیا۔

اس کے بعد شہرت پانے والے تراجم میں رچرڈ بیل کا ترجمہ ہے جو لندن سے 1937ء میں شائع ہوا۔ اس میں بھی قرآن کو انسانی تصنیف قرار دیا گیا ہے اور سورتوں کی ترتیب الٹ دی ہے۔ (ان تراجم کے اجمالی تعارف کیلئے ملاحظہ فرمائیں:

Translating the Untranslatable:A Survey of English Translation of Qur'an: A.R.Kidwai: http:www.quran.org.uk)

یہاں مستشرقین کے ان چند تراجم کے سرسری ذکر سے اس دور کی علمی فضا کا طائرانہ جائزہ پیش کرنا مقصود ہے، جس میں ہمارے ممدوح مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے انگریزی ترجمہ کا بیڑا اُٹھایا تھا۔ مناسب ہوگا کہ آگے بڑھنے سے پہلے ۱۹ویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے ابتدائی ۲۵۔۳۰ سال کی عالمی سیاسی فضا کا بھی ذکر کر دیا جائے، جس سے مولانا دریابادی جیسا حساس مفکر اور باخبر صحافی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا ہوگا۔ صلیبی جنگوں اور داخلی خلفشار کی بدولت تاریخ کے اس مرحلے تک پہنچتے پہنچتے وہ عظیم الشان ایمپائر منتشر ہو چکا تھا جس کی بنیاد اسلام پر رکھی

گئی تھی اور جس کو خلافت کہا گیا۔ خلافت عثمانیہ کی بساط لپٹ چکی تھی، ہسپانیہ پر تقریباً سات صدی کا مسلم اقتدار پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ لے دے کر خلافت کے نام پر ترکی بچا تھا، جس کی گردن پر انگریزوں نے چھری چلا دی تھی۔ ہندستان کے مغل حکمرانوں کو بے دخل کر کے سات سمندر پار سے آئے ہوئے انگریزوں نے اقتدار پر قبضہ کر لیا تھا اور ایک طرح سے مسلمانوں کی تلوار کند پڑ چکی تھی۔ ہر طرف سے نشانہ اسلامی اقتدار و نظام حیات اور مسلم اختیار و اقتدار تھا۔ جس کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ انگریزوں کے ساتھ یہ سیلاب ہندستان بھی پہنچا اور سچ پوچھئے تو انگریز اقتدار کے نشانے پر اگر کوئی رہا تو وہ اس سرزمین کا غیور مسلمان ہی رہا۔ انگریزوں نے اپنے اقتدار کی جڑیں مضبوط کرنے اور اپنے نظریات کی تبلیغ کرنے کیلئے انگریزی تعلیم کو رائج کیا۔ اس شر میں ایک خیر کا پہلو بھی نکل آیا۔ چنانچہ مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا محمد علی جوہر جیسی غیور اور جوہر شناس ہستیاں ملت میں پیدا ہوئیں، جنہوں نے براہ راست انگریزی کے ذریعہ ان علمی تحریکات سے آگاہی حاصل کی جو اہل یورپ اسلام کے خلاف برپا کئے ہوئے تھے۔ ایسے میں مولانا عبدالماجد دریابادی کا قلم کیسے خاموش رہ سکتا تھا؟

مولانا عبدالماجد مرحوم خود ان حالات سے براہ راست متاثر ہوئے تھے۔ مولانا کی ولادت ۱۸۹۲ء میں ہوئی تھی جب کہ ہندستان کی پہلی جنگ آزادی (غدر) ۱۸۵۷ء کے زخم ابھی تازہ تھے۔ ہوش سنبھالنے کے بعد مولانا نے یقیناً اس پر آشوب دور کے قصے سنے ہوں گے اور اپنے گرد و پیش میں ان درختوں کو دیکھا ہوگا جن میں انگریزوں نے پھندے ڈال ڈال کر بے دریغ ان ہندستانیوں کو سولی پر چڑھا دیا تھا جنہوں نے اپنی مادر وطن کو غیر ملکی اقتدار سے بچانے کیلئے جدوجہد میں حصہ لیا تھا۔ انہوں نے اپنے بچپن میں ان شہیدان وطن کی روداد یں بھی سنی ہوں گی، جنہوں نے ہنستے ہنستے جان دیدی مگر اپنی غیرت کا سودا نہیں کیا۔ انہوں نے وہ مسمار مکان بھی دیکھیں ہوں گے جو انگریزوں کے ظلم کی منہ بولتی داستان تھے اور انہوں اس سانحہ کے نتیجہ میں یتیمی اور بیوگی کا زخم کھانے والے بچوں، ماؤں اور بہنوں کی سونی آنکھوں میں یہ سوال بھی پڑھا ہوگا کہ اس ظلم کا جواب کیا ہے؟ ان کے ذہن پر خود اپنے دادا جان کی قید بند کے نقش بھی مرتسم ہوئے ہوں گے، جو انہوں حب الوطنی کی پاداش میں کاٹی تھی (انگریزوں نے ان کو سزائے عمر قید دی تھی تاہم سات سال کے بعد رہا کر دیا تھا)۔ ان کے ذہن میں بہت سے سوال پیدا ہوئے ہوں گے، مثلاً ہم مسلمان ہیں، اسلام کیا ہے؟ انگریز عیسائی ہیں، عیسائیت کی حقیقت کیا ہے؟

دونوں مذاہب آسمانی ہیں تو دونوں کے پیروکاروں میں یہ جنگ وجدال کیوں؟ وغیرہ۔

حسن اتفاق یہ کہ عبدالماجد کو روایتی دینی اداروں کے بجائے جدید عصری اداروں میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ انہوں نے کینگ کالج لکھنؤ سے فلسفہ میں بی اے آنرس کی ڈگری حاصل کی جو اس وقت بہت بڑی علمی معراج تھی۔ انہوں نے ابتدا سے انگریزی کی تعلیم پائی اور مطالعے کے ذوق نے ان کو جویائے علم سے دریائے علم بنادیا۔ افلاطون، ارسطو، مل، ہیوم، اسپنسر رسل اور بریڈ لے جیسے فلسفیوں کے مطالعے نے ان کو عقلیت پسند بنادیا۔ مگر ان انسانی فلسفوں میں ایک بیدار ذہن کو تشفی کہاں ملنے والی تھی؟ سوالات اتنے تھے اور ان کی نوعیت ایسی تھی کہ ان کے جوابات معاشرتی روایات اور مروجہ مذہبی تعلیمی روایات میں نہیں ملتے۔ چنانچہ انہوں نے مذاہب کا مطالعہ شروع کیا اور دنیا کا کوئی قابل ذکر مذہب ایسا نہ تھا جس پر انہوں نے گہرائی سے غور وفکر نہ کیا ہو، اور پھر ایک دن حق ان پر آشکارا ہوگیا۔ ہر چند کہ وہ ۱۹ویں صدی کے ایک روایتی مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے تھے، مسلم معاشرے میں پلے بڑھے، لیکن مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ وہ موروثی مسلمان نہیں تھے، بلکہ اسلام کی حقانیت ان پر وسیع مطالعے اور استدلال کی بدولت منکشف ہوئی تھی۔ بیشک وہ مسلمان گھرانے کے فرد تھے اور ان کو اسلام سے فطری لگاؤ ضرور رہا ہوگا۔ مگر ان کے اندر حق گوئی، بیباکی اور جرات کی وہ اعلیٰ صفات بھی بدرجہ اتم موجود تھیں جن سے اللہ تعالیٰ نے ہم جیسے موروثی مسلمانوں کے مقابلے میں نومسلموں کو زیادہ فراخی سے نوازا ہے۔ ان کا جذبہ ایمانی ان کو کچھ کر گزرنے پر آمادہ کرتا تھا اور انہوں نے شہادت حق کا فریضہ اپنے قلم سے ادا کیا، یا یوں کہئے کہ جہاد بالقلم کی سچی تعبیر پیش کی۔ انہوں نے اپنے قلم کا سفر مضمون نویسی سے شروع کیا اور تاریخ، فلسفہ اور عمرانیات پر متعدد گرانقدر کتابیں تصنیف کیں، لیکن انکا شاہکار کتاب ربانی کا ترجمہ اور تفسیر ہی ہے۔

ہندستان میں قرآن کے انگریزی تراجم کی روایت:

مناسب ہوگا کہ پہلے ہندستان میں قرآن کے انگریزی تراجم کی روایت کا سرسری طور پر ذکر کیا جائے تاکہ وہ پوری فضا سامنے آجائے جس میں مولانا دریابادیؒ کی تفسیر القرآن منظر عام پر آئی۔ اس ترجمہ سے قبل قرآن کے کچھ پورے اور کچھ ادھورے، کم وبیش 45 تراجم شائع ہو چکے تھے، جن میں سے کم از کم 32 تراجم ان مصنفین کے ہیں جن کا براہ راست یا بالواسطہ تعلق سرزمین

ہند سے ہے۔ان تراجم کو چار زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

اول: مستشرقین یا معاندین اسلام کے تراجم

دوئم: ان مترجمین کے تراجم جو خود تو مسلمان ہونے کے مدعی ہیں مگر بعض بنیادی عقائد سے انحراف کی باعث اسلام سے خارج قرار دیئے جاتے ہیں۔

سوئم: جدید افکار سے متاثر مسلمانوں کے تراجم، جن میں معذرت خواہانہ انداز اختیار کیا گیا ہے۔

چہارم: مسلمانوں کے وہ تراجم جن کو جمہور علمائے اسلام کی سند حاصل ہے۔

اس چوتھے زمرے کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: اول وہ تراجم جو خالص دعوتی نقطہ نظر سے لکھے گئے ہیں۔ دوسرے وہ تراجم جو معاندین اسلام کے پروپگنڈے کے رد کے طور پر لکھے گئے۔ مولانا دریابادی کا ترجمہ اس آخری زمرے میں آتا ہے۔

آئندہ ہم صرف ان تراجم کی بات کریں گے جو چوتھے زمرے میں آتے ہیں، چاہے وہ ہندستان میں کئے گئے ہیں یا کسی غیر ہندستانی نے کئے ہیں۔

قرآن کے ان انگریزی تراجم کو ہم ایک اور نظریہ سے دو زمروں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ اول وہ تراجم جو عربی سے براہِ راست انگریزی میں کئے گئے۔ ان میں مارمیڈوک پکتھال، عبداللہ یوسف علی اور مولانا دریابادی کے تراجم خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ دوسرے وہ تراجم جو عربی سے پہلے کسی اور زبان میں اور پھر انگریزی میں کئے گئے۔ مثلاً مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تفہیم القرآن کا انگریزی، اعلاحضرت مولانا احمد رضا خاں بریلوی کا ترجمۂ کنز الایمان فی ترجمۃ القرآن، سید قطب شہید کی تفسیر فی ظلال القرآن کا ترجمہ ان دی شیڈ آف اسلام وغیرہ۔ ان تمام ترجمہ نگاروں میں مولانا عبدالماجد دریابادی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انہوں پہلے اردو میں تفسیر ماجدی لکھی اور پھر ضروری حذف و اضافوں کے ساتھ خود اس کی تلخیص کو انگریزی کے قالب میں ڈھالا۔ مولانا مرحوم کو اردو کی طرح انگریزی تحریر پر بھی عبور حاصل تھا، یہی وجہ ہے کہ اس کی زبان و بیان زیادہ فصیح و بلیغ ہے اور اس میں انگریزی لٹریچر کی چاشنی خوب ہے۔ مولانا نے یہ تلخیص چونکہ خود فرمائی ہے اور انگریزی لٹریچر کا انکا مطالعہ بے حد وسیع تھا، چنانچہ انہوں نے جتنے بہتر انداز

سے اپنے انگریزی کے مخاطب کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے مافی الضمیر کو پیش کردیا ہے، وہ شاید کسی اور کے لئے ممکن نہ ہوتا۔

اس سیاسی اور علمی فضا کا ذکر اوپر آچکا ہے، جس میں مولانا دریابادی کا ترجمہ منظر عام پر آیا۔ بات ادھوری رہ جائے گی اگر ہندستان میں اس سلسلہ کے اس سے پہلے شائع ہونے والے تراجم کا ذکر نہ کیا جائے۔ سب سے پہلا ترجمہ حکیم عبدالحکیم خاں کا ہے جو 1905ء میں پٹیالہ سے شائع ہوا۔ حکیم صاحب کا رجحان ابتدا میں قادیانیت کی طرف تھا، لیکن پھر وہ عقیدہ جمہور کی طرف لوٹ آئے۔ وہ اگرچہ دین کے بڑے عالم نہ تھے، مگر مستشرقین کے جواب کے جذبے نے ان کو ترجمہ قرآن پر آمادہ کیا۔ یہ ایک محتاط ترجمہ ہے، تاہم اس کی نوعیت بھی دعوتی نہیں، بلکہ رد الزامات کی ہے۔ اس کے دو ایڈیشن شائع ہوئے۔ اس کو سرزمین ہند سے شائع ہونے والے پہلے انگریزی ترجمہ کا شرف حاصل ہے۔ حکیم صاحب کو انگریزی پر قدرت حاصل نہیں تھی، تاہم انکا جذبہ اور حوصلہ لائق ستائش ہیں۔

دوسرا ترجمہ قرآن جو ہندستان میں منظر عام پر آیا وہ کسی ایک فرد کی نہیں بلکہ متعدد اہل علم کی کاوش کا نتیجہ ہے، جس کی تدوین وترتیب مرزا حیرت دہلوی نے کی۔ اس میں سیل، روڈویل، پامیر اور سرولیم میور جیسے بڑے بڑے مستشرقین کے الزامات اور اعتراضات کا معقول، مدلل جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ ترجمہ ۱۹۱۲ء میں دہلی سے شائع ہوا۔ یہ بھی ایک محتاط ترجمہ ہے۔

اس کے بعد مولانا دریابادی کے ترجمہ تک تقریباً تیس سال کی مدت میں کوئی قابل ذکر کام ہندستان میں غالباً نہیں ہوا، البتہ ایک انگریز نومسلم مارمیڈوک پکتھال کا شہرۂ آفاق ترجمہ ۱۹۳۰ء میں لندن سے شائع ہوا۔ اب تک جتنے تراجم شائع ہوئے تھے ان میں اپنی سلامت روی اور بلند معیار کی بدولت یہ ترجمہ دیگر تمام تراجم میں امتیازی اہمیت کا حامل ہے اور آج بھی مقبول ہے۔ یہ شمار کرنا مشکل ہے اس کے کہاں کہاں سے کتنے ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور کس کس طرح استعمال کیا گیا ہے، تاہم ڈاکٹر اے آر قدوائی (یو کے اسلامک فاؤنڈیشن) کے بقول اس کے ایڈیشنوں کی تعداد کم از کم تیس ہے۔ دوسرا قابل ذکر ترجمہ عبداللہ یوسف علی کا ہے، جو لاہور سے ۱۹۳۴۔۱۹۳۷ کے درمیان شائع ہوا۔ یہ ایک انتہائی مقبول ترجمہ ہے، اس کی زبان انتہائی فصیح و

بلیغ ہے۔ پڑھنے میں دلچسپ اور قرآن کے مفاہیم کی ادائیگی میں بے نظیر ہے۔ مولانا ابوالحسن علی میاں ندویؒ نے ان دونوں تراجم کی تعریف کرتے ہوئے یہ دلچسپ نشاندہی کی ہے کہ قرآن کے متداول انگریزی مسلم مترجموں کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ بجز پکتھال سب کے سب ہندستانی ہیں۔ اور پکتھال کا ہندستان سے یہ تعلق ہے کہ اس ترجمہ کی خدمت پر ان کو نظام حیدرآباد نے مامور کیا تھا۔ ڈاکٹر ایم خان(Metcalf 1982-98, 216) کے مطابق انگریزی کے 26 تراجم برصغیر ہندو پاک کے مترجمین کے کئے ہوئے ہیں۔ (یہ تعداد اب بڑھ کر کم از کم 28 ہوگئی ہے۔) سوال یہ ہے کہ ان مقبول و معروف اور صحیح العقیدہ تراجم کی اشاعت کے متصلاً بعد مولانا دریابادیؒ کے ترجمہ کی کیا حاجت و معنویت ہے؟ اس سوال کا جواب حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی مرحوم نے تفسیر القرآن کے تعارف میں یہ دیا ہے:

There was however need of another English Translation of the Holy Qura'n; complete with explanatory notes, which could be recommended with confidence to the Muslims and Non Muslims whose mother tongue is English or who found it easy owing to there cultural background or educational upbringing, to understand it better in English.

The author of such an exegesis has to expound the Qura'nic Text in terms acceptable to the scholars of the Ahle-sunnat wal Jamaat, to avoid putting forward his own views and ideas in the exegesis: to be fully conversant with the Arabic Lexicon and rules of grammer to avoid the apologetic approach in the expounding the Qura'nic injunctions and institutions: to have an implicit faith in the life after death and the rewards and retroactions promised in the Qura'n as divine pronouncements instead of taking them merely as symbolical expressions: to have studied all the classical and modern commentaries in

depth; to be able to expound the significance of the Qura'nic injunctions in regard to polygamy, slavery, dowry, executions of the apostates, blood wits etc: to hold the same belief about the throne (arsh and kursi) the preserved tablet (loh-e-mahfooz) jinne, angles, prophet hood, revelations (wahi) and the earlier and final divine scriptures as entertained by the earliest Muslims, and to have no qualms about the bodily lifting of Jesus Christ to the higher regions. Taking all these factors in the account the translation and the commentary of Abdul Majid Daryabadi is undoubtedly unique and most acceptable among all the exegetical renderings of the Holy Qura'n attempted so far in the English language.(Introduction to Tafseerul Qura'n)

مولانا علی میاں کی اس شہادت کے بعد ہم اطمینان کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ترجمہ نگار کا عقیدہ، فہم قرآن اور زبان پر قدرت شک وشبہ سے بالاتر ہے اس لئے اس ترجمے میں غلطی کا امکان کم ہے۔ جہاں تک ترجمہ کے مطابق اصل ہونے کا اور عربی کے مفہوم کو بلا کم و کاست انگریزی کے قالب میں ڈھالنے کا سوال ہے، خود مترجم موصوف نے تفصیل سے ان دشواریوں کا ذکر کردیا ہے، جو اس راہ میں حائل ہیں۔ تفسیر القرآن کی جلد اول میں مولانا دریابادی کا پیش لفظ پڑھنے کے بعد یہ نتیجہ آسانی سے اخذ کیا جاسکتا ہے کہ مترجم چاہے کتنا بھی راسخ العقیدہ کیوں نہ ہو، اور عربی اور انگریزی پر اس کو کیسی بھی قدرت حاصل کیوں نہ ہو، ترجمہ بس ترجمہ ہی ہوتا ہے، اصل کا بدل نہیں ہوسکتا۔ محمد مارمیڈوک پکتھال نے اپنے ترجمہ قرآن کے پیش لفظ میں یہ اعتراف کیا ہے:

The Qura'n cannot be translated..... The book is here rendered almost literally and every effort has been made to choose befitting language. But the result is not the Glorious Qura'n, that inimitable symphony, the very sound of which

moves men to tears and ecstasy. It is only an attempt to present the meaning of the Qura'n and peradventure something of the charm in English.

اس میں شک نہیں کہ مترجم علیہ الرحمۃ نے خوب عرق ریزی کی ہے۔قرآن کو پہلے بخوبی سمجھنے اور پھر اسے انگریزی کے قالب میں ڈھالنے میں بھرپور کوشش کے باوجود بہر حال یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ کلام الٰہی کو کسی دیگر زبان میں ان تمام خصوصیات کے ساتھ بیان کیا جاسکتا ہے جو اللہ کے کلام میں موجود ہیں۔زیادہ سے زیادہ جو بات ہم کہہ سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ قرآن کے مطالب کو سمجھنے کیلئے یہ ترجمہ ان لوگوں کیلئے بڑا قیمتی سرمایہ ہے جو براہ راست عربی نہیں جانتے۔ہم جتنی محنت ترجمہ کو سمجھنے میں کرتے ہیں اس کے نتیجہ میں ہم صرف یہی جان سکتے ہیں کہ ترجمہ نگار نے قرآن سے کیا سمجھا، رہا قرآن کو اس کی اصل صورت میں سمجھنا، اس کی تمام خوبیوں سے آشنائی حاصل کرنا، اور اس سے تعلق قائم کرنا، تو یہ اسی وقت ممکن ہے جب ترجمہ کو وقتی سہارا سمجھا جائے اور اصل سے رشتہ قائم کرنے کی فکر کی جائے۔اس ترجمے کے محاسن کو سمجھنے اور دیگر تراجم سے تقابلی مطالعہ ایک الگ موضوع ہے، جس کیلئے نہایت دیدہ ریزی، اعلیٰ صلاحیت اور وقت درکار ہے۔ تاہم ترجمہ کا سرسری اندازہ کرنے کیلئے ذیل میں قرآن کی سب سے چھوٹی سورہ والعصر کا ترجمہ درج ہے اور اس کے تین دیگر تراجم پیش ہیں۔قارئین خود محسوس کریں گے کہ مولانا کے ترجمے میں جو برجستگی، روانی اور مفہوم کی قریب ترین ادائیگی ہے اس کی شان ہی نرالی ہے۔

Surat-ul-Asr

The Time: CIII

By the time1, verily man2 is in loss; but not those who believe and work righteous deeds3 and enjoin upon each other the truth4 and enjoin upon each other steadfastness.5

Foot notes:

1. (through the ages, wherein man is the author of his undoing) As'r is 'Any unlimited extent of time, during which

people pass away and become extinct.'

2. (Who employs himself in acts of disobedience)
3. I.e. those whose intellect and will both are attuned to perfect discipline. In the Aristotelian phraseology, moral choice is nothing but Will consequent or deliberation. 'The reason must be true and the Will right, to constitute good Moral Choice and what the Reason affirms the Will must pursue' (Aristotle's Ethics: IV:2, p.163)
4. I.e. true doctrine.
5. I.e. perseverance and constancy is good works and righteousness.

Mohd Asad:

{1} Consider the flight of time!1 {2} Verily, man is bound to lose himself {3} unless he be those2 who attain to faith and do good works, and enjoin upon one another the keeping to truth and enjoin upon one another patience in adversity.

Note: [1] The term 'Asr' denotes 'time' that is measurable, consisting of a succession of periods (in distinction from dhar, which signifies 'unlimited time', without beginning or end: i.e. 'time absolute') Hence Asr bears the connotation of the passing or the flight of the time - time which can never be recaptured.[2]. Lit, "man is indeed in [a state of] loss, except those......" etc

Mohammad Marmaduke William Pickthall :

{1} by the declining day, {2} Lo! Man is in the state of loss,

{3} save those who believe and do good works, and exhort one another to truth and exhort one another to endurance.

Abdullah Yusuf Ali:

{1} By (the Token of) time, (through the ages) {2} Verily Man is in loss, {3} Except such as have Faith and do righteous deeds and (join together) in the mutual teaching of Truth, and of Patience and Constancy.

ترجمہ کے بعد اب ایک نظر مولانا دریابادیؒ کے تفسیری نوٹس پر ڈالتے ہیں۔ جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے، اس ترجمہ اور تفسیر کا مقصد دراصل مستشرقین کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کا تدارک ہے۔ دیکھنا یہ چاہئے کہ اس مقصد میں یہ تفسیری نوٹس کس حد تک کامیاب ہیں؟ اگر چہ اس سوال کا کوئی حتمی جواب دینا سخت دشوار ہے کہ یہ بھی طویل مطالعہ ومشاہدہ کا موضوع ہے، تاہم متعدد علمی کاوشوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ اس ضمن میں جتنی بھی کوششیں ہوئی ہیں، ان میں اس کاوش کو نہایت اہم مقام حاصل ہے۔ اس کا سبب اس کا اسلوب استدلال ہے۔ مغرب کو جواب دینے کا جو طریقہ افضل ترین ہوسکتا ہے، مولانا دریابادی نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ انہوں نے اپنی بات کو منوانے کیلئے زور بیان کا سہارا نہیں لیا ہے بلکہ علمی استدلال کو بروئے کار لائے ہیں، اور یہ استدلال اکثر وبیشتر یورپی مفکرین کے حوالے سے پیش کیا ہے جن کی علمی حیثیت مخاطبین کی نظر میں وقیع ہے۔ انہوں نے نہایت خوبی سے قرآن پر اہل مغرب کے اعتراضات کا تار پود بکھیر دیا ہے اور ہر اس موضوع پر، جس کو بہانہ بنا کر نظام اسلام کو بدنام کیا جاتا ہے، سائنس، فلسفہ، تاریخ وعمرانیات وغیرہ علوم کے ممتاز مغربی مفکرین کے حوالوں سے مسکت جواب دیا ہے۔ ان موضوعات میں، طلاق، کثرت ازدواج، ترکہ جیسے معاملات شامل ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ یہ موضوعات آج بھی اسی طرح الزام تراشی کے لئے استعمال کئے جا رہے ہیں، جیسے کئی صدی پہلے کئے جاتے تھے مگر ان کے جواب دینے کیلئے مولانا دریابادی کے اشارات کی طرف ہماری توجہ کم ہی جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان موضوعات کو منتخب کر کے ان کے عقلی جوابات کے لئے مولانا دریابادی کی تفسیر القرآن کی طرف رجوع کیا جانا چاہئے۔ یہ ایک

بڑا اہم کام ہوگا، اگر شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ اس کی طرف توجہ کرے۔ مولانا کے استدلال کا ایک نمونہ یہاں پیش ہے۔ سورۃ نساء کی آیت مبارکہ ''والمطلقات یتربصن بانفسهن ثلثة...... واللہ عزیز حکیم (۲۲۸) کے ذیلی نوٹ میں طلاق پر اسلام اور دیگر مذاہب سے موازنہ کرتے ہوئے شریعت اسلامی کی برتری انتہائی جامع و مانع انداز میں اور بہت کم الفاظ میں واضح کردی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں نوٹ نمبر 502

The course of divorce or the dissolution of the marriage tie. among ancient nations has been erratic. Some making it too loose, others making it too tight. Speaking sociologically, every religion has be meet two ends on the sphere of marriage and family - to raise the standard of morality and to sanctify the marriage contract. But in practise some religions have become too lenient, others too rigid. The Jewish law allows it as a matter of no great concern. If husband finds 'some uncleanness in her, than let him write her a bill of divorcement, and give it in her hand and send her out of his house. And when she is departed out of his house, she may go and be another man's wife.' (Dt. 24:1, 2)

Christianity on the other hand taking its stand on the reported saying of Jesus: What therefore God hath joined together let not man part asunder...... Whosoever shall put away his wife and marry another, committetch adultery against her. (Mk. 10: 9, 11), and also upon the dictum of Paul: 'Let not the wife depart from her husband/' (1, Co. 7:10) has interdicted divorce altogether. The Catholics hold: 'When the sacrament of matrimony has been received by a man and a woman and

ratted by their cohabitatins as husband and wife, their union cannot be dissolved except by death.' (CD. P. 477)

The climax was reached in the rules of the Roman Catholic Church.... (It)' treats marriage as a sacrament and demands indissolubility and unchanging fidelity.' This is itself unreasonable. Judaism takes account of the mutability of human feelings. And for people when the chains of matrimony become fetters: but the Catholic Church refuses the recongnise any such change of feeling. The bonds of matrimony become as heavy and galling as iron in which two people must languish for the term of their natural lives." (Bauer, Women and Love, II, p. 291) The Protestants allow it no doubt but only on such grounds as are on comparatively rare occurrence-fornication.

Islam has steed its course midway between the two, avoiding the extremes of either making divorce too rigid or banning it altogether or it making too loose and frivolous. Islam has adopted the only wise course open - that of imposing certain conditions and limitations upon the right of the husband to dissolve the matrimonial bond, the object of which is 'to ensure that the husband was not acting in haste or anger and that separation becomes inevitable in the interests of the husband and the wife and the children' (Abdur Rahim, op.cit, p 336)

اسی طرح کثرت ازدواج پر چار صفحہ کا جو اپینڈکس سورۂ نساء کے اختتام پر شامل کیا ہے، وہ کسی شاہکار سے کم نہیں۔ اس طرح کے اپینڈکس تفسیر میں جا بجا شامل کئے ہیں اور اس کام

میں انہوں نے وسعت نظر سے کام لیا ہے اور متعدد موضوعات پر دیگر مفکرین کے مضامین کو بلا تکلف استعمال کر کے اس حدیث نبوی کا عملی ثبوت پیش کیا ہے کہ علم مومن کی میراث ہے، جہاں سے ملے حاصل کر لے۔

تفسیر القرآن کی کچھ بہت ہی نمایاں خوبیاں ہیں، جن کا ذکر کئے بغیر بات ادھوری رہ جائے گی۔ اول یہ کہ قرآن میں مذکور تمام مقامات اور شخصیات کا حسب موقع بھرپور تعارف کرایا گیا ہے۔ دوم یہ کہ مرعوبیت پاس کو بھی نہیں پھٹکی ہے، جس کی ایک علامت یہ ہے کہ انگریزی میں انہوں نے قرآن میں مذکور شخصیات اور مقامات کے وہی نام درج کئے ہیں جو قرآن میں ہیں، ان کیلئے عیسائی یا یہودی روایات میں مروج ناموں سے گریز کیا ہے۔ البتہ اگر کسی مغربی مفکر کا کوئی قول یا اقتباس نقل کیا ہے تو اس کو جوں کا توں برقرار رکھا ہے۔

آخر میں چند مختصر معروضات پیش ہیں۔ اول اس ترجمہ کے باب میں اور دوم اس سرد مہری کے باب میں جو اس علمی خزانے کی طرف سے دکھائی گئی ہے۔ کلام اللہ کے باب میں ہم اس نظریہ کے قائل ہیں کہ قرآن الگ الگ آیتوں کا بے ربط مجموعہ نہیں ہے، بلکہ ان میں ایک نہایت لطیف تسلسل اور ربط موجود ہے۔ ایک آیت کو سمجھنے کیلئے اس سے آگے پیچھے کی آیات پر غور و فکر ضروری ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ قرآن کی ترتیب اور سورتوں میں اس کی تنظیم خود اپنی جگہ اہمیت کی حامل ہیں۔ کلام ربانی کی یہ ترتیب و تنظیم خارج از علت نہیں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ یہ تقسیم، ترتیب و تنظیم خود اللہ کے رسول ﷺ نے اللہ کی راست نگرانی میں فرمائی ہے۔ چنانچہ قرآن کو سمجھنے کے لئے اس تنظیم، ترتیب اور تقسیم کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ قرآن کا اصل جز و پارہ نہیں ہے، بلکہ سورہ ہے۔ اس لئے ہم سورتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس کے مطلب اور مقصود تک نہیں پہنچ سکتے۔ ہر سورہ کا ایک مرکزی موضوع ہے، جس کے گرد وہ سورت بنی گئی ہے۔ دوسرے یہ کہ قرآن حکیم کوئی قانون کی خشک کتاب نہیں ہے جس سے ہدایت پانے کیلئے محض عقل کا سہارا کافی ہو۔ میں نے یہ تمہید یہ عرض کرنے کیلئے باندھی ہے کہ مجھے اس تفسیر میں سپاروں پر تقسیم کی جیسی اہمیت نظر آتی ہے ویسی سورتوں کی نظر نہیں آتی، حالانکہ ہمیں نہیں معلوم کہ تیس سپاروں میں قرآن کی تقسیم کی اصل کیا ہے۔ سورتوں کی جو اہمیت ہے اور جس طرح ایک ایک آیت کے ساتھ پورے رکوع کی اور پوری سورت کی تفہیم ہونی چاہئے وہ اس میں نہیں ہے۔ یہ ترجمہ قرآن مختلف علوم کا خزانہ تو عطا کرتا ہے،

علمی ریشہ دوانیوں کے جوابات بھی فراہم کرتا ہے چنانچہ دماغ کو خوب اپیل کرتا ہے لیکن مردہ دلوں میں کتنی روح پھونکتا ہے، یہ متعین کرنا ابھی باقی ہے۔

ایک شکوہ مولانا دریابادیؒ کے قدر دانوں سے بھی کرنا چاہئے۔ چار جلدوں پر محیط یہ کتاب عصری اور دینی علوم کا بیش بہا خزانہ ہے، لیکن جیسی توجہ اس کی طرف ہونی چاہئے تھی اور اس کے گل بوٹوں سے جس طرح چمن سجائے جانے چاہئے تھے، اس کی طرف توجہ نہیں گئی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کو پورے اہتمام کے ساتھ مطالعے کا موضوع بنایا جائے۔ اس میں مختلف موضوعات پر جو اشارے ہیں، ان پر مزید کام کیا جائے اور اس کو پورا کا پورا انٹرنیٹ پر ڈالا جائے۔ اس کے دیگر یورپی زبانوں میں بھی تراجم ہونے چاہئیں۔ قرآن کی تشہیر و تبلیغ کیلئے جو کوششیں قادیانی کر رہے ہیں، ان سے پیچھے رہنے کا مطلب بتانے کی شاید مجھے ضرورت نہیں ہے۔

عاشق رسول، سیرت نگار — مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

مولانا عقیدت اللہ قاسمی ☆

ہمارے ممدوح حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ صاحب طرز انشاء پرداز اور صاحب عزم صحافی تھے۔ نامور ادیب تھے۔ مفسر قرآن تھے۔ محقق مورخ تھے۔ سوانح نگار تھے۔ تصوف کے غواص تھے۔ فلسفی تھے۔ ماہر نفسیات تھے۔ رسول اکرم ﷺ کے شیدائی تھے۔ آپ کا ادبی مطالعہ بے حد وسیع تھا۔ آپ اردو ادب کے قدیم وجدید مختلف پہلوؤں سے خوب واقف تھے، قلم کے بادشاہ تھے۔ ایک شگفتہ اور منفرد ادبی اسلوب کے بانی تھے۔ علامہ شبلی نعمانی، مولانا الطاف حسین حالی، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے علماء ومفکرین کی صف کے فرد تھے۔ آپ کو اسلامی تہذیب سے والہانہ لگاؤ اور عشق تھا۔ مغربی تہذیب کو خوب اچھی طرح جانتے اور سمجھتے تھے اس کے مالۂ وماعلیہ پر بھی عمیق نظر رکھتے تھے۔ اس کے نتائج بدوخوب سے اچھی طرح واقف اور باخبر تھے۔ اس لئے اس سے کبھی مرعوب نہیں ہوئے۔ آپ کی تحریروں میں مغربی تہذیب سے مرعوبیت کا کہیں کوئی شائبہ یا نام ونشان تک نہیں پایا جاتا اس کے برخلاف اس کے کمزور اور بدنما پہلوؤں پر نہایت ٹھوس اور مدلل تنقید کرتے تھے۔ آپ نے اپنے قلم کے جوہر بہت سے میدانوں میں دکھائے اور قلم کی بادشاہی وزبان پر کمانڈ کا لوہا منوایا۔ اردو ادب کے مختلف پہلوؤں پر بے شمار تحریریں، مضامین، انشائیے، مقالات، ریڈیائی نشری تقاریر، شذرات، نوٹس، اداریے، ہفتہ وار کالم سچی باتیں آپ کے قلم کی جولانیوں کا مظہر ہیں۔ بحیثیت مفسر قرآن یہ آپ ہی کا امتیاز ہے کہ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں تفاسیر لکھیں۔ آپ کے رشحات قلم سدابہار اور زندۂ جاوید ہیں یہ امر حقیقت ہے کہ آپ کی تحریروں کی شگفتگی کا یہ عالم ہے کہ پڑھتے ہوئے قاری تحریر کی گرفت سے آزاد نہیں ہو پاتا یہی وجہ ہے کہ آپ کے معاندین کو بھی آپ کی شگفتہ اور دلچسپ تحریروں کو پڑھے بغیر کبھی چین نہ آتا تھا۔

☆ سہ روزہ دعوت، نئی دہلی۔

آپ ایک سچے عاشق رسول تھے چنانچہ آپ کے قلم سے جذبات قلبی کا اظہار نہایت والہانہ وعارفانہ انداز میں ہوتا تھا اسی لئے عشق رسول اور اردو ادب کی چاشنی وشیرینی کے آمیزہ سے تیار ہونے والے مضامین کو حکیم عبدالقوی دریابادی نے بجاطور پر ''نثری نعت'' کا نام دیا ہے۔ سیرت رسولؐ پر آپ کی بہت گہری، وسیع اور عمیق نظر تھی۔ اگر ایک طرف عاشقان رسولؐ کی تالیفات کا آپ نے بہت گہرائی وگیرائی کے ساتھ مطالعہ کیا تھا تو دوسری طرف مخالفین ومعاندین رسولؐ اور مستشرقین کی حرکات وسکنات کو بھی اچھی طرح جانچا و پرکھا تھا اور روشن خیال وغیر جانبدار سیرت نگاروں کو بھی پڑھا تھا۔ سیرت رسولؐ کے ایک ایک جزئیہ پر آپ کی گہری نظر تھی اور ارشاد باری تعالیٰ: لقد کان لکم فی رسول الله اسوة حسنة کے مطابق ہر ہر پہلو سے بڑی گہری بصیرت کے ساتھ انسانوں کی دنیاوی فلاح و بہبود اور اخروی نجات وبلندی درجات کے نمونوں اور راہوں وسمتوں کی نشاندہی فرماتے تھے۔

اکبرالہ آبادی کے شعر ''خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے۔ کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا'' سے ماخوذ ''مردوں کی مسیحائی'' کو عنوان قرار دے کر نعتیہ مضمون سپرد قلم فرماتے ہیں تو ذیلی عنوان ''گمراہی کی سیاہ چادر'' کے تحت ظہور نبوت کے وقت کی دنیا کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں:

''انسان زندہ بنایا گیا ہے لیکن یہی زندہ کبھی مردہ بھی ہوجاتا ہے۔ دنیا روشن پیدا کی گئی ہے لیکن یہی روشنی کبھی تاریکی میں بھی تبدیل ہوجاتی ہے۔ روئے زمین کے مختلف حصوں میں بڑے بڑے ہادی ورہنما آئے اور گزر چکے لیکن اب ایک مدت سے دنیا ان کی ہدایتوں سے محروم ہے۔ بارش اپنے موسم میں زمین کو خوب سیراب کر چکی تھی لیکن اب جلتی اور تپتی ہوئی زمین کے ہونٹوں پر پیاس سے خشکی کی پپڑیاں جمی ہوئی ہیں آخری نبی حضرت مسیحؑ کے زمانہ کو ساڑھے پانچ سو سال کی مدت گذر چکی ہے اور اب سطح زمین نورانیت کے فیض سے یکسر محروم ہے۔ دن کی روشنی چھپ چکی ہے اور عالم انسانیت پر رات کی سیاہی چھائی ہوئی ہے۔ کسی ایک ملک کی تخصیص نہیں۔ آفتاب کے طلوع ہونے کی جگہ مشرق اور غروب ہونے کی جگہ مغرب سب گمراہی وسرگشتگی کی اسی سیاہ چادر میں لپٹے ہوئے ہیں۔ بحر و بر، شرق وغرب، عرب وعجم سب کی روحانی زندگی موت سے ظهر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس تبدیل ہوچکی ہے اور کائنات

انسانی کی ساری فضا شقاوت ونفس پرستی، بدی و بدکاری، شرارت ونفاق کے گھرے بادلوں سے سیاہ ہورہی ہے۔"

عام دنیائے انسانیت کا نقشہ کھینچنے کے بعد خاص عالم عرب سے متعلق اس کتاب پاک کی تصریحات پیش کرتے ہیں، جو ہر قسم کے مبالغہ وافراط سے بالاتر ہے اور جس کا ایک ایک حرف صداقت وحقیقت کے اونچے سے اونچے معیار کا نمونہ ہے۔ مضمون اور عبارت کے درمیان قرآن کریم کی آیات کو کس انداز سے پیش کرتے ہیں وہ بھی قابل توجہ امر ہے۔

''محروم عرب'' کے ذیلی عنوان کے تحت رقم طراز ہیں:

''یہ حال سارے عالم انسانیت کا ہے لیکن براعظم ایشیا کے جنوب ومغرب کا وہ حصہ جو عرب کے نام سے موسوم ہے اس عموم میں ایک خصوص رکھتا ہے۔ یہ سرزمین جس طرح مادی حیثیت سے بنجر ہے شاید اسی طرح اب تک فطرت کی روحانی بارشوں اور بخششوں سے بھی محروم ہے۔ اس کی تباہ کاریاں اور تیرہ بختیاں سارے عالم کے لئے ایک نمونہ عبرت ہیں۔ بیمار کل دنیا ہے لیکن عرب کا مریض دق میں مبتلا ہے۔ خشک سالی سب کہیں ہے لیکن یہاں قحط شدید پڑا ہوا ہے۔ اس کی اخلاقی پستی حد سے گذر چکی ہے۔ اس کی روحانی بیماریاں تقریباً لاعلاج ہو چکی ہیں۔ اس کی سرکشی وتباہ کاری، خود پرستی **الاعراب اشد کفرا و نفاقا و اجدر الا یعلموا حدود ما انزل اللہ علی رسولہ** وخدا فراموشی، عقائد کی خرابی اور اعمال کی ابتری نے اسے اس لائق بھی نہیں رکھا ہے کہ کوئی بشری کوشش اصلاح حال میں کامیاب ہو سکے۔ رشد وہدایت، پاک بازی وپاکیزہ خوئی، حسن عمل ونیک کردار کا کیا ذکر ہے اب تو اس قوم کی ساری زندگی کا خلاصہ صرف ایک لفظ گمراہی یا ضلالت میں بیان کیا جاسکتا ہے اور ضلالت بھی کیسی؟ **وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین** تاویل وتوجیہہ کی گنجائش سے ماوراء بالکل واضح وصریح! ساری اصلاحوں کی بنیاد قلب کی صلاحیت پر ہوتی ہے، قلب میں جب تک نرمی وگداز باقی ہے اس وقت تک اصلاح حال کی امید قائم کی جاسکتی ہے لیکن ان بدنصیبوں کی نوبت یہاں تک پہونچ چکی ہے کہ ان کے سینوں میں انسانیت کی ندی اور قلبوں میں آدمیت کے چشمے خشک ہو چکے ہیں، **فھی کالحجارۃ او اشد قسوۃ** اور اس کے بجائے دلوں میں پتھروں کی سی سختی بلکہ پتھروں سے بھی بڑھ کر سختی پیدا ہوگئی ہے۔ اور قبول حق کے گویا سارے دروازے انہوں نے اپنے ہاتھوں اپنے

او پر بند کر لئے ہیں۔ بدکاریوں اور بدکرداریوں میں مسلسل مبتلا رہتے تھے ان کے دل و دماغ، ان کی عقل و ذہن مسخ ہو چکے ہیں۔ حق و باطل، نیک و بد، نور و ظلمت کا فرق ان کی نظروں سے مٹ گیا ہے اولئک کالانعام بل ھم اضل بن چکا ہے۔ جانوروں کی سی کیفیت پیدا ہوگئی ہے بلکہ اپنی کج فہمی، بے بصری اور تنگ نظری میں جانوروں سے بھی آگے نکل چکے ہیں۔

ظہور اسلام سے قبل کے عالم عرب کے بارے میں قرآن کریم کے حوالے سے ان تصریحات کو بیان کرنے کے بعد آپ وقت کے تقاضوں اور حالات کے پیش نظر یہ بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ "اس زمانہ کے روشن خیال اپنی تشفی کے لئے "محققین فن" و "ماہرین تاریخ" کے بیانات پر بھی ایک سرسری نظر کرتے چلیں"۔ ظاہر ہے دوسروں کے سامنے ان "محققین فن" اور "ماہرین تاریخ" کے حوالے اور اقتباسات پیش کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ بالتفصیل ان لوگوں کو پڑھ چکے تھے اور رسول اکرم ﷺ کے عشق و محبت کے غلبہ میں ان کے خیالات، نظریات، تحریروں اور تصنیفات کا مطالعہ کر چکے تھے۔ چنانچہ "تاریخ زوال مملکت رومہ" کے حوالہ سے مشہور مورخ رومہ ایڈورڈ گبن کا بیان نقل کرتے ہیں۔ "لائف آف محمد" سے سرولیم میور کے اعترافات درج کرتے ہیں "محمد بسلسلہ سوانح مشاہیر اقوام" کے حوالہ سے مشہور دشمن اسلام، آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر مارگولیس کی شہادت بھی نقل کرتے ہیں نیز لیڈن یونیورسٹی (ہالینڈ) کے مشہور "ماہر عربیات و اسلامیات" پروفیسر ہرگرونج کی تحقیقات کا بھی محمڈنزم کے حوالہ سے ذکر کرتے ہیں جو امریکہ کی یونیورسٹی میں مخصوص اسی موضوع پر تقریریں کرنے کے لئے مقرر ہوئے تھے۔ اور ان سب کے خلاصۂ بیان کے طور پر علامہ شبلی نعمانی کا حوالہ دیتے ہیں جنہیں آپ ایک روشن خیال مسلمان کا خطاب دیتے ہیں اور جن کی ترتیب دی ہوئی سیرۃ النبی کو "اپنی قوم کے روشن خیالوں ہی کے لئے سیرت محمدیؐ پر تالیف کی ہوئی ضخیم کتاب" قرار دیتے ہیں، ان تمام حوالوں کو پیش کرنے کے بعد آپ فرماتے ہیں:

"یہ فضا ہے، جس میں ایک بے کس و بے یاور، یتیم اور ان پڑھ بچہ اپنی آنکھیں کھولتا ہے۔ کارساز فطرت کی مشیت یہ ہوتی ہے کہ اس بے کس و ناتواں کے ذریعہ سے، ایک قبیلہ کی نہیں، ایک قوم کی نہیں، ایک ملک کی نہیں، سارے عالم، بلکہ سارے عالموں لیکون للعالمین نذیرا کی اصلاح کا کام لیا جائے اور اسے سارے جہانوں کی جانب یہ پیام دے کر بھیجا جائے کہ

فطرت سے بغاوت کرتے رہنے والوں کا بالآخر کیا انجام ہونے والا ہے۔''

اور پھر اس پیامبر کی پیغام رسانی اور مخاطبین کی حرکتوں، ضد وہٹ دھرمیوں کا یوں اندراج کرتے ہیں:

''پیامبر اپنا پیام پہونچاتا ہے اور اس کے گرد وپیش کی ساری شیطانی قوتیں دولت، وقوت کے سایہ میں جمع ہو کر اس کی مخالفت وعدوات پر کمربستہ ہو جاتی ہیں، اس عالی ظرف کا ظرف، سالہا سال تک ہر قسم کی تکلیف وتوہین، اذیت ورسوائی کے مقابلہ میں سپر بنا رہتا ہے، تاآنکہ مخالفین کے حوصلے اور بڑھ جاتے ہیں اور کھلم کھلا یہ مطالبہ ہونے لگتا ہے، اگر حق کی قوت ونصرت اس کے ساتھ ہے تو آخر حق وباطل نور وظلمت میں کھلا ہوا فرق، فرقان اس پر کیوں نہیں نازل کر دیا جاتا؟ جواب ملتا ہے کہ فرقان تو شروع ہی سے اس کے ہمراہ ہے قد تبین الرشد من الغی حق وباطل کی راہیں تو آغاز ہی سے الگ الگ ہیں البتہ اے بے بصرو! تم جو سوا مادی فتح وفیروزمندی کے کسی اور فرقان کو محسوس کرنے سے معذور ہو اور دن رات اس قسم کے واہی تباہی خیالات اور بچوں کے سے مطالبات پیش کرتے رہتے ہو کہ یہ پیمبر تو ہم ہی انسانوں کی طرح کھاتا پیتا اور بازاروں میں **مال هذا الرسول ياكل الطعام ويمشى فى الاسواق لولآ انزل اليه ملك فيكون معه نذيرا او يلقىٓ اليه كنز او تكون له جنة ياكل منها** چلتا پھرتا ہے۔ اس کے ساتھ انسانی قوئی سے ماورا کوئی فرشتہ کیوں نہ اتارا گیا یا اسے فکر معاش سے بے نیاز کرنے اور عیش سے زندگی گذارنے کو غیب سے کوئی خزانہ اس کے پاس کیوں نہیں اتر آیا یا اسے جنت کے موعودہ اور مفروضہ باغوں کی طرح کوئی باغ کیوں نہیں نصیب ہو جاتا! سوا اپنی ان خام خیالیوں اور بے مغزیوں کے جواب میں تیار ہو جاؤ۔ اس دنیا میں فرقان اتر کر رہے گا۔ اور ایسا فرقان، جسے تمہارے مادی حواس بھی محسوس کر کے رہیں گے تم ایک غیبی قوت فرشتہ کے نزول کا مطالبہ کر رہے ہو، اس نبی کا مرتبہ تو کہیں بڑھ چڑھ کر ہے، اس کے غلاموں پر ان غیبی قوتوں کا نزول ہوگا جس کی توجیہ وتاویل میں تمہارے بڑے بڑے فلسفیوں اور حکیموں، عاقلوں اور داناؤں کی دانائی وزیرکی عاجز رہ جائے گی۔ **تبٰرک الذى نزل الفرقان علىٰ عبده** اور آج تم ایک باغ کو انتہائی نعمت سمجھ رہے ہو کل دیکھنا کہ اس بندہ کے غلام، ان غلاموں کے غلام قیصر وکسریٰ کے تخت الٹ دیں گے، روم وایران کی زبردست شہنشاہیاں زیر وزبر کر دیں گے اور مصر و

افغانستان، عراق وایران ترکی وہندوستان کے چمن وگلشن سبزہ زار وگلستان ان کے قدموں سے پامال ہوکر رہیں گے۔"

ایک سچا عاشق رسول اپنے قلم کی جولانیاں دکھانے اور جذبات قلبی کا اظہار اس والہانہ وعارفانہ انداز میں کرنے کے بعد اشارات وکنایات، تلمیحات واستعارات کو استعمال کرتے ہوئے رقمطراز ہے:

"کیسی بابرکت، کس کثرت سے برکت نازل کرنے والی، کس طرح دائمی ومسلسل برکت نازل کرنے والی وہ پاک ذات ہے جس نے تبارک الذی جعل فی السماء بروجا وجعل فیھا سراجا و قمرا منیراً آسمان میں ستارے اور روشن آفتاب اور اجالا کرنے والا چاند بنادیا جس پروردگار نے مادی رہنمائی وروشنی کے لئے سب کچھ سامان مہیا کردیئے ہیں کیا وہ اپنے بندوں کو روحانی روشنی ورہنمائی کے سامان سے محروم رکھے گا؟ آفتاب اسی وقت طلوع ہوتا ہے جب پہلے تاریکی اچھی طرح چھا چکی ہوتی ہے۔ دنیا کی روحانی تاریکی اب اپنی انتہا کو پہونچ چکی ہے۔ وقت آگیا ہے کہ سراج منیر، تمام عالموں کے روشن کردینے والے چراغ کا طلوع ہو، آفتاب جب طلوع ہوتا ہے تو اس کی تڑپ سے چاند بھی جگمگا اٹھتا ہے اور خود روشن ہوکر دوسروں کو روشن کردیتا ہے۔ اس آفتاب روحانی کی ضیاباری بھی اسی شدت وقوت کی ہوگی۔ اس کی شعاعیں دوسروں کو منور کرکے انہیں خود چاند کی طرح نورانی ونورافگن بنادیں گی۔ پھر یہ اس کارساز مطلق کا بنایا ہوا عام قانون فطرت ہے کہ رات اور وھو الذی جعل الیل والنھار خلفة لمن اراداں یذکر او اراد شکورا دن ایک دوسرے کے پیچھے آتے رہتے ہیں اور جن کے دلوں میں نصیحت قبول کرنے اور بندۂ شکرگزار بننے کی صلاحیت ہے ان کے درس کے لئے یہ قانون مادی بالکل کافی ہے جب عالم جسم ومادہ میں ہر رات کے بعد دن کا آنا لازمی ہے۔ تو کیا کائنات جان وروح میں ہمیشہ تاریکی ہی چھائی ہوئی رہے گی؟"

اس وقت کے حالات کا تقابلی موازنہ اور قانون فطرت کا حوالہ دیتے ہوئے آنے والے انقلاب کی تفصیل یوں بیان فرماتے ہیں:

"نفس پرستی وخدا فراموشی کی طویل شب دیجور کا ختم ہوکر رہنا لازمی تھا، وہ ختم ہوئی اور روحانیت کا آفتاب اصلاح وہدایت کا سورج طلوع ہوگیا۔ زندہ فرقان، اس زندہ فرقان کی

عظمت کو دیکھو۔ اس نے دیکھتے ہی دیکھتے تمہاری آنکھوں کے سامنے اخلاق کی دنیا میں کیا سے کیا انقلاب پیدا کر دیا۔ تم اس کے پیام میں طرح طرح کی حجتیں نکالتے ہو۔ سرے سے رحمٰن ہی کے وجود میں شک کر رہے ہو اور ڈھٹائی سے پوچھتے ہو کہ کون رحمان؟ سو اپنے اس ان دیکھے رحمٰن کی شان رحمت کو دیکھو۔ اس کی برکات رحمانیت کا مشاہدہ کرو کہ تمہاری ہی بنجر سرزمین سے، تمہاری ہی مردہ قوم سے، تمہارے ہی گرد و پیش کیسے کیسے بندۂ رحمٰن پیدا ہو گئے ہیں۔''

اور پھر رسول اکرم ﷺ کے فیض تربیت سے اخلاق و عادات، ادب و تہذیب، حلم و آشتی، صلح و نرمی اور اللہ کے بندوں اور اس کی مخلوقات کے ساتھ حسن سلوک کے نئے سانچوں میں ڈھلنے والے صحابۂ کرام کی تصویر کشی کس لب و لہجہ کے ساتھ فرماتے ہیں قابل غور و توجہ ہے:

''وہ لوگوں سے بات بات پر وعبادالرحمٰن الذین یمشون علی الارض ھونا و اذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلاماً۔ لڑنا، بلاوجہ الجھنا تو الگ رہا۔ صدیوں کی اس عادت اور پشتا پشت کی اس خصلت کو چھوڑ کر اب اس قدر خاکسار و مسکین ہو گئے ہیں کہ ہاتھ پیر کی زیادتیوں اور بات چیت کی سختیوں کا ذکر نہیں، ان کی رفتار تک ان کی فروتنی اور حلم پر گواہی دے رہی ہے اور از خود تو اب کسی سے کیا چھیڑ چھاڑ کریں گے جب دوسرے اپنی نادانی و سفاہت سے، اپنی شرارت و خباثت سے انہیں چھیڑتے ہیں۔ ان کی دلآزاری کے لئے ان پر اعتراضات کرتے ہیں تو اس کے معاوضہ میں بھی ان کی جبین تحمل پر شکن نہیں پڑنے پاتی بلکہ حلم و آشتی اور صلح و نرمی کے لہجہ میں ان سے اپنی سلامتی چاہتے یا ان کے حق میں سلامتی کی دعا کرتے گذر جاتے ہیں۔''

صحابۂ کرام کی زندگی میں کیسا عظیم انقلاب آیا تھا۔ ان کا ماضی کیا تھا اور حال کیا ہو گیا تھا۔ رسول اللہؐ کے انداز تربیت کے فیضان کو یوں بیان فرماتے ہیں:

''ابھی کل کی بات ہے کہ ساری ساری رات شراب خوری، ناچ رنگ اور بے حیائی کے دوسرے مشغلوں میں کاٹ کر صبح کر دیتے تھے، پر آج وہی خدائے رحمٰن کے بندے ہیں والذین یبیتون لربھم سجدا و قیاما جو یہی نہیں کہ اپنے ان گندے مشغلوں سے یکسر تائب ہو چکے ہیں بلکہ اب ان کی پوری پوری راتیں نماز و عبادت کی، دعا و قرآن خوانی کی اور تہجد کے سجود و قیام کی نذر ہونے لگی ہیں اور کچھ یہ نہیں کہ یہ کسی کے ڈر اور دباؤ سے کسی کی مروت میں یا ریا و نمائش کی غرض سے کر رہے ہوں۔ بلکہ قانون پاداش عمل کی ہیبت ان کے دلوں پر طاری ہو چکی ہے والذین یقولون

ربنا اصرف عنا عذاب جهنم ان عذابها کان غراماً، انها ساءت مستقراً و مقاماً، پر بدی کے نتیجۂ بد کا خوف ان پر غالب آچکا ہے۔ اور آخری شر رگاہ دوزخ کی سختیاں ان کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے پاتیں اس لئے بکمال خلوص وخضوع اپنے پروردگار سے دعا کرتے رہتے ہیں کہ ان سے انہیں محفوظ رکھے اور جس پر اس قدر ہیبت الٰہی غالب ہوگی وہ لازمی طور پر اپنی زندگی کے ہر ہر جزئیہ میں نیکی و نیک کرداری، تقویٰ و حسن عمل کی ٹوہ میں برابر لگا رہے گا بس یہ نیک و برگزیدہ بندے والذین اذا انفقوا لم یسرفوا ولم یقتروا و کان بین ذٰلک قواما بھی محض حقوق اللہ کی ادائی میں ہی مستعد نہیں بلکہ حقوق العباد کے ادا کرنے میں بھی ویسے ہی محتاط و ذوق شناس ہیں۔ چنانچہ خرچ کے معاملہ میں یہ گناہوں میں خرچ کرنے سے رکے رہتے ہیں عیاشی میں یہ نہیں خرچ کرتے۔ شراب خواری میں یہ پیسہ نہیں برباد کرتے۔ نام و نمود کے لئے یہ اپنی ہتھیلیاں نہیں کھولتے اور جب طاعت میں خرچ کرنے کا وقت آتا ہے، جب غریبوں اور بیکسوں کی امداد کا وقت آتا ہے، جب اللہ کے نام پر پیسہ لگانے کی ضرورت پڑتی ہے تو اس وقت ان کا ہاتھ نہیں رکتا۔ اس وقت یہی سب سے بڑھ کر خرچ کرنے والے نکلتے ہیں اور اس طرح ان کے مصارف، اسراف و بخل دونوں برائیوں سے بچ کر ٹھیک اپنے صحیح موقع اعتدال پر ہیں۔"

صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی زندگیوں اور سیرتوں میں آنے والا یہ انقلاب ظاہر ہے رسول اکرم ﷺ کے طرز تربیت کا اعجاز تھا اور آپ کی ذات "زندہ فرقان تھی"۔ مولانا فرماتے ہیں:

"زندہ فرقان" کا اعجاز یہ تھا کہ اس زہریلی فضا اس ربائی ماحول میں بھی اپنے مرید بندگان رحمٰن کو ان وباؤں کے اثرات سے بالکل محفوظ کر دیا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو نہ خدا کے ساتھ کسی اور معبود کو پکارتے ہیں نہ ناحق کسی کو قتل کرتے ہیں اور نہ زنا کرتے ہیں اور جانتے رہتے ہیں کہ ان بداعمالیوں میں پڑنے والے کیفر کردار کو پوری طرح پہونچ کر رہیں گے۔ البتہ ان بداعمالیوں کے بعد جس نے انہیں برا سمجھ کر ترک کر دیا اور نیکی کے راستہ کو پہچان لیا اور پھر اسی راستہ پر چلا بھی، سو خدائے غفور و رحیم خواہ مخواہ تکلیف کسی کو نہیں دیتا وہ ان کی موجودہ نیکیوں سے ان کی پچھلی برائیوں کو محو کر دے گا اور ایسا ہوتا تو اس کے بنائے ہوئے قانون فطرت کے عین مطابق ہے اس لئے کہ جس کسی نے بدی کو بد سمجھ کر ترک کر دیا یا بالفاظ دیگر اس سے توبہ کر لی۔ اور اس کے بعد نیک عمل کرنے لگا تو اس کے معنی ہی یہ ہیں کہ اس نے شیطان سے اپنی دوستی منقطع کر کے اللہ سے اپنا رشتہ جوڑ لیا اور ٹیڑھے راستہ کو چھوڑ کر سیدھے راستہ پر پڑ گیا۔ اب تک ان کی زندگیوں کا سررشتہ جھوٹ اور

ناراستی، نمود ونمائش، ریا اور بناوٹ کے دامن سے وابستہ تھے۔ آج یہ دیکھتے دیکھتے اتنے پاک وصاف ہوگئے ہیں کہ خود جھوٹ بولنا اور جھوٹی کارروائیوں میں شریک ہونا تو درکنار، جھوٹی زندگی رکھنے والوں کے پاس تک نہیں پھٹکتے۔ جھوٹ اور تصنع ان کے شہود میں سرے سے آتا ہی نہیں اور اگر محض اتفاق سے کسی ایسے مجمع میں پھنس جاتے ہیں جو کسی لغو لایعنی مشغلہ میں مبتلا ہوتا ہے تو یہی نہیں کہ ان کے پاک نفوس ان شیطانی ترغیبات کی جانب سے بے رغبت رہتے ہیں بلکہ ان کے شیوۂ کریمانہ اور روش بزرگانہ کو دیکھ کر خود وہ جماعت متاثر ہوجاتی ہے۔ وہ زمانہ گذر گیا جب ان کے سامنے اللہ کی نشانیاں، اس کی قدرت وعظمت کی نشانیاں گزرتی رہتی تھیں اور یہ بہرے اور اندھے بنے ان کی طرف سے غافل اور بے خبر رہتے تھے۔ اب ان کے کان کھل گئے ہیں۔ ان کی چشم بصیرت روشن ہوچکی ہے اب دنیا ان کے لئے ایک تماشا گاہ نہیں بلکہ دارالعمل ہے۔''

یہ انقلاب کہاں سے کہاں پہونچ گیا۔ ضلالت وجہالت کی زندگی گذارنے والے بدوؤں کا طرز حیات اور انداز فکر کیا سے کیا ہوگیا۔ سچے عاشق رسول، سیرت نگار، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اس کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں:

''اب یہ نیکی اور بدی کے قانون کو، عمل وجزائے عمل کے اصول کو، رب رحمٰن ورحیم کے بتائے ہوئے سیدھے راستہ کو اچھی طرح سمجھ گئے ہیں خود ان کی زندگیاں تو اخلاقی بیماریوں کے جراثیم سے بالکل پاک ہوچکیں۔ اس منزل سے گذرنے کے بعد قدرتاً اب ان کے دل میں یہ تمنا غالب ہے اور یہ اس کی دعائیں کرتے رہتے ہیں کہ ان کے قریب ترین تعلق رکھنے والے ان کی بیویاں اور ان کی اولادیں ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک بن جائیں خود انہی کے رنگ میں رنگ جائیں ان کی زندگیاں بھی انہی کے نمونہ پر ڈھل جائیں اور دوسروں کو راہ راست دکھانے کا جوش انہیں اس درجہ بیتاب کئے ہوئے ہے کہ محض اپنی زندگی کے سدھارنے پر قانع نہیں بلکہ دوسرے متقیوں کے لئے اپنی زندگی کو بطور نمونہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اللہ اکبر! کمال روحانیت کی ترقی کو دیکھنا یہی نہیں کہ خود اچھے بن گئے ہیں۔ یہی نہیں کہ دوسرے اچھوں کے ساتھ ہوں گے بلکہ اس مرتبہ کی تمنا اور طلب کہ دوسرے پاکوں اور اچھوں کی پیشوائی اور امامت حاصل ہوجائے جس کو سارے متقی مل کر اپنا امام ومقتدا تسلیم کریں۔ اس کے مرتبۂ کمال، اس کے ارتقاء روحانیت کا کچھ ٹھکانا ہوسکتا ہے۔ اس کی زندگی جو دوسرے کاملوں کے لئے نمونہ کا کام دے سکے خود کس درجہ کامل ہوگی؟''

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ پر عشق رسول اور فدائیت ووارفتگی کا اس قدر غلبہ ہے کہ رو رو کر

والہانہ انداز میں آپ کی سیرت کے مختلف پہلوؤں کو پیش کرتے اور آپ کی سیرت مبارکہ و حیات مقدسہ کا طرح طرح سے نقشہ کھینچتے ہیں۔ آپ کی تربیت کے فیضان سے آنے والی تبدیلی کی ایک جگہ اس طرح نقشہ کشی فرماتے ہیں:

زمین خشک اور پیاس بڑی ہوتی ہے۔ بارش کے فیض سے افسردہ چمن لہلہانے لگتا ہے۔ مردہ کھیتی میں جان پڑ جاتی ہے۔ سویا ہوا سبزہ جاگ اٹھتا ہے، باغ سنسان پڑا ہوتا ہے۔ پتیاں مرجھا مرجھا کر گر چکتی ہیں۔ بہار کی ہوا چلتے ہی نئی اور ہری پتیاں نکل آتی ہیں اور اجڑا ہوا باغ پھر سرسبز و شاداب ہو جاتا ہے۔ عالم پر شب کی سیاہی چھائی ہوتی ہے۔ ہر شئے تاریکی میں گم ہوتی ہے۔ صبح کے طلوع ہوتے ہی ہر طرف اجالا پھیل جاتا ہے اور ہر ذرہ روشن ہونے لگتا ہے۔ ایک پاک روح دنیا میں اصلاح و تزکیہ کے لئے آتی ہے اور اپنے فیض صحبت سے بہت سے اندھوں کو بینا، بہت سے بیماروں کو تندرست اور بہت سے مردوں کو زندہ کر دیتی ہے۔ کارخانہ فطرت میں اس قانون فطرت کی نظیریں برابر ملتی رہتی ہیں۔ لیکن دنیا میں یہ انقلاب روحانی پیدا کر دینا کہ کل تک جو راہزن تھے وہ آج اچھے رہرو ہی نہیں بلکہ بہترین امیر بھی ہو جائیں۔ کل تک جن کی زندگی فسق و فجور کی نذر تھی آج وہ اتنے بلند و مقدس مرتبہ پر پہونچ جائیں کہ صداقت و پاکیزگی کو ان کے انتساب سے شرف ہو جائے کل تک وہ جو مردہ تھے وہ آج زندہ ہی نہیں بلکہ دوسروں کو زندہ کر دینے والے بن جائیں ایسے آفتاب کا طلوع جو ہر ذرہ کو آفتاب بنا دے۔ ایسے مسیح کا نزول جو مردوں کو مسیح بنا دے اس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں بجز سرور عالم کے صحابیوں، بجز محمد کے غلاموں کے اور کہیں بھی مل سکتی ہے۔''

بعض مستشرقین اور اسلام مخالف مغربی مصنفین کے اس بیان کو پیغمبر اسلام نے کوئی معجزہ نہیں دکھایا۔ پرزور انداز میں رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''یہ پاک زندگی تو شروع سے آخر تک خود ایک معجزہ تھی اور اس کا کوئی جزئیہ ایسا نہ تھا جو اپنے اندر ایک اعجازی رنگ نہ رکھتا ہو۔ اس ''زندہ فرقان'' کے ان زندہ معجزوں کے ہوتے ہوئے کشتی نوح، گلزار خلیل، عصائے موسیٰ، تخت سلیمانی، حسن یوسف، دم عیسیٰ، کسی محدود، وقتی و مقامی معجزہ کی کچھ بھی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی نہ اس وقت راز تھی نہ آج راز ہے۔ ابولہب و ابوجہل اور ان کے سارے ہمنشینوں نے اس وقت دیکھا کہ بدبودار اور

پر عفونت کھاد گملے میں پڑی اوران کی آنکھوں کے سامنے شاداب وخوش رنگ مہکتے ہوئے گلاب کے پھول میں تبدیل ہوگئی۔ حق کی قوت ہر تر دید وتغلیط کے خطرہ سے بے پرواہے زندہ معبود کے زندہ رسول کے زندہ معجزہ کا جواب نہ اس وقت بن پڑا نہ آج حق کے جھٹلانے والوں، محمد کے دشمنوں اورابولہب وابوجہل کے موجودہ جانشینوں میں سے کسی کے بس کی بات ہے۔

عشق رسول کے غلبہ اور ایمان کی قوت ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ آپ کی نظر میں کوئی دوسرا رہبر مصلح، انقلابی رہنما اس محبوب ومعشوق کے مقابلہ میں جچتا ہی نہیں اور آپ ربع مسکون کے چپہ چپہ پر، وقت، زمانہ اور تاریخ کے ایک ایک لمحہ پر اس عظیم ہستی کی عظمت کے ترانے گاتے اور نقش ثبت کرتے چلے جاتے ہیں۔ تاریخ کا کون سالمحہ اور زندگی کا کون سا پہلو ہے، جس کے گوشہ گوشہ میں جھانک کر آپ نے نہیں دیکھا مگر جہاں دیکھا ہر جگہ اسی محبوب ومعشوق کی عظمت کی نشانیاں نظر آئیں۔ جو لاکھوں کے سردار کروڑوں کے پیشوا ہیں وہ بھی اسی آستان پاک کی جاروب کشی پر فخر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس لئے مولانا دریابادیؒ فرماتے ہیں:

''کروڑوں نہیں تو اللہ کے لکھوکھا بندے یقیناً ایسے ملیں گے جو اپنی نجات اور اپنی عقبیٰ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی ذات سے وابستہ سمجھ رہے ہیں۔ اور آج ہی نہیں سیکڑوں برس سے سمجھتے چلے آرہے ہیں۔ عقیدہ کی صحت وغلطی سے یہاں بحث نہیں۔ مقصود نفس واقعہ کا اظہار ہے۔ ان کی زبانوں پر نام ہے تو غوث اعظم کا اور دلوں میں اعتقاد ہے تو محبوب سبحانی کا۔ لیکن ذرا سوچ کر بتائیے کہ شیخ اور ان کے سارے پیش رو اور پس رو حسن بصری اور جنید بغدادی، خواجہ اجمیری اور سید احمد سرہندی، نظام الدین اور علاؤالدین صابر کلیری ناز اں کس شے پر ہیں؟ اپنی سروری اور سرداری پر یا عرب کے امی کی غلامی اور مکہ کے یتیم کی چاکری پر؟ اللہ اللہ جو خود لاکھوں کے سردار اور کروڑوں کے پیشوا، انہیں اگر فخر ہے تو صرف اس کا کسی آستان پاک کے جاروب کش ہیں اور بس! دنیا میں اب تک بڑے بڑے جوگی اور رشی راہب اور اہل ریاضت گزرے ہیں یہ امتیاز اور یہ اعزاز کسی اور کے حصہ میں آئی ہے؟ کسی کے خادموں میں بھی ایسے ایسے آفتاب اور ماہتاب اور وہ بھی اس کثرت سے ہوئے ہیں؟''

احادیث رسول کو حفظ کرنے یاد کرنے اور جمع کرنے ان کی تنقیح وتنقید تحقیق اور تشریح میں کیسے کیسے لوگوں نے اور کیوں اپنی زندگیاں بسر کیں۔ مولانا دریابادیؒ کی نظر عاشقانہ ان سب کو

کس طرح دیکھتی ہے آپ بھی ملاحظہ فرمائیں اور لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے ایمان کی تازگی اور تقویت کا سامان فراہم کیجئے لکھتے ہیں:

''امام بخاریؒ کے مرتبہ وعظمت سے کون ناواقف ہے؟ ان کی کاوش وتحقیق کی نظیر کیا کسی ملک کسی قوم میں ملتی ہے؟ پھر انہوں نے اور انہی کی راہ پر دوسرے صدہا چلنے والوں نے امام مسلم نے، امام مالک نے، امام ابوداؤد نے، امام ترمذی نے، امام نسائی نے، اپنی ساری ساری عمریں کس شغل کی نذر کردیں؟ محض ایک امی ہی کے اعمال واقوال کے جمع کرنے میں! اور عسقلانی اور عینی، قسطلانی اور طیبی، سخاوی اور شوکانی، قاضی اور نووی اور ان جیسے سیکڑوں دوسروں نے اپنی زندگیوں کو کس چیز کے لئے وقف کر رکھا ہے؟ اس امی کے اقوال کی شرح وتفسیر اور اس کی جانب منسوب الفاظ کی تنقیح وتنقید کے لئے! ابن جوزی اور ابن تیمیہ اور ابن قیم، ان کی ساری زندگیوں کی تحقیق وتدقیق کا خلاصہ کیا ہے؟ بس اسی قدر نہ کہ فلاں فلاں بدعتیں اس امی کی سنت کے مخالف ہیں اور فلاں فلاں اقوال اس کی جانب منسوب کرنا اس پر افترا کرنا ہے۔ اس پردۂ عالم پر ایک سے بڑھ کر ایک عالم وفاضل، حکیم وفلسفی، ادیب ومہندس پیدا ہوچکے ہیں دنیا نے اب تک ان میں سے کسی کے ساتھ اس کا نصف بھی اعتنا کیا ہے؟ کسی فلاطون، کسی سقراط، کسی ارسطو، کسی نیوٹن، کسی کیپلت، کسی ڈارون کے اقوال وملفوظات اس کاوش کے ساتھ جمع کئے گئے ہیں؟ کسی کا ایک ایک فقرہ، ایک ایک قول، ایک ایک لفظ اتنی سخت جرح اور ایسی ایسی موشگافیوں کے بعد پاکوں کے واسطہ سے اور سچوں کی شہادت سے یوں سلسلہ بہ سلسلہ منقول ہوکر پہونچا ہے؟''

پیروکار، عاشق زار، روشن خیال، علم دوست، تحقیق پسند، حقیقت طراز، سیرت نگاروں نے رسول اکرم ﷺ کی سیرت نگاری کو اپنا مشغلہ بنایا۔ یہ تاریخ کا اہم ترین حصہ ہے۔ عاشق رسول سیرت نگار اس سلسلہ میں کیا تبصرہ فرماتے ہیں ملاحظہ فرمائیں:

''ابن اسحاق اور ابن ہشام، سہیلی اور زرقانی، ابن سعد اور قاضی عیاض، دمیاتی اور مغلطائی اور ان کے صدہا شاگردوں اور رفیقوں کے ضخیم مجلدات آپ کی نظر سے اگر نہیں گذرے نہ سہی ان کے ناموں کی شہرت تو یقیناً آپ کے کانوں تک پہونچ چکی ہوگی۔ ان کا مشغلہ زندگی کیا رہا؟ یہ کاہے میں جئے اور کاہے میں مرے؟ اس امی معلم کائنات کی سیرت کا ایک ایک گوشہ محفوظ رکھنے میں اس کی کتاب زندگی کی ایک ایک سطر حفظ کرنے میں اور محض یہی نہیں روشن خیال میور اور علم دوست مارگولیس، تحقیق پسند کارلائل اور حقیقت طراز دلیاوس کو کس کے سوانح نویسوں کی صف

میں شمار ہونے کی آرزو یہ قرار کیے ہوئے ہے؟ دنیا میں بڑے بڑے گردن کش بادشاہ اور تاجدار ہو چکے ہیں۔ کسی کی سیرت، اس تحقیق اور اس جزئی تفصیل کے ساتھ تاریخ کے صفحات میں کہیں بھی ملے گی؟ کسی فرعون، کسی نپولین، کسی سکندر، کسی زار، کسی قیصر، کسی دارا، کسی فغفور، کسی سلطان، کسی مہاراجہ، کسی ہز ہجسٹی کا اٹھنا بیٹھنا، چلنا، پھرنا، سونا، جاگنا، کھانا، پینا، ہنسنا، رونا، لیٹنا، بولنا اس جامعیت، اس استقصاء، اس تاریخیت اور اس اہتمام کے ساتھ کاغذ کے نقوش پر آج تک منتقل ہو سکا ہے؟''

کیسے کیسے لوگ رسول اللہ کے لائے ہوئے قانون کی شرح و تفسیر اور آپ کی بتائی ہوئی شریعت کے فروع کا حل اور جزئیات احکام کے استنباط کو اپنا مقصد زندگی سمجھتے رہے ہیں۔ عاشق رسول مولانا دریابادیؒ ان کو کس تصور اور نظر سے دیکھتے ہیں قابل توجہ ہے:

''امام ابوحنیفہؒ کے نام سے بچہ بچہ واقف ہے۔ کون دل ہے جو آپ کی عظمت سے خالی ہے؟ آپ خود الگ رہے ان کے شاگرد بلکہ ان کے شاگردوں کے شاگرد اس پایہ کے تھے کہ معاصرین نے انہیں امام وقت تسلیم کیا لیکن خود یہ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی، اور امام مالک اور امام احمد اور ان کے احباب و رفقاء و تلامذہ سفیان ثوری اور اوزاعی، ابو یوسف اور محمد، زفر اور حسن، حماد اور مزنی، طحاوی اور سرخسی اور صدہا ہزار ہا فقہا جواب تک ہو چکے ہیں۔ یہ آخر گروہ در گروہ انبوہ در انبوہ کرتے کیا رہے ہیں؟ اسی ان پڑھ کے لائے ہوئے قانون کی شرح و تفسیر اور اسی حرف ناشناس کی بتائی ہوئی شریعت کے فروع کا حل اور جزئیات احکام کا استنباط! دنیا میں آخر اور بڑے بڑے امیر، وزیر، قانون ساز، قانون گر، مدبرین سلطنت گذرے ہیں کیا ان میں سے کسی کو ایسے اور اتنے شارحین نصیب ہوئے ہیں؟ یونان، ہندوستان، مصر وغیرہ کو چھوڑ یئے۔ روم کو لیجئے کہ اس کا رومن لا آج خدا معلوم کتنے دماغوں کو مرعوب کیے ہوئے ہے۔ جو بسط و وسعت اسلامی فقہ کو حاصل ہے رومن لا غریب کو اس کا عشر عشیر بھی تو نصیب نہیں ہے۔''

رسولؐ خدا کے متوالے، عاشق اور جاں نثار و فداکار کو دنیا کی دنیا اسی رسول کی مداح، ثنا خواں اور عاشق و فداکار نظر آ رہی ہے۔ چنانچہ دنیا کی عقیدت مندی، ارادت و خلوص اور سوز و گداز کی تصویر کشی یوں فرماتے ہیں:

''مثنوی شریف آج بھی کتنے دلوں کو مست کیے ہوئے اور کتنی محفلوں کو گرمائے ہوئے

ہے، یہ مولانائے رومی اور خواجۂ حافظ، سعدی شیرازی اور نظامی گنجوی، خسرو اور جامی، سنائی اور عطار صدیوں سے کس کے نام پر سردھن رہے ہیں؟ کس کے پیام کی ترجمانی کررہے ہیں؟ کس بڑے کا سہارا پکڑ کر خود بھی بڑے بن چکے ہیں؟ وہی بادیہ عرب کا بوریہ نشین جو شاید شعر موزوں پڑھ بھی نہیں سکتا تھا اور جس کے لئے شاعری موجب فخر نہیں باعث ننگ تھی وماعلمناہ الشعر، وماینبغی لہ، دنیا کے بڑے سے بڑے شاعروں نے آج تک کس کا اس طرح استقبال کیا ہے؟ کس بادشاہ کی شان میں اس عقیدت قلب کے ساتھ، اس ارادت وخلوص کے ساتھ اور اس سوز وگداز کے ساتھ قصائد لکھے ہیں؟ کسے یوں بے تاب ہو ہوکر پکارا ہے؟ ہومر کے، امرؤ القیس کے، فردوس کے، والمیک کے، شیکسپیر کے، ملٹن کے، گوئٹے کے، کالیداس کے، کسی خطہ اور کسی زمانہ کے شاعر کے نام کو، پیام کو، کلام کو، یہ مقبولیت، یہ مرتبہ نہ سہی اس کا آدھا، چوتھائی، دسواں حصہ بھی نصیب ہوا ہے؟''

بڑے بڑے بہادر، سلطان، حکمراں اصحاب جاہ وحشمت بادشاہ، جاں نثاری اور ایثار وقربانی کے بڑے سے بڑے پیکر رسول اللہ ﷺ کی پابوسی اور آپ کے آستانہ پر جبیں سائی کو اپنے لئے معراج کمال اور وسیلۂ نجات سمجھتے رہے ہیں۔ان پروانوں کی حالت کو یہ عاشق رسول اس طرح بیان فرماتے ہیں:

''عمر فاروق اور علی مرتضٰی کے نام سے کیسے کیسے سورماؤں کے کلیجے دہل دہل کررہے خالد سیف اللہ کی شمشیر اور ابن عاص کی تدبیروں نے پتھروں کو پانی کرکے بہادیا۔لیکن یہ سب خود کس شمع کے پروانے تھے؟ کس کے آستانہ پر جبیں سائی سے رفعتیں اور بلندیاں حاصل کرتے رہے؟ ہارون اور مامون، سلجوق اور دیلم، غزنوی وغوری، تیمور وبایزید، عثمان وسلیم، طارق وقاسم، لودھی وخلجی، تیمور وبابر، ہمایوں وجہانگیر، شاہجہاں اور اورنگ زیب کس کی خاک بوسی کو سدا اپنے لئے معراج کمال اور وسیلۂ نجات سمجھے؟ دکن کا موجودہ صاحب سریر کس کے اشتیاق وتمنا میں گرم آنسو بہاتا اور سرد آہیں بھرتا رہتا ہے؟ بے سروسامان ریفیوں نے کس کے دین کی غیرت میں اسپین اور فرانس دو دو سلطنتوں کا چیلنج قبول کرلیا؟ انور نے کس کی امت کی خاطر جان تک نذر کردی؟ محمود الحسن کو کس کے نام کی عزت وناموس نے دردر پھرایا؟ گھر سے بے گھر کرایا؟ نظر بند کرایا؟ محمد علی کس کی امت کے غم میں دیوانہ وار جلاوطن ہوا، نظر بند ہوا جیل میں کئی کئی سال کاٹے سب کے جواب میں ایک بار پھر اس عبداللہ کے لخت جگر اور آمنہ کے نور نظر کا نام لیا جائے گا؟ یا

کسی اور کا؟"

علم اسرار دین اور معالجۂ امراض نفسانی پر دفتر کے دفتر تیار کر دینے والوں اور نبی امی کے لائے ہوئے دین کی حمایت ونصرت اور اس کی تبلیغ وترویج کو اپنی زندگی کا حاصل اور لب لباب سمجھنے والوں کا ذکر یوں فرماتے ہیں:

"غزالی کی تصانیف پر خود انہیں رشک آگیا ہے جن پر ہم آپ دن رات رشک کرتے رہتے ہیں بہ قول جارج ہنری ریکس صاحب تاریخ فلسفہ کے۔ اگر غزالی کی تصانیف کا ڈیکارٹ کے وقت تک ترجمہ ہو گیا ہوتا تو لوگ ڈیکارٹ کے فلسفہ کو غزالی کا سرقہ ہی سمجھتے۔ یہ غزالی اور ان کے آثار قدم پر چلنے والے شاہ ولی اللہ دہلوی اور حکیم الامت اشرف علی تھانوی وغیرہم نے علم اسرار دین اور معالجۂ امراض نفسانی پر خود دفتر کے دفتر تیار کر دیئے ہیں ان کا حاصل اور لب لباب کیا ہے؟ بس اسی نبی امی کے لائے اور پھیلائے ہوئے دین کی حمایت ونصرت اور اس کی تبلیغ وترویج، ابوالحسن اشعری اور ابوبکر باقلانی، رازی اور آمدی، نسفی اور جرجانی نے عقائد وکلام میں تصانیف کا جو انبار لگا دیا اور ان کے جانشین جس طرح ہر دور میں پیدا ہوتے رہے یہاں تک کہ آج چودھویں صدی ہجری کے وسط میں بھی جو کام ہو رہا ہے اس پایہ کا علم کسی شخصیت کے اردگرد پیدا ہو سکا ہے؟ کون سی تاریخی ہستی اتنا زبردست اور اس قدر وسیع کلامی لٹریچر پیدا کر سکی ہے؟"

عاشق رسول نے عشق رسول میں بے شمار سمندروں میں غواصی کی ہے اور اپنی ہی طرح شمع نبی امی کے پروانوں پر نظریں ڈالی ہیں اور اسی عشق ووارفتگی کے عالم میں ایک ایک کا تذکرہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ فرمایا:

"مفسرین کے نام اور ان کے کارنامے کس پر روشن نہیں؟ تابعین میں ضحاک اور قتادہ، مجاہد اور ابن زید نے معانی قرآن کی جو خدمت کی اس کا صلہ کس کے امکان میں ہے؟ ابن جریر کے تیس مجلدات کو کون بھول سکتا ہے۔ ابن کثیر کی کاوش وجستجو کی داد کون دے سکتا ہے۔ بیضاوی و زمخشری کی قدر کس کے دل میں نہیں۔ بغوی اور نسفی، ابن حیان اور ابو مسعود نے اپنی عمریں کس کی خدمت کے لئے وقف کر دیں۔ چشم تصور دیکھ رہی ہے کہ یہ سب اپنے اپنے مجلدات واسفار لئے ہوئے ایک امی کی خدمت میں دست بستہ اس کی نگاہ کرم کے منتظر کھڑے ہوئے ہیں اور ان کی بڑی سے بڑی آرزو ہے تو یہ کہ اس کے قدموں پر نثار ہو جائیں۔"

عربی زبان کی صرف ونحو، لغت معانی وبیان اور بدیع پر جو کام کرنے والوں نے کئے ہیں ان کا تعلق بھی مولانا اسی امی کے لائے ہوئے دین کی خدمت سے جڑا دیکھتے ہیں اس لئے فرماتے ہیں:

''نحو ولغت کی طرف آیئے تو ایک سے بڑھ کر ایک امام فن نظر آئیں گے۔ ایسے کہ جن پر خود فن کو ناز ہے۔ کسائی اور ابوالاسود دوئلی، خلیل اور سیبویہ، ابن مالک اور ابن حاجب، ابن درید وابن سیدہ، زمخشری ومطرزی، جوہری وفیروز آبادی، ابن منظور وزبیدی کسی نے صرف پر لکھا اور کسی نے نحو پر۔ کسی نے لغت کو اپنا موضوع رکھا لیکن ان تمام پردوں کے پیچھے مقصود اصلی سب کا کیا رہا؟ وہی دین کی خدمت، اسی کے لائے اور بتلائے ہوئے دین کی خدمت! کیا دنیا میں امیوں اور ان پڑھوں کو بھی مرتبے حاصل ہوا کرتے ہیں؟ امیوں کو چھوڑ یئے جو زیادہ سے زیادہ پڑھے لکھے گزرے ہیں۔ کیا ان میں سے کسی کو بھی ایسے شارح، ایسے ایسے خادم نصیب ہوئے ہیں؟ معانی وبیان اور بدیع پر لکھنے والوں کی تعداد اس فہرست پر مستزاد۔''

فلسفہ کو یونان کی دین اور الحاد کا ذریعہ وغیر اسلامی سمجھا وقرار دیا جاتا ہے لیکن عاشق رسول جو خود نبی امی کی زلف کا اسیر ہے ہر کوئی اسی کی زلف کا اسیر نظر آتا ہے۔

''فلسفیوں کو لیجئے، فلسفی بھی بھلا کسی کے ہوتے ہیں؟ لیکن یہاں کیا ہے کہ ابن سینا وابن رشد، طوسی وفارابی، رازی وشیرازی، سب کے سب اسی زلف کے اسیر، سب کی عقیدتوں کے دامن امی کے بند نعلین سے وابستہ، کتنے علوم وفنون کے نام گنائے جائیں؟ زندگی کے کن کن شعبوں کو روشنی میں لایا جائے؟ قوت اور صولت کے کن کن پہلوؤں کو شمار کیا جائے؟ سرداروں اور ناموروں کے نام، شہادت میں کہاں تک پیش کئے جائیں کہ جملہ ترکان، جہاں ہندوئے تو!

مصر کے جامع ازہر، اور آزاد اسلامی ممالک کے مدرسوں کو چھوڑ یئے غلام اور بے نوا ہندوستان میں جہاں عربی کے سکہ کا چلن کسی بازار میں بھی نہیں یہ آخر ندوہ اور دیوبند کے سے عظیم الشان مدارس کس کا نام لئے ہوئے چل رہے ہیں؟ جامعہ ملیہ کس کی امت کی خدمت کی خاطر زندہ ہے؟ علی گڑھ آزادیوں کے دعوے کے باوجود کس کے دین وآئین کی پابندیوں پر نازاں ہے؟ ہندوستان کے چھوٹے چھوٹے قریوں اور موضعوں، عرب کے ریگستان اور چٹیل میدان اور افریقہ کے صحراو بیابان سے لے کر لندن اور پیرس اور برلن کے تمدن زاروں تک ہر روز، اور ہر روز

میں بھی پانچ پانچ بار کس کے نام کی پکار، اللہ کے نام کے ساتھ ساتھ بلند ہوتی رہتی ہے؟ اپنی ذاتی عقیدت مندی کو الگ رکھئے محض ایک خالی الذہن اور ناطرف دار اور تماشائی کی حیثیت سے محض واقعات پر نظر کر کے فرمائیے کہ یہ مرتبہ، یہ اکرام، دنیا کی تاریخ معلوم سے لے کر آج تک کسی ہادی، کسی رہبر، کسی مخلوق کو حاصل ہوا ہے؟ جس بے کس اور بے بس سے۔ عین اس وقت جب کہ اسے زور اور قوت والے سرداران قریش اپنے خیال میں کچل کر اور پیس کر رکھ چکے تھے اور اس کا نام ونشان تک مٹا چکے تھے۔ یہ وعدہ ہوا تھا ورفعنالک ذکرک ہم نے تیرے لئے تیرا ذکر بلند کر رکھا ہے اگر آوازہ اس کا بلند نہ ہوگا تو اور کس کا ہوگا؟ نام اس کا سرافراز اور سربلند نہ ہوگا تو اور کس کا ہوگا؟ بلندی ذکر کی یہ وہ تفسیر ہے جو اوراق لیل ونہار پر ساڑھے تیرہ سو برس سے ثبت چلی آرہی ہے چشم روزگار اسے صدیوں سے بڑھتی چلی آرہی ہے اور خدا معلوم کب تک اس طرح بڑھتی رہے گی۔ حشر کے دن عنداللہ، اس بندہ کا جو مرتبہ ہوگا، وہ تو ہوگا ہی، اس سے قطع نظر کر کے ذرا صرف اس مرتبہ کا تصور کیجئے جو محض اس بلندیٔ ذکر کے لحاظ سے اس روز حاصل ہوگا۔ فوج کی فوج، انبوہ در انبوہ، ادھر سے ملوک وسلاطین چلے آرہے ہیں ادھر سے بڑے بڑے نامور جنرل اور سپہ سالار، ایک طرف محدثین کرام جوق در جوق چلے آرہے ہیں اور دوسری طرف سے مفسرین عظام، اہل فقہ، اہل اصول، اہل کلام، اہل تصوف، اہل لغت، اہل سیر، اہل رجال، اہل نحو، اہل معانی، اہل بیان، اہل فلسفہ، اہل منطق، اہل اخلاق، جس فن کو بھی لیجئے اس کے ائمہ وماہرین ادب سے آنکھیں نیچی کئے، ہاتھ باندھے ہوئے خادمانہ انداز سے گرد وپیش حلقہ کئے ہوئے ہیں۔ ایک اسی انعام کی پوری وسعت کا تصور کس کے بس کی بات ہے؟''

مضمون کافی طویل ہو چکا۔ وقت بہت لے چکا، لیکن راقم السطور طبیعت سے مجبور ہے۔ ذکر رسول اکرم ﷺ کا ہے اور انداز بیان عاشق رسول اکرم ﷺ کا ہے جس گوشہ اور پہلو سے بھی نظر ڈالئے عاشق رسول کی زندگی تحریر وتقریر میں عشق رسول اور والہانہ رنگی کا عالم ہے۔ یہ حقیقت اور واقعہ ہے کہ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے قلم سے نکلنے والے نثری نعت کے پر کیف مضامین اس قابل ہیں کہ انہیں ہر وقت پیش نظر رکھا جائے، اور حرز جاں بنایا جائے جس سے ایمان کو تازگی اور روح کو کیف وسرور ملتا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ: ''منفرد لہجے کا ادیب''

ڈاکٹر ریاض احمد☆

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ بیک وقت منفرد ادیب، بے مثل صحافی، عظیم نقاد و محقق، بالغ نظر فلسفی و ماہر نفسیات، لازوال سوانح نگار، صاحب طرز طنز نگار اور باکمال مفسر قرآن تھے۔ ان کو صالح روایات، عصری رجحانات، ماحول اور معاشرے کے حالات اور زندگی کے مسائل ومعاملات کو سمجھنے، زمانے کے رنگ کو پہچاننے اور ان سب کو دل کش و دل نشیں انداز میں بیان کرنے پر قدرت حاصل تھی۔ قدرت نے ان کو بڑی فیاضی کے ساتھ ذہن رسا، فکر بلند، بہترین حافظہ اور منفرد ذوق ادب عطا کیا تھا۔ مثل مشہور ہے کہ ''ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات'' چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد اپنے اخبار الہلال میں ۱۳ر ستمبر ۱۹۱۳ء میں مولانا دریابادیؒ کے متعلق لکھتے ہیں:

''آج کے نوجوان تعلیم یافتہ اصحاب میں بعض اشخاص ایسے بھی ہیں جن کو عام حالت میں حق امتیاز واستثناء حاصل ہے اور ہماری مایوسیوں میں وہ اپنے اندر ایک نشانِ امید رکھتے ہیں۔ میں ان کی وقعت کرتا ہوں اور ان ہی چند لوگوں میں میرے عزیز دوست مسٹر عبدالماجد بی اے بھی ہیں مجھ کو یقین ہے کہ ان کا ذوق علمی اردو زبان کو انشاء اللہ بہت فائدہ پہنچائے گا۔''

یہ وہ زمانہ ہے جب عبدالماجد دریابادیؒ علی گڈھ اے، ایم، او کالج کی جانب سے ایم اے فلسفہ کا امتحان دینے الٰہ آباد یونیورسٹی گئے تھے کیونکہ اس وقت اے، ایم، او کالج ابھی یونیورسٹی کا درجہ حاصل نہیں کرسکا تھا۔ حالانکہ وہ اس امتحان میں ناکام رہے اور دوبارہ ایم اے کرنے کے لئے دہلی کے سینٹ اسٹیفن کالج میں داخلہ لیا ظاہر ہے عمر بیس اکیس سال کی رہی ہوگی۔ اور ناکامی کا غم اور اپنے والد کے انتقال کا رنج والم ابھی زائل نہیں ہوا ہوگا۔ لیکن ان سب دکھوں اور

☆ لکچرار کالج آف ایجوکیشن (مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی) سری نگر۔

ناکامیوں کے باوجود ایسی نثر لکھتا کہ یکتائے زمانہ انشاء پرداز مولانا ابوالکلام آزاد تعریف کئے بغیر نہ رہ سکے اور ان کی کی ہوئی پیشین گوئی صدفی صد درست ثابت ہوئی۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے ہشت پہلو سے اردو زبان وادب کو فائدہ پہنچایا اور اتنا پہنچایا کہ شاید کوئی جماعت یا انجمن ہی اتنا فائدہ پہنچا سکتی تھی۔

جون ۱۹۱۶ء میں مولانا کی شادی ہوئی، والد کا انتقال ہو چکا تھا، خرچ کا بوجھ بڑھا، روزگار کی تلاش ہوئی، صاحب زادہ آفتاب احمد خاں علی گڈھ نے ہمت افزائی کی اور کانفرنس میں بطور لیٹریری اسسٹنٹ منتخب کیا لیکن باوجود مناسب تنخواہ اور بلا معاوضہ رہائش نیز خاں صاحب کی شفقت وعنایت کچھ کام نہ آئی اور جی اچاٹ ہو گیا بہرکیف خرابیٔ صحت کا بہانہ بنایا اور لکھنؤ جاکر استعفا بھیج دیا۔ ۱۹۱۷ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کی بنیاد پڑی۔ دارالترجمہ کا قیام عمل میں آیا اور مولوی عبدالحق نے بحیثیت مترجم فلسفہ اچھی تنخواہ پر مولانا کا تقرر کیا۔ افتادیٔ طبع کی بے قیدی یہاں بھی رنگ لائی۔ جولائی ۱۹۱۸ء میں چھٹی لے کر لکھنؤ آئے اور استعفا بھیج دیا۔ غرض کہ ع

ٹیڑھا لگا ہے قط قلم سرنوشت کو

آٹھ دس مہینے بے کاری میں گزرنے کے بعد سرکاری مہمان کی حیثیت سے حیدرآباد تشریف لے گئے۔ (طوالت کی وجہ سے پورا واقعہ بیان نہیں کر سکتا) غرض کہ ایک سو پچیس روپے ماہوار تاحیات پنشن منظور ہوئی۔ صرف کام یہ تھا کہ اپنی تخلیقات کو سلسلۂ آصفیہ سے منسوب کر دینا تھا۔ اس سے اچھی صورت لکھنے پڑھنے کی اور کیا ہو سکتی تھی کہ قیام کی کوئی قید نہیں اور کام پر کچھ پابندی نہیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کو پڑھنے لکھنے کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ رسالہ ہو یا کوئی اخبار، کتاب یا اشتہار پڑھنا شروع کرتے تو آخیر تک پڑھتے۔ لکھنے کا دھن اور گن عمر کے بارہویں سال سے شروع کر دیا۔ شروع میں اودھ اخبار لکھنؤ میں مراسلے اور مضمون اپنے والد ماجد کے ڈر سے فرضی نام سے بھیجا کرتے تھے۔ آٹھویں جماعت میں تھے تو عیسائیوں کے جواب میں ایک کتاب مرتب کی۔ شروع میں مولوی محمد علی مونگیری بانی ندوہ کے ماہنامہ "تحفۂ محمدیہ" کانپور سے استفادہ کیا۔ مولوی احسان اللہ عباسی چریا کوٹی کی کتابیں خوب پڑھیں اور اب یہ عالم تھا کہ اودھ اخبار کے دائرے سے نکل کر "ریاض الاخبار" گورکھپور اور "اخبارالاسلام" امرتسر تک پہنچ گئے۔ پڑھنے

کا یہ عالم تھا کہ امیر الدولہ پبلک لائبریری اور کالج چھٹی کی وجہ سے جس دن بند ہوتا اس دن جی اداس ہوا تھا اور بے چینی میں کبھی یہ کتاب پڑھتے اور کبھی وہ کتاب۔ امرتسر سے نکلنے والے سہ روزہ ''وکیل'' نامی اخبار جو مسلمانوں میں سنجیدہ اخبار سمجھا جاتا تھا، میں ۱۹۰۸ء اور ۱۹۰۹ء میں دو طویل مضامین لکھے، ایک کا عنوان تھا۔ ''محمود غزنوی'' اور دوسرے کا ''غذائے انسانی'' ان مضامین نے اتنی دھوم مچائی کہ وکیل بک ایجنسی (امرتسر) نے انہیں رسالوں کی صورت میں شائع کردیا۔ عمر کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں کہ ۱۵؍۱۶ ارکی رہی ہوگی۔ انہیں رسالوں پر پہلے پہل عبدالماجد دریابادیؒ کے نام کے پہلے ''مولانا'' لکھا گیا۔ ۱۹۱۰ء ماہنامہ الناظر لکھنؤ میں مولانا شبلی کی ''الکلام'' پر ''تنقیدی نظر'' کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا اور بڑے چرچے میں رہے پھر کیا تھا؟ الناظر سے مستقل تعلق ہوگیا برسوں کچھ اپنے نام سے اور کچھ فرضی ناموں سے مضامین لکھتے رہے۔ اس کے بعد ادبی ماہنامہ ''ادیب'' الہ آباد میں الندوہ لکھنؤ میں ۱۹۱۲ء اور ۱۹۱۳ء میں کئی مضامین اور تراجم شائع ہوئے اب تو مضامین مراسلے ترجمہ لکھنا مستقل مشغلہ بن گیا اور روزی روٹی کا ذریعہ بھی۔

مولانا کا تعلق ''معارف'' سے تو تھا ہی اب اس کی ادارت بھی کرنے لگے۔ ۱۹۲۵ء میں اپنا ہفتہ وار اخبار ''سچ'' ظفر الملک علوی کی شرکت سے نکالا جو بعد میں ''صدق'' اور ''صدق جدید'' کے نام سے جانا گیا۔ مولانا محمد علی جوہر کے روزنامے ہمدرد کی ذمہ داری بھی ۱۹۲۸ء میں لے لی۔

فروغ اردو عبدالماجد دریابادیؒ نمبر بابت اگست تا اکتوبر ۱۹۷۷ء میں حکیم عبدالقوی دریابادیؒ نے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی ۶۲ تصنیفات کا ذکر کیا ہے جو مختلف مضامین پر مشتمل ہیں ان تصانیف میں فلسفہ اور سیرت پر ۱۲؍ کتابیں، ترجمہ پر ۵، تصوف پر ۳ سوانح پر ۴، سفرنامے ۲، ادبی تصانیف پر ۱۲، تفسیر پر ۱۰، حدیث پر ۲، اور مجموعۂ مضامین کی ۱۳؍ کتابیں شامل ہیں۔ لیکن ساہتیہ اکیڈمی دہلی کے ذریعے شائع ہونے والی مولانا کی بائیوگرافی میں ڈاکٹر سلیم قدوائی نے ان کی مجموعی کتابوں کی تعداد ۷۰ بتائی ہے میرا خیال ہے کہ اس میں مولانا کی انگریزی تصانیف بھی شامل ہیں۔

مولانا عبدالماجد کسی زمانے میں مسٹر عبدالماجد کہلاتے تھے۔ اس دور میں وہ اپنی فلسفیانہ تحریروں کے لئے کافی چرچے میں رہے اور اس دور کی یادگار کتابوں میں فلسفۂ جذبات اور فلسفۂ

اجتماع کافی مشہور ہیں جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ دیگر اخبارات ورسائل کے علاوہ مولانا نے ''سچ'' نام سے ایک ہفتہ وار اخبار نکالا یہ اخبار ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۳ء تک لگاتار نکلتا رہا۔ اس نے اپنے نام بدلے ''سچ'' سے صدق اور ''صدق جدید''۔ اس اخبار کے لفظوں کے پیراہن بدلنے سے مدیر کی تعلیمی لیاقت اور انشا پردازی میں نکھار کا پتہ چلتا ہے۔ اس اخبار کے پہلے صفحہ کی سچی باتیں، مقالے اور کتابوں پر تبصرے، سارے کا سارا مولانا کے زورِ قلم کا نتیجہ ہوتا تھا۔ ان اداریوں سے ان کی فن کارانہ صلاحیت اور انشا پردازی کے نمونے کی جھلک ملتی ہے۔ آپ بھی دیکھئے اور سر دھنیے۔ یہ پیراگراف جو ۱۹۳۱ء کے ہیں ملاحظہ فرمایئے:

''اگر آپ کا تعلق اونچے طبقے سے ہے تو کسی ''سرا'' میں ٹھہرنا باعثِ توہین لیکن کسی ہوٹل میں قیام کرنا باعث شرم نہیں حالانکہ دونوں میں کیا فرق بجز اس کے ہے کہ ''سرا'' مشرقی ہے دیسی ہے اور ہوٹل مغربی ہے، انگریزی وولایتی ہے۔ کوئی اگر یہ کہہ دے کہ ''سرا'' کے فلاں بھٹیارے سے آپ سے یارانہ ہے تو آپ اس کے منہ نوچ لینے کو تیار ہو جائیں لیکن فلاں ہوٹل کے منیجر سے آپ سے بڑا ربط ضبط ہے اسے آپ فخریہ تسلیم کرتے رہتے ہیں۔ حالانکہ ''سرا'' کے بھٹیارے اور ہوٹل کے منیجر کے درمیان بجز ایک کے دیسی اور دوسرے کے ولایتی ہونے کے اور کوئی فرق ہے؟ کسی مدرسہ میں آپ مدرس ہیں تو آپ حقیر ہیں ذلیل ہیں لیکن کسی کالج میں اگر آپ لکچرر یا پروفیسر ہیں تو معزز ہیں صاحب وجاہت ہیں حالانکہ اصل مفہوم کے اعتبار سے مدرس اور پروفیسر بالکل ایک چیز ہیں۔''

مولانا نے کسی کی شاگردی قبول نہیں کی لیکن جن مشاہیر زمانہ سے اثر قبول کیا بلکہ بہت کچھ سیکھا ان میں مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ اقبال، مرزا محمد ہادی رسوا، مولوی نذیر احمد، ریاض خیرآبادی، اکبرالہ آبادی، پنڈت رتن ناتھ سرشار، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا محمد علی جوہر، جواہر لال نہرو، گاندھی جی اور کئی دیگر دانشور شامل تھے لیکن مولانا پر جس ادیب کا سب سے زیادہ اثر رہا وہ مولانا شبلی ہی تھے۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کو ان سے بہت عقیدت تھی اور وہ مولانا شبلی کو استاد قبول کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ وہ اپنی ''آپ بیتی'' میں خود فرماتے ہیں۔

''پھر بھی اگر کسی کے لئے لفظ استاد کا اطلاق ہو سکتا ہے تو بلاشک وشبہ مولانا شبلی تھے، ان کا ممنونِ احسان دل کی گہرائیوں سے ہوں لکھنا لکھانا جو کچھ بھی آیا ان کی نقالی میں آیا برسوں ان کا

چربہ اتار تا رہا ہوں ان کے فقرے، ترکیبوں کی ترکیبیں نوکِ زبان تھیں۔"

عبدالماجد دریابادیؒ تصنیف برائے تصنیف کے کبھی قائل نہیں ہوئے بلکہ ان کا خیال تصنیف برائے تہذیب، تصنیف برائے سماجی بھلائی، تصنیف برائے مذہبی رواداری اور تصنیف برائے جمالیات تھا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

"ہر دور میں وہی لکھا جو اپنے خیال وعقیدہ کے مطابق تھا قلم سے وہی ٹپکا وہی چھاپا جو دل ودماغ کے اندر موجود تھا جب الحاد کی شامت سوار تھی تو رنگ ملحدانہ تھا جب اسلام کی حلقہ بگوشی از سرنو نصیب ہوئی تو وہی رنگ تحریر کا بھی ہوگیا کام اجرت پر کیا رائلٹی لی حسن تالیف یک مشت فروخت کیا لیکن اللہ نے ہر صورت میں مخالفتِ ضمیر کی بھٹی میں گرنے سے محفوظ رکھا"

جس موضوع پر مولانا عبدالماجد دریابادیؒ قلم اٹھاتے تو اپنی انفرادیت ضرور برقرار رکھتے۔ جس طرح کا موضوع ہوتا ویسا ہی طرز تحریر اختیار کرتے۔ مذہبی امور پر لکھا جانے والا مقالہ عالمانہ ہوتا جب کہ فلسفہ اور تحقیق پر جب بھی لکھتے فلسفی اور محقق کی شان برقرار رکھتے۔ جب صحافتی مضامین تحریر کرتے تو کبھی بھی سلاست و روانی کو برقرار رکھتے۔ غرض کہ جس طرح کے مضامین لکھتے اپنی انفرادیت کی چھاپ ضرور چھوڑ جاتے۔ پیچیدہ سے پیچیدہ اور خشک سے خشک مضامین میں بھی ان کی نثری دل آویزی قائم رہتی ہے۔ مولانا کبھی کبھی قافیہ پیائی اور کبھی مسجع عبارت سے بھی اپنے مضامین میں کام لیتے ہیں مگر مضمون کی دل آویزی پر کوئی حرف نہیں آتا۔ ایک بار آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس کی طرف سے استقبالیہ خطبہ دیا۔ چند جملے آپ بھی ملاحظہ فرمائیے:

"آئیے آئیے میری سرزمین پر مہمان کرام آئیے اور ایک زنانہ محاورہ میں جم جم آئیے، اور نزول فرمائیے میرے فرش پر ادب وصحافت کے عرش سے، دلی یا شاہ جہاں آباد سے، آگرہ یا اکبرآباد سے، پٹنہ یا عظیم آباد سے رام پور دارالسرور سے میسور سراپا نور سے، بھوپال دارالاقبال سے، بمبئی بندر سے کلکتہ ساحل سمندر سے، حیدرآباد فرخندہ بنیاد سے مدراس مینوسواد سے، گجرات معدن برکات سے۔"

عبدالماجد دریابادیؒ اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ تھے کہ کس طرح تحریر کو پرکشش بنایا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ تمہید، اختتام، الوداع، وفات وغیرہ پر جب مضامین قلم بند کرتے ہیں تو اس کی تفہیم کا خیال رکھتے ہیں، ان کے اسلوب کی امتیازی خوبی عبرت آفرینی بھی ہے اور تصوف

ومعرفت کی تصویر کشی بھی۔ انہوں نے انشائے ماجد میں مولانا محمد علی جوہر کی موت پر اپنے احساسات کا کچھ اس طرح ذکر کیا ہے لکھتے ہیں:

''شب برات ایک خیر و برکت والی رات ہے، کسے خبر تھی کہ یہ شب شب قیامت بھی بن سکتی ہے۔ مسلمان تو اس رات کو جاگ جاگ کر گزارتے ہیں۔ کون کہہ سکتا تھا کہ اسی رات کو ان کا نصیبہ سلا دیا جائے گا، زندگیاں مانگتے ہیں، صحتوں کے لئے گڑگڑاتے ہیں۔ کسے خیال تھا کہ عین اسی وقت وہ اٹھا لیا جائے گا جس کے وجود سے ملت اسلامیہ کا وجود تھا۔''

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے قلم نے انشائیہ نگاری کا جوہر بھی اپنے خاکوں میں دکھایا ہے ان خاکوں کو پڑھنے کے بعد سرور وانبساط کا احساس ہونے لگتا ہے اور قاری پر اس کا دل آویز اثر پڑتا ہے۔ معاصرین کے ایک خاکے میں تحریر فرماتے ہیں:

''ہر حال میں خوش رہتے اپنی کھال میں مست، جہاں پایا پڑ رہے۔ جہاں بھی جگہ پائے بیٹھ گئے یا لیٹ گئے۔ ایک بار میں لکھنؤ میں تھا کہ بیوی دریاباد میں سخت علیل ہوئیں خبر پاتے ہی میں پہلی گاڑی سے دریاباد روانہ ہو گیا مگر لکھنؤ کچہری کلکٹری میں ان سے ملتے ہوئے جانا نہ بھولا یہ ملے نہیں رقعہ لکھ کر ان کے نام چھوڑ آیا کہ ''خود تو دریاباد بھاگا جا رہا ہوں آپ جایئے اور آپ کے اللہ میاں'' کہہ سن کر میری بیوی کو دوبارہ زندگی دلوایئے، گھر پہنچا تو بیوی کو پورا افاقہ ہو چکا تھا۔''

''بہار کی بہار'' میں مولانا نے اپنے ایک میزبان کے ساتھ کسی اسپتال کا منظر پیش کیا ہے۔ کیا ہی شگفتہ بیانی سے کام لیا ہے جیسے کہ وہ منظر ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ کر محظوظ ہو رہے ہوں لکھتے ہیں:

''لق و دق اسپتال کی خوش منظری کا کیا کہنا نیچے دریائے گنگا برسات کے موسم میں خوب چڑھا ہوا اپنی پوری وسعتوں کے ساتھ موجزن، حدِ نظر تک وہی نظارہ اسپتال کی چھت سے دیکھئے تو دریا پر سمندر کا گمان گزرے اور پٹنہ بمبئی نظر آنے لگے اس اسپتال کی خوش سوادی سے متاثر ہو کر عجب نہیں جو بہت سے تندرستوں کے دل یہ تمنا پیدا کرنے لگیں؟ کاش بیمار ہی ہو کر ہمیں اس چھت سے یہ نظارہ کرنے کو ملے۔''

مختصر یہ ہے کہ ماجد کے اسلوب کی انفرادیت کا راز ان کی شخصیت، علم اور احساس کی انفرادیت میں مضمر ہے۔ انہوں نے اکیلے اردو نثر کو کتنے ہی اسالیب دیئے ہیں۔ ''مولانا کے فقروں کے ٹھاٹھ کسی بربط نواز کے تال سُر سے کم نہیں ہوتے اور ان کے لہجے کا زور اور معنویت کی اشاریت سونے پر سہاگہ کا کام کرتی ہے۔ ان کا طرز تخاطب اور جذبات کی لہریں نثر میں نظم کا کیف وسرور پیدا کر دیتی ہیں۔''

سید احتشام حسین نے درست لکھا ہے کہ ان کا اسلوب تنقید تاثراتی اور شخصی ہوتے ہوئے بھی اپنے اندر ایک استدلالی رنگ رکھتا ہے۔ بہت سے علمی کاموں سے قطع نظر مولانا دریابادیؒ اپنے ادبی اسلوب کی وجہ سے بھی زندہ رہیں گے۔

ماجد نے جس زمانے میں اپنے ادبی کیریر کا آغاز کیا متحدہ ہندوستان میں دو اکابر اپنے اسلوب کا سکہ بٹھا چکے تھے یا کم از کم بٹھا رہے تھے ماجد کی شخصیت کی انفرادیت نے ان دونوں حضرات یعنی ابوالکلام اور اقبال سے اثرات ضرور قبول کیے لیکن ان کا ضمیمہ کبھی نہ بنے۔ ان کے اسلوب پر ان کی اپنی متنوع علمی اور ادبی شخصیت کی چھاپ ہے۔ وہ اپنے اسلوب کے بانی بھی خود ہیں اور خاتم بھی خود۔

حیدرآباد کی چند ممتاز شخصیتیں اور ادارے

مولانا عبدالماجد دریابادی کی نظر میں

ڈاکٹر سید داؤد اشرف ☆

اردو کے صاحب طرز ادیب، نامور صحافی، جید عالم اور ممتاز مفسر مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی سابق ریاست حیدرآباد سے قریبی وابستگی رہی۔ انہوں نے دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ میں مترجم کی حیثیت سے ستمبر ۱۹۱۷ء تا اگست ۱۹۱۸ء گیارہ مہینے خدمت انجام دی تھی۔ اس ملازمت سے سبکدوشی کے بعد ریاست حیدرآباد نے ان کے نام علمی وظیفہ جاری کیا تھا جو ریاست حیدرآباد کے خاتمے کے بعد بھی انہیں ملتا رہا۔ اس کے علاوہ مولانا کو ان کی تصانیف کی اشاعت کے لئے بھی ریاست حیدرآباد کی جانب سے مالی امداد دی گئی تھی۔ میں مولانا کی ریاست حیدرآباد سے وابستگی کے ان پہلوؤں سے متعلق دو مضامین قلمبند کر چکا ہوں جو آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکائیوز اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ریکارڈ اور ان کی خودنوشت سوانح عمری ''آپ بیتی'' کے مواد پر مبنی ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ پہلی بار ۱۹۱۷ء میں حیدرآباد تشریف لائے تھے۔ جب کہ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ میں ان کا مترجم کی حیثیت سے تقرر عمل میں آیا تھا۔ اس کے بعد مولانا کا کئی بار حیدرآباد آنا ہوا۔ سابق ریاست حیدرآباد میں وہ آخری بار ایک خانگی تقریب میں شرکت کی غرض سے اکتوبر ۱۹۳۸ء میں حیدرآباد آئے تھے۔ ربع صدی بعد جب کہ ریاست تقسیم ہو چکی تھی اور آندھرا پردیش کی تشکیل عمل میں آ چکی تھی۔ مولانا دریابادیؒ ۱۹۶۳ء میں ایک بار پھر حیدرآباد آئے اور اس بار انہوں نے ۲۹ ستمبر تا ۱۶ اکتوبر اٹھارہ دن یہاں گزارے۔ مولانا نے اس سفر

☆ حیدرآباد (آندھرا پردیش)۔

حیدر آباد کی روداد تحریر کی تھی جو حکیم عبدالقوی دریابادی کی مرتب کردہ کتاب ''گیارہ سفر۔سیاحت ماجدی'' میں شامل ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس کتاب میں حیدر آباد کے سفر کے علاوہ دیگر شہروں کے سفر کی روداد بھی شامل ہے۔ حیدر آباد کے سفر کی روداد ''تاثرات دکن'' کے نام سے کتابی صورت میں بہادر یار جنگ اکیڈمی، کراچی پاکستان شائع کر چکی ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ بے باکی، حقیقت بیانی، راست گوئی، تیکھے طنز اور مخصوص رواں وسہل طرز تحریر کے لئے بڑی شہرت رکھتے ہیں۔ ان ہی خصوصیات کی وجہ سے ان کا سفر نامۂ حیدر آباد بھی غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سفرنامے کے مطالعے سے حیدر آباد کی چند اہم شخصیتوں اور اداروں کے تعلق سے ان کی بے باک رائے اور تاثرات جاننے کا موقع ملتا ہے۔

مولانا نے اس سفر حیدر آباد کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس مضمون میں اس کا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے۔ ان کا ۱۹۶۳ء کا سفر حیدر آباد علاحدہ نوعیت کا حامل تھا۔ اس سے پہلے وہ جس حیدر آباد کو دیکھ چکے تھے، وہ انقلابات زمانہ کی وجہ سے تبدیل ہو چکا تھا۔ اس بار مولانا کو نئے حیدر آباد کے تشکیل پانے کا شدت کے ساتھ احساس ہوا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''قدیم حیدر آباد سلطنت آصفیہ کی حسرت نصیب یادگار بے شک مٹ چکا لیکن جدید حیدر آباد بھی انڈین یونین کی اقبال مندی اور فیروز بختی کا پرچم لہراتا ہوا وجود میں آ گیا ہے۔ بیسوں محل اور حویلیاں جہاں اُجڑی ہوئی، لٹی ہوئی، گری ہوئی، گری پڑی، ٹوٹی پھوٹی دکھائی دیں وہیں پچاسوں نئی کوٹھیاں، نئے بنگلے، ہوٹل اور سینما گھر، کالج اور اسپتال، یہ دفتر اور وہ دفتر، جدت اور تازگی، سرسبزی اور شادابی کا حق ادا کرتے ہوئے بھی نظروں کے سامنے آ گئے! تخریب وتعمیر کی دوگونہ نیرنگیاں، نیرنگ فطرت کے ہر آنی کرشموں میں سے ہیں۔''

حیدر آباد پہنچتے ہی سب سے پہلے مولانا نے مرحوم مخلصوں، محسنوں، بزرگوں، عزیزوں اور دوستوں کی ابدی آرام گاہوں پر حاضری دی۔ اس سلسلے میں ان کا پہلا قدم بہادر یار جنگ کے مزار کی جانب اٹھا۔ مولانا نے بہادر یار جنگ کے بارے میں لکھا ہے: ''کیا شخصیت تھی اور کیا شخص تھا۔ اب ناواقفوں کو کیا بتایا جائے اور جو واقف ہیں انہیں کسی تعارف کی ضرورت نہیں۔ دین وملت کے لئے ساری زندگی وقف کئے ہوئے اور پھر جوش کے ساتھ ہوش کا غیر معمولی اور عدیم النظیر اجتماع! حیدر آباد کی مسلم اور نیم اسلامی سلطنت کا وجود ہی مشیت ربانی کو منظور نہ تھا کہ

ایسے کلے ٹھلے کے توانا وتندرست کو یک بیک ایسے سن میں اٹھالیا جب کہنا چاہئے کہ وہ جوان ہی تھے ورنہ اس افراتفری اور اس ہولناک بربادی کی نوبت ہی کیوں آنے پاتی۔'' مولانا خطیرہ (قبرستان) پہنچے، دروازہ مقفل تھا اس لئے صرف جالیوں سے اندر کا کچھ نظارہ کر سکے۔ ان کے قلب نے لطافت وحلاوت کے ساتھ ساتھ شاہانہ وقار وہیبت کی بھی کیفیت محسوس کی۔ مولانا نے فاتحہ پڑھی۔ لکھتے ہیں: ''فاتحہ کیا پڑھی یہ کہیے کہ درد دل کی تھوڑی سی داستان دہرادی۔ عرض ومعروض عالم تخیل میں کچھ اس قسم کی رہی۔ بہادر سردار! عین ایسے نازک وقت اپنی خستہ قوم وملت کو بے سہارا چھوڑ کر کہاں چلے گئے۔ یہی تو خاص وقت مخلصانہ، حکیمانہ، دلیرانہ رہنمائی کا تھا۔ ہمارا حقیقی رہنما تو وہ تھا جو سبق جنگ بدر اور صلح حدیبیہ دونوں کے دے گیا۔ تم اس ہادی بے خطا کے نقش قدم پر چلنا اپنے لئے مایۂ افتخار سمجھے ہوئے تھے۔ تم ہوتے تو اپنی مومنانہ فراست سے ادھر حیدرآباد کو سنبھالے رہتے اور اُدھر مسلم لیگ کے بھی بہترین مشیر ہونے کی حیثیت سے پاکستان کو بھی ابتری کی راہ پر نہ پڑنے دیتے، لیکن خدائے بے نیاز سے کس کو مجال گلہ شکوہ کہ عین وقت پر تمہیں کو اٹھالیا! اپنی ملت کی پستی وندامت کو یقیناً وہاں بھی نہ بھولے ہوگے۔ خون کے آنسو اس کے حالِ زار پر بہا رہے ہوگے اور جنت برزخی کی ساری نعمتوں، راحتوں، لذتوں کے باوجود یہ کانٹا دل میں برابر کھٹک ہی رہا ہوگا۔''

بہادر یار جنگ کے علاوہ مولانا نے احمد محی الدین مبرر ہبر دکن، سید امین الحسن بسمل موہانی، ناظم سالار جنگ اسٹیٹ اور ہوش یار جنگ وغیرہ کے مزاروں کی بھی زیارت کی۔

مولانا نے ''حیدرآباد کی صحافت'' کے زیر عنوان لکھا ہے کہ رہنمائے دکن اب دکن کا ایک معروف ومقبول روزنامہ ہے۔ اس کا نقش اول رہبر دکن کے نام سے معیار حال کے مطابق نکلا تھا جو اپنی زندگی کے ہر دور میں اپنے فرائض انجام دیتا رہا اور جہاں تک مسلمانوں کی نمائندگی کا تعلق ہے اپنی سنجیدگی، معقولیت، میانہ روی اور اسلامیات کا نقش دوسروں کے دل پر بٹھائے ہوئے ہے۔ روزنامہ ''سیاست'' کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ دوسرا قابل ذکر روزنامہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''اس کے مدیر عابد علی خاں صاحب سے بھی نیاز حاصل رہا۔ خاصا سنجیدہ، شریفانہ دپُر معلومات پرچہ ہے اور بڑی بات یہ ہے کہ اپنا ظریفانہ کام خوب سنبھالے ہوئے ہے ورنہ لوگ ظرافت اور توہین، دل آزاری اور پھکڑپن کے درمیان فرق ہی نظر انداز کر جاتے ہیں''۔

روز نامہ ''سیاست'' کا ظریفانہ کالم ''شیشہ و تیشہ'' اس وقت مجتبیٰ حسین لکھ رہے تھے۔ مجتبیٰ حسین نے یہ سلسلہ ۱۹۶۲ء میں شروع کیا تھا۔ ان کے کالم کے بارے میں مولانا عبدالماجد دریابادی کی رائے سند رکھتی ہے۔ مولانا نے روز نامہ ''ملاپ'' اس کے ایڈیٹر یدھ ویر جی اور روز نامہ ''صحیفہ'' کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

اردو صحافت، اردو زبان اور اردو کلچر کے بارے میں مولانا کے یہ خیالات بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتے ہیں کہ اردو صحافت محض اردو زبان کی صحافت نہیں اردو کلچر کی مظہر و ترجمان ہے۔ اردو محض ایک زبان کا نام نہیں، اردو کلچر یا تہذیب خود ایک مستقل چیز ہے۔ اردو تہذیب کا آئینہ ہے اور اس آئینہ کی ساری جلا صرف ایک لفظ شرافت کے اندر مضمر ہے۔ حیدرآبادی تہذیب لکھنوی تہذیب اسی جوہر شرافت کی یادگار تھی۔ وہ جب مٹتی ہے تو ہر شریف کو اس کے مٹنے کا رنج ہوتا ہے اور جب اس تہذیب کا جنازہ اٹھتا ہے تو ماتم داروں میں سب سے آگے شرافت ہی ہوتی ہے۔

حیدرآبادیوں کی محبت اور ان کی مہمان نوازیوں کے بارے میں مولانا لکھتے ہیں:
''حیدرآباد کے انس و محبت کا، ان کی مسافر نوازیوں کا قائل تو شروع سے تھا لیکن دعوتی تکلفات کا جو درجہ مشاہدے میں آیا اس حد تک اندازہ نہ تھا۔ آج یہاں عصرانہ ہے تو کل وہاں ظہرانہ اور پرسوں وہاں عشائیہ، دعوت، ایٹ ہوم کا ایک مسلسل چکر اور بندھے ہوئے وقتوں کے علاوہ بے وقت بھی چائے، پیسٹری اور پھل پھلاری پر اصرار۔''

جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ کیپٹن فتح نصیب خاں، ڈاکٹر یوسف الدین، غلام دستگیر رشید، ڈاکٹر ابوالنصر محمد خالدی، مظہر احسن گیلانی اور ڈاکٹر میر ولی الدین سے ملاقاتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا، ڈاکٹر سید عبداللطیف کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

''داستان کا یہ ٹکڑا تمام تر ناقص رہے گا اگر ذکر کسی قدر تفصیل سے ایک حیدرآبادی شخصیت ڈاکٹر عبداللطیف کا نہ آئے۔ اب تو ریٹائر ہو چکے ہیں، لیکن استادوں کے استاد رہ چکے ہیں۔ یعنی ان کے پڑھائے ہوئے ان کے سکھائے ہوئے درجۂ فضیلت پاس کر کے خود اپنے فن کے یونیورسٹی میں استاد بھی بنے اور اب وہ بھی ریٹائر ہو چکے ہیں۔ آنکھوں کے مریض اور اب دنیا کے ہنگاموں سے کچھ الگ تھلگ سے رہتے ہیں پھر بھی بڑی گہری نظر دنیا کے حالات پر رکھتے ہیں۔ یونیورسٹی میں استاد تو شاید انگریزی ادب کے تھے لیکن اب تو ان کی ماہرانہ نظر سیاسیاتِ عالم پر رہتی

ہے۔ سرسری نیاز ان کی خدمت میں پہلے سے تھا۔ لیکن خوب ہوا کہ اب کی ملاقاتیں بار بار اور خوب کھل کر رہیں۔ بدگمانی ان کی طرف سے دل میں یہ جمی ہوئی تھی کہ یہ تجدد مآب ہیں۔ مل کر معلوم ہوا کہ نہیں۔ ان کے دل میں بڑی اسلامیت ہے۔ مڈل ایسٹ (مشرقی وسطیٰ) کے کسی انسٹی ٹیوٹ کے سرکاری طور پر ناظم ہیں اور مسلم ملکوں کے حالات وانقلابات سے خوب باخبر ہیں۔ ان ملکوں کی تجدد مآبی اور فرنگیت کا ذکر بڑی دردمندی سے کرتے رہے اور دنیا کے بعض مبصرین (مثلاً شہرۂ آفاق پروفیسر ٹائن بی) سے ان کے گہرے تعلقات ہیں۔ اس نے انہیں خود ایک بڑا مبصر بنادیا۔ میں نے متعدد معاملات میں ان کی معلومات اور بچے تلے تبصروں سے استفادہ کیا۔''

ڈاکٹر لطیف نے مولانا کے اعزاز میں جو عصرانہ دیا تھا اس موقع پر احمد علی خاں، مولانا بادشاہ حسینی، ڈاکٹر مسعود حسین خاں صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ، احمد مرزا اور ابوسعید مرزا (فرزندانِ عزیز مرزا مرحوم) سے مولانا کی سرسری ملاقاتیں ہوئیں۔

حیدرآباد کی جن چند اور مشہور شخصیتوں سے مولانا کی ملاقاتیں ہوئیں ان میں ممتاز آرکیٹکٹ فیاض الدین، ڈاکٹر عبدالمنان، دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ میں طب کی کتابوں کے اردو مترجم ڈاکٹر محمد عثمان، یونس سلیم، مرزا شکور بیگ، نواب ماندور خاں، فینانس سکریٹری محامد علی عباسی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

درگاہ حضرت شاہ خاموش کے سجادے مولوی شاہ قطب الدین الحسینی سے ملاقات پر مولانا خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ طبقۂ مشائخ کے ایک ایسے فرد سے ملاقات ہوئی جس کا وجود اپنے طبقے کے لئے باعثِ فخر ہے۔ شہر کے بزرگوں میں خصوصی جمعیت کے تاجدار حضرت عبداللہ شاہ سے ملاقات کا تذکرہ مولانا ان الفاظ میں کرتے ہیں: ''خوب ہوا کہ حاضری ہوگئی۔ چہرہ پرنور ہی نور تھا۔ بات چیت زیادہ کیا ہوتی۔ یہی بہت ہے کہ جو مقصود تھا یعنی دعائے خیر لینا، وہ حاصل ہوگیا۔ ہاتھ پکڑ کر جب اپنے ہاتھ میں لیا تو قلب کو وہ سرور اور ٹھنڈک محسوس ہوئی کہ جی یہ کہتا رہا بس اب یہ ہاتھ اسی ہاتھ میں رہے اور اس کی گرفت کبھی ڈھیلی نہ ہونے پائے! دستگیری جس اہلِ دل، جس اہل اللہ کی بھی نصیب ہوجائے اور بے سہارے کے لئے بڑا سہارا ہے۔''

طبقۂ علماء میں مولانا کی ملاقات مولانا فضل اللہ سابق شعبۂ دینیات اور مولانا ابوالوفا افغانی سے

ہوئی۔ مولانا قیام حیدرآباد کے دوران ڈاکٹر حمید اللہ کے مکان جانا بھول گئے۔ وہ اپنی اس بے خیالی پر شرمندگی کا اظہار کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''ڈھائی ہفتہ کے قیام میں آنا جانا بہت جگہ رہا، افراد کے یہاں بھی اور اداروں میں بھی لیکن سہو ونسیان تو انسان کے دم کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ ایک جگہ جانے کی لازمی تھی اور اس وقت اس کا خیال نہ آیا۔ اس بے خیالی پر تو اب بھی پچھتاوا ہے۔ حیدرآباد کا اتنا لمبا سفر روز روز کیوں کر ممکن ہے اور عمر کی اس منزل پر پہنچ کر اب دوبارہ سفر کا تو کوئی قرینہ ہی نہیں نظر آتا۔ اس لئے قدرتاً قلق بھی زیادہ ہے۔ ان قابل زیارت جگہوں میں نمبر اول پر فخر دکن بلکہ فخر ہند ڈاکٹر حمید اللہ فرانسوی کا مکان آیا ہے۔ سچے مجاہد اور سچے مہاجر کی مثال انہی کی ذات میں ملتی ہے۔ علم ودین دونوں کے لئے یہ یک وقت وقف کئے ہوئے۔ اس وقت ایک انہی کی شخصیت جس نے محض اپنے عقیدے کی خاطر عمر بھر کے لئے جلاوطنی اختیار کرلی۔ لازم تھا کہ ان کے مکان پر حاضری دیتا۔ ان کے رہنے سہنے اور سب سے بڑھ کر ان کے لکھنے پڑھنے کی جگہ کی دست عقیدت سے جاروب کشی کرتا۔ موقع ہاتھ آکر محض سہو وغفلت کی نذر ہو گیا۔ اب یہ چند سطریں بطور سجدۂ سہو کے ہیں۔ دو ایک جگہ کی اور ضروری حاضری بھی اس طرح رہ گئی، گو ضروری حاضری بھی اس درجہ میں نہ تھی۔''

مولانا نے اپنے قیامِ حیدرآباد کے دوران جن اداروں اور کتب خانوں کا معائنہ فرمایا تھا ان میں ادارہ ادبیاتِ اردو، انجمن ترقی اردو، مجلس تعمیر ملت، دائرۃ المعارف، کتب خانہ آصفیہ، سالار جنگ کتب خانہ اور دارالقرأت کلیمیہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ مولانا ادارہ ادبیاتِ اردو کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

''نام کی کشش جب ادارۂ ادبیات اردو تک لے گئی تو ایوانِ اردو نام کا نہیں، واقعی ایوانِ اردو ہی پایا۔ عمارت کے ظاہری حسن وجمال، وسعت وطول وعرض سے قطع نظر جب عمارت کے اندر قدم رکھا اور چل پھر کر ادھر اُدھر، اوپر نیچے دیکھنا شروع کیا تو شانِ خدا نظر آئی۔ میوزیم اور لائبریری، آڈیٹوریم اور لیکچر گیلری سب ہی کچھ اس ایوان کے اندر جمع! اللہ اکبر! اپنی اردو کی بھی یہ شان! قلمی کتابوں، نادر مخطوطوں کا پورا ذخیرہ فراہم، ریسرچ اسکالر آئیں تو اپنے کام کے لئے مدتوں قیام کا سامان پائیں۔ سچ یہ ہے کہ اس احاطہ کے اندر آکر یہ بھی یاد نہیں رہ جاتا کہ اردو کوئی

مظلوم زبان اور ناقدری اور کس مپرسی کی شکار ہے یا یہ کہ کسی بھی ترقی یافتہ زبان سے پیچھے یا نیچے!
اللہ نے خلوص میں بڑی برکت رکھی ہے۔ڈاکٹر زور مرحوم اردو کی خدمت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے
ہوئے تھے۔اللہ نے ان کی کوششوں کو کامیابی و سرسبزی کا یہ مرتبہ عنایت کیا اور بابائے اردو کا صحیح
جانشین بلکہ یوں کہئے کہ بابائے اردو ثانی بنادیا۔"

انجمن ترقی اردو کے بارے میں مولانا رقم طراز ہیں کہ ایک وسیع احاطے میں اور اس کے
اندر دو دو اردو کالجوں کو بڑے پیمانے پر چلانا کوئی آسان اور معمولی کام نہیں۔کتابوں کی تالیف اور
اشاعت اس کے علاوہ ہے۔یہ سب کچھ بڑی حد تک انجمن کے معتمد پروفیسر حبیب الرحمٰن کی
جواں ہمتی اور ایثار کا نتیجہ ہے۔انہوں نے اپنی ایک بڑی ذاتی عمارت انجمن کی نذر کردی ہے اور
خود دن رات اس کی خدمت میں لگے رہتے ہیں۔خوش نصیب ہے وہ انجمن جسے ایسے مخلص کارکن
نصیب ہوئے ہیں۔اس انجمن کے چلانے میں تنہا مسلمانوں کا ہاتھ نہیں بلکہ متعدد ہندو بھی اس
میں جان و دل سے شریک ہیں۔چنانچہ شری جانکی پرشاد کا نام بار بار سننے میں آیا۔

مجلس تعمیر ملت کے متعلق مولانا لکھتے ہیں کہ شہر حیدرآباد میں ایک ایسا ادارہ دیکھنے میں آیا جو
شہر ہی کی نہیں بلکہ ساری ریاست کی ملی زندگی میں ایک مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔اس ادارے
کے صدر سید خلیل اللہ حسینی سرگرم عمل مجسم ہیں۔۱۹۴۸ء کے بعد سے ملت میں جو افسردگی، انتشار،
ہراس بلکہ سراسیمگی پیدا ہوگئی تھی، اس کو دور کرنے اور مسلمانوں میں از سر نو اعتماد نفس پیدا کرنے
میں بڑا دخل مجلس تعمیر ملت کو ہے۔مجلس کا نصب العین جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے تعمیر ہے،
تخریب نہیں۔ٹھوس کام کرنا ہے محض نعرے لگانا اور جلوس گشت کرانا نہیں۔

دائرۃ المعارف کے بارے میں مولانا اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ دوسرے دینی
اداروں سے قطع نظر یہ دینی علمی ادارہ ایسا ہے کہ جس کی وجہ سے منفرد تھا اور اب تک ہے اور
ہندوستان کیا معنی اس کی نظیر اس بڑے پیمانے پر عالم اسلام میں کمتر ہی نظر آئے گی۔اس کے ناظم
ڈاکٹر عبدالمعید خاں جو نظامت کے ہمہ وقتی و نازک کام کے علاوہ بلند پایہ انگریزی سہ ماہی
"اسلامک کلچر" کے ایڈیٹر ہیں، یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں اور اسلام کے علمی محاذوں پر سپاہی کی
خدمات انجام دیتے ہیں۔دائرۃ المعارف کو بند کروانے کی کوششوں اور مولانا ابوالکلام آزاد کی
دلچسپی اور توجہ کے باعث اس ادارہ کی برقراری کے بارے میں مولانا کہتے ہیں:

''یاروں نے کیا کوئی کسر ادارہ کے بند کرا دینے کی اٹھا رکھی تھی۔ادارہ مسلمانوں کا مخصوص کام کر رہا ہے، فرقہ وارانہ ہے، سیکولر حکومت میں اس کا کیا کام۔اسے فوراً بند ہونا چاہئے۔قریب تھا کہ فرمان قضا اسی مضمون کا شائع ہو جائے اور حکومت آندھرا پردیش کے حکم سے ادارہ کے دروازوں پر قفل پڑ جائیں لیکن حافظ حقیقی کو کچھ اور ہی منظور تھا۔وزیر تعلیم سرکار ہند مولانا ابوالکلام نے اپنے منصب عالی کی کرسی سے زبردست احتجاج نامہ بھیجا کہ ''بند ہونا کیا معنیٰ'' ایسے ادارے کو قائم ہی نہیں اور ترقی دینا چاہئے۔بیرون ہند کی پڑھی لکھی دنیا میں سرکار ہند کے سیکولرزم کا بھرم ہی اس سے قائم ہے۔اپنے سرکاری دورے میں میں نے کیا جرمنی اور کیا فرانس، کیا برطانیہ اور کیا اٹلی سب مقامات کے اہلِ علم کو اس کی خیریت دریافت کرتے اور اس کے کارناموں کے راگ گاتے ہوئے پایا۔جب کہیں جا کر ادارہ کی جان بخشی ہوئی۔

مولانا جب دارالترجمہ میں ملازمت کے دوران حیدر آباد میں مقیم تھے، ان دنوں کتب خانہ آصفیہ ان کی شوق و دلچسپی کا مرکز تھا۔وہ اکثر وہاں جایا کرتے تھے۔اب کتب خانہ آصفیہ اسٹیٹ لائبریری میں تبدیل ہو چکا تھا۔اس مرتبہ اس کتب خانے کو دیکھنے پر مولانا کے یہ تاثرات تھے کہ اس ریاست میں اردو کے ساتھ سوتیلے پن کا رویہ تھا۔اردو کی نئی کتابوں کی کوئی فہرست باہر آویزاں نہ تھی۔جب کہ انگریزی اور ہندی کتابوں کے نام تعارف کے ساتھ بورڈ پر چسپاں تھے۔

مولانا پہلے بھی کئی بار کتب خانہ سالار جنگ جا چکے تھے۔سالار جنگ سوم ان سے بڑی شفقت و مہربانی سے پیش آتے تھے۔اس مرتبہ کتب خانہ سالار جنگ میں نصیر الدین ہاشمی سے ان کی تفصیلی ملاقات رہی جن کے بارے میں مولانا تحریر کرتے ہیں کہ پڑھے لکھوں اور تحقیقی کام کرنے والوں میں کون ان سے ناواقف ہوگا۔وہ اپنی ذات سے خود ایک زندہ کتب خانہ ہیں۔وہ کتنی کتابوں اور کتاب سازوں کے نام پتے، خصوصیات کے حافظ اور کتب خانوں کی ترتیب، فہرست سازی وغیرہ کے ماہر ہیں۔

ملک میں قرأت و تجوید کے نظام کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا کہتے ہیں: کہ حیدر آباد، بحمداللہ اس خصوص میں بھی اپنی امتیازی شان قائم کئے ہوئے ہے۔فارسی کے پروفیسر قاری کلیم اللہ حسینی کی نگرانی وسرپرستی میں کامیابی کے ساتھ کام کرنے والے ادارہ دارالقرأت کی کارکردگی پر

اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ قاری صاحب خود اپنی ذات سے جامع صفات ہیں۔ ایک طرف صورۃً، سیرۃً، پختہ وکھرے مسلمان اور دینی علوم کے عالم اور دوسری طرف انگریزی زبان اور مغربیات میں برق۔

مولانا نے حیدرآباد میں اٹھارہ روز بے حد مصروف گزارے۔ واپسی کے وقت وہ اپنے احساسات کا ان الفاظ میں اظہار کرتے ہیں:

''بڑی بڑی عمریں بات کہتے اور لمبی لمبی زندگیاں پلک جھپکاتے ختم ہوجاتی ہیں تو سترہ اٹھارہ دن کی بساط ہی کیا تھی۔ ابھی حیدرآباد کے پلیٹ فارم پر آمد ہی ہوئی تھی کہ اسی اسٹیشن سے روانگی کی گھڑی بھی آگئی۔ وہ ۲۹ر ستمبر کی صبح تھی اور یہ ۱۶ر اکتوبر کی شام! خوب یقین کے ساتھ شروع ہی سے معلوم تھا کہ قیام بالکل عارضی اور چندروزہ ہے، پھر بھی دل کسی حد تک لگ گیا تھا اور طبیعت درودیوار سے، گلی کوچے سے مانوس ہوگئی تھی۔ چلتے وقت دل کسی درجہ میں ضرور کُوھا۔''

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

حکیم ظل الرحمٰن ☆

ابھی کیا ہے مجھے ڈھونڈیں گے اک دن کارواں والے
کہ مرجانے پہ قدر آدمی معلوم ہوتی ہے

پیدائش:

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی پیدائش ایک معزز، خوشحال، دیندار قدوائی خاندان میں ۱۶/مارچ ۱۸۹۲ء میں ہوئی۔ ان کے خاندان کا آبائی تعلق اتر پردیش کے ضلع بارہ بنکی میں واقع قصبہ دریاباد سے تھا۔ یہ قصبہ لکھنؤ اور فیض آباد ریلوے لائن پر وسط میں واقع ہے۔ انیسویں صدی کے شروع سے لے کر اب تک اس قصبہ کی پہچان مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی ذات سے ہی قائم ہے۔ یہ امتیاز اس صدی میں شمالی ہند کے کسی اور کے حصے میں شاید ہی آیا ہو اگر چہ مولانا کی پیدائش لکھنؤ کی ہی ہے۔

ان کے خاندان کے مورث اعلیٰ قاضی القضاۃ شیخ معزالدین قاضی القدوہ تھے یہ زمانہ دسویں صدی عیسوی کا ہے۔ ان کی نسل میں دس پشتوں کے بعد ایک نمایاں ہستی مخدوم شیخ آب کش کی نظر آتی ہے۔ انہوں نے ہی دریاباد کی بنیاد ڈالی ان کے نام آب کش کی وجہ یہ تھی کہ ان کے مرشد نے ان کے لئے مجاہدہ آب کشی تجویز کیا تھا۔ یعنی پانی بھر بھر کر مسافروں اور نمازیوں کو پیش کیا کریں۔

شیخ مخدوم کی گیارہویں پشت میں مولانا مظہر کریم پیدا ہوئے۔ جو عبدالماجد دریابادیؒ کے حقیقی دادا تھے۔ مولوی مظہر کریم کے بڑے بھائی حکیم نور کریم عبدالماجد دریابادیؒ کے حقیقی نانا بھی تھے۔ جو اپنے علم، فضل، تقویٰ، بردباری، استقلال مزاج، سخاوت اور اصول پسندی کے لئے

☆ ممبر مجلس عاملہ آل انڈیا ملی کونسل۔

مشہور تھے۔مولانا دریابادیؒ نے ددیہال اور ننہال دونوں کے خصائص ورثہ میں پائے!

عبدالماجد دریابادیؒ کے والد مولانا عبدالقادر اپنے والدین کی سب سے چھوٹی اولاد تھے۔ وہ ۱۸۴۸ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے اور وہیں تعلیم حاصل کی۔ ملازمت کا آغاز کسی اسکول کے فارسی استاد کی حیثیت سے کیا۔ ہردوئی میں کسی انگریز کو فارسی پڑھائی اس کی سفارش پر عدالت فوجداری کی سرشتہ داری (صدر شعبہ) ملی فرض شناسی کی بنا پر ترقی کرتے کرتے ڈپٹی کلکٹر کے عہدے تک پہنچے۔ جو اس زمانہ میں ہندوستانیوں کی معراج تھا، وہ اپنی آمدنی کا ایک معقول حصہ یتیموں، بیواؤں اور غریب عزیزوں پر خرچ کرتے تھے۔۱۹۱۲ء میں حج کرنے گئے اور مکہ ہی میں انتقال ہوکر وہیں مدفون ہوئے۔

تعلیم:

گھر خوشحال تھا، قرآن ناظرہ، اردو، فارسی، عربی، انگریزی کی تعلیم گھر پر ہی استادوں سے حاصل کی۔ دسویں جماعت تک تعلیم سیتاپور کے ہائی اسکول میں پائی عربی کے پہلے استاد لکھنؤ کے ایک شیعہ عالم حکیم محمد ذکی صاحب تھے۔ بعد میں فرنگی محل لکھنؤ کے ایک ممتاز استاد مولوی عظمت اللہ صاحب آگئے اور مولانا نے ان سے فیض حاصل کیا۔ ۱۹۰۸ء میں مولانا عبدالماجد نے کیننگ کالج لکھنؤ میں داخلہ کیا۔ اختیاری مضمون کے طور پر عربی۔ منطق لئے انگریزی لازمی مضمون تھا لیکن کالج کے مغربی ماحول میں عربی کے ذوق کی وقعت ان کی نظروں میں کم ہوتی گئی۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ کیننگ کالج میں پہنچ کر اسباب ایسے پیدا ہوگئے کہ دل عربی سے اچاٹ ہوگیا۔

لکھنؤ کالج کی لائبریری سے مولانا نے اس قدر استفادہ کیا کہ کالج کے انگریز پرنسپل نے تکمیل تعلیم کے بعد جو سرٹیفکیٹ ان کو دیا اس میں لکھا کہ ان کے علم کے مطابق اس لائبریری سے کسی دوسرے نے اس قدر فائدہ نہیں اٹھایا جتنا عبدالماجد نے۔ انٹرمیڈیٹ پاس کرنے کے بعد بی اے میں ان کے مضامین انگلش لٹریچر، جنرل انگلش عربی اور فلسفہ تھے اس زمانہ میں وہ اگرچہ سقراط، ارسطو اور دیکارٹ کے فلسفہ سے بے نیاز نہیں رہے لیکن ان کی اصل دلچسپی۔ ہیوم، لاک، مل اسپنسر اور ڈارون سے رہی۔ بی اے پاس کرنے کے بعد ان کی خواہش فلسفہ میں ایم اے کرنے کی تھی۔ لکھنؤ میں چونکہ اس کا اہتمام نہیں تھا اس لئے وہ ۱۹۱۲ء میں علی گڑھ چلے گئے۔ علی گڑھ ایک سال گذار کر دہلی جا کر سینٹ اسٹیفن میں داخلہ لے لیا۔ وہاں ان کی ملاقات مشہور علم

دوست، انسانیت دوست، اورار دو نواز پادری سی۔ ایف اینڈ ریوز سے ہوئی۔

اسی زمانے میں مولانا کو دو ممتاز انگریزی انجمنوں کی اعزازی ممبر شپ بھی ملی وہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے ممبر ہوئے۔ پھر ارسٹوٹیلین سوسائٹی کی ممبری ان کو ان کی انگریزی کتاب سائیکلوجی آف لیڈر شپ پر ملی۔

معمولات:

مولانا ماجد صاحب دریابادیؒ کے معمولات کی نمایاں خصوصیت، ترتیب و تنظیم اوقات کا انضباط اور اصولوں کا پاس ہے۔ دوپہر کو وہ کھانا اس لئے نہیں کھاتے تھے کہ پھر جم کر لکھنے پڑھنے کا کام نہ ہو سکے گا۔ مزاج میں بہت غصہ تھا مگر مولانا اشرف علی تھانویؒ کے فیض صحبت کے بعد اس میں کمی آ گئی تھی۔

الحاد و تشکیک:

جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ کالج میں داخلہ کے بعد مولانا مذہب سے دور ہو گئے۔ اور نوبت بہ ایں جارسید کہ آٹھ سال تک ملحد و مذہب بیزار رہے۔ انٹرمیڈیٹ کے امتحان کے وقت امتحانی فارم میں خانہ مذہب میں بجائے مسلم کے ریشنلسٹ تحریر کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عقلیت اور آزادخیالی نے ان کو پوری طرح گرفت میں لے لیا۔ اس دوران ان کی دو کتابیں اور شبلی کی الکلام کے خلاف الناظر کا سلسلۂ مضامین شروع ہوا ان میں انہوں نے سخت قابل اعتراض باتیں لکھیں مثلاً الکلام کو بنیاد بنا کر عقاید اسلامی، وجود باری تعالیٰ، نبوت اور ضرورت مذہب وغیرہ پر تنقیدات لکھیں۔ انگریزی کتاب میں بظاہر اجتماع کی نفسیات کو بنیاد بنا کر تعبیر تجزیہ کا کام انجام دیا گیا تھا اس میں بھی ان کی مذہب دشمنی اور تشکیک آفرینی جھلکتی تھی۔ اس کتاب کا اردو ایڈیشن فلسفہ اجتماع کے نام سے شائع ہوا۔ اسلام وایمان سے برگشتہ کرنے میں ملحدوں کی تحریروں سے بڑھ کر زیادہ موثر وہ کتابیں ہوئیں جو نفسیات کے موضوع پر اہل فن کے قلم سے نکلی تھیں اور بظاہر مذہب سے کوئی تعلق نہیں رکھتی تھیں مثلاً ڈاکٹر ڈریسٹریل کی کتاب المیبٹ آف سوشل سائنس (Elemint of soceal science) اس کتاب کی لہر اس قدر پڑتی تھی جو مذہب اور اخلاق کو ہمیشہ عزیز رہے ہیں۔ اس کا انداز بیان بلا کا زوردار اور خطیبانہ تھا ایک اور کتاب جس نے مذہب سے برگشتہ کرنے میں اہم رول انجام دیا وہ تھی International library of Famous

literature۔ یہ کتاب بھی صرف لٹریچر کی کتاب تھی اور مذہب سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا اس کی ایک جلد میں قرآن اور اسلام کا ذکر کچھ اس طرح کا تھا جس سے ذات رسالت سے اعتقاد بحیثیت رسول کے کیا معنی۔ بحیثیت ایک بزرگ یا اعلیٰ انسان بھی دل سے ہٹ گیا۔ اس طرح وہ ذہنی اور فکری اور عقلی اعتبار سے وہ تمام تر صاحب بہادر بن گئے۔

دین کی طرف واپسی:

مگر قدرت کا کرشمہ دیکھئے ملحد فلسفیوں اور مصنفوں کو جی بھر کر پڑھ لینے کے بعد ۱۹۱۸ میں انہوں نے مطالعہ کے شوق میں مذہبی اور نیم مذہبی فلسفیوں کو پڑھنا شروع کیا تقریباً دو برس کے بعد ان کی رائے میں تغیر آیا جس کو خود ہی انہوں نے درج ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے۔

''فرنگی اور مادی فلسفہ کا جو بت دل میں بیٹھا ہوا تھا وہ شکست ہو گیا۔ اور ذہن کو یہ صاف نظر آنے لگا کہ اسرار کائنات سے متعلق آخری توجیہہ اور قطعی تعبیر ان فرنگی مادئیں کی نہیں بلکہ دنیا میں ایک سے ایک اعلیٰ اور دلنشیں توجیہیں اور تعبیریں اور بھی موجود ہیں اور روحانیت کی دنیا سراسر وہم اور جہل اور قابل مضحکہ و تحقیر نہیں بلکہ حقیقی اور ٹھوس دنیا ہے، عزت و توقیر کی مستحق، عمیق اور تحقیق اور تدقیق کے اعتبار سے گوتم بدھ اور کرشن کی تعلیمات ہرگز کسی مل (Mill) یا اسپنسر سے کم نہیں ہیں بلکہ بڑھی ہوئی ہیں اور حکمائے فرنگ ان کے مقابلے میں بہت پست نظر آتے ہیں (آپ بیتی ص:۲۴۷)

اس تمام عرصہ میں مذہب سے قریب کرنے میں جن زندہ شخصیات نے مولانا کو متاثر کیا ان میں اکبر الہ آبادی، مولانا محمد علی جوہر، سید سلیمان ندوی، مولانا حمید الدین فراہی۔ عبدالباری ندوی۔ مہدی افادی اور بھگوان داس جیسے اکابر شامل تھے۔ نفس مذہب کو قریب لانے میں کنفیوشس کی تعلیمات بھگوت گیتا۔ بدھ مت کی تعلیمات۔ مسز اینی بیسنٹ کی تھیوری پر مبنی تحریریں۔ مہاتما گاندھی اور آربندو گھوش کی تحریریں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مولانا شبلی کی سیرۃ النبی جلد اول، مثنوی مولانا روم، محمد علی لاہوری کی انگریزی تفسیر قرآن نے اسلام کی حقانیت کا نقش بٹھانے میں اہم کردار انجام دیا ہے اس ضمن میں خود مولانا دریابادی کا یہ اعتراف بہت اہم ہے ''ضلالت۔ مطالعہ کے راستہ سے پائی۔

ہدایت بھی بحمد اللہ اسی راہ سے نصیب ہوئی۔ زندہ شخصیتوں کو دخل خاص ان انقلابوں میں کم ہی رہا۔

ہندو فلسفہ اور جوگیانہ تصوف نے گویا کفر اور ایمان کے درمیان پل کا کام انجام دیا۔"
(آپ بیتی ص:۲۵۵)

اس کا اثر یہ ہوا کہ ان کا رجحان تصوف کی طرف ہوا۔ انہوں نے صوفیہ کے ملفوظات کا دل لگا کر مطالعہ کیا اور ان مطالعات نے ان کی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اور تقریباً دس برس تک الحاد و تشکیک کی کیفیت میں مبتلا رہ کر وہ ایک بار پھر مذہب کی طرف لوٹ آئے۔

خود انہوں نے اپنی آپ بیتی میں تحریر کیا ہے ص:۳۵۲۔

"میری سیرت سازی میں سب سے زیادہ معین اور مؤثر دو شخصیتیں ثابت ہوئیں ان دونوں نے میری زندگی کا رخ ہی موڑ دیا ان دونوں کا فیض صحبت نہ نصیب ہوتا تو خدا معلوم کہاں کہاں اب تک بھٹکتا پھرتا۔ پہلا نام ہندوستان کے مشہور لیڈر مولانا محمد علی کا ہے یہ گویا میرے محبوب تھے۔

دوسری شخصیت ان سے بھی اہم تر اور مفید تر جو میرے نصیب میں آئی وہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کی تھی، بزرگ، عابد و زاہد بزرگ متعدد دیکھنے میں آئے لیکن مصلح، مربی، مزکی تو ایسا دیکھنے میں نہیں آیا محمد علی اگر میرے محبوب تھے تو اشرف علی مقتدا و مطاع۔ محبت کے مرکز اگر وہ تھے تو عقیدت کے مرجع یہ۔"

بیعت وارادت:

دور الحاد سے مراجعت کے بعد جہاں بہت سی چیزیں معاون ہوئیں وہاں متعدد صوفیانہ تصانیف نے بھی ان کی فکری قلب ماہیت میں اہم کردار ادا کیا۔ وہ ایک مدت تک رواجی تصوف اپنائے رہے اور مختلف مزارات پر حاضری دیتے رہے ۱۹۲۸ء میں وہ مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے بیعت ہو گئے لیکن ان کا اصل مرکز عقیدت تھانہ بھون کے اشرف علیؒ ہی رہے مولانا نے مولانا اشرف علی تھانویؒ کی سوانح حیات "حکیم الامت، نقوش و تاثرات" تصنیف فرمائی اس میں ایک خصوصی دیباچہ تحریر کیا ہے جس کا ایک جز درج ذیل ہے۔

"حکیم الامت امام اشرف علی تھانویؒ بزرگ کس رتبہ کے اور ولی کس پائے کے تھے اس کا حال تو وہی بتا سکتا ہے جو خود بھی بزرگ، عارف اور ولی اللہ ہو اپنے کو تو اس کوچہ کی ہوا بھی نہیں لگی

اس لئے اگر کسی صاحب نے اس کتاب کو اس ارادہ سے کھولا ہے کہ اس میں حضرت کے مرتبہ معرفت وولایت کی تفصیل درج ہوگی یا ان صفحات میں حضرت کے مناقب عرفانی ومدارج روحانی کا بیان ہوگا تو خیر اسی میں ہے کہ آگے ورق گردانی کی زحمت ہی گوارہ نہ فرمائیں اور کتاب کو بے پڑھے بند کی بند رہنے دیں۔ یہ مجموعہ اوراق نہ کتاب المناقب ہے نہ ملفوظات مرشد نا سیرت شیخ۔ اس کا موضوع ان سے الگ ہی نہیں سب سے پست بھی ہے۔

حضرت شیخ کے کمالات وفضائل جو کچھ بھی ہوں بہر حال اشرف علی تھانوی نامی ایک انسان بھی تو اس صدی میں ہوئے ہیں ان کی عمر کے آخری پندرہ سولہ سال کے زمانے میں اس نامہ سیاہ کو ان سے نیاز اور گہرا نیاز حاصل رہا ہے اور اس نے اپنے لمبے تجربہ اور سابقہ زمانے میں انہیں ایک بہترین انسان پایا ہے۔ ان کی انسانی زندگی کا ہلکا سا عکس ان نقوش وتاثرات کے اندر بند کر دینے کی کوشش الٹی سیدھی آپ کو یہاں ملے گی اور چونکہ ان کی انسانیت، ان کے مفسر اور فقیہ اور درویش ہونے سے الگ بھی نہیں کی جا سکتی اس لئے ضمناً ذکر ان کے علم وفضل، تفقہ، سلوک کا لانا بھی ناگزیر ہو گیا۔''

اس کے باوجود مولانا کی یہ رائے بھی قابل غور ہے جو رقعات ماجدی مرتبہ غلام احمد حیدر آبادی ص:۳۵ پر تحریر ہے۔

''حضرت تھانوی کی انتہائی عظمت کے باوجود میرا یہ عقیدہ نہیں کہ ان کی تفسیر کا ہر لفظ قرآن سے متعلق آخری لفظ ہے۔''

بحیثیت مفسر قرآن:

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے علم وفضل کا انتہائی کمال یہ ہے کہ وہ باقاعدہ مفسر سے مولانا بن گئے جب کہ انہوں نے نہ کسی دینی مدرسہ میں تعلیم حاصل کی نہ کسی عالم سے احادیث وفقہ اور تفسیر کا درس لیا۔ عربی زبان جتنی سیکھی تھی وہ اسکول اور کالج میں بطور اختیاری مضمون کے تھی۔ ایسی مثالیں بہت کم ملیں گی کہ ایک شخص جس نے ابتداء سے عالم شباب تک باضابطہ دینی تعلیم حاصل نہ کی ہو بلکہ مذہب کی مخالفت پر کمربستہ رہا ہو پھر اچانک وہ دینی علوم میں بھی اتنی مہارت حاصل کر لے کہ علماء نہ صرف اس کو اپنی صف میں جگہ دیں اور وہ اس صف میں نمایاں اور ممتاز جگہ حاصل کر لے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ان کو اعزازی ندوی تسلیم کیا گیا۔ مولانا حبیب

الرحمٰن خان شیروانی نے اپنے خطبہ میں ان کو با قاعدہ فضلاء ندوہ میں شمار کر کے بطور سند پیش کیا۔

عبدالماجد دریابادیؒ کا تصور مذہب کسی جامع ذہن کی پیداوار نہیں تھا ان کے تصور دین میں گریز اور رہبانیت نہیں تھی۔ انہوں نے اسلام کے نظری پہلوؤں کے ساتھ اس کی عملی تعبیرات پر بھی پوری توجہ دی۔ وہ جانتے تھے کہ حالات کس قدر بدل گئے ہیں ان حالات میں اسلام کی جو موزوں ترین تعبیر ہوسکتی تھی وہ انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ کی۔ وہ جدید علوم سے واقف اور مغربی طرز کی تعلیم کی پیداوار تھے۔ مولانا نے مغربی علوم سے بے حد استفادہ کیا اور اسے مذہب کی حمایت میں بڑی حکمت کے ساتھ استعمال کیا۔ وہ اپنے گرد وپیش کے حالات وکوائف و ماحول سے پوری طرح واقف تھے انہوں نے خاص طور پر جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی رہنمائی کی۔ اسلامی تعلیمات کو اس کی اصلی شکل وصورت میں نہایت مؤثر اور دلنشیں انداز میں پیش کرنے کی مسلسل کوشش کی، مذہبی فرقوں کے تنازعات کی علانیہ مذمت کی۔ چونکہ وہ جدید علوم سے بخوبی واقف تھے اس لئے جدید علوم کے ارتقا کے ساتھ ساتھ جو نئے مسائل پیدا ہوئے ان کے پیش نظر قرآن کی تعلیمات کی تشریح کی اس کے ساتھ احادیث نبوی اور اسوۂ صحابہ کو اس ڈھنگ سے پیش کیا جس کو جدید تعلیم کے پروردہ طبقہ نے قبول کیا۔ عقلی دلائل سے بھی مذہبی صداقتوں کو تلاش کرنے کی کوشش کی اور بہت سی اہم گتھیوں کو سلجھایا۔

سب سے پہلے انہوں نے تفسیر انگریزی میں تحریر کی جس میں انجیل اور تورات وغیرہ کے بہت حوالہ جات ہیں بعد میں پھر اردو میں تحریر کی۔ جو پہلی کا ترجمہ نہیں بلکہ خود ایک اصل ہے اور بہت جگہوں پر انگریزی تفسیر سے مختلف بھی ہے۔

ایک صاحب طرز ادیب اور انشا پرداز:

۱۹۱۳ء میں مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے الہلال میں عبدالماجد دریابادیؒ کے بارے میں لکھا تھا:

> ''آج کل کے نوجوان تعلیم یافتہ اصحاب میں بعض اشخاص ایسے بھی ہیں جن کو عام حالات میں حق امتیاز واستثناء حاصل ہے اور ہماری مایوسیوں میں وہ اپنے اندر ایک نشان امید رکھتے ہیں۔ میں ان کی وقعت کرتا ہوں ان ہی چند لوگوں میں میرے عزیز دوست مسٹر عبدالماجد بی اے بھی ہیں مجھ کو یقین ہے کہ ان کا ذوق علمی اردو زبان کو

انشاءاللہ بہت فائدہ پہنچائے گا۔'' (الہلال ۱۳ر ستمبر ۱۹۱۳ء)

مولانا کی ادبی تربیت میں علامہ شبلی کا بہت بڑا تعاون ہے جس کا اعتراف خود انہوں نے کیا ہے لکھتے ہیں:

''اپنے ہوش کی جب آنکھیں کھلیں تو سمجھئے کہ بیسویں صدی کے شروع کا زمانہ تھا۔ ادبی فضا پر اس وقت دو شخصیتیں تھیں ایک شبلی دوسرے شرر۔ سنجیدہ، علمی، فکری، واقعاتی قسم کے ادبیات کے فرمانروا شبلی نعمانی تھے۔ علی گڑھ کے سابق استاذ الفاروق کے مصنف اور بڑے بڑے اہم اور معرکہ کے مقالوں کے مقالہ نگار۔ ان انگلیوں نے جب قلم پکڑنا سیکھا روش اعظم گڑھ کے اس مرد عظیم کی بھائی۔''

(نقوش لاہور فروری ۱۹۶۱ء ص: ۵۰)

آپ بیتی ص: ۲۱۱ میں لکھتے ہیں:

۱۹۰۶ء تھا یا ۱۹۰۷ء تھا کہ زیارت پہلے ماہنامہ الندوہ کی ہوئی پھر اس کے بعد ہی صاحب ندوہ مولانا شبلی کی۔ اور الندوہ نے دل و دماغ کو اتنا متاثر کیا کہ اور سارے رسالے، جریدے نظر سے گر گئے اور دل و جان سے شبلی کا کلمہ پڑھنے لگا۔ مولانا شبلی کا علم و فضل، اسلوب زبان، طرز بیان سب دماغ پر چھا گئے۔ اور کہنا چاہئے کہ علمی و قلمی زندگی کا ایک نیا دور اسی وقت شروع ہو گیا۔

رسالہ ادیب شبلی نمبر کے پیش لفظ میں انہوں نے صاف طور پر شبلی سے اسلوب اور فکر و فرہنگ کی سطح تاثیر پذیری کا اعتراف درج ذیل الفاظ میں کیا ہے۔

''باضابطہ شاگردی کی سعادت اس کم سواد کے نصیب میں نہ تھی لیکن طرز تحریر کا چربہ اڑانے کی شعوری کوشش مدتوں برسوں کی چلتے ہوئے فقروں کو نوک زبان کرلیا۔ ڈھلے ہوئے، ترشے ہوئے جملے ٹھونس ٹھانس حافظے کے خزانے میں بند کر لئے۔ نقالی کو ایک مستقل پیشہ بنائے رکھا اور مزید خوش نصیبی یہ لکھنؤ میں دو ڈھائی سال تک کہنا چاہئے کہ روزانہ سہ پہر کو ہمیشہ ڈیڑھ گھنٹہ کے لئے حاضری کی توفیق ہوتی رہی۔ مجلس میں عموماً ادبی، علمی، شعری، تنقیدی نقطے بیان ہوتے رہے اور کبھی کوئی تاریخی یا ذہنی موضوع بھی چھڑ جاتا۔'' (ادیب شبلی نمبر ستمبر ۱۹۶۰ء ص: ۷۰)

آپ بیتی میں اس موضوع پر مزید تحریر فرماتے ہیں:

''پھر بھی اگر کسی کے لئے لفظ استاد کا اطلاق ہو سکتا ہے تو بلا شک وشبہ مولانا شبلی تھے ان کا ممنون احسان دل کی گہرائیوں سے ہوں لکھنا لکھانا جو کچھ بھی آیا ان کی نقالی میں آیا۔ برسوں ان کا چربہ اتارتا رہا ان کے فقرے کے فقرے۔ ترکیبوں کی ترکیبیں نوک زبان تھیں۔'' (آپ بیتی ص: ۳۵۷)

وہ اپنے مضامین کے لئے انشاء کی اصطلاح استعمال کرنا پسند کرتے تھے۔ ایک تقریر میں مقالات ماجد کے بارے میں فرمایا:

مقالات ماجد بے شک میری ترتیب دی ہوئی ہے لیکن یہ نام ناشر صاحب کا طبع زاد ہے میں تو اسے انشاء ماجد کہلاتا۔

مزید لکھتے ہیں:

''ہر دور میں لکھا جو اپنے خیال وعقیدہ کے مطابق تھا۔ قلم سے وہی ٹپکا وہی چھلکا جو دل ودماغ کے اندر موجود تھا۔ جب الحاد کی شامت سوار تھی تو رنگ ملحدانہ تھا جب اسلام کی حلقہ بگوشی از سر نو نصیب ہوئی تو وہی رنگ تحریر کا بھی ہو گیا۔ کام اجرت پر کیا۔ رائلٹی لی۔ حسن تالیف یک مشت فروخت کیا لیکن اللہ نے ہر صورت میں مخالفت ضمیر کی بھٹی میں گرنے سے محفوظ رکھا۔'' (آپ بیتی ص: ۳۸۲)

مولانا عبدالماجد صاحب کی تحریروں میں اشعار کا استعمال برمحل ہوتا ہے کہ یہ استعمال سراسر آمد محسوس ہوتا ہے اور باعث سرور بن جاتا ہے مثال کے طور پر یادایام میں اپنے دانتوں کا تذکرہ اس طرح فرماتے ہیں:

''دانت اپنی جوانی ہی کے زمانے سے گرنے شروع ہو گئے تھے آخری دانت کو بھی گرے ہوئے ایک عرصہ ہو چکا تھا البتہ اس کی ایک کرچ نیچے کے جبڑے میں بائیں طرف لگی رہ گئی تھی۔ اس ہفتہ وہ بھی ختم ہو گئی خزاں کی آخری پتی۔ شمع کی آخری بھڑک۔ زندگی کی آخری سانس آخر کب تک اس غریب کی زندگی قائم رہتی۔

تاسحر وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادصبا
یادگار رونق محفل تھی پروانے کی خاک

(صدق جدید ۱۳/اگست ۱۹۶۵ء)

دوسری تحریر ملاحظہ فرمائیں۔

''ابھی ابھی ایک فقرہ زبان وقلم سے ادا ہوا ہے۔

''بوانے مجھے گود میں اٹھالیا''

یہ فقرہ آج ۶۷ء میں ۷۴، ۷۵ سال کے پیر سال خوردہ کی زبان سے ادا ہوا ہے۔ ہائے وہ دایہ کی گود میں جانے کی لذت اب کیا بیان ہو وہ لذت جس کا بدل نہ جوانی کی گرمیاں دے سکیں۔ نہ کبھی بڑھاپے کی خشکیاں۔ پڑھنے والے اس مقام پر پہنچ کر ایک پیر نابالغ پر ہنسنے اور مضحکہ کرنے میں جلدی نہ کریں۔ عجب نہیں اس سن پر پہنچتے پہنچتے انہیں بھی بچپن کی پیاری معصومانہ شرارتوں کی یاد تازہ ہو جائے غضب کی حسرت ناک سچائی بھر دی ہے کسی نے اس مصرع میں

دو دن اے جوانی دے دے ادھار بچپن'

(آپ بیتی ص:۶۲)

ایک دعائیہ پیراگراف ملاحظہ فرمائیں۔

مشرق کے بدنام سخن گو اردو شاعر رخصت (اقبال)

تو دردبھرا دل رکھتا تھا۔ تیری یاد بھی دردوالوں کے دلوں میں زندہ رہے گی۔ تو نے موت کو یاد رکھا۔ تیرے نام بھی موت نہ آئے گی۔ تو نے غفلتوں اور سرمستیوں کی داستان کو خوب پھیلایا۔ شاید کسی رحمت بے حساب پر تکیہ کر کے۔ لیکن اپنی غفلتوں اور سرمستیوں کی کو موت وانجام کی یاد دلا کر بھی خوب رلایا۔ کسی کی عظمت بے بیان کا خوف کر کے۔ عجب کیا کہ خدائے آمرزگار۔ اس عالم کا ستار اس عالم کا غفار تیری دعاؤں اور لغزشوں کو اپنے دامن عفو، مغفرت کے سائے میں لے لے۔ (انشاء ماجد ص:۳۲۱)

اپنی ایک لڑکی کی شادی پر اس سے مخاطب ہیں:

ہاں تو سن لڑکی آج جو باپ اور چچا کے ہاتھوں اپنی آزادی کو قید میں تبدیل ہوتے دیکھ رہی ہے۔ اپنا گھر اجاڑ کر دوسرے کا گھر آباد کرنے جارہی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بے فکری کی جو نیندیں اب تک سوئی وہ آج ختم ہو رہی ہیں۔ بے گھر اس گھر سے ہو رہی ہے جسے آنکھ کھول کر اپنا گھر سمجھا تھا چھوٹ رہے ہیں وہ درودیوار جہاں پیدا ہوئی۔ پلی بڑھی۔ الگ ہو رہا ہے وہ مکان جہاں عمر کی

اتنی منزلیں گزار لیں ہنس ہنس کر اور کھیل کھیل کر جدا ہو رہا ہے وہ گھروندہ جسے گرمیوں کی چھاؤں اور جاڑوں کی دھوپ میں سینکڑوں بار سجایا۔ سنوارا۔ جہاں بیٹھ بیٹھ کر بارہا اپنی گڑیوں اور گڈوں کو مانگا اور بیاہا۔ پرایا ہو رہا ہے وہ صحن جس میں مدتوں دوڑی۔ کھیلی، گری، بے وفا نکل رہے ہیں وہ دالان جن میں ضدیں کیں روئی۔ مچلی۔

اور وہ پردہ نشین ماں لوگ کہتے ہیں کہ وہ تو رو بھی نہیں رہی ہے محض سکتہ کا عالم ہے۔ آنسو سلب ہو گئے ہیں لیکن کلیجہ کی دھڑکن کیا کہہ رہی ہوگی۔ ہر لحہ جو ہوک سینے میں اٹھ رہی ہے اس کا کیا علاج ہے وہ پتھر کی نہیں آخر گوشت پوست ہی کی عاجز و ناتواں مخلوق ہیں آرزوؤں اور تمناؤں کے ہرے بھرے باغ کو مٹتے دیکھ کر خود زندہ کیسے رہیں۔

یہ چند اقتباسات ہیں عبدالماجد دریابادیؒ کی تحریروں کے گداز و گریہ کے ثبوت میں جو ہر انسان کو آخری حد تک متاثر کر دینے کے لئے کافی ہیں۔

دور صحافت:

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی صحافتی زندگی کا آغاز بارہ برس کی عمر سے ہی ہو گیا تھا جب انہوں نے اودھ اخبار میں فرضی نام سے اپنا مضمون شائع کرایا۔

اودھ اخبار کے علاوہ ریاض الاخبار۔ ماہنامہ عصر جدید، الندوہ، البشیر ماہنامہ الناظر نیز دوسرے اخبارات اور رسائل میں ان کے مضامین اور تبصرے کثرت سے شائع ہونے لگے۔ لکھنؤ کے روزنامہ ہمدم کے مضمون نگاروں میں وہ شروع سے ہی شامل تھے۔ برج نرائن چکبست کے ماہنامہ صبح امید اور سید سلیمان ندوی کی ادارت میں شائع ہونے والے معارف میں بھی ان کے مضامین چھپنے لگے۔ ۱۹۱۹ء سے معارف سے باضابطہ تعلق قائم ہو گیا۔ مولانا محمد علی جوہر کے روزنامے ہمدرد سے بھی شروع سے ہی تعلق رہا۔ عبدالماجد کی باقاعدہ صحافت کی شروعات اخبار سچ کے اجراء سے ہوئی جو جنوری ۱۹۲۵ء سے نکلنا شروع ہوا شروع میں ان کا نام معاون ایڈیٹر کی حیثیت سے رہا لیکن اگست ۱۹۲۵ء سے ظفر الملک کے ہٹ جانے کے بعد وہ باقاعدہ ایڈیٹر بن گئے سچ کسی مجبوری کی وجہ سے بند ہوا تو صدق کے نام سے نکلا۔ صدق کو بند کرنا پڑا تو صدق جدید کے نام سے آخر دم تک نکالتے رہے۔

سچ کے پہلے شمارے میں جس لائحہ عمل کا اعلان کیا گیا اس میں پہلا کام اسلامی شریعت کی

روشنی میں مسلمانوں کی زندگی کی اصلاح تھی۔ دوسرا کام ملک کی آزادی کے لئے ہرممکن کوشش کرنا تھا۔ غاصب اور ظالم حکومت سے آزادی حاصل کرنے کو مسلمانوں کے لئے فرض ایمان کہا گیا۔ تیسرا کام مسلمان اور غیر مسلموں کے درمیان اچھے اور خوشگوار تعلقات کو فروغ دینا تھا۔

صحافت کے بارے میں مولانا کا نظریہ جاننے کے لئے ان کے مضمون ہفتہ وار صحافت کے آداب کا مطالعہ ضروری ہے جس کے چند اقتباسات درج ذیل ہیں:

۱۔ مقصود خدمت دین وملت رکھئے عام خدمت خلق بھی اسی کے تحت آتی ہے۔

۲۔ وطن کا بھی بڑا حق ہے لیکن مسلمان پرستار وطن نہیں ہوسکتا۔ عبودیت کا یہ خصوصی تعلق تو صرف ذات حق کے لئے مخصوص ہے۔

۳۔ صحافت ایک قسم کی تجارت نہیں ہے بلکہ ایک قسم کی عبادت ہے۔

۴۔ دوسروں کا احتساب پبلک معاملات میں ضرور کیجئے لیکن اپنے کو بھی احتساب سے بالا خیال نہ کیجئے۔ احتساب نفس کو سب سے مقدم رکھئے۔

۵۔ سلامت روی اختیار کیجئے لیکن مرعوبیت اور احساس کمتری تک ہرگز نہ پہنچ جائیے۔ صلح جوئی دوسری چیز ہے اور بزدلی اور خوشامد دوسری چیز۔

۶۔ مزاح، شگفتی، خوش طبعی شرافت نفس کی علامات ہیں اور تشنیع وتضحیک وپھکڑ بازی نائت کی علامات ہیں اور سفلہ پنی کی بھی اس فرق عظیم کو ہمیشہ نظر میں رکھئے۔

۷۔ غلطی ہر انسان سے ہوتی ہے۔ غلطی کا علم ہوجانے پر اس کے اعتراف سے۔ اسے واپس لینے سے۔ اس پر معذرت سے مت شرمائیے۔

۸۔ آپ کی تحریر کا ایک ایک لفظ جرح کی زد میں آتا ہے خیال کرتے رہئے اور ڈرتے رہئے آخری اور حقیقی عدالت میں اس کے ایک ایک لفظ پر سوال ہو رہا ہوگا۔

بحیثیت شاعر:

خود مولانا کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

شاعری کہئے یا تک بندی اس کا تھوڑا بہت خبط بچپن ہی سے تھا۔ شبلی کی صحبت نے شعر سمجھنے کا

سلیقہ سکھایا۔ اکبر الہ آبادی کے اصرار پر شاعری کے کوچہ میں قدم رکھا۔ ۱۹۱۳ء میں مولانا نے غالب پر ایک مضمون لکھا جو الہ آباد سے نکلنے والے رسالے ادیب میں شائع ہوا۔ اکبر الہ آبادی کو یہ مضمون بہت پسند آیا انہوں نے مولانا کو لکھا۔

میں آپ کو مذاق شعر سے کس طرح بے بہرہ سمجھوں غالب کے متعلق آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ بہت دل آویز ہے۔ (فروغ اردو ص:۲۲۱)

مولانا کا شعری مجموعہ تغزل ماجدی کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ چند نمونے ملاحظہ فرمائیں۔

ان کے انداز میں الفت نہ وفا ہوتی ہے
ہاں اگر ہوتی ہے کوئی تو جفا ہوتی ہے

پھر ہے بیتاب زباں عرض تمنا کے لئے
دیکھئے دیکھئے پھر مجھ سے خطا ہوتی ہے

وہ دل کہ جلوہ گاہ سرور ونشاط تھا
اب غم ہے اس کو مدفن حسرت کئے ہوئے

زینت حسن ہے خود اپنے پہ نازاں ہونا
نازش زخم جگر دین نمکداں ہونا

زندگی اصل میں ہے ایک قفس طائر روح
موت کیا ہے اسی زنداں سے گریزاں ہونا

ہم شہید ان وفا موت کے ہیں خود مشتاق
کفر اس شرع میں ہے طالب درماں ہونا

راز ہستی وہ گرہ ہے جو کبھی کھل نہ سکی
فلسفی کے لئے آخر ہے پشیماں ہونا

سب کو آخر ہے فنا حسن ہو یا عشق
اہل ہستی کبھی ہستی پہ نہ نازاں ہونا

ایک دم ہو نہ سکی ہم سے کبھی طاعت حق
ایسا پابند ہمیں حرص وہوا نے رکھا

رخصت اے ضبط وتحمل، الوداع اے پاس وضع
بندشوں سے اب زباں آزاد ہو جانے کو ہے

نعتیہ کلام

پڑھتا ہوا جب محشر میں صل علیٰ آیا
رحمت کی گھٹا اٹھی اور ابر کرم چھایا

جب وقت پڑا نازک اپنے ہوئے بیگانے
ہاں کام اگر آیا تو نام ترا آیا

چرچے ہیں فرشتوں میں اور رشک ہے زاہد کو — اس شان سے جنت میں شیدائے نبی آیا
سمجھے تھے سیہ کاری اپنی ہے فزوں حد سے — دیکھا تو کرم تیرا اس سے بھی سوا پایا
فاسق کی ہے یہ میت پر ہے تو تری امت — ہاں ڈال تو دے دامن کا اپنے ذرا سایا

بحیثیت فلسفی:

فلسفہ سے مولانا کو خصوصی دلچسپی تھی کالج کی تعلیم کے دوران انہوں نے فلسفہ کا انتخاب بطور ایک اختیاری مضمون کے کیا تھا۔ وہ حقیقتاً تفکر و تعمق کی وادیوں کے راہ پیا تھے۔ اپنے دور تشکیک والحاد میں مولانا نے فلسفہ پر خاص توجہ دی اور اس دور میں ان کا قلم فلسفیانہ افکار کا ترجمان رہا۔ ان کی فلسفیانہ تحریروں کا زمانہ ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۸ء تک پھیلا ہوا ہے اس دور میں اردو میں فلسفہ کے باب میں اردو کی کم مائگی کا شدت سے احساس تھا مولانا کا ارادہ تھا کہ مغربی فلسفہ کے مشاہیر کے افکار کو اردو میں منتقل کیا جائے چنانچہ ماہنامہ الناظر میں انہوں نے اپنا مضمون "فلسفہ اور اس کی ماہیت اور اس کے مذاہب" اشاعت کے لئے بھیجا تو ایک خط بھی بھیجا جس میں ایسے مضامین تسلسل کے ساتھ شائع کرنے کی درخواست کی۔

عبدالماجد صاحب کی فلسفیانہ تحریروں کا پہلا مجموعہ "فلسفیانہ مضامین" ہے جو الناظر کے ایڈیٹر نے بغیر ان کی رضامندی کے شائع کر دیا بعد میں یہی مضامین چند مزید مضامین کے ساتھ نیز نظر ثانی کے بعد مبادی فلسفہ کے نام سے شائع ہوئے۔ اس کتاب میں تیرہ مقالات ہیں جو مولانا کی فکری سفر کی ذہنی کشمکش کی بڑی حد تک تصویر کشی کرتے ہیں۔ ۱۹۳۱ء میں یہ کتاب ایسے دور میں وجود میں آئی جب مذہب کا فلسفہ تیزی سے نکھر رہا تھا۔ مبادی فلسفہ کتاب کو اسی نظر سے پڑھنا چاہئے۔ یہ مضامین اس وقت لکھے گئے جب تجرباتی سائنس کی ترقی سے فلسفہ کی دنیا روز بروز سکڑتی جارہی تھی فلسفہ کی طرح مولانا کی نفسیات سے بھی اسی قدر دلچسپی تھی۔ اس دور میں نفسیات فلسفہ ہی کا ایک باب سمجھا جاتا تھا۔

نفسیات پر مولانا کی تحریریں ان کے مجتہدانہ انداز فکر کا پتہ دیتی ہیں ان کی کتب "فلسفہ جذبات، فلسفہ اجتماع اور سائیکلوجی آف لیڈرشپ" ہیں۔ اول الذکر دو اردو میں اور تیسری انگریزی میں ہے۔ یہ کتب ان کے دور تشکیک کی تخلیق ہیں اور ان میں ان کے اپنے ذاتی تجربات

ومشاہدات بھی ہیں خصوصاً تنویم پر۔ آخر میں ان کی ایک اور کتاب فلسفہ "ہم اور آپ" وجود میں آئی۔ فلسفہ اجتماع کے سلسلہ میں مولانا احمد رضا خاں صاحب نے مولانا عبدالماجد صاحب پر فتویٰ کفر صادر کیا۔ مولانا نے اس پر جو تبصرہ فرمایا وہ درج ذیل ہے:

"نیک نامی کو جماعت عطیہ وانعام سمجھتی ہے وہ فرد کی اس جسارت کو معاف نہیں کر سکتی کہ اس نے جماعت سے بے نیاز ہو کر یا اس کے فیصلہ کا انتظار کئے بغیر اس انعام کو اپنے لئے مخصوص کر لیا۔ اور سوسائٹی ایسے افراد کو یہ سزا دیتی ہے کہ اس کا نام، خود بین، خود نما، خود پرست رکھ دیتی ہے۔"

قومی تحریک میں حصہ:

مولانا عبدالماجد اگر چہ سیاست کے مرد میدان نہیں تھے لیکن وہ ایک غیر معمولی حساس انسان تھے اور وہ اپنے دور کے سماجی اور سیاسی مسائل اور تحریکات سے خود کو علیحدہ نہیں رکھ سکتے تھے۔ حالات کے تقاضوں سے مجبور ہو کر رفتہ رفتہ سیاست کی طرف مائل ہونے لگے۔ یہ تبدیلی کب اور کیسے رونما ہوئی اس کا جواب خود مولانا نے اپنی آپ بیتی میں دیا ہے ملاحظہ فرمائیں:

"جب اپنے ہوش کی آنکھیں کھلیں تو مسلمانوں کی مسلّم پالیسی سرکار انگریزی کی تائید اور وفاداری پائی، میٹرک پاس کرنے کے بعد (جون ۱۹۰۸ء) تک اپنا بھی یہی رنگ ماحول کی تقلید میں رہا۔ کالج میں آنے اور لکھنؤ قیام کے بعد جب آزادی کی ہوا لگی تو اپنے خیالات بھی بدلے اور کانگریس کی طرف مائل ہونے لگے۔"

(آپ بیتی ص:۲۶۰)

چنانچہ ۱۹۱۷ء میں جب برطانوی حکومت نے مسز اینی بیسنٹ کو گرفتار کیا تو اس پر اپنے رد عمل کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے:

"۱۹۱۷ء میں جب حکومت نے مسز اینی بیسنٹ جیسی آفاقی شخصیت کو ہوم رول کے سلسلے میں گرفتار کیا تو سارا ملک دہل گیا اور مجھ پر بھی ایک جوش کا عالم تھا"۔

خلافت اور ترک موالات کے سلسلے میں انہوں نے مولانا محمد علی جوہر کے ساتھ مل کر کام کیا وہ ان کو ہی اپنا رہنما خیال کرتے تھے۔ مولانا کو اودھ خلافت کمیٹی کا صدر بنایا گیا۔ مرکزی خلافت کمیٹی کے رکن بنائے گئے تحریک خلافت دراصل ایک مشعل تھی جس نے ہندوستان کے ضمیر کو

روشن کیا اور اسی اجالے میں اس نے اپنے آپ کو پہچانا۔ گاندھی جی سے ان کی تاثیر پذیری گہری سطح پر تھی۔ مضمون 'غبار کارداں' شائع شدہ آج کل میں وہ لکھتے ہیں:

''گاندھی جی کی دوراندیشی، تدبر اور اخلاص سب کا مداح زندگی بھر رہا، الحاد سے مذہبیت کی طرف دوبارہ رجوع کرنے میں دوسری شخصیت کے علاوہ گاندھی جی بھی شامل تھے۔ ۱۹۳۲ء میں جب کسانوں کی تحریک کے سلسلے میں جواہر لال نہرو دورہ کرتے ہوئے دریاباد آئے تو میٹنگ کی صدارت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے فرمائی۔

مولانا محمد علی جوہر کے انتقال کے بعد وہ عملی سیاست سے کنارہ کش ہو گئے البتہ اپنے اخبارات کے ذریعہ وہ علمی طور سے سیاست سے وابستہ رہے اور تحریک کو تقویت پہنچاتے رہے۔

آخری علالت اور وفات:

وسط مارچ ۱۹۷۴ء میں مولانا پر فالج کا حملہ ہوا۔ جس سے وہ پوری طرح صحتیاب نہیں ہو سکے علاج معالجہ سے مرض میں معمولی کمی واقع ہوئی تکان محسوس ہونے لگی اور یادداشت پر بھی اثر پڑا اس کے باوجود وہ اخبار کے لئے کچھ نہ کچھ لکھتے رہے۔ اس دوران میں انہوں نے مختصر تحریریں یا خطوط لکھے وہ بڑی مشکل سے پڑھے جا سکے۔ ان کی دونوں آنکھیں فالج کے حملے سے بہت کمزور ہو چکی تھیں خصوصاً دائیں آنکھ جنوری ۱۹۷۶ء میں لکھنؤ میں اس کا آپریشن کرایا جو کامیاب رہا وسط اکتوبر ۱۹۷۶ء میں وہ لکھنؤ میں اپنی قیام گاہ خاتون منزل میں رات کو کوٹھے سے گر پڑے جس سے ان کی کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس حادثہ نے ان کی صحت پر اور برا اثر ڈالا اور اسی روز سے وہ مستقل طور پر صاحب فراش ہو گئے۔ اور ان کی زندگی ایک کمرہ تک محدود ہو کر رہ گئی۔ زیادہ تر غافل رہتے تھے لیکن نمازوں کے وقت ہوشیار ہو جاتے تھے۔ ہاتھ کان تک اٹھا کر پھر نیچے لا کر نماز کی طرح نیت باندھ لیتے۔ یہ کیفیت وفات سے کچھ قبل تک رہی بالآخر ۶ر جنوری ۱۹۷۷ء کو علی الصبح ساڑھے چار بجے بمقام خاتون منزل لکھنؤ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ نماز جنازہ ان کی وصیت کے مطابق ندوۃ العلماء میں مولانا علی میاں نے پڑھائی بعد ازاں جنازہ دریاباد لے جایا گیا جہاں ان کے مکان کے نزدیک حضرت مخدوم آب کش کے مزار کے قریب تدفین عمل میں آئی۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

تصنیفات

ادبی موضوعات

مقالات ماجد۔ انشاء ماجد جلد اول ودوم۔ لطائف ادب۔ مضامین عبدالماجد۔ اقبالیات ماجد۔ اکبرالہ آبادی میری نظر میں۔ زود پشیمان۔ تغزل ماجدی۔ نشریات ماجد۔

سوانح

آپ بیتی۔ چند سوانحی تحریریں۔ حکیم الامت: نقوش وتاثرات۔ محمد علی کی ذاتی ڈائری جلد اول ودوم۔ محمود غزنوی۔ فلسفہ۔ فلسفہ جذبات۔ فلسفہ اجتماع۔ فلسفہ کی تعلیم گذشتہ اور موجودہ۔ فلسفیانہ مضامین۔ مبادی فلسفہ جلد اول ودوم۔ ہم اور آپ۔ غذائے انسانی۔ فرائض والدین۔

سفرنامے

تاثرات دکن۔ سفرحجاز۔ ڈھائی ہفتہ پاکستان میں۔ سیاحت ماجدی گیارہ سفر۔

مذہبیات

تفسیر ماجدی۔ اعلام القرآن۔ الحیوانات فی القرآن۔ بشریت انبیا۔ تصوف اسلام۔ تمدن اسلام کی کہانی۔ قصص الانبیا کے چند باب۔ مسائل وقصص۔ مردوں کی مسیحائی۔ مشکلات القرآن۔ قتل مسیح سے یہود کی بریت۔ نورانی جہیز۔ یتیم کا راج۔ سچی باتیں۔

خطبات

خطبہ صدارت مجلس استقبالیہ خلافت کانفرنس لکھنؤ۔ ندوہ کا پیام ندویوں کے نام۔ خطبات ماجدی۔ تمدن اسلام کا پیام۔ پیام امن۔ تاریخ اخلاق یورپ۔

تراجم وتالیفات

تاریخ تمدن جلد دوم۔ تاریخ یورپ برائے انٹرمیڈیٹ۔ مکالمات برکلے۔ مناجات مقبول۔ ناموران سائنس۔ منطق استخراجی واستقرائی۔ چہل حدیث ولی اللہی۔ بحرالمحبت۔ تحفہ خسروی۔

مرتبات

خطوط مشاہیر۔ فیہ مافیہ۔ مکاتیب اکبر۔ مکتوبات سلیمانی جلد اول ودوم۔ مکتوبات ماجدی جلد اول ودوم۔ رقعات ماجدی۔ دی سائیکلوجی آف لیڈر شپ انگریزی۔ قرآن حکیم تفسیر وترجمہ انگریزی ہولی قرآن وِدھ ٹرانسلیشن Holy Quran with Translation۔ تفسیر القرآن جلد اول ودوم انگریزی۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اور اصلاحِ معاشرہ

مولانا محمد شیث ادریس تیمی ☆

اللہ جل شانہٗ کا ارشاد ہے:

من المومنین رجال صدقوا ماعاهدوا الله علیه فمنهم من قضٰی نحبه ومنهم من ینتظر وما بدلوا تبدیلاً (الاحزاب:۲۳)۔ (ایمان لانے والوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے اللہ کے کئے ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا ہے، ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا اور کوئی وقت آنے کا منتظر ہے۔ انہوں نے اپنے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں کی)۔

اہل علم جانتے ہیں کہ یہ آیت مبارکہ غزوۂ احزاب (۵ھ) کے تناظر میں نازل ہوئی ہے اور اس میں ان تقدس مآب صحابۂ کرام کی تعریف کی گئی ہے جنہوں نے نذر مانی تھی کہ اگر انہیں آنحضرت ﷺ کے ساتھ مل کر جہاد کا موقع ملا تو وہ ثابت قدم رہیں گے اور اولوالعزمی و جاں نثاری کی مقدس بازیاں کھیلیں گے۔ چنانچہ ان میں سے بعض نے تو غزوۂ احد (۳ھ) میں جام شہادت نوش کیا اور بعض اللہ کے دین کی فتح ونصرت کے لئے سرفروشی و جاں نثاری کا ثبوت دیتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوگئے۔ لیکن اس آیت کے عموم میں وہ تمام مجددین و مصلحین اور صلحائے امت شامل ہیں جنہوں نے اپنی حیات مستعار کو احیائے دین، بندگانِ خدا کی اصلاح اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے وقف کر دیا اور اپنی خداداد صلاحیتوں اور میسر وسائل کے ذریعہ وقت کے سیاسی، معاشی، سماجی اور فکری طاغوتوں کا مقابلہ کیا۔ بعض کو جہاد بالسیف کا رتبۂ بلند ملا تو بعض جہادِ حرف کی سعادتوں سے بہرہ ور ہوئے۔ کسی نے اپنے خونِ شہادت کے چھینٹوں سے دعوت وعزیمت کا گلزار سجایا تو کسی کو 'قول کلمۃ حق عند سلطان جائر' کی کلاہِ فضیلت نصیب ہوئی۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اسی سلسلۂ دعوت واصلاح کے ایک عظیم قافلہ سالار تھے۔ انہوں نے

☆ چیئرمین الثقافہ فاؤنڈیشن، نئی دہلی۔

نصف صدی سے زائد عرصہ تک جہادِ حرف جاری رکھا اور وہ بجا طور پر "من المومنین رجال صدقوا ما عاهدوا الله علیه.....الآیة" کے مصداق ٹھہرے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی شخصیت محتاج بیان نہیں۔ وہ تو آسمانِ دعوت واصلاح اور تزکیۂ وسلوک کے نیرتاباں تھے۔ اوران کی زندگی صدق وصفا کی روشن کتاب، اللہ تعالیٰ نے مرحوم کو بڑی خوبیوں سے نوازا تھا۔ وہ بیک وقت ایک صاحبِ طرز ادیب تھے، ممتاز انشاء پرداز تھے۔ فلسفی تھے، صحافی تھے۔ عالم دین تھے، مفسر قرآن تھے، محقق ونقاد اور متکلم اسلام تھے۔ سچائی ان کا شعار تھا اور دردمندی ودل سوزی، اخلاص ووضع داری، انصاف پسندی وفراخ دلی، علم دوستی وخوش مذاقی، جرأت وبے باکی، گفتار وکردار کی ہم آہنگی ان کا طرۂ امتیاز، وہ بنیادی طور پر مصلح ومربی تھے اور انہوں نے ادب کو بطور وسیلہ اختیار کیا تھا۔ ادب ان کے نزدیک مقصد نہیں بلکہ ذریعہ تھا تاہم وہ ذریعہ کو بھی پیغام کی حرمت وطہارت اور نزاکت ونزاہت کی طرح برتتے تھے۔ ان کا ادب وصحافت تعمیری اور ابلاغی تھا اور اس سے وہ معاشرہ کی اصلاح اور جہاں تازہ کی تعمیر چاہتے تھے۔ انہوں نے ناموسِ فن اور اس کی ثقاہت وپاکیزگی کو ہمیشہ پیش نظر رکھا اور کبھی اس کی دوشیزگی وجمال پر حرف آنے نہیں دیا۔ حالانکہ اس دوران میں ادب کے نام پر اخلاق باختہ افکار اور ملحدانہ نظریات کے بارہا جھونکے آئے اور کتنوں کو مع جبہ ودستار اڑا لے گئے لیکن مولانا کی ذات تھی کہ بقول اقبال ؏

ہوا ہے گو تند وتیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے

لیکن اس سب کے باوجود نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جب بھی مولانا دریابادیؒ پر گفتگو ہوتی ہے تو عموماً ان کے اصلاحی پہلو کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور یہ باور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وہ بنیادی طور پر ادب وانشاء کے آدمی تھے حالانکہ سچ، صدق اور صدق جدید کے شذرات چیخ چیخ کر یہ کہتے ہیں کہ وہ پہلے مصلح تھے پھر ادیب وغیرہ وغیرہ یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے ۱۹۲۵ء میں ہفتہ وار "سچ" جاری کیا تو اس کا سرنامہ اس آیت کریمہ کو قرار دیا: والذی جآء بالصدق وصدق به أولٓئک هم المتقون (الزمر:۳۳) (اور جو شخص سچائی لے کر آیا اور جنہوں نے اس کو سچ مانا وہی پرہیزگار ہیں)۔

نیز اسی اصلاحی مقصد کے پیش نظر "سچی باتیں" کے نام سے ایک مستقل کالم شروع کیا جو اپنی

اثر آفرینی اور تربیتی واصلاحی مضامین کی وجہ سے بہت مقبول ہوا۔ مولانا نے ایک موقع پر اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا:

> ''صدق کا مسلک ومزاج اچھا ہے یا برا جیسا کچھ بھی ہے واضح وظاہر ہے۔ اصلاً ایک دینی، اصلاحی، اخلاقی صحیفہ ہے اس کی اصل دعوت ایک دینی واصلاحی دعوت ہے۔''
> (صدق جدید، ۸ راگست ۱۹۵۸ء بحوالہ محمد سلیم قدوائی، عبدالماجد دریابادیؒ ص:۴۲، ساہتیہ اکادمی، دہلی)

مولانا دریابادیؒ ایک باکمال صحافی تھے انہوں نے خود جس طرح صحافت کو اصلاح معاشرہ کا ذریعہ بنایا اسی طرح وہ چاہتے تھے کہ دوسرے صحافی حضرات بھی اپنی کوششوں کو اسی مقصد کے لئے بروئے کار لائیں اور صحافت کو صحت مند اقدار کا امین بنائیں۔ چنانچہ وہ صادق الخیری دہلوی کو لکھتے ہیں:

> ''اب پرچہ اچھا نکلا، اس معیار کو قائم رکھئے، آپ کے والد مرحوم ہوا کے رُخ پر چلنے والے تاجر نہ تھے۔ مصلح تھے یہ بات ہمیشہ یاد رکھنے کی ہے۔ اور ضرورتِ اصلاح اب پہلے سے کہیں زائد ہے۔''

نوا را تلخ ترمی زن چوں ذوق نغمہ کم یابی۔ (خطوطِ ماجدی ص:۵۵، ادارہ تصنیف وتحقیق، پاکستان)۔

مولانا دریابادیؒ کی نگاہ میں صحافت کی حیثیت کیا تھی اور وہ اسے کس نگاہ سے دیکھتے تھے؟ اس کا اندازہ ایک استفسار کے جواب میں تحریر کردہ مولانا کے اس مضمون سے لگایا جاسکتا ہے جس کے اہم نکات یہ تھے۔

۱۔ مقصود خدمتِ دین وملت رکھئے، عام خدمتِ خلق بھی اس کے تحت میں آجاتی ہے۔

۲۔ پبلک کے جذبات کی محض نمائندگی پر ہرگز اکتفا نہ کرنا چاہئے، پبلک کے مذاق اور جذبات کی اصلاح کی کوشش کیجئے۔

۳۔ صحافت ایک قسم کی تجارت نہیں بلکہ ایک قسم کی عبادت ہے۔ بس اسی کو نصب العین بنا کر ہمیشہ اپنے سامنے رکھئے۔

۴۔ دیانت کے امتحان بھی اس راہ میں آتے رہتے ہیں۔ اپنے کو بچانے کا اہتمام سامنے رکھئے۔ (سچی باتیں، مرتبہ نعیم الرحمٰن صدیقی ندوی ص: ۵)

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے صحیفۂ کمال کا یہ پہلو نہایت اہم ہے کہ وہ ہمہ وقتی مصلح تھے اور وہ اصلاح معاشرہ کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ حتیٰ کہ اپنے نجی خطوط جو اردو ادب کا عظیم شاہکار ہیں، میں بھی مقصدِ اصلاح کو پیش نظر رکھتے تھے۔ چنانچہ اپنے ایک عزیز ڈاکٹر مختارالدین آرزو جو غالباً امریکہ میں رہتے تھے کو لکھتے ہیں:

''انگریز کہیں اور کسی حال میں ہو پر اپنے کو انگریز ہی سمجھتا ہے۔ اور یہی حال روسی، امریکی، جرمن سب کا ہے۔ کاش ہم بھی اپنے کو ہمہ وقت اور ہر حال میں مسلمان سمجھنے کی عادت ڈال لیں۔'' (خطوط ماجدی: ص: ۴۹)

چوں کہ کوئی بھی معاشرہ افراد سے بنتا ہے اس لئے مولانا کی بھی کوشش ہوتی تھی معاشرہ سے پہلے افراد کی اصلاح اور کردار سازی کی جائے، خاص طور سے ایسے افراد کا جن کا اثر معاشرے پر بلاواسطہ پڑتا ہے مثلاً شعراء، واساتذہ، جیسا کہ جوش ملیح آبادی کے نام مولانا کے اس خط سے پتہ چلتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اخبار میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ جوش نے بادہ نوشی ترک کردی ہے۔ اس پر مولانا نے بڑی مسرت کا اظہار فرمایا اور ان کو لکھا:

''کیا بتاؤں کتنی مسرت ''قومی زبان'' میں ترک بادہ نوشی کی خبر پڑھ کر ہوئی۔ مخلصانہ مبارک بادصدق دل سے پیش ہے۔

ایسی شی جو مزیل عقل ہو ہرگز کسی صاحب فہم وادراک کے شایان شان نہیں ہے اب دوسری خوش خبری سننے کے لئے بھی مشتاق ومنتظر ہی نہیں دعا گو ہوں، آپ کی شرافت پر مجھے ہمیشہ اعتماد رہا ہے اور میرا وجدان یقین کے ساتھ کہہ رہا ہے کہ جس قلم سے وہ زبردست ولولہ انگیز و وجد آفریں نعت نکل چکی ہے، ناممکن ہے کہ وہ اپنے مولیٰ کے حضور میں منکر ومکذب، باغی وطاغی کی حیثیت سے حاضری دے۔'' (خطوط ماجدی، ص: ۲۲۵)

لیکن افسوس کہ یہ خبر صحیح نہ تھی۔ اسی طرح جب ڈاکٹر مختار الدین آرزو کی تقرری لکچرر کی حیثیت سے ہوئی تو ان کو یہ لکھا:

''استاذوں کے دیندار ہونے کی ضرورت تو ہمیشہ ہی سے تھی اب کئی گنی اور بڑھ گئی

ہے۔" (خطوط ماجدی، ص:۴۹)

مولانا دریابادیؒ کی اصلاحی کاوشوں میں سب سے زیادہ دخل ان کے معجز بیاں اسلوب کا تھا، ایسا اسلوب طنز تھی تلخی نہ تھی۔ مزاح تھا لیکن تفضیح وتضحیک نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی طنز نگاری جہاں لطف طبع کا سامان فراہم کرتی تھی وہاں قاری کو غیر شعوری طور پر دعوت احتساب وعمل بھی دے جاتی۔ لکھنؤ میں پتنگ بازی کے مقابلہ پر مولانا کا تبصرہ ملاحظہ فرمائیں:

"شاباش لکھنؤ! اور زندہ باد ملت اسلامیہ! ایسے میدانوں کے مرد میداں سوا "خیر امت" کے کہاں مل سکتے ہیں! ہوش ربا گرانی نے مزا ہیم فاقہ کشی نا چکھادیا ہو، خطرہ کے بگل پر بگل بجتے جارہے ہوں بےفکروں کے ہاتھ سے پتنگ کی ڈور نہ چھوٹنے پائے!

محشر میں خلق اپنی مصیبت میں مبتلا
اور داغ کو یہ دھن کہ آئے کوئی خوب رو پسند

(بحوالہ: عبدالماجد دریابادیؒ، ص:۳۷)

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ رہ اصلاح کی آبلہ پائیوں سے پوری طرح واقف تھے اور انہیں اس حقیقت کا بھی ادراک تھا کہ اصلاح کا کام پیغمبرانہ عزم وحوصلہ اور پیغمبرانہ روحانیت اور دقت نظر چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے دور میں بھی اپنے موقف پر ڈٹے رہے جب کہ ہر طرف تشکیک والحاد کی گرم بازاری تھی۔ نئی نسل مغربی تہذیب سے مرعوب اس پر سو جان سے فدا ہو رہی تھی۔ معاشرہ عقیدۂ خالص اور اسلامی تعلیمات سے دور ہوکر ان گنت ہندوانہ وجاہلانہ رسم ورواج کی دلدل میں پھنسا ہوا تھا۔ اخلاق انسانی کا آئینہ دھندلا ہو چکا تھا۔ سیاسی اتھل پتھل زوروں پر تھی حتیٰ کہ ۳۵ء میں گورنمنٹ ایکٹ کا نفاذ ہوا تو گاندھی جی اور ان کے ساتھی ریاستوں میں حکومت سازی کی فکر میں تھے اور علماء ومسلم عوام کی غفلت شعاری کا یہ عالم تھا کہ وہ مسلکی اختلافات، مناظرہ بازی، مدح صحابہ اور تبرا کے جھگڑوں میں مصروف تھے (اور وہ نہ دیکھ پار ہے تھے کہ ملک کس انقلاب کے دوراہے پر کھڑا ہے۔) ایسے ناگفتہ بہ اور نازک ترین موڑ پر مولانا نے پیغمبرانہ عزم وحوصلہ کے ساتھ معاشرہ کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور نہایت صبر وتحمل کے ساتھ ملت کے چاک چاک پیراہن کے رفو کی تدبیریں کرنے لگے۔ مولانا صوفی مشرب ضرور تھے۔ نیز جلسے

جلوسوں سے گھبراتے اور گریز بھی کرتے تھے۔ لیکن اس سب کے باوجود تغیر حالات سے بے خبر نہ تھے ہمیشہ ان کی انگلیاں عصری مسائل کے نبض پر ہوتی تھیں۔ مولانا کی نگاہ میں اس وقت کا سب سے بڑا مسئلہ مسلکی اختلاف تھا اس لئے انہوں نے اس کو سب سے زیادہ نشانہ بنایا اور کلمہ کی بنیاد پر سب کو جوڑنے کی کوشش کی۔ مولانا شیعہ سنی اختلافات کے پس منظر میں لکھتے ہیں:

> ''احترام صحابہ یقیناً ایک اعلیٰ درجہ کی چیز ہے لیکن اس میں اس درجہ منہمک ہو جانا کہ امت کے تفرقہ و تشتت اور اس کے نتائج کی طرف سے آنکھیں بند ہی کر لی جائیں اور رد بدعات میں اس حد تک غلو کہ کفر صریح کے غلبہ سے بے پروائی پیدا ہو جائے یہ کہاں کا مقتضائے علم و دانش اور کس حد تک مطابق دین و شریعت ہے!''
>
> (بحوالہ: ڈاکٹر سید عبد الباری، تقدِ نو عیار، ص: ۶۷، ۶۸)

اسی طرح دیو بندی و بریلوی فرقے کے درمیان تصادم کی ایک خبر پر یوں اظہار خیال فرمایا:

> ''جو قوم دین کے ادنیٰ اور جزئی اختلافات پر اس بے دردی کے ساتھ کشت و خوں اور ایک دوسرے کی بے انتہا جان و مال کی بربادی پر اتر آئے اُسے کوئی حق اپنی موجودہ خستہ حالی اور شکستگی اور مغلوبیت پر تقدیر الٰہی سے گلہ و شکوہ کا ہے!''
>
> (حوالۂ مذکور: ص: ۷۸)

مولانا کی نظر میں فروعی اختلافات کی کوئی وقعت نہیں تھی۔ ہاں اگر وقعت تھی تو خدا ترسی کی، مکارم اخلاق کی، پاکیزہ کردار کی، جذبۂ اخوت و بھائی چارے کی، ہم دردی و غم گساری کی اور صفائی قلب و روح کی، وہ معاشرے میں انہیں اوصاف حمیدہ کی بنیادیں استوار کرنا چاہتے تھے۔ ذرا یہ پیراگراف ملاحظہ فرمائیں:

> ''قرآن پاک کو شروع سے آخر تک تلاوت کر جایئے۔ بات بات پر خیر و خیرات، صدقۂ و زکوٰۃ، خدمتِ خلق و خدا ترسی کی تعلیم ملے گی۔ یا اس کے برعکس آمین بالجہر و رفع یدین، امکانِ کذب باری و سماع موتی پر مناظرہ کی ہدایت نظر آئے گی۔ رسول کریم ﷺ کے وقت کا بیشتر حصہ یتیموں کی پرورش، ناداروں کی خبر گیری، بیکسوں کی حاجت روائی میں صرف ہوتا تھا یا حنفی، مالکی، اشعری و معتزلی نزاعات کے چکانے میں''۔ (سچی باتیں، ص: ۱۱۵، ۱۱۶)

مولانا دریابادیؒ کی زندگی کا یہ پہلو بھی اہم ہے کہ وہ ہر گھڑی ملتِ اسلامیہ کی شیرازہ بندی میں لگے رہتے تھے۔ ان کی آرزو یہی تھی کہ افرادامت اپنے اپنے بنائے ہوئے حصاروں کو توڑ حصار ملت میں گم ہو جائے۔ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد ان کو قطعاً گوارا نہ تھی۔ ذرا یہ بصیرت افروز اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''گلہ کا وجود جب ہی تک ہے جب تک سب بھیڑیں ایک ہی راستہ پر چل رہی ہیں۔ خواہ وہ راستہ کتنا ہی تنگ، وتاریک اور ناہموار ہو۔ لیکن ہر بھیڑ اپنی بصارت وبصیرت کے موافق الگ الگ روشن کشادہ وہموار راستہ اپنے لئے چُن لے تو فرمائیے کہ گلہ کا وجود ایک لمحہ کے لئے بھی قائم رہ سکتا ہے؟'' (سچی باتیں، ص:۱۳۲)

قرآن کریم جس کے اندر قوموں کے عروج وزوال کا راز مضمر ہے۔ تاریخ کے ایک لمبے دور سے اس کے تئیں مسلم معاشرے کا رویہ ظالمانہ اور گریز کا رہا ہے۔ اس نے اس کی تعلیمات کی روشنی میں نہ خود کو سنوارا اور نہ ہی اوروں کو سنور نے کا موقع دیا۔ نتیجتاً یہ ملت منصب امامت سے معزول کر دی گئی اور دوسری قوم اس پر مسلط ہو گئی۔ مولانا اس حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قرآن کا وجود آپ کے لئے تھا اور آپ کی زندگی قرآن کے لئے تھی۔ آج ان دونوں میں سے کون سی بات موجود ہے؟ آپ نے قرآن پاک کو چھوڑنا شروع کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن پاک نے آپ کو چھوڑ دیا۔ آج نہ آپ قرآن کے ہیں، نہ قرآن آپ کا ہے۔ دوسروں تک پہنچانا الگ رہا، پہلے یہ دیکھئے کہ خود آپ کا واسطہ اس سے کہاں تک باقی ہے؟ حکومت کا قانون، برادری کا رسم ورواج، دوستوں کی خاطر ومروت، بدنامی کا خوف، قرآن کی اہمیت ان سب سے زیادہ نہ سہی کاش ان کے برابر ہی آپ کا دل محسوس کرتا، آپ کی ساری زندگی نہ سہی کاش اس کے کسی ایک ہی شعبہ پر قرآن حاکم ہوتا۔'' (سچی باتیں، ص:۱۰۴)

مولانا نے اپنی تحریروں میں سب سے زیادہ معاشرہ کے اخلاقی زوال اور کردار کی پستی کو تنقید بنایا اور واضح کیا کہ اس کی بے راہ روی نہ صرف یہ کہ اس کی دنیا و عاقبت خراب کر رہی ہے بلکہ یہی روش ہدفِ اسلام کی نشر واشاعت کی راہ میں رکاوٹ بن رہی ہے۔ چنانچہ وہ مسلم

معاشرے کی غیرت کو تازیانہ لگاتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''آج آپ نے اپنی زندگی کا کون سا رخ، کون سا شعبہ، کون سا پہلو غیروں کے سامنے ایسا پیش کیا ہے، جس پر وہ اپنے دین کو چھوڑ کر آپ کے گروہ میں شامل ہونے کو بڑھیں آج آخر وہ کس چیز میں آپ کو اپنے سے ممتاز پا سکتے ہیں؟ دیانت میں، امانت میں، سچائی میں، خلوص میں، پاکبازی میں، پارسائی میں، قناعت میں، پاک نظری میں، یکدلی میں، فیاضی میں، خداترسی میں، مزاج کی نرمی میں، برداشت مصائب میں، تمام اخلاقی فضائل میں، آخر کون سا جوہر آپ میں موجود رہ گیا ہے جسے دیکھ کر وہ آپ کی طرف شوق و اشتیاق، رغبت و عقیدت کے ساتھ لپکیں؟ آپ کی 'بدآواریاں' بیگانوں کو اپنانے والی ہیں یا اس کے برعکس، اور اپنوں کو بھی بیگانہ بنانے والی؟ اگر اسلام (نعوذ باللہ) صرف اسی قدر ہے جو ہمارا اور آپ کا اسلام ہے تو آخر اس اسلام کے کس پہلو پر کفر کو رشک آئے؟'' (سچی باتیں، ص:۱۸۰)

بیسویں صدی عیسوی جن لعنتوں کے ساتھ نمودار ہوئی تھی اُن میں سے ایک اہم لعنت خدا بیزاری، عقلیت پسندی اور مغرب سے مرعوبیت بھی تھی۔ نوجوان طبقہ اس کے جال میں آسانی سے پھنس رہا تھا۔ خود مولانا دریابادی عنفوانِ شباب میں اپنی عقلیت پسندی پر فخر کرتے تھے لیکن جب اللہ نے ان کو نورِ ہدایت سے نوازا تو پھر وہ عقلانیوں اور مغرب زدہ ذہنوں کے لئے تیغ جگر دار ہو گئے۔ چونکہ وہ عقلانیوں کی کمزوریوں سے اچھی طرح واقف تھے اس لئے انہوں نے ان پر وار کر کے ان کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔ جس کے تابندہ نقوش ان کی انگریزی و اردو تفسیروں میں جا بجا ملتے ہیں۔ مولانا نے اپنے مخصوص انداز میں مغرب سے مرعوبیت کا بھی خوب مذاق اڑایا اور نوجوانوں کے دل میں مقام کر چکی مغرب کی برتری کے احساس کو کھرچ ڈالنے اور انہیں مشرقی اقدار و روایات کا عادی بنانے کی بھرپور کوشش کی۔ یہ تلخابۂ شیریں ملاحظہ ہو:

> ''آج کوئی ہمارے سامنے دسترخوان پر صبح ناشتہ کے وقت گھی میں چپڑی ہوئی روٹی پیش کر دے تو ہم اپنے دل میں کہیں اور ممکن ہے کہ زبان پر بھی لے آئیں کہ کیا واہیات کھانا اور کیسا گنوارپن ہے حالانکہ ہمارے باپ دادا اسے بڑی خوشی سے کھاتے آئے ہیں۔ لیکن کہیں بریک فاسٹ کے وقت میز پر نان پاؤ کے ٹکڑے مکھن

کے ساتھ آجائیں تو پھر دیکھئے ہم کس رغبت وشوق سے اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں! یہ کیوں؟ اس لئے کہ گھی چپڑنا کہنگی کی یادگار اور قدامت پرستی کی علامت ہے اور مکھن لگانا خاص ماڈرن ازم کی دلیل۔ (صدق جدید دسمبر ۱۹۶۶ء بحوالہ عبدالماجد دریابادیؒ، ص:۳۵)

الغرض یہ کہ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کا اصلاحی کارنامہ اس قدر وسیع ہے کہ ان کا احاطہ مختصر وقت میں ناممکن ہے ع

سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لئے

اخیر میں ایک بات عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا کہ مولانا نے ''سچی باتیں'' کی صورت میں تربیتی واصلاحی مضامین کا جو گراں قدر سرمایہ چھوڑا ہے اس کی افادیت آج بھی مسلم ہے اور ان شاء اللہ مستقبل میں اس کا فیض جاری رہے گا۔ اگر ان نگارشات کو یکجا کردیا جائے تو بلاشبہ ایک جامع اور مستند اصلاحی وتربیتی نصاب تیار ہوجائے گا۔ امید ہے کہ شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی یہ کام کر کے ملت کی طرف سے فرضِ کفایہ ادا کرے گا۔ واللہ ولی التوفیق۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

بیگم حامدہ حبیب اللہ ☆

کچھ شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے کارنامے سے ان کے ماں باپ اور خاندان کا نام روشن ہوتا ہے اور وقار میں اضافہ ہوتا ہے لیکن کچھ شخصیتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن سے نہ صرف ان کے آباؤاجداد کا نام روشن ہوتا ہے بلکہ وہ اپنے کارہائے نمایاں سے اپنے وطن کا نام بھی اونچا کرتے ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کا شمار بھی اس آخری قسم کے افراد میں ہوتا ہے۔ قصبہ دریاباد مولانا کا وطن ہونے کی بنیاد پر آج ملک کے گوشے گوشے میں جانا جاتا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کی پیدائش ایک معزز، خوشحال اور دیندار خاندان میں ہوئی تھی۔ ان کا بچپن بہت خوشحالی میں گذرا۔ اردو، فارسی، عربی اور انگریزی کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کیننگ کالج میں اور علی گڑھ میں حاصل کی۔ علی گڑھ اگرچہ بچوں کے دل لگنے کے لئے مشہور ہے مگر مولانا کے ساتھ معاملہ الٹا رہا ان کا دل علی گڑھ میں نہیں لگا اور لکھنؤ میں ہی اٹکا رہا۔ ریلی والی گاڑی کو وہ حسرت سے دیکھتے تھے کیونکہ وہ لکھنؤ کی طرف سے ہی آتی اور ادھر جاتی تھی۔ علی گڑھ میں ایک سال گذار کر وہ دہلی پہونچے اور وہاں کے مشہور اسٹیفن کالج میں داخلہ لیا۔

مولانا ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ بیک وقت صاحب طرز ادیب دانشاء پرداز، ایک بلند پایہ صحافی، مکتوب نگار، شاعر، ڈرامہ نگار، قابل مترجم، سوانح نگار، محقق ومرتب، عالم دین مفسر قرآن اور مفکر وفلسفی تھے۔

مولانا شبلی نعمانی کے طرز تحریر سے بہت متاثر تھے اور ان کے طرز تحریر کا رنگ وہ اپنے مضامین میں اتارنے کی کوشش کرتے تھے اس کا اقرار انہوں نے خود اپنی آپ بیتی میں کیا ہے۔

مولانا کی صحافتی زندگی کا آغاز بچپن میں ہی ہوگیا تھا جب بارہ برس کی عمر میں انہوں نے اودھ اخبار میں فرضی نام سے اپنا مضمون چھپوایا، اودھ اخبار کے علاوہ عصر جدید، البشیر، ماہنامہ

☆ سابق ممبر پارلیمنٹ۔

الناظر اور ادیب میں ان کے مضامین اور تبصرے کثرت سے شائع ہوتے تھے۔ ان اخبارات ورسائل کے علاوہ چکبست کے جریدہ صبح امید اور سید سلیمان ندوی کے معارف میں بھی ان کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ مولانا محمد علی کے روزنامہ ہمدرد سے بھی ان کا تعلق تھا۔

مکتوب نگاری کی حیثیت سے بھی مولانا دریابادی کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ ان کا شمار ان مکتوب نگاروں میں کیا جاسکتا ہے جنہوں نے خطوط کے ذریعہ گفتگو کا نعم البدل مہیا کیا اور تحریر اور بات چیت کے فاصلے کم کئے۔

مولانا کے اندر شعر گوئی اور شعر فہمی کی بھی زبردست صلاحیت تھی اور ان کی صلاحیتوں کا اندازہ اکبرالہٰ آبادی نے خوب لگایا تھا اور ان کو شاعری کرنے کی ترغیب بھی دلائی تھی جس کے نتیجہ میں مولانا دریابادی نے غزلیں بھی کہیں۔ ان کا کلام ''تغزل ماجدی'' کے نام سے شائع بھی ہوا ہے۔

فلسفہ سے مولانا کو خصوصی دلچسپی تھی کالج میں انہوں نے فلسفہ کا انتخاب بحیثیت ایک اختیاری مضمون کیا تھا۔ مولانا کی فلسفیانہ تحریروں کا مجموعہ ''فلسفیانہ مضامین'' کے نام سے شائع ہوا اور بعد میں یہی مضامین چند دیگر مضامین کے اضافہ کے بعد ''مبادی فلسفہ'' کے نام سے شائع ہوئے۔ یہ کتاب ''مبادی فلسفہ'' فلسفہ کے مبتدی طالب علموں کے لئے بڑی مفید ہے۔ مولانا کو فلسفہ کے علاوہ نفسیات سے بھی کافی دلچسپی تھی اور اسی ضمن میں عمل تنویم سے ان کو خاص شوق تھا۔ انہوں نے جس زمانے میں نفسیات پر قلم اٹھایا اس وقت نفسیات فلسفہ کا ہی حصہ سمجھی جاتی تھی۔ ان کی فلسفیانہ تحریروں میں نفسیات کے چند باب ملتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی کتابیں ''فلسفۂ جذبات''، ''فلسفۂ اجتماع'' اور سائیکالوجی آف لیڈرشپ ہیں۔ اول الذکر دو کتابیں اردو میں اور تیسری انگریزی میں ہے۔ ان کی انگریزی کتاب لندن کے ایک مشہور اشاعتی ادارے نے شائع کی تھی۔

اس کے علاوہ مولانا ایک ماہر اور قابل مترجم بھی تھے انہوں نے فلسفہ، سائنس، تہذیب وتمدن، عمرانیات وغیرہ پر اہم کتابوں کے ترجمے کئے۔

یہ ایک مختصر تعارف ہے جو میں نے یہاں پیش کیا۔ اب سیمینار میں جو دانشور شریک ہیں وہ مولانا عبدالماجد دریابادی کی شخصیت اور ان کے علمی اور ادبی کارناموں پر تفصیل سے روشنی ڈالیں گے۔ بہر حال میں اس سیمینار کے منتظمین کی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مولانا جیسی قدآور شخصیت پر یہاں مجھ ناچیز کو بھی اظہار خیال کا موقع دیا۔

کتاب زندگی کا آخری باب

زہیرہ قدوائی ☆

آخر عمر میں والد صاحب اکثر بڑے حسرت کے لہجہ میں فرمایا کرتے تھے کہ "آپ بیتی یعنی کتاب زندگی کا آخری باب بالکل نامکمل اور ناتمام رہ گیا" فالج نے دماغ کو اور موتیا بند نے آنکھوں کو اتنا کمزور کر دیا تھا کہ باوجود ارادہ کے اس کو پورا نہ کر سکے۔ آپ بیتی پر نظر ثانی انتقال سے دس سال قبل یعنی فروری ۱۹۶۷ء میں کی تھی اور مجھ ایسی کم استعداد کے لئے اس باب کو پورا اور مکمل کرنا دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ فالج کے حملہ کے بعد ڈھائی تین سال زندہ رہے اس عرصہ کے کچھ واقعات ناظرین کی دلچسپی اور واقفیت کے لئے لکھے دے رہی ہوں۔

وسط مارچ ۱۹۷۴ء تھا کہ دریاباد سے اطلاع آئی کہ والد صاحب پر فالج کا حملہ ہوا ہے اس خبر سے میرے دل پر کیا گزر گئی۔ فالج کے مرض کی ایسی بے کار زندگی اور والد صاحب جیسا حساس انسان کیسے برداشت کرے گا۔ میرے علی گڑھ آنے کے بعد جب کبھی ان کی بیماری کی اطلاع آتی تھی ہم دونوں میاں بیوی پہلی ٹرین سے گھر اور بچوں کو چھوڑ کر فوراً روانہ ہو جاتے تھے ان کو صحت ہونے کے بعد خوشی خوشی واپس آجاتے تھے مگر آہ فالج کے ایسے موذی مرض میں صحت کہاں ممکن تھی!

جس وقت دریاباد میں ان کے کمرے میں پہنچی حیرت اور خوشی سے دیکھنے لگی وہ حسب معمول اپنی کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے اور اردو تفسیر کا چودھواں پارہ جو نظر ثانی کر رہے تھے کھلا ہوا تھا جو ان کی زندگی کا بہترین سرمایہ تھا، میری نادانی کیا معلوم تھا بس قدرت کی طرف سے ان کی خدمت قرآن کا زمانہ ختم ہو گیا ہے۔ ان کو اپنی بیماری کا علم نہیں تھا وہ جو دورہ پڑا تھا وہ انہیں یاد نہیں تھا اور اپنے کو تندرست سمجھ رہے تھے۔ ہر عیادت کرنے کے لئے آنے والے کو حیرت سے دیکھتے تھے اس عالم میں ڈاکٹر کا آنا اور دوائیں پابندی سے استعمال کروانا بھی ممکن نہ تھا۔ قومی آواز میں

☆ بیگم ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی و صاحبزادی مولانا عبدالماجد دریابادیؒ۔

''مولانا دریابادی پر فالج کا حملہ'' خبر چھپی زبانی کہنے کی ہم لوگوں کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ اخبار کا وہ صفحہ دکھا کر کہا کہ اس میں آپ کی بیماری کی خبر چھپی ہے۔ بولے ایک لفظ بھی نہیں —— مگر دل اور دماغ پر خدا جانے کیا کچھ گزر گئی مجھ سے ان کا چہرہ دیکھا نہیں گیا۔

مارچ ۶۷ء تھا کہ علی گڑھ کانوکیشن میں ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری دینے کے لئے بلائے گئے لائبریری میں اپنی کتابیں دیکھنے کے اشتیاق میں اتنا بڑا سفر گوارا کرلیا۔ والد صاحب اور رشید احمد صدیقی صاحب کو ایک ساتھ ہی ڈگری ملی۔ میں چچی یعنی بیگم رشید احمد صدیقی کے پاس گئی اور ہنس کر کہا چچی مبارک ہو چچا اور والد صاحب کو ڈگری ملی وہ مسکرا کر بولیں بیٹی تم کو باپ اور چچا کی ڈگریاں مبارک ہوں یہ باتیں تم لوگوں یعنی بچیوں ہی کے خوش ہونے کی ہیں کسے معلوم تھا کہ دونوں اس دار فانی میں صرف دس مہینے کے مہمان ہیں۔ جنوری ۱۹۷۷ء میں والد صاحب کے انتقال کے بعد جب میں لکھنؤ سے واپس آکر چچی کے پاس تعزیت میں گئی تو میں نے رقت انگیز آواز میں چچی سے کہا کہ میں باپ اور چچا دونوں کی تعزیت کرنے آپ کے پاس آئی ہوں۔

والد صاحب بیماری کے بعد اکثر فالج کے مریضوں کے عبرتناک حال ہم لوگوں سے بیان کرتے رہتے تھے۔ ستمبر ۷۶ء تھا والد صاحب رمضان کرنے دریاباد تشریف لے گئے تھے عید کے دوسرے روز لکھنؤ واپس آرہے تھے خلاف معمول اس مرتبہ دریاباد کے بہت سے لوگ ان کو رخصت کرنے اسٹیشن تک آئے۔ ان کے معالج ڈاکٹر وجیہہ الدین اشرف (جو ہماری برادری کے ہیں اور خاندانی تعلقات بھی بہت عرصہ سے ہیں ان کی والد صاحب کے علاج کے سلسلہ میں توجہ اور کرم فرمائی کے ہم چاروں بہنیں بہت ہی ممنون ہیں۔ اسی طرح لکھنوی معالج ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی جنہوں نے بیماری کے پورے زمانہ میں اپنی والی کوئی کوشش اٹھا نہ رکھی ان کے بھی ہم لوگ بہت ہی شکر گزار ہیں) نے اپنے کیمرہ سے راستہ میں ان کی تصویریں بھی لیں جس کی خبر آنکھوں کی خرابی کے باعث ان کو نہ ہوئی۔ منجھلی لڑکی ساتھ تھیں کہتی تھیں کہ والد صاحب دریاباد والوں سے خاص طور پر متاثر ہو کر ملتے رہے۔ خاتون منزل یعنی اپنے گھر آتے ہی چھوٹی لڑکی سے بولے اب کی دریاباد والوں نے ہم کو غیر معمولی طور سے رخصت کیا اور ان کا اس طرح رخصت کرنا بے معنی نہ تھا بلکہ پُر معنی تھا۔

اکتوبر ۱۹۷۶ء تھا کہ تہجد کے وقت وضو کرنے جارہے تھے پیر پھسلا اور گرنے سے کولہے کی

ہڈی ٹوٹ گئی اطلاع ملتے ہی ہم دونوں حسب معمول لکھنؤ گئے۔بس ایک تخت پر لیٹے ہوئے تھے اور زندگی اسی تخت تک محدود تھی مگر پروگرام کے مطابق اپنے سب معمولات پورے کرتے رہتے تھے داہنی کروٹ ہمیشہ سوتے تھے اب یہ ممکن نہ تھا اس کی بڑی تمنا تھی۔

دسمبر ۷۶ء تھا علی گڑھ میں جاڑوں کی چھٹیاں شروع تھیں ہم لوگ لکھنؤ گئے مگر میری حسرت کی انتہا نہیں رہی جب معلوم ہوا کہ کل ہی فالج کا دوسرا حملہ ہوا ہے اور زبان صاف نہیں ہے۔ بات برائے نام سمجھ میں آتی تھی ویسے ہوش وحواس ٹھیک تھے ہم چاروں بہنوں کے تو بالکل عاشق زار تھے ان کی محبت اور شفقت کا یہ عالم تھا کہ رشتے کے بھتیجے بھانجوں وغیرہ کو اپنی اولاد کی طرح اور غیروں کو مثل بھتیجوں بھانجوں کے چاہتے تھے۔مگر اب کسی سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رہ گئی تھی۔ انتقال سے پندرہ روز قبل منجھلی لڑکی سے جوان کے پاس آخر وقت رہیں ادھ کٹے لفظوں میں فرمایا وہ جو آتا ہے "ف"، منجھلی لڑکی نے جب دیکھا کہ جملہ پورا نہیں ہو رہا ہے تو کہا فرشتہ بولے ہاں اور ہاتھ سے داہنی طرف اشارہ کیا اور کہا آ گیا ہے۔

اپنی صحت کے زمانہ میں اکثر ہم لوگوں کے سامنے فرمایا کرتے تھے کہ آخر وقت جب آئے تو کیسا اچھا ہو اس وقت دیوبند کے مولانا محمد طیب صاحب موجود ہوں۔اور مولانا علی میاں نماز پڑھائیں جب علی میاں ہندوستان سے باہر چلے جاتے تھے تو بڑے فکرمند رہتے تھے۔نماز جنازہ کے لئے دوسرا نام دریاباد کے معمر حافظ قرآن جنھوں نے سیکڑوں لڑکوں کو حفظ کرایا حافظ غلام نبی کا بھی لیتے تھے۔

۲رجنوری ۷۷ء کو بڑے نواسے سلیم قدوائی جو چھٹیوں میں دہلی سے آئے ہوئے تھے اور واپس جا رہے تھے رات کو ۸ بجے والد صاحب سے رخصت ہونے کے لئے آئے میں نے والد صاحب کے کان کے پاس جھک کر کہا سلیم دہلی جا رہا ہے۔بڑی حسرت سے بغور اس کی طرف دیکھتے رہے خدا حافظ کہتے ہوئے ہونٹ ہلے اور سلام کے جواب میں ہاتھ میں جنبش ہوئی۔ سلیم [۱] کی آنکھوں میں آنسو بھرے تھے میں نے بھرائی ہوئی آواز میں اس سے کہا۔

دیکھ لینا کہ پھر نہ دیکھوگے
غالب بے مثال کی صورت

(۱) آج یہ جے این یو کے پروفیسر ہیں، اوران کی تحریک پر یہ سیمینار ہوا تھا۔(قاسمی)

اور واقعی وہ صرف چار روز کے مہمان تھے یہ شعر زندگی میں بڑی رقت سے اکثر پڑھا کرتے تھے۔

عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

۳ر جنوری کو میں کمرہ میں ان کے پاس گئی تو دیکھا نوکر لڑکے سے اشارہ سے ہر تھوڑی دیر کے بعد قلم کاغذ مانگتے تھے وہ ردی کاغذ اور بغیر روشنائی کا قلم دے دیتا تھا نہ جانے کیا لکھ کر وہ واپس کر دیتے تھے۔ مجھ سے دیکھا نہیں گیا اب کی ان کے اشارہ کرنے پر میں نے قلم میں روشنائی بھر کر سادہ کاغذ دیا ہاتھ میں قلم پکڑنے کی بھی قوت نہیں رہ گئی تھی میں نے ٹھیک سے قلم پکڑوایا بڑا ہی موثر منظر تھا جس نے ہزاروں لاکھوں صفحے لکھ ڈالے اس کی آخری تحریر سادہ کاغذ پر چند لکیریں تھیں جو دنیا کی بے ثباتی اور فنا کا سبق دے رہی تھیں۔ آج رات میں برائے نام سوئے بار بار اٹھ کر بیٹھ جاتے تھے اور بڑے ادب اور تعظیم سے کسی کا استقبال کرتے تھے جو الفاظ سمجھ میں آتے تھے وہ یہ تھے۔ تشریف، مہربانی، وغیرہ وغیرہ خود ہر منٹ چلنے پر تیار لحاف اپنے کمزور اور نحیف ہاتھوں سے بار بار ہٹاتے تھے جسے سردی کے خیال سے ہم لوگ پھر ان پر ڈال دیتے تھے۔

۵ر جنوری کی صبح کو بعد نماز فجر میں ان کے کمرہ میں گئی بچپن سے پالے ہوئے لڑکے نثار علی حسب معمول ناشتہ کرا رہے تھے۔ نیم برشت انڈے کے ٹکڑے منہ میں تھے جن کو نکالنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ میں نے انگلی سے سب نکال دیے اور رومال سے منہ صاف کر دیا انڈا کھاتے بھی کیسے اب زندگی کا آخری رزق بھی ختم ہو چکا تھا۔ لیٹنے کا اشارہ کیا کیا معلوم تھا اب قیامت تک سونے کی تیاری کر رہے ہیں۔ میں نے اور ملازم نے گاؤ تکیہ ہٹا کر آرام سے لٹا دیا بالکل پرسکون سو رہے تھے قریب ہی محلہ میں کسی کے تقریر کرنے کی آواز آ رہی تھی کسی نے بتایا کہ مولانا محمد طیب صاحب تقریر کر رہے ہیں مجھے خوشی کی وجہ سے یقین نہیں آیا کہ والد صاحب کا آخری وقت ہے اور ان کی تمنا کے بموجب مولانا محمد طیب صاحب نہ صرف لکھنؤ میں موجود ہیں بلکہ گھر سے اتنا قریب فوراً منجھلے بھائی ان کی خدمت میں ہم لوگوں کا پیام لے کر گئے مولانا از راہ محبت تشریف لائے مگر والد صاحب کو کچھ خبر بظاہر نہیں ہوئی روحانی خبر کا علم تو اللہ ہی کو ہوگا۔ دیر تک بیٹھے پڑھتے رہے چہرہ پر سکون اب اور کچھ زیادہ ہی ہوگیا۔ آج رات بھر ہم لوگ قریب ہی بیٹھے رہے آج کی رات

حیرت کی بات یہ ہے کہ بجائے نہ کٹنی والی رات کے بڑی تیزی سے گزر رہی تھی۔ منجھلی اور چھوٹی بہن نماز اور قرآن شریف پڑھ رہی تھیں چچازاد بہن اور بڑی بہن کلمہ اور قرآن شریف کی سورتیں قریب ہی بیٹھی پڑھ رہی تھیں۔ بڑے بھائی جان ہر تھوڑی دیر کے بعد آکر نبض دیکھ جاتے تھے۔ بڑی نواسی سرہانے بیٹھی زار و قطار آنسو بہا رہی تھی اور ہاشم قدوائی صاحب کے کہنے کے بموجب زمزم میں ملا کر ڈاکٹر قریشی کی دوائیں دے رہی تھی وہ آسانی سے حلق سے نیچے اتر جاتی تھیں قدوائی صاحب اس مشہور بات پر عمل کر وار ہے تھے کہ جب تک سانس ہے تب تک آس ہے۔ میں قریب ہی کرسی پر بیٹھی ایک ہاتھ میں تسبیح لئے کلمۂ طیبہ پڑھ رہی تھی دوسرا ہاتھ آنکھ پر تھا ہر تھوڑی دیر بعد والد صاحب کے چہرہ کی طرف دیکھتی تھی منہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا اور زبان اللہ اللہ کی رٹ لگائے تھی۔

گھڑی کی سوئیاں بڑی تیزی سے حرکت کر رہی تھیں ساڑھے ۴ بج رہے تھے اول وقت فجر کی اذان ہو رہی تھی کہ بڑی بہن کی آواز سے میں چونک پڑی کہ دیکھو والد صاحب رخصت ہو گئے تین بجے رات سے ہر موسم میں جانماز پر بیٹھا رہنے والا اپنے مالک و مولا کے حضور میں حاضر ہو چکا تھا، کمرہ نواسے نواسیوں اور لڑکے لڑکیوں کی سسکیوں اور کلمۂ طیبہ کی آواز سے گونج رہا تھا۔ انتقال کی خبر سنتے ہی والد صاحب کے عقیدت مندوں رشتہ داروں کا مجمع ہو گیا۔ والد صاحب کی رشتہ کی بھتیجیاں ایک دوسرے سے لپٹ کر کہہ رہی تھیں کہ آج ہم یتیم ہو گئے، جن کے باپوں کے انتقال کو مدتیں ہو چکی تھیں ہر باپ کے مرنے پر اس کی لڑکیاں یتیم ہوتی ہیں مگر والد صاحب کے انتقال پر دوسرے کہہ رہے تھے کہ آج ہم یتیم ہو گئے۔

بجیا یعنی حامدہ حبیب اللہ روتی ہوئی گھر میں داخل ہوئیں امی مرحومہ یعنی اپنی خالہ جان کے انتقال کے بعد سے وہ اپنے خالو جان کا اور زیادہ ہی خیال اور محبت کرنے لگی تھیں ان کے خالو جان نے ان کو بچپن میں کھلایا بھی بہت تھا۔

چھوٹے بھائی نے ایک آدمی دریاباد قبر وغیرہ کے انتظام کے لئے قیوم بھائی کے پاس بھیجا اور ندوہ والوں نے رائے بریلی موٹر مولانا علی میاں کو لینے کے لئے بھیجا۔

جنازہ نہلا دھلا کر تیار ہو گیا دریاباد جانے کے لئے لاری گولہ گنج کے چوراہے پر کھڑی تھی جنازہ ندوہ تک کاندھوں پر گیا ملکہ عالیہ کے مقبرے کے پاس شیعہ حضرات بھی کاندھا دینے کے

لئے کھڑے تھے۔ ہم لوگ لاری سے ندوہ پہنچے علی میاں جب تشریف لائے تو انہوں نے نماز جنازہ پڑھائی مجمع کئی ہزار کا تھا۔

عام مجمع کے علاوہ ندوہ کے طلباء برابر کاندھا دے رہے تھے اور لاری پر جنازہ رکھنے کا نام ہی نہیں لیتے تھے لاری کے پچھلے حصہ میں جنازہ رکھا گیا ہم چاروں بہنیں جنازہ کے قریب ہی بیٹھیں والد صاحب ہمیشہ سفر میں ہم لوگوں کو اپنے پاس بٹھا کر خوش ہوتے تھے۔ لمبے سفر میں جب کبھی ان کا ساتھ ہوتا تھا تو طلوع آفتاب کی مثال زندگی کے آغاز کی اور غروب آفتاب کی مثال زندگی کے انجام کی بڑی عبرت سے دیا کرتے تھے آج جب لاری حدود دریاباد میں داخل ہو رہی تھی تو غروب ہونے والے آفتاب کی آخری کرنیں جنازہ پر پڑ رہی تھیں اور زبان حال سے درس عبرت دے رہی تھیں گھر سے کئی میل دور سے سڑک کے کنارے لوگ کھڑے اپنے مولانا صاحب کے آخری دیدار کا گھنٹوں سے انتظار کر رہے تھے۔ آج صبح سے گھروں میں چولہا نہیں جلا تھا بازار بھی صبح ہی سے بند تھے قصبہ کے ہندو بھی اپنے مولانا صاحب کے غم میں برابر کے شریک تھے لوگ فیض آباد کانپور اور دریاباد کے قرب و جوار بانسہ، بڑاگاؤں احمد پور، رسولی وغیرہ وغیرہ سے صبح ہی سے جمع ہونا شروع ہو گئے تھے گھر میں جانے کا راستہ مجمع کی وجہ سے نہیں مل رہا تھا محلّہ کی عورتیں ہم لوگوں سے گلے مل کر رو رہی اور کہہ رہی تھیں آج ہمارا باپ اٹھ گیا۔

جنازہ کے پلنگ میں کاندھا دینے کے لئے بانس لگا دیئے گئے تھے نماز جنازہ دوبارہ اسکول کی فیلڈ میں والد صاحب کی تمنا کے بموجب حافظ غلام نبی صاحب نے ہزاروں کے مجمع میں پڑھائی خود فرمایا کرتے تھے کہ نماز جنازہ میں مجمع کے ہم بہت حریص ہیں وہ تمنا بھی اللہ میاں نے پوری کر دی وصیت گھر سے ملی ہوئی مخدوم صاحب کی درگاہ میں دفن کی تھی اور ایک مرتبہ مولانا علی میاں سے کہہ چکے تھے جب وہ دریاباد آئے تھے کہ اس درگاہ کا اصلی مجاور تو میں ہوں۔ جس کمرہ میں پچاس سال سے بیٹھے قرآن مجید کا کام کرتے رہتے تھے سامنے کھڑکی سے درگاہ نظر آتی رہتی تھی یعنی اپنی آخری آرام گاہ۔

غل ہوا کہ جنازہ آ رہا ہے کوٹھے کی چھت سے پورا دریاباد دکھائی دیتا تھا میں بھی کوٹھے پر گئی نیچے درگاہ تھی رات کے آٹھ بجے کا وقت تھا دور سے گیس کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں بے حد مجمع تھا معلوم ہوتا تھا نہ جانے کتنی شاندار بارات آ رہی ہے۔

محسنہ قدوائی جنازہ میں شرکت کرنے مع بڑے گاؤں کے اور لوگوں کے دریاباد آ گئی تھیں محسنہ[1] نے روتے ہوئے کہا کہ میں نے یہ کبھی سوچا ہی نہیں کہ دادا رشتہ میں میرے کیسے دادا ہیں بس یہ معلوم تھا کہ ابو کے بے حد محبوب ماموں ہیں۔

درگاہ میں جنازہ جانے کا دروازہ چھوٹا تھا اور مجمع اندر جانے کے لئے بے قرار تھا حسین قدوائی نے دیوار تڑوادی پھر بھی مجمع بے قابو ہوا جارہا تھا۔ عزیز الرحمٰن صاحب ریاستی وزیر بھی جنازہ میں شرکت کے لئے آئے تھے اسی وجہ سے پولیس بھی تھی کسی نے عزیز الرحمٰن صاحب سے کہا کہ پولیس مجمع کی لائن بنوادے۔ جواب میں عزیز الرحمٰن صاحب نے کہا نہیں یہ سب مولانا کے عوام ہیں ان سے پولیس نہیں بولے گی۔

دریاباد کے گھر کے در ودیوار بجائے رونے کے آج اپنے ملک کے آنے سے نہ جانے کیوں خوش تھے گھر جتنا بڑا ہے ان سے کہیں زیادہ وسیع اور صاف ستھرا لگ رہا تھا میں بار بار حیرت سے در ودیوار کو دیکھ رہی تھی شمع بجھنے سے قبل جس طرح بھڑکتی ہے وہی حال اس گھر کا تھا۔ کیونکہ ایک ہفتہ بعد میں پھر جب لکھنؤ سے دریاباد فاتحہ پڑھنے گئی تو مکان پر غضب کا سناٹا اور ویرانی برس رہی تھی۔

قبر میں حافظ قرآن بھتیجے اور داماد حکیم عبدالقوی صاحب اترے بڑے ہی شوق سے ان کو بچپن میں حافظ کرایا تھا شاید اسی دن کے لئے۔ والد صاحب کے دفن کا منظر نہ پوچھئے کتنا پُر درد اور مؤثر تھا عورتوں کا دفن ہوتے ہوئے دیکھنا وہ بھی اتنے شفیق باپ کا آج تک دل پر بڑا گہرا اثر ہے۔ میں دونوں ہاتھ قبلہ رخ اٹھائے گڑگڑا گڑگڑا کر اپنے مالک ومولا سے ان کی مغفرت کی دعائیں کررہی تھی اور پھر کلمۂ طیبہ زور زور سے پڑھنے لگتی تھی والد صاحب ہی کی کہی ہوئی غزل کا یہ مصرع بھی زبان پر آجاتا تھا۔

ہاں ڈال تو دے رحمت کا اپنے ذرا سایہ

---

(۱) مشہور کانگریسی لیڈر سابق مرکزی وزیر اور موجودہ ممبر پارلیمنٹ جنہیں ہم لوگ ''محسنہ آپا'' کہتے ہیں (قاسمی)

الشيخ عبد الماجد الدريابادى: أديباً ومفسراً

بقلم: الأستاذ الدكتور شفيق أحمد خان الندوي☆

الشيخ عبدالماجد الدريابادى من أبرز رواد الأدب الإسلامي، في شبه القارة الهندية. ومن أهم كتابها المعروفين، بصفته مترجما للقرآن الكريم ومفسرا له باللغتين الإنكليزية والاردية، وفلسفيا في اختصاصه الدراسي، وكاتبا في العلوم النفسية، إلى جانب كونه أديبا بارعا، ومنشئًا رائعا، وباحثا قديرا فذا، ومترجما موفقا، وصحفيا أمينا، مخلصا للإسلام والمسلمين، ومصلحا للمجتمعات الإسلامية وغير الإسلامية ذات الديانات والثقافات واللغات المنوعة، إنه تطرق إلى معظم الأجناس الأدبية وما يرتبط بها من شعر ونثر، بما في ذلك قصة، ومسرحية، وسيرة، ورحلات ورسائل ونحوها، فتميز بأسلوبه البياني الرائع الجذاب، وانتقاده اللطيف اللاذع البناء ضد الدمار الخلقي الاجتماعي العام.

وهو من مواليد درياباد إحدى قرى مديرية باره بنكي، على بعد ٧٠ كيلومتر، شرقا من لكنؤ، عاصمة الولاية الشمالية / أوتار براديش الهندية، وذلك في ١٦ من شعبان ١٣١٠ هـ الموافق ١٦ مارس ١٨٩٢م تلقى دراسته الابتدائية في موطنه الأصلي فانتقل إلى لكنؤ حيث تخرج في كلية كينينغ الإنجليزية، التابعة لجامعة الله آباد حينذاك في عام ١٩٠٨م،

☆ صدر شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔

والتي تحولت إلى جامعة لكنؤ فيما بعد عام ١٩٢٠. قام الشيخ بمطالعات أدبية وفلسفية حرة من الشرق والغرب، وتاه في أودية الفلسفة، فخبط في طرقها الوعرة من التشكك والتحرر والإنحلال لمدة غير يسيرة، حتى اهتدى الى الصراط المستقيم نهائيا عند ما وفق الى دراسات متانية في القرآن الكريم، والسيرة النبوية الشريفة للعلامة شبلي النعماني، والمثنوى للشيخ جلال الدين الرومي ورسائل مجدد الالف الثاني الشيخ أحمد السرهندي رحمهم الله. توفي شيخنا في لكنؤ ودفن في مسقط رأسه درياباد في ١٩٧٧/١/٦م. رحمه الله رحمة واسعة وأدخله في فسيح جناته، إنه قام بخدمات جليلة في مجالات متنوعة من الأدب، والصحافة والعلوم القرآنية، فاشتهر بأسلوبه البديع الأنيق الرنان في اللغتين الأردية والإنجليزية على السواء، وبرز بتفسيره للقرآن الكريم وترجمته إلى اللغتين، وطبق صيته الخافقين منشئًا ومديراً للصحف الأسبوعية الأردية المعروفة ب "سچ" و"صدق" و "صدق جديد" الصادرة عن مكتبه الخاص في مدينة لكنؤ لمدة نصف قرن من الزمان، منذ يناير ١٩٢٥ لحين وفاته، بصورة متواصلة، من غير انقطاع، ألف كتبا قيمة في العلوم العربية الإسلامية والفنون، فحصل على جائزة الدولة التقديرية على يد فخامة رئيس الجمهورية الهندية عام ١٩٦٥، وجائزة الولاية الشمالية، ولاية أوتار براديش كذلك، وأخيراً فإنه نال درجة الدكتوراه الفخرية للأدب من جامعة علي كره الإسلامية عام ١٩٧٦م. ويبلغ عدد مؤلفاته سبعين مؤلفا مابين صغير وكبير في النقد الأدبي، والشعر، والسير، والفلسفة، وعلم النفس والترجمات، والرسائل، والتحقيقات العلمية، والعلوم القرآنية، أهمها:

☆ جغرافيا قرآنية: أطلس الأماكن والأثار المذكورة في القرآن الكريم.

☆ وأعلام القرآن،
☆ والحيوانات في القرآن،
☆ وبشرية الأنبياء في ضوء القرآن،
☆ وترجمة معاني القرآن الكريم وتفسيره باللغة الإنجليزية،
☆ وترجمة معاني القرآن الكريم وتفسيره باللغة الأردية،
☆ والسيرة النبوية الشريفة كما تتجلى من خلال القرآن الكريم،
☆ ومشكلات القرآن العشرين وحلولها القرآنية،
☆ وانطباعات وخواطر عن الإمام التهانوي رحمه الله،
☆ والزعيم محمد علي جوهر،
☆ والشاعر أكبر إله آبادي،
☆ ورسالة ندوة العلماء،
☆ وفلسفة الاجتماع،
☆ وفلسفة العواطف من منظور نفسي،
☆ ومبادئ الفلسفة،
☆ وعلم النفس العام،
☆ وتاريخ أوروبا،
☆ وتاريخ الحضارة،
☆ ومجموعات خطب للمناسبات،
☆ وأحاديث إذاعية،
☆ ومقالات ماجدية،

☆ ورسائل من عبد الماجد،

☆ وسيرة ذاتية،

وغيرها من المؤلفات الأخرى ذات الروعة البيانية الطريفة والأسلوب الماجدي الفريد الممتع الخاص الذي قلما يوجد له نظير في تاريخ المحسنات اللفظية والمعنوية المصبوغة بالصبغة الفكاهية والنكت الظريفة والتعابير البلاغية البناءة.

هذا و إذا تساءلنا أن أهم انجازاته العلمية الدينية فلا يمكننا إلا أن نقول إنه يتمثل في ترجمته للقرآن الكريم وتفسيره باللغتين الإنجليزية والأردية في عدة مجلدات ضخمة، ويعتبر من أفضل الترجمات القرآنية وتفاسيرها الشهيرة في الآفاق وذلك إن دل على شيء فإنه يدل على بصيرته القرآنية ودقة نظره في ترجمة لمعاني القرآن الكريم وتفسيره للعالمين، إلى جانب تضلعه من اللغتين الإنجليزية والأردية وقدرته على التعبير عما يكنه من الأفكار بأسلوب ساذج بسيط سهل رائع جذاب، يستهوي أفئدة القراء مثل ما تستهويها النصوص القرآنية الأصلية بالذات.

وذلك لأنه يتجنب الادعاء الذاتي والتفسير بالرأي، ويعتمد على مأثورات السلف الصالح في شرح المدلولات القرآنية وينقلها من التفاسير القديمة والجديدة، كما هي، فورشرحها شرح وجيزا وافيا من تلقاء نفسه من غير خلل، ويهتم في ذلك أيضا، بتقديم عصارة دراساته في الأعلام والآثار والأمكنة والديانات المذكورة بين دفتي المصحف الشريف، مستمدا من الشواهد والأدلة المتواجدة في المصادر القديمة والجديدة من أمثال المفردات لراغب الأصفهاني، ولسان العرب لابن منظور، وقاموس لين بول الإنكليزي، والتفسير الجامع لأحكام القرآن للقرطبي، وروح المعاني للآلوسي، ومدارك التنزيل للنسفي، والبحر المحيط لابن حيان وتفسير بيان القرآن للشيخ أشرف على التهانوي، ونحو ذلك من التفاسير

المتداولة، والهدف الذي يرمي إليه المفسر الدريابادي رحمه الله هو– كما ذكره لنفسه–ايقاظ الوعي الإسلامي والثقة بالرسالة الإلهية القرآنية الخالدة وترسيخ جذور العقيدة الإسلامية الأصلية في الأوساط العصرية المتفرنجة وإزالة الشبهات المزعومة من نفوسهم عن الإسلام، علما بأنه تمت الترجمة الإنجليزية للقرآن الكريم وتفسيره على يد شيخنا الدريابادي في مدة استغرقت سبع سنوات كاملة، أولا بأول، ثم قام بالترجمة الأردية له مع تفسيره فأكمله في غضون أربع سنوات عام ألف وتسع مائة وأربعة وأربعين الميلادي، استفاد صاحبنا الشيخ الدريابادى في ذلك من تفسير بيان القرآن للعلامة الشيخ التهانوي كثيرا، واعترف بذلك مرارا وتكرارا، كما اعترف بفضل مدارك التنزيل والبحر المحيط في سبيل كشف القناع عن المرويات الموضوعة.

وهكذا استطاع صاحبنا وشيخنا الدريابادي إثراء المكتبة الإسلامية العالمية، والمكتبة الأردية على الأخص، علما بأن اللغة الأردية هي، في الحقيقة، لغة معروفة ومشتركة بين العوام والخواص، إلى حد كبير، لدينا، في شبه القارة الهندية، ولغة الثقافة العربية والإسلامية كذلك في معظم أنحاء العالم، والتي أنجبت كتابا أجلاء في هذه الديار النائية عن مهد العروبة والإسلام من أمثال الشاعر العملاق محمد إقبال، والعلامة أبي الأعلى المودودي وصديق شيخنا الدريابادى سماحة الشيخ أبي الحسن علي الحسني الندوي رحمهم الله.

وجماع القول أن الجهود التي بذلها الشيخ عبد الماجد في المجالات الثقافية والأدبية القرآنية هي جهود هائلة قيمة، لايستغني عنها الدارسون والباحثون باللغات العربية والأردية والإنجليزية على السواء، فإنها في حاجة إلى نقلها إلى اللغات الحية الأخرى، نظرا إلى مغزاها الفكري والاجتماعي البنّاء، وتعميما لنفعها العميم.

هيهات لايأتي الزمان بمثله
إن الزمان بمثله لبخيل

ولله أسال أن يجزيه خيرا، ويوفقنا جميعا لما يحبه ويرضاه، وصلى الله على سيدنا ونبينا محمد، إمام الهداة والتقاة والمربين، وعلى آله وصحبه أجمعين ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين.

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کی اہم مطبوعات ایک نظر میں

کتاب	مصنف	قیمت
دلی کی تاریخی مساجد حصہ اول	مولانا عطاء الرحمن قاسمی	200/-
دلی کی تاریخی ساجد حصہ دوم	//	100/-
الواح الصنادید حصہ اول	//	100/-
الواح الصنادید حصہ دوم	//	100/-
پنجاب وہریانہ کی تاریخی مساجد	//	200/-
امام شاہ ولی اللہ اور ان کے افکار ونظریات	//	250/-
ہندومندراور اورنگ زیب کے فرامین (اردو)	//	20/-
ہندومندراور اورنگ زیب کے فرامین (ہندی)	//	20/-
نقوش خاطر (قلمی خاکوں کا مجموعہ)	//	70/-
مولانا عبدالماجد دریابادیؒ، خدمات وآثار	//	200/-
ضمائر القرآن	ڈاکٹر ابوالنصر محمد خالدی	300/-
الاشباہ والنظائر فی القرآن الکریم (قرآنی لغات)		350/-
وفیات اعیان الہند	//	300/-
قرآنی تشبیہات واستعارات	//	200/-
مضامین خالدی	//	300/-
مرزا غالب اور ہند مغل جمالیات	پروفیسر شکیل الرحمن	1000/-
گلدستۂ ظرافت	وسیم احمد سعید	100/-
بلاد ہند کی داستان	//	150/-
سفر، وسیلۂ ظفر (سفرنامہ)	خورشید انوار عارفی	100/-
نشریات (ریڈیائی تقریریں)	مولانا جنید احمد بنارسی	100/-

Shah Waliullah Institute
Office:- Masjid Kaka Nagar,
Near (N.D.M.C.Primary School)
Kaka Nagar, New Delhi-110 003
Ph.: 26323430-32 Mob.: 9811740661
E-mail: qasmi@shahwaliullah.com
website: www.shahwaliullah.com

ISBN 81-901848-3-0
Rs. 200/-